جنوری 2021
گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

جنوری 2021ء کا شمارہ

کامیابی کے

سنہرے پچاس سال

گولڈن جوبلی نمبر

ہر کہانی خاص کہانی

گولڈن مصنفین کا جھرمٹ

طاہر جاوید مغل، نجمہ مودی، ناہید سلطانہ اختر، منظر امام، ایچ اقبال، احمد اقبال، غلام قادر، پروین زبیر، ڈاکٹر ساجد امجد، اسما قادری، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، حسام بٹ اور امجد رئیس ایک ساتھ

اس کے علاوہ

سسپنس کلاسک

محی الدین نواب، عبدالقیوم شاد، ش م جمیل، اقبال کاظمی، ش صغیر ادیب، اثر نعمانی و دیگر مصنفین کی یادگار تحریروں کا انتخاب

نوٹ: گولڈن جوبلی نمبر میں کہانیوں کی طوالت کے باعث صفحات میں مزید اضافہ کیا جارہا ہے اب صفحات 322 سے بھی بڑھا کر 362 کیے جارہے ہیں مگر قیمت 150 ہی رہے گی۔

قارئینِ عزیز......السلام علیکم!

الحمدللہ سال 2021ء طلوع ہو چکا ہے۔ دعا ہے ہم سب کے لیے یہ نیا سال خیرو برکت اور ایمان کی مضبوطی کے ساتھ نیک تمناؤں اور بھرپور خوشیوں کا سال ہو۔ آمین!

یوں تو دو عشرے پہلے اگرچہ اکیسویں صدی کا آغاز ہو چکا مگر اب جانے کیوں ایسا لگا کہ گزشتہ ایک برس میں پوری صدی گزار لی گئی۔ جس طرح کے تغیرات رونما ہوئے...... بے انتہا ترقی یافتہ دور میں بھی ایک صدی پہلے کے تجربات اور یادداشتیں دُہرائی گئیں، اس سے یوں محسوس ہوا کہ انسان تو وہیں کا وہیں کھڑا ہوا ہے۔ وہ جو دوسرے چاند ستاروں، تمام سیّاروں پر کمندیں ڈال چکے تھے وہ بھی بے بس و مجبور نظر آئے۔ اللہ کی قدرت کے آگے تو انسان ہمیشہ سے ہی بے بس ہے۔ بلاشبہ انسان خسارے میں ہے ماسوائے ان کے جو دل سے ایمان لائے، نیک کام کرتے رہے اور حق اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔ اس مکمل ضابطۂ حیات کے بعد تو کسی اور چارٹر کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

آپ سب کے لیے خوشگوار امیدیں، نیک خواہشات و تمنائیں اور پُرخلوص دعائیں حاضر ہیں۔ اپنے پیارے ملک کے لیے دعا گو ہیں کہ یہاں ایثار و قربانی، بھائی چارے، رواداری، تحمل و برداشت کا دور دورہ ہو، تاکہ اس امن و خوش حالی کی فضا میں پیارا ملک ترقی کرے اور روشن راہوں کی طرف گامزن ہو۔

اللہ پاک ہماری گزشتہ فروگزاشتوں، کوتاہیوں، دانستہ و نادانستہ غلطیوں پر ہمیں معاف فرمائے۔ آمین!

مدیرہ

نزہت اصغر

اور اگر ہم تجھے ان میں سے کچھ دکھلا دیں جن کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں یا تجھے (دنیا سے) پورا، پورا لے لیں تو بھی ان کی بازگشت ہماری طرف ہی ہوگی۔ پھر جو کچھ وہ کرتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ گواہ ہے۔ (۴۶) اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ پس جب ان کا رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کردیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔ (۴۷) اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو (تو بتاؤ) یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا۔ (۴۸) (اے رسولؐ) کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لیے نہ کسی نقصان کا مالک ہوں اور نہ کسی فائدے کا۔ سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔ ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جب ان کا مقرر شدہ وقت آجاتا ہے تو وہ ایک گھڑی نہ پیچھے کرسکتے ہیں۔ اور نہ پہلے کرسکتے ہیں۔ (۴۹) کہہ دو کہ کیا تم نے سوچا کہ اگر اس کا عذاب تم پر رات کو یا دن کو آجائے، تو (بتاؤ) وہ کیا ہے جسے مجرم جلدی طلب کررہے ہیں۔ (۵۰) کیا جب وہ (عذاب) واقع ہوجائے گا تو تم اس پر تب ایمان لاؤ گے۔ (اس وقت ہم کہیں گے کہ) اب (تم ایمان لاتے ہو) حالانکہ تم ہی تو اسے جلدی مانگا کرتے تھے (۵۱) پھر جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان سے کہا جائے گا کہ تم ہمیشہ رہنے والے عذاب کا مزہ چکھو۔ جو کچھ تم کمایا کرتے تھے تمہیں اسی کی سزا دی جاتی ہے۔ (۵۲) اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ (جو تم کہتے ہو) سچ ہے۔ کہہ دو کہ ہاں میرے پروردگار کی قسم! وہ یقیناً سچ ہے۔ اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ (۵۳) اور اگر جو کچھ کہ زمین میں ہے اس شخص کے پاس ہو، جس نے ظلم کیا۔ تو وہ ضرور اسے (اپنے بدلے) فدیہ دے ڈالے اور جس وقت وہ عذاب کو دیکھیں گے، ندامت کو چھپائیں گے۔ اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ (۵۴) آگاہ ہو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ آگاہ ہو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ہیں۔ (۵۵) وہی زندہ رکھتا اور مارتا ہے۔ اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۵۶) اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت اور جو سینوں کے اندر (امراض) ہیں۔ ان کے لیے شفا آگئی ہے۔ اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت (آچکی ہے) (۵۷) (اے رسول) کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے انہیں خوش ہونا چاہیے۔ جو کچھ وہ جمع کرتے ہیں اس سے یہ بہتر ہے۔ (۵۸) کہہ دو کیا تم نے غور کیا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے رزق اتارا۔ پھر تم نے اس میں سے کچھ حرام اور کچھ حلال ٹھہرایا۔ کہہ دو کہ کیا تمہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا یا تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ موٹ بہتان باندھتے ہو۔ (۵۹) اور ان لوگوں کا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ موٹ بہتان باندھتے ہیں۔ قیامت کے دن کے متعلق کیا گمان ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ (۶۰)

(سورۂ یونس ۱۰ پارہ ۱۱ آیات ۴۶ تا ۶۰)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ مَّنْ نَّطَقَ وَحْیًا یُّوْحٰی

ہمارے پیارے نبی معظم، سید المرسلین، خاتم النبین، افضل الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بابرکت و باسعادت صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا امین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے۔ جس کے معنی و مفہوم امانت دار کے ہیں۔

1۔القرآن: ترجمہ: اور جب ان پر ہماری روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں جنہیں ہم سے ملنے کی امید نہیں کہ اس کے سوا اور قرآن لے آیئے یا اسی کو بدل دیجیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دیجیے کہ مجھے اس کا حق نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی کا تابع ہوں جو میری طرف وحی ہوتی ہے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

(سورۃ یونس آیت 15)

2۔الحدیث: ا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”خدا کی قسم! میں یقیناً آسمان میں بھی امین ہوں اور زمین میں بھی امین ہوں۔

(مدارج النبوہ)

۲۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی خطبہ شاید ہی ایسا ہوا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہ فرمایا ہو کہ جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس کا عہد (وعدہ) مضبوط نہیں اس کا دین نہیں۔

(مشکوٰۃ)

3۔الرائے: ا۔انہوں نے (کفار مکہ) نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار کی تعریف کی اور انہیں الامین، وفادار، مخلص اور قابل بھروسا جیسے ناموں سے پکارا۔ اس وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا کردار پس منظر میں ادا کیا۔

(ڈرمینگھم)

۲۔محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہرا ہم کو زائل اور تمام اصنام کی عبادتوں کو باطل کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت سچے اور بے مثال امین تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام لوگوں کو گمراہیوں سے نکال کر صراط مستقیم پر لا کر ڈال دیا۔

(مسٹر ہربرٹ وائل)

4۔الفضائل: جو کوئی روزانہ باوضو حالت میں ۱۴ مرتبہ یہ اسم پاک ”سیدنا امین“ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اسے کبھی ذلیل ورسوا نہیں کرے گا۔

(قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس)

زندگی کبھی، کبھی انسان کو ایسے کربناک حادثے سے دوچار کر دیتی ہے کہ اس کا اپنی ذات اور ارد گرد کے لوگوں پر سے اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کی وجہ بعض اوقات اس کی اپنی توقعات بھی ہوتی ہیں جو وہ کسی بے نام تعلق سے وابستہ کر لیتا ہے۔ وہ جذبے جو رشتوں کے توسط سے دل میں بسیرا کریں ان کی پزیرائی تو مذہب اور معاشرہ دونوں کرتے ہیں، ان کی حق تلفی پر جواب طلبی بھی کی جا سکتی ہے مگر وہ دلی تعلق جنہیں رشتوں کی سند نہ حاصل ہو، انہیں کسی عدالت سے بھی سزا نہیں سنائی جا سکتی، سوائے ضمیر کی عدالت کے۔ جبکہ وہ رشتے جنہیں تعلق کا نام بھی دے دیا جائے کبھی کبھی وہ اپنے جائز حق سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اور ان کی جوابدہی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دنیا دارالعمل ہے جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا... مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔

حادثوں میں گزری ہے راس بس تباہی ہے
زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے
خواب اب نہیں میرے، نیند تک پرائی ہے
عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

میرا سارا زنگ اتار دو

سلسلے وار ناول

افشاں آفریدی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیرازی ولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے جس میں یو ایس اے سے تین سال بعد واپس آ کر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے۔ دُرِ مکنون، سائرہ بیگم کی بھانجی تھی جس کی ذمے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھائی تھی۔ ایک رات درمکنون کی طبیعت خراب ہونے پر دادی اسے سکون آور دوا دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتاتی ہیں۔ اسٹڈی میں دُرِ مکنون کو دیکھ کر آنسو بہاتے مظفر شیرازی، عکرمہ کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ مظفر صاحب نے اپنی نئی ول بنوائی تھی وہ لے کر عکرمہ نکلتا ہے تو زاویار کا شیری کے ساتھ رویّہ دیکھ کر سوچتا ہے کہ کوئی عورتوں کے ساتھ اس طرح بھی برتاؤ کرتا ہے۔ خولہ، درمکنون سے عکرمہ کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اگر آپ اس گھر میں بہو بن کر آئیں تو بہت خوش رہیں گی، اس جملے کو سن کر عکرمہ ایک انجانے احساس سے دوچار ہوا تھا۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کو بھی شام کو گھر پر رہنے کا کہتی ہیں۔ عکرمہ کو زاویار سے مل کر یاد آ جاتا ہے کہ اس نے صفدر صاحب کے آفس کے باہر اسے دیکھا تھا اور لڑکی سے اس کا خراب برتاؤ بھی یاد آ جاتا ہے۔ زاویار کو دیکھ کر دُرِ مکنون بے ہوش ہو جاتی ہے۔ عینی، دُرِ مکنون سے ملنے آتی ہے اور اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے، عکرمہ کو یہ جان کر شاک لگتا ہے کہ درمکنون کے خوف اور وحشت کی وجہ اظہار بھائی ہیں۔ سائرہ بیگم، دُرِ مکنون کو بتاتی ہیں کہ زاویار نے رشتے سے انکار کر دیا ہے اور وہ اس کا رشتہ جلد از جلد کرنا چاہتی ہیں کیونکہ ان کے بعد عکرمہ اور سیف کی فیملی اس کی ذمے داری نہیں اٹھا سکے گی۔ عکرمہ اندر آتا ہے تو دُرِ مکنون بتاتی ہے کہ کوئی طاہرہ آنٹی آئی ہیں، عکرمہ بہت تیزی سے ان سے ملنے کے لیے جاتا ہے۔ دادی عکرمہ اور مظفر صاحب کو بتاتی ہیں کہ انہوں نے طاہرہ کو دُرِ مکنون کی میڈیکل فائل زوہا کے ذریعے دے دی ہے۔ طاہرہ بانو (ماہر نفسیات) دُرِ مکنون کو بتاتی ہیں کہ عکرمہ کی والدہ شگفتہ ان کی دوست ہی نہیں دودھ شریک بہن بھی تھی۔ دُرِ مکنون جب طاہرہ بانو کے پاس سے واپس آتی ہے تو عینی کا فون آتا ہے۔ اس کے فون رکھتے ہی دوبارہ بیل ہوتی ہے تو وہ عینی کا ہی سمجھ کر اٹھاتی ہے لیکن وہ زاویار کا فون تھا اور وہ اس سے معافی مانگتا ہے دُرِ مکنون کچھ کہہ نہیں پاتی رونے لگتی ہے عکرمہ جو گاڑی کی چابی بھول گیا تھا وہ دُرِ مکنون کو روتا دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور اس سے فون لے لیتا ہے لیکن دوسری طرف زاویار کی موجودگی اس کے لیے حیران کن تھی۔ ردا کی شادی میں سائرہ بیگم، دُرِ مکنون کو ایک فیملی سے ملواتی ہیں رخصتی کے بعد آصف اپنی پھپھو کو ائرپورٹ چھوڑنے جاتا ہے تو واپسی پر ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ آصف کا آپریشن تھا تو سب اسپتال میں تھے اظہار صاحب کو اپنی فیملی کے ساتھ واپس جانا تھا عکرمہ ٹکٹ لے کر آتا ہے تو اظہار اسپتال میں نہیں تھے، وہ پریشان ہو جاتا ہے اور زوہا کے ساتھ گھر آ جاتا ہے، سیڑھیوں پر دُرِ مکنون کا دوپٹا پڑا دیکھ کر وہ دادی کے کمرے کا دروازہ بجاڑالتا ہے۔ ماسٹر کی سے جب وہ لوگ دادی کا کمرا کھولتے ہیں تو دہشت زدہ رہ جاتے ہیں کیونکہ دُرِ مکنون کمرے کے انتہائی سرے پر دیوار کے قریب اوندھے منہ پڑی تھی۔ عکرمہ جب اسپتال سے گھر آتا ہے تو واچ مین اسے اظہار صاحب کا گولڈ پلیٹڈ پسٹل کی شکل کا لائٹر لا کر دیتا ہے کہ کل گیٹ کے پاس گرا ہوا تھا۔ عکرمہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ کل زارا نے اظہار صاحب کو لائٹر دیا تھا اور انہوں نے گاڑی میں اسموکنگ بھی کی تھی ان کا ارادہ اسپتال سے ڈائریکٹ ائرپورٹ جانے کا تھا اور وہ انہیں اسپتال ڈراپ کر کے ٹکٹس لینے گیا تھا تو لائٹر واپس شیرازی ولا کیسے آیا۔ اس کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ دُرِ مکنون کو کومہ میں گئے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ مظفر شیرازی بہت زیادہ پریشان ہوتے ہیں تو دادی کہتی ہیں کہ ڈاکٹر تو پُرامید ہیں جب وہ صحت یاب ہو کر آئے گی تو جشنِ صحت منائیں گے اور اسی تقریب میں، میں اسے اپنے پوتے سے منسوب کر دوں گی۔ مظفر صاحب کے پوچھنے پر دادی سیف کا نام لیتی ہیں تو مظفر صاحب کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ دُرِ مکنون ان کی اور سائرہ شیرازی کی سگی بیٹی ہے۔ عکرمہ بھی یہ بات سن لیتا ہے۔ دادی کہتی ہیں کہ انہیں دُرِ مکنون کو دیکھ کر ہمیشہ لگتا تھا کہ وہ ان کی ہے۔ نہیں جانتی تھیں کہ یہی سچ ہے۔ جب سے اسے دُرِ مکنون سے اپنے اور اس کے رشتے کا پتا چلا تھا وہ اور بھی زیادہ ذمے دار ہو گیا تھا کہ وہ اس کی سگی چچازاد تھی۔ دُرِ مکنون گھر آتی ہے تو سب اس کے استقبال کے لیے موجود ہوتے ہیں آصف کو وہیل چیئر پر دیکھ کر وہ آزردہ ہو جاتی ہے۔ عکرمہ، دادی اور مظفر صاحب کو بتا دیتا ہے کہ دُرِ مکنون اس کا انتخاب ہے۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کے درمکنون سے شادی کے فیصلے پر بہت سیخ پا ہوتی ہیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ردا کو آصف سے طلاق دلوا کر عکرمہ سے شادی کر دیں۔ دادی نے زوہا کو بلا کر دُرِ مکنون تک عکرمہ کا پروپوزل پہنچوایا تو دُرِ مکنون انکار کر دیتی ہے۔ عکرمہ، دُرِ مکنون سے بات کر کے اسے اس رشتے پر کنوینس کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن دُرِ مکنون سوچتی ہے کہ اس کا انکار بہتر ہے لیکن فرحان جو ردا کی شادی میں ملا تھا وہ اپنا پروپوزل بھیجتا ہے اور زارا فون پر اس کی طبیعت پوچھتی ہے تو اظہار صاحب اس سے

کہتے ہیں کہ جو کام ادھورا رہ گیا وہ مکمل کرنا ہے۔ پھر طاہرہ بھی دُرِ مکنون کو سمجھاتی ہیں تو دُرِ مکنون، عکرمہ سے رشتے کے لیے ہاں کر دیتی ہے۔ زوہا، عکرمہ سے ٹریٹ مانگتی ہے۔ ولی (عکرمہ کا دوست) بھی یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ عکرمہ کا بھائی عبید آ رہا تھا تو عکرمہ کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں، عکرمہ فضول رسومات نہیں کرنا چاہتا تو زارا اسے سمجھاتی ہے کہ وہ نہیں چاہتا تو دُرِ مکنون تو چاہتی ہوگی۔ عکرمہ، دُرِ مکنون سے بات کرتا ہے تو وہ کوئی اعتراض نہیں کرتی۔ زاویار کا فون آتا ہے اور وہ دُرِ مکنون سے معافی مانگتا ہے تو دُرِ مکنون، عکرمہ کو اپنے اور زاویار اور اپنے ماضی کے رشتے کے بارے میں بتاتی ہے۔ زاویار، دُرِ مکنون کی دوست عینی کا بھائی تھا عینی اور دُرِ مکنون اس سے پہلے ایک پروجیکٹ میں مدد لیتی ہیں اور پھر وہ ان کے کلس میں ایڈمیشن کے لیے ان کی تیاری کرواتا ہے۔ زاویار، درِ مکنون کو پسند کرنے لگتا ہے۔ صوفیہ (دُرِ مکنون کی ماں) مکرم صاحب کی چھٹی بیٹی تھی جو اُن کی دوسری بیوی سے تھی ان کی پہلی بیوی سے سات بیٹیاں ہوئیں۔ جن میں دو پیدا ہوتے ہی مر گئیں۔ ان کو اولادِ نرینہ کی خواہش نے دوسری شادی پر مجبور کیا لیکن دوسری بیوی سے بھی بیٹی ہوئی تو مجبوراً دل کو سمجھا لیا۔ چار بیٹیوں کی شادی کے بعد ان کی (پہلی بیوی کی) سائرہ اور صوفیہ ہی رہ گئی تھیں۔ شادی کے لیے جب زاہد علی نے اپنی والدہ کو ان کے گھر رشتے کے لیے بھیجا جو اس کالونی میں نئے، نئے شفٹ ہوئے تھے۔ زاہد علی کی والدہ نے جب مکرم صاحب کی بیٹیوں کو دیکھا تو سوچا کہ زاہد علی نے سائرہ کو ہی پسند کیا ہوگا اور ان کے لیے رشتہ ڈال دیا جو قبول ہو گیا۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے جب وہ سب سے چھپ کر اپنے دوست مظفر کے ساتھ ان کے گھر گئے تو دلہن کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ انہوں نے شادی سے انکار کیا تو مظفر کی والدہ نے ان کے لیے سائرہ کا رشتہ دیا جو قبول کر لیا گیا لیکن سائرہ کے دل سے یہ بات نہ نکلی۔ سائرہ کے لگاتار چار بیٹیاں ہوئیں جن میں سے ایک پیدائش کے فوراً بعد انتقال کر گئی اب اتنے سال بعد صوفیہ اور سائرہ دونوں امید سے ہو گئیں۔ صوفیہ کے ساتھ کچھ مسائل تھے لیکن اس بار وہ خوش تھیں کہ خدا نے ان کی گود ہری کی لیکن جب ان کے مردہ بچے نے جنم لیا تو مظفر نے اپنی بیٹی (دُرِ مکنون) صوفیہ اور زاہد علی کی گود میں ڈال دی۔ اس بات سے صرف زاہد علی اور مظفر ہی باخبر تھے انہوں نے یہ بات اور کسی کو نہیں بتائی تھی۔ دُرِ مکنون، صباحت کی منگنی کی شاپنگ کے لیے جاتی ہے تو ٹیکسی خراب ہو جاتی ہے تو ٹیکسی والا اسے راستے میں ہی اتار دیتا ہے۔ وہاں زاویار آ جاتا ہے وہ اس کے ساتھ جاتی ہے وہ راستے میں اسے پروپوز کرتا ہے......

ایک جگہ زاویار کولڈ ڈرنک لینے کے لیے رکتا ہے ان کے پیچھے کچھ بدمعاش ٹائپ لوگ لگ جاتے ہیں جو اسلحے کے زور پر دُرِ مکنون کو اغوا کر لیتے ہیں اور زاویار موت کے خوف سے اسے ان لوگوں کے پاس چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ عکرمہ کہتا ہے کہ وہ زاویار کو معاف کر دے۔ شہرین، میمونہ بیگم کو زاویار کے متعلق بتاتی ہے تو وہ سوچتی ہیں کہ آغا جان اور شہریار سے بھی اس کا دل صاف ہو جائے گا۔ جلال انصاری (آغا جان)، شہریار کو کہتے ہیں کہ وہ زاویار کو کال کر لیں۔ عاصمہ، زاویار کے باپ شہریار سے طلاق لے چکی تھیں۔ وہ شہرین کو اپنے دوسرے شوہر عثمان کے انتقال اور مومنہ کی شادی کا بتاتی ہیں اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں۔ شہریار انصاری، زاویار کو فون کرتے ہیں اور زاویار کے بدتمیزی سے جواب دینے پر فون بند کر دیتے ہیں۔ میمونہ بیگم، شہرین کو بتاتی ہیں کہ آغا جان چاہتے ہیں کہ خولہ کی یا شہرین کی شادی زاویار سے ہو جائے۔ زاویار تین سال پہلے کے اس منظر سے کسی طرح نکل نہیں پا رہا تھا۔ تین سال بعد آغا جان، زاویار کے سامنے تھے اور ان کے انداز بھی خاصے بدل گئے تھے، ان کے ساتھ شہریار اور عینی بھی تھے۔ آغا جان، زاویار سے کہتے ہیں کہ گزرے دنوں کو بھول جاؤ اور اپنا دل صاف کر لو......لیکن وہ کہتا ہے کہ کچھ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں۔ شیری کھانا لے کر آتی ہے تو اس کو بتاتی ہے دُرِ مکنون، زارا بھابی کی کزن ہے اور وہ اس کے لیے ہاں کب کر رہا ہے وہ اور عینی جا کر اسے زاویار کے نام سے چھیڑیں گی۔ عاصمہ، زاویار کو سمجھاتی ہیں کہ آغا جان کے لیے جو کدورت اس کے دل میں ہے وہ نکال دے لیکن زاویار کہتا ہے کہ وہ یہ نہیں کر سکتا۔ عینی، زاویار کو بتاتی ہے کہ شہرین نے اسے دُرِ مکنون سے ملوایا۔ عاصمہ صبح، صبح اسپتال آ جاتی ہیں زاویار کے پوچھنے پر وہ بتاتی ہیں کیونکہ تمہارے پاپا کی فلائٹ ہے اور وہ تم سے ملنے آئیں گے تو میں ان کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤں، زاویار کہتا ہے کہ آپ اس انسان کے لیے اچھا کیسے سوچ سکتی ہیں جس نے مجھے، آپ سے جدا کر دیا اس پر وہ کہتی ہیں کہ وہ پرانی بات تھی اب تم میرے ساتھ ہو اس لیے جب شہریار انصاری اور آغا جان آئے تو زاویار نے اپنے منفی جذبات پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔ زاویار، طارق اور خولہ کی انگیجمنٹ میں جاتا ہے تو طارق اس کے اور آغا جان کے درمیان ہونے والی ناراضی پر بات کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ان باتوں کو چھوڑو اور اپنی خوشی کو انجوائے کرو۔ عاصمہ، زاویار کو جلال انصاری کا فیصلہ ماننے کے لیے راضی کرنا چاہتی ہیں تو وہ بتاتا ہے کیونکہ طارق اپنی کسی ڈاکٹر کولیگ میں انٹرسٹڈ تھا اس لیے آغا جان نے طارق کو خولہ سے منسوب کر دیا حالانکہ شہریار انصاری، طارق سے عینی کا رشتہ کرنا چاہتے تھے یہ انکشاف سن کر وہ حیران رہ جاتی

ہیں۔ عاصمہ، زاویار سے وعدہ لیتی ہیں کہ وہ ان کے اور اپنے پاپا کے کیے کی سزا خود کو نہیں دے گا تو زاویار کوشش کرنے کا کہتا ہے۔ آغا جان، شہرین کے ساتھ زوی سے ملنے آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ زاویار شادی کرے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پاس آپ کے سوال کے جواب میں نہ کے سوا کچھ نہیں۔ زاویار، شہریار صاحب سے کہتا ہے کہ شیری کو اس کے نام پر نہ بٹھائیں اسے اس سے شادی نہیں کرنی ہے۔ جس پر اس کو شہرین کی طرف سے تھینکس کا میسج ملتا ہے تو اسے ایک اطمینان سا محسوس ہوتا ہے۔ زاویار اور اس کے دوستوں نے آج ایک اغوا شدہ لڑکی کو بازیاب کرایا تھا اس کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا تھا مگر اس کے گھر والے اسے قبول نہیں کر رہے تھے کہ کئی لڑکیوں کے سامنے اسے اغوا کیا گیا اب اگر وہ اس لڑکی (کلثوم) کو قبول کر لیں گے تو باقی چار لڑکیوں کی شادی میں مسئلہ ہوگا۔ زاویار، کلثوم کو یونیورسٹی کے گرلز ہاسٹل میں چھوڑتا ہے۔ نازیہ، عاصمہ کو بتاتی ہیں کہ دُرِمکنون کی شادی عکرمہ سے ہو رہی ہے تو زاویار بہت اپ سیٹ ہو جاتا ہے۔ وہ ساحلِ سمندر پر آتا ہے تو کلثوم اسے فون کرتی ہے وہ فون سن کر ہاسٹل پہنچتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے اور وارڈن سرفراز کے منع کرنے کی وجہ سے جانے نہیں دے رہی تو زاویار اسے اسپتال لے جاتا ہے، کلثوم کی ماں اس کی شادی ایک چار بچوں کے باپ سے کرنا چاہتی ہے اور زاویار کو کہتی ہیں کہ وہ اسے یہ شادی کرنے پر راضی کرے۔ زاویار، اسما (آفس کی لڑکی) کے ذریعے دُرِمکنون سے بات کرتا ہے تو وہ زاویار کو دُرِمکنون کے حوالے سے چھیڑتی ہے تو وہ اس کو بتاتا ہے کہ اس مہینے دُرِمکنون کی شادی ہے وہ اس کی دوست ہے اور اس سے ناراض تھی تو وہ اس کو منانا چاہتا تھا۔ زاویار، اسما کو یہ کہہ کر بہلا دیتا ہے لیکن خود کو بہلانا اتنا ہی مشکل تھا۔

اب آگے پڑھیے.......................................

قسط نمبر 22

عبید اور سندرہ بچوں سمیت آج کی فلائٹ سے کراچی پہنچ گئے تھے۔ گھر میں اسی وجہ سے ٹھیک ٹھاک گہما گہمی تھی۔

پھر نئے لوگ۔ پھر وہی گھبراہٹ......

عکرمہ کے حوالے سے سب سے قریبی رشتہ عبید بھائی کا تھا اور آج پہلی بار اس کا اُن سے سامنا تھا۔ وہ جتنا بھی نروس ہوتی کم تھا۔ صبح طاہرہ اسے اپنے ساتھ ایک کاؤنسلنگ نشست میں لے گئی تھیں۔

رشتۂ ازدواج میں منسلک دو مختلف لوگوں کے حقوق و فرائض کے علاوہ... آپس میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنے کے زریں اصول وضوابط سے آگاہ کرتا یہ درس نما سیمینار اس کے لیے بہت معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ طاہرہ اسے اپنے ساتھ یہاں کیوں لائی ہیں۔ شرکا میں عموماً وہی لوگ شامل تھے جو مختلف کاؤنسلرز کی مدد سے اپنے موجودہ یا آئندہ بننے والے رشتۂ ازدواج کو سمجھنے یا بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

ابتدا میں اتنے ڈھیر سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ بہت گھبرائی تاہم جوں، جوں مختلف کاؤنسلرز، سائیکاٹرسٹ اور مذہبی فکر رکھنے والی شخصیات نے یکے بعد دیگرے خطاب کرنے شروع کیے۔ وہ دھیرے، دھیرے اسے اپنی جانب متوجہ کرتے چلے گئے۔

واپسی پر اس کا ذہن پریشان سا تھا اور دل بھی پہلے سے زیادہ فکر مند ہو گیا تھا۔ رشتے ذمے داری ہوتے ہیں، فرائض ہوتے ہیں، حقوق ہوتے ہیں اور اس بندھن سے وابستہ توقعات اور امیدیں پوری کرنا کس قدر مشکل ہوگا۔ اسے اندازہ تھا۔

طاہرہ اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت سمجھ رہی تھیں۔ مگر بولیں کچھ نہیں۔ ان کے خیال سے اس وقت دُرِمکنون کو اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دینا ہی بہتر تھا۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔

ان کے شیرازی ولا پہنچنے کے ساتھ ہی عکرمہ مع عبید بھائی کی فیملی اندر داخل ہوا تھا۔

دادی سمیت تمام گھر والے موجود تھے۔ اتنے سالوں بعد عبید گھر آئے۔ دادی آبدیدہ ہو گئیں۔ مگر ان کی خوشی چہرے سے ہویدا تھی۔

''کم آن دادی، رو، رو کر کتنا بلایا کرتی تھیں آپ مجھے۔ اب آ گیا ہوں تب بھی رو رہی ہیں آپ۔'' عبید انہیں خود سے لگائے مسکرا رہے تھے۔

''پلیز دادی۔ چپ ہو جائیں۔ نہیں تو بچے بھی رونا شروع کر دیں گے۔'' سدرہ نے شرارت بھرے لہجے میں کہا تو دادی بچوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اور ان کو پیار سے بھینچ لیا۔

گھر میں یک دم رونق اتر آئی تھی۔

آصف کے ساتھ، ساتھ دُرِ مکنون بھی ان سے پہلی مرتبہ مل رہی تھی۔ آصف سے ان کا تعارف سائرہ نے کرایا تھا مگر دُرِ مکنون کا نہیں۔

''اور یہ میری بیٹی دُرِ مکنون۔ تمہاری ہونے والی بھابی۔'' مظفر صاحب نے دور کھڑی دُرِ مکنون کو پاس بلا کر شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان دونوں سے متعارف کرایا تو سائرہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔

''ہوں۔ اب سمجھ میں آیا عکرمہ کہ تم کیوں ہر بار انکار کر دیا کرتے تھے تو گویا یہ تھا وہ گوہر نایاب جس کی تلاش تھی تمہیں۔'' سدرہ ہنس مکھ اور بے تکلف تھیں۔ عکرمہ محض مسکرا کر رہ گیا۔ جبکہ دُرِ مکنون کے چہرے پر سرخی پھیلنے لگی تھی۔

اس نے بمشکل نظر اٹھا کر سامنے کھڑے عبید کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' عبید شیرازی کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں پسندیدگی تھی۔

''کیا حال ہے....؟''

''ٹھیک ہوں۔''

عبید شیرازی، عکرمہ کے مقابلے میں کافی سنجیدہ مزاج تھے۔ اسے ان سے ڈر سا لگا۔ اس لیے فوراً وہاں سے ہٹ آئی۔

زوہا نے عبید کے بیٹوں سے اس کا شوخی بھرا تعارف کرایا تو وہ دونوں دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔

''ہوں......تو اس کا مطلب ہے یہ ہماری ہونے والی چچی جان ہیں۔''

معاذ اور معیز دس اور بارہ سال کے سدرہ کی طرح ہی دوستانہ مزاج کے لڑکے تھے۔

''بالکل۔'' زوہا نے تائید کی۔

اپنے لیے ایک اور نئے طرزِ تخاطب نے اسے جھینپنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''کیسی لگیں تم کو تمہاری 'چچی جان'۔'' یہ ردا تھی۔

''گڈ۔'' معاذ نے بے ساختہ کہا تھا۔

''پریٹی۔'' یہ خیال معیز کا تھا۔

''ہاں مگر۔ اکی چاچو سے زیادہ نہیں۔'' معاذ، عکرمہ کا پکا چمچہ تھا۔

''آئی ڈونٹ ایگری She is more charming than Aki chachu (بھئی یہ اکی چاچو سے زیادہ پیاری ہیں)۔''

''تمہارے ایگری کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔'' معاذ برا مان گیا تھا۔

''اچھا اچھا۔ اب یہ لڑنا بند کرو۔ آؤ میں تمہیں تمہاری چچی جان کا لو برڈز کلیکشن دکھاؤں۔'' سیف نے بالآخر بیچ میں کود کر دونوں کو متوجہ کیا۔ اور ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔

''دُرِ مکنون پلیز۔ تم ان دونوں کی باتوں کا برا نہ منانا۔ ان فیکٹ انہیں ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کی عادت ہے۔ نیور ٹیک اٹ پرسنل پلیز۔'' سدرہ نے بچوں کے جاتے ہی اس کا ہاتھ تھام کر معذرتی لہجے میں کہا تو وہ

محض سر ہلا کر رہ گئی۔

''معاذ اصل میں عکرمہ کا پکا چچہ ہے۔ تم ساتھ رہو گی تو پتا چل جائے گا تمہیں۔ لاسٹ ایئر عکرمہ آیا تھا سمر ویکیشنز میں ہمارے پاس رہنے۔ سمجھو جتنے دن وہ ہمارے یہاں رہا۔ معاذ کا سونا جاگنا اُٹھنا بیٹھنا کھانا پینا بس عکرمہ کے ساتھ ہی تھا۔ تم اس کے عزیز ترین چاچو کی ہونے والی بیوی ہو۔ تم کو بھی بہت پیار کرے گا وہ مگر فی الحال معیز سے اختلاف کرنا ضروری تھا اس کے لیے۔'' پتا نہیں اس کے چہرے پر کیا لکھا تھا کہ سدرہ نے وضاحت دینی ضروری سمجھی۔

''پلیز ڈونٹ وری۔ مجھے کچھ برا نہیں لگا۔ وہ بچے ہیں بچوں کی باتوں کو کیا دل پر لینا۔'' اس نے دل سے کہا تو سدرہ مسکرا دی۔ پھر کافی دیر باتوں کا دور چلا۔ دُرِمکنون ایک طرف خاموشی سے بیٹھی سب کو سنتی رہی۔ اس گھر میں کتنے رشتے تھے اور اب یہ تمام رشتے اس کے اپنے ہونے جا رہے تھے۔ وہ خود میں عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔

اس نے دیکھا عکرمہ، عبید بھائی کے آنے سے بہت خوش لگ رہا تھا۔ دادی اور مظفر صاحب کے ساتھ، ساتھ بقیہ تمام لوگ بھی مسرور تھے۔ اسے شیرازی ولا میں عبید شیرازی کے مقام کا ادراک ہوا۔ گویا والدین کے انتقال کے بعد بھی ان دونوں بھائیوں کی حیثیت مسلم تھی۔ خاص طور پر اسے سائرہ شیرازی کے رویّے پر قدرے حیرت ہوئی۔ وہ سدرہ اور عبید سمیت بچوں کو بہت اہمیت دے رہی تھیں۔

یک دم اسے اپنے تنہا ہونے کا احساس ہوا۔

صوفیہ اپنی والدہ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ والد کے تو ظاہر ہے پہلی بیوی سے بچے تھے مگر صوفیہ کی ماں سے اور بچے نہیں ہوئے۔ سائرہ کی بقیہ بہنوں نے بھی صوفیہ کی شادی کے بعد ان سے ملنا جلنا نہیں رکھا تھا۔ دوسری طرف زاہد صاحب کے اکلوتے بھائی لندن میں رہتے تھے۔ بچپن ہی سے اسے بہت کم رشتے نصیب ہوئے تھے۔ کبھی، کبھی یہ احساس حاوی ہوتا تو وہ صوفیہ سے شکایت کر دیتی تھی۔ تاہم جوں، جوں وہ بڑی ہوتی گئی۔ اپنے کیے گئے سوال کے باعث ماں کے چہرے پر چھائے غم کے بادل اسے یہ بات اچھی طرح باور کرا گئے کہ یہ موضوع اس کے والدین کا دل دُکھا دیتا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے اندر کے تمام سوالات اور رشتوں سے جڑی خواہشیں اپنے اندر ہی دفنانا شروع کر دیں۔

البتہ شیرازی ولا آنے کے بعد اسے مختلف رشتے ملے۔ اور اب عکرمہ کے حوالے سے اور بھی بہت سے مضبوط تعلقات استوار ہونے جا رہے تھے۔

''عکرمہ کے بھی والدین نہیں ہیں مگر ان کو کتنے رشتے نصیب ہیں۔ سب کتنا چاہتے ہیں انہیں۔'' وہ بے اختیار سوچے گئی۔ نظریں اس وقت عکرمہ کی طرف مرکوز تھیں جو معاذ سے باتیں کرتا بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

جبھی اچانک عکرمہ نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ نظروں کی چوری پکڑے جانے سے زیادہ عکرمہ کی بھرپور مسکراہٹ اسے بلش کر گئی تو وہ وہاں سے اٹھ آئی۔

تھوڑی دیر میں کھانا سرو کر دیا گیا تو اسے بھی سب کے ساتھ ٹیبل پر آنا پڑا۔

''دُرِمکنون میں آپ کی بہت resemblance (شباہت) ہے چچی جان۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ یہ آپ سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔''

اِدھر اُدھر کی باتوں کے درمیان اچانک عبید نے سائرہ کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ عکرمہ، دادی اور مظفر صاحب نے بے ساختہ سائرہ کی طرف دیکھا۔ جبکہ دُرِمکنون کی وزدیدہ نظریں بھی ان کا ہی حصار کر گئی تھیں۔ سائرہ پھیکے پن سے مسکرا دیں۔

''ہو سکتا ہے۔ ان فیکٹ رشتہ بھی تو ایسا ہے ناں ہمارے درمیان۔''

دُرِ مکنون کے دل کو کچھ ہوا۔ کسی بھی طرح سہی انہوں نے اس کے اور اپنے مابین رشتے کو تسلیم تو کیا تھا۔

''میں تو خود اکثر سوچتی ہوں کہ صوفیہ اور زاہد میں تو کوئی بھی ایسے رنگ روپ کا نہیں تھا۔ نہ جانے یہ کس پر گئی ہے۔'' غیر متوقع طور پر جلتی مسکراہٹ سمیت سائرہ بنا کسی کا لحاظ کیے کہہ گئی تھیں۔

دُرِ مکنون مارے خفت کے سرخ سی پڑ گئی۔ یک دم آسمان سے زمین پر پٹخ دیا تھا انہوں نے۔ جبکہ مظفر صاحب اور دادی نے تاسف سے سائرہ کی طرف دیکھا تھا جو اپنی بات کہہ کے تمسخر سے دُرِ مکنون پر نظر ڈال رہی تھیں۔

''چلیں، اب تو پتا چل گیا ناں کہ دُرِ مکنون بالکل آپ پر گئی ہیں اور میرے خیال میں میرا یہ ریمارک آپ دونوں ہی کے لیے کامپلیمنٹ ہے۔ کیا خیال ہے سدرہ؟'' عبید نے متانت سے کہہ کر بیوی سے استفسار کیا۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا۔'' سدرہ مسکرا رہی تھیں۔

''شاید اسی لیے مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا۔ جیسے میں نے دُرِ مکنون کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ یقیناً یہ چچی جان کی شباہت ہے جو مجھے کئی بار سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔'' عکرمہ نے سرخی مائل چہرے سمیت پلیٹ پر سر جھکائے بیٹھی دُرِ مکنون کو دیکھ کر سوچا تھا۔ جو اپنے والدین کے مذاق اڑائے جانے پر بہت دلگرفتہ لگ رہی تھی۔ جبکہ سائرہ ایک بار پھر پھیکے پن سے مسکرا دی تھیں۔

''بھابی آپ نے کچھ شاپنگ کی سڈنی سے یا سب کچھ کراچی سے ہی لینا ہے۔'' زوہا نے ٹیبل پر خاموشی محسوس کی تو موضوع بدلنے کی خاطر سدرہ کو مخاطب کر لیا تھا۔

''ارے کہاں۔ سڈنی میں بچوں کے ایگزامز چل رہے تھے۔ اس لیے بزی رہی۔ ویسے بھی یہاں کے کپڑوں کا جو مزہ ہے وہ بھلا کہیں اور کہاں۔ یہیں سے لوں گی سب کچھ۔ تم لوگ چل سکتی ہو کل میرے ساتھ۔ میرا خیال ہے ہم چاروں چلیں گے۔'' سدرہ نے ردا اور دُرِ مکنون بیک وقت دونوں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''آف کورس۔'' زوہا دل و جان سے تیار تھی۔

''میرا مشکل ہے بھابی۔ کل کچھ کام ہے مجھے۔'' ردا نے معذرت کی تھی۔

''کیوں؟''

''کل آصف کی تھراپی ہے۔ اس لیے نہیں جاؤں گی۔''

''چلی جانا ردا۔ بھئی میں معذور ہوا ہوں تم تو نہیں۔ تم جانا، انجوائے کرنا۔'' اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا آصف خود ہی بول پڑا تھا۔ جملہ ہی ایسا تھا کہ حاضرین کے لبوں پر یک دم قفل پڑ گئے۔

''کم آن ایسی بات نہیں ہے آصف بھائی۔ آپ بھی بس چند دنوں کے لیے اس وھیل چیئر کے محتاج ہیں۔ علاج چل رہا ہے آپ کا۔ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے آپ۔'' زوہا نے ہی ایک بار پھر بات سنبھالی تھی۔

''چند دن کے لیے سہی۔ ہوں تو محتاج ہی ناں۔'' آصف تمسخرانہ انداز میں ہنس پڑا تھا۔

ماحول میں یک دم کشیدگی در آئی تو ردا نے سب سے پہلے کرسی چھوڑی اور یوں دھیرے، دھیرے سب ہی میز سے اٹھتے چلے گئے۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا چچا جان۔ آپ زیادہ تردد نہ کریں۔ میں نے سڈنی کے بون اسپیشلسٹ سے کنسلٹ کیا تھا۔ عکرمہ نے رپورٹس بھیجی تھیں مجھے آصف کی۔'' میز پر مظفر صاحب اور وہ دونوں بھائی اکیلے رہ گئے تو عبید نے چچا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردی سے کہنا شروع کیا۔

''اس کا کہنا ہے کہ آصف کا کیس ہوپ لیس نہیں ہے۔ تھراپی اور ول پاور کے ذریعے وہ ایک بار پھر اپنے پیروں پر چلنے کے لائق ہو جائے گا۔ البتہ اس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ میری بچیاں بہت دکھ اٹھا چکی ہیں۔ آگے اللہ انہیں سکھ دے۔'' افسردگی سے کہتے مظفر صاحب بھی بالآخر اٹھ گئے تو عبید نے الجھے ہوئے انداز میں عکرمہ کی طرف دیکھا اور چونکہ وہ جانتا تھا کہ عبید بھائی سوال کریں گے۔ اس لیے فی الحال خود بھی وہاں سے اٹھ گیا۔ تاہم رات کو جب سب سونے کے لیے چلے گئے تو عبید نے اس کو گھیر لیا تھا۔

''از ایوری تھنگ آل رائٹ عکرمہ۔ کیا زارا یا زوہا کو کوئی پرابلم ہے؟''

مظفر صاحب کے 'بچیاں' کہنے پر وہ چونک گئے تھے۔ دل میں سوال تھے۔ انہیں گھر کے ماحول میں کشیدگی محسوس ہوئی تھی۔

''نہیں، ایسا کچھ نہیں۔ وہ دونوں خوش باش ہیں۔''

''تو پھر چچا جان نے 'بچیاں' کیوں کہا۔''

''ان کا مطلب دُرِمکنون اور ردا سے تھا۔ ان فیکٹ دُرِمکنون کے لیے بہت فکرمند رہتے ہیں وہ۔'' لان میں کین کی کرسیوں پر بیٹھے وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک عبید کو مظفر صاحب کی کہی کچھ دیر پہلے کی بات یاد آئی۔ سدرہ اور بچے سونے جا چکے تھے۔ گو کہ ابھی صرف ساڑھے نو ہی بجے تھے۔ مگر Jetlag کی وجہ سے ان سب کا نیند سے برا حال تھا۔ عبید البتہ کچھ گھنٹوں کی نیند فلائٹ پر لے چکے تھے۔ اس لیے آرام سے بیٹھے تھے۔

''کمال ہے۔ چچی جان کے انداز سے تو لگ رہا تھا جیسے انہیں دُرِمکنون سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ جبکہ رشتہ تو ان کا بنتا ہے۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا ان کا رویہ۔ اب تم بتا رہے ہو کہ چچا جان دُرِمکنون کے لیے پریشان ہیں مگر کیوں۔ اتنا اچھا رشتہ تو مل گیا ہے دُرِمکنون کو۔ لائف سیٹ ہونے جا رہی ہے اس کی۔'' عبید کے انداز میں الجھن تھی۔ جیسے وہ یہ سب سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''چچا جان کے عزیز ترین دوست تھے زاہد انکل۔ ان کی وائف صوفیہ آنٹی کی اچانک ڈیتھ کے بعد وہ خود بھی کار ایکسیڈنٹ میں چل بسے۔ دُرِمکنون کے لیے یہ شاک خاصا مہلک ثابت ہوا۔ کافی دن تو وہ denial میں رہیں۔ اور ابھی کچھ دنوں پہلے بھی نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ کئی ہفتے کوما میں رہی ہیں وہ۔ چچا جان بیٹی مانتے ہیں دُرِمکنون کو۔'' اس نے بہت سے حقائق حذف کر کے مختصر قصہ بھائی کے گوش گزار کیا۔

کچھ تھا اس کے چہرے پر درج۔ عبید نے اسے بغور دیکھا۔

''ہوں۔ یہ سب تو مجھے بھی معلوم ہے۔'' عبید نے گہری سانس بھری تھی۔

''اب تم مجھے وہ بات بتاؤ جو میں نہیں جانتا۔''

''کیا مطلب؟'' بظاہر انجان بنتے۔ وہ دل ہی دل میں فکرمند ہو گیا تھا۔

''مطلب یہ کہ تم نے اچانک شادی کا فیصلہ کیسے کر لیا۔ وہ بھی دُرِمکنون جیسی لڑکی سے۔ آئی مین۔ بے شک وہ بہت گڈ لکنگ ہے۔ اس میں تو کوئی دو رائے ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر جہاں تک میں جانتا ہوں۔ شادی کے لیے تمہارا criteria تو کچھ اور تھا۔ سدرہ نے کم و بیش اسی عمر کی لڑکی دکھائی تھی تمہیں اور تم نے صاف انکار کر دیا تھا۔ وجہ تمہارا ایج ڈفرینس تھا۔ تو اب تم دُرِمکنون کے لیے کس طرح راضی ہو گئے۔ جبکہ وہ بھی تم سے سات، آٹھ سال تو چھوٹی ہوگی ہی۔''

عبید کو حقیقتاً دُرِمکنون سے مل کر حیرت ہوئی تھی۔

ردا کی شادی کی اسنیپس گو کہ سدرہ نے انہیں دکھائی تھیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح انہوں نے سرسری ہی سب کو دیکھا تھا۔ ان دنوں بزنس کی مصروفیات بھی بہت زیادہ تھیں۔

''عمر سے میرا مطلب میچورٹی تھا اور بس جبکہ دُرِمکنون بہت میچور ہیں۔'' بھائی کے استفسار پر وہ اعتماد سے بولا تھا۔
''تمہیں لگتا ہے کہ تم اس کے ساتھ خوش رہو گے؟''
عبید کے لہجے میں بھائی کی محبت اور اس کے مستقبل کے لیے فکرمندی جھلک رہی تھی۔عکرمہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔
''مجھے یقین ہے۔''
انداز ایسا تھا کہ عبید کے چہرے پر بھی تبسم پھیل گیا۔
''زندگی میں تم نے جو بھی فیصلہ کیا۔میں نے تمہیں ہمیشہ سپورٹ کیا ہے۔مجھے تمہارے اس فیصلے سے بھی خوشی ہوئی ہے۔میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ وہ لڑکی بہت لکی ہوگی جو تمہاری لائف پارٹنر بنے گی۔مگر دُرِمکنون کو دیکھ کر لگا تم بھی کچھ کم خوش قسمت نہیں ہو۔آئی وش یو آل دا بیسٹ۔'' اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے عبید پُرسکون تھے۔
''تھینکس بھائی۔'' عکرمہ نے محبت سے بھائی کی طرف دیکھا۔
''بس مجھے چچی جان کے رویّے سے تھوڑی کوفت ہوئی ہے۔دُرِمکنون بھی بہت سہمی ہوئی سی لگی مجھے۔''
''چچی جان کا مزاج تو آپ جانتے ہی ہیں۔مفکر کہہ گئے کہ Man lives in the womb of time (انسان وقت کی کوکھ میں رہتا ہے۔) مگر چچی جان تو جیسے محض ماضی میں جی رہی ہیں۔اپنی اسٹیپ سسٹر سے ان کے جو بھی differences اختلافات رہے۔وہ اب تک انہیں دل سے لگائے ہوئے ہیں۔درمکنون سے بھی ان کا دل صاف نہیں۔کچھ چچا جان کا دُرِمکنون کے لیے بہت زیادہ حساس ہونا بھی انہیں ہرٹ کرتا ہے۔آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ وہ کتنی پوزیسو ہیں۔'' اس نے بھائی کی تشویش پر اس کی توجہ کا رخ پھیرا تھا۔
عبید نے ''ہوں۔'' کہہ کر خاموشی اختیار کرلی۔

☆☆☆

"come in my cabin and have lunch with me"

وہ لنچ کرنے کے ارادے سے نکل ہی رہا تھا کہ سیل فون پر سرفراز کا پیغام آیا تھا۔اکیلے رہنے سے تو اچھا تھا کہ وہ سرفراز کے ساتھ بیٹھ جاتا۔بھوک تو اسے کوئی خاص تھی نہیں۔سوچا تھا ایک آدھ سینڈوچ لے لے گا۔لہٰذا اب اس کے قدم سرفراز کے کیبن کی طرف اٹھ رہے تھے۔

آشیانے کی بات کرتے ہو
دل جلانے کی بات کرتے ہو

وہ اندر داخل ہوا تو سرفراز کے سیل پر بجتی غزل کے بولوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔

ہم کو اپنی خبر نہیں یارو
تم زمانے کی بات کرتے ہو
حادثہ تھا گزر گیا ہو گا!
کس کے جانے کی بات کرتے ہو
ساری دنیا کے رنج و غم دے کر
مسکرانے کی بات کرتے ہو

سرفراز غالباً کسی کام سے باہر گیا تھا۔وہ چپ چاپ صوفوں کے ساتھ رکھی ٹیبل کے پاس آبیٹھا جس پر کھانا چنا ہوا تھا۔غزل کے بول بڑی گہرائی لیے ہوئے تھے۔اس کی توجہ حاصل کرنے میں وہ سو فیصد کامیاب رہے تھے۔اس نے صوفے کی بیک سے سر ٹکا کر دھیان غزل کے بولوں پر لگا دیا۔اسے شروع سے ہی میوزک سے کوئی خاص

رغبت نہیں رہی تھی مگر سرفراز کی کمپنی میں رہ کر غزلیں سننے کا تجربہ خاصا دلچسپ رہا تھا۔ اس وقت وہ کہیں کھو گیا۔
''سوری، سوری۔ ان فیکٹ ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔'' سرفراز کی آواز اسے واپس حال میں لے آئی تھی۔
''اٹس او کے۔'' وہ سیدھا ہو بیٹھا۔
''کم آن، تم نے شروع نہیں کیا اب تک!''
''مجھے خاص بھوک نہیں۔'' وہ تکلفاً نہیں حقیقتاً کہہ رہا تھا۔
''تو چلو عام ہی سہی۔ بسم اللہ تو کرو۔'' سرفراز ہاتھ دھو کر آ گیا تھا۔
اس نے خواہ مخواہ کی بحث سے بچنے کے لیے تھوڑے چاول پلیٹ میں نکال لیے۔ سرفراز اس دوران آستینیں اونچی کیے مزے سے کھانا شروع کر چکا تھا۔ سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔
''اور سناؤ۔ تمہاری فرینڈ کی شادی کب ہے؟''
''کون سی فرینڈ؟'' وہ چونکا تھا۔
''کیا بٹالین کھڑی کر رکھی ہے فرینڈز کی تم نے۔ جو ایسے پوچھ رہے ہو۔'' سرفراز نے شوخ لہجے مگر سنجیدہ تیوروں سے اسے دیکھا تھا۔
زاویار نے نظر پلیٹ کی طرف مرکوز کر لی۔
''تم غالباً دُرِمکنون کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔ پندرہ دن بعد ہے شادی۔''
''جاؤ گے؟'' سرفراز کے لہجے میں عجیب سی کرید تھی۔ بظاہر وہ ہاٹ پاٹ سے روٹی نکالتے ہوئے سادہ سے لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔
''شاید نہیں۔ بائی داوے تم اتنا کنسرنڈ کیوں ہو رہے ہو؟'' وہ جھلا گیا تھا۔
سرفراز لمحے بھر کے لیے خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔
''کنسرنڈ تو نہیں ہو رہا۔ بس یونہی پوچھ لیا تھا۔ انی وے ایچ اینڈ ایم والوں کے پراجیکٹ کا بلیو پرنٹ تیار کر لیا تم نے؟''
''ہوں۔ نائنٹی پرسنٹ کام ختم ہو چکا ہے۔''
''گڈ۔ جیسے ہی مکمل ہو جائے بتانا مجھے۔ ہم میٹنگ فکس کر لیں گے ایگزیکٹوز کے ساتھ۔''
''ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔
پانی کی تلاش میں اس نے بائیں جانب دیکھا تو شرٹ کی آستینیں اونچی کیے سرفراز کے بائیں بازو پر بندھی پٹی پر نظر پڑی۔ خون کے نشانات سے واضح تھا کہ زخم ابھی تازہ ہے۔
''یہ چوٹ کیسے لگی تمہیں؟'' گلاس اٹھاتے ہوئے اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔
سرفراز نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے سرسری سے انداز میں بازو کو دیکھا۔
''بس ایسے ہی کل رات کھرونچ لگ گئی تھی۔ بے دھیانی کے باعث۔''
''کل تم کہیں گئے تھے؟'' اس نے بھویں سکیڑی تھیں۔
''ہاں۔ ایک چھوٹی سی مہم تھی۔'' سرفراز کا لہجہ سرسری سا تھا۔
''کیا مطلب۔ چھوٹی سی مہم تھی۔ تم نے مجھے ساتھ کیوں نہیں لیا۔'' وہ کھانا چھوڑ کر سیدھا ہو بیٹھا تھا۔
''کم آن۔ کوئی بہت بڑا مشن نہیں تھا۔''
''اس سے کیا فرق پڑتا ہے سرفراز۔ مشن بڑا ہو یا چھوٹا۔ ہم ہمیشہ ساتھ کام کرتے ہیں۔''

''فرق پڑتا ہے زاویار۔ کل جہاں ہم گئے تھے وہاں تمہارا جانا تمہارے لیے سیکیور نہ ہوتا۔'' سرفراز نے بردباری سے سمجھایا۔

''کیوں کل رات کیا میں کانچ کا بن گیا تھا؟'' وہ طنز پر آمادہ ہوا۔

''نہیں۔ مگر وہ لوگ بہت بارسوخ ہیں۔ دیکھو زاویار تمہارا سویلین فیملی بیک گراؤنڈ ان لوگوں سے بھڑنا افورڈ نہیں کرسکتا۔ ایسے لوگوں سے ٹکر لینا تمہیں بہت بھاری پڑ سکتا تھا۔'' سرفراز کے لہجے میں اس کے لیے تفکر تھا۔ اپنائیت تھی۔ البتہ اس کے الفاظ اسے ماضی میں کھینچ لے گئے تھے۔ آج سے چند سال پہلے آغا جان نے بھی کم و بیش ان ہی الفاظ کا استعمال کیا تھا۔

جب اس نے دُرِ مکنون کو اغوا کرنے والوں کے خلاف ان سے مدد مانگی تھی اور جن کو وہ پہچان بھی گیا تھا۔

''جو ہوگیا ہے۔ اسے ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ زاویار۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ ان سے مقابلہ کرنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔'' آغا جان کی آواز ماضی کے ایوانوں سے نکل کر اس کی سماعتوں میں گونج گئی تھی۔ جس نے اسے زہرخند کردیا تھا۔

''اب اتنا بھی کمزور نہیں ہوں میں۔'' اس کی جھلاہٹ میں بہت بیزاری تھی۔

''بہنوں، بیٹیوں والے چاہے کتنے بھی مضبوط ہوں۔ ہوتے کمزور ہی ہیں۔'' سرفراز کے انداز میں سنجیدگی اور چہرے پر متانت تھی۔

''کیا تم بھی اس طرح سوچتے ہو؟'' اس نے ملامتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں...... بالکل، کیونکہ سچ ہی یہ ہے۔ رشتے ہمیں کمزور بناتے ہیں۔ ان کی محبت ہمیں روحانی طور پر خواہ کتنا ہی مضبوط اور توانا کیوں نہ کرے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی وجہ سے ہمیں بعض اوقات کچھ ایسی احتیاط اور مصلحت سے کام لینا پڑتا ہے کہ ہم خود سے بھی شرمندہ ہوجاتے ہیں۔'' سرفراز کا لہجہ کھردرا تھا۔

زاویار کی آنکھوں کے سامنے گویا آغا جان کا چہرہ آگیا۔

''خواہ ایسے میں کسی اور کا ناقابلِ تلافی نقصان ہی کیوں نہ ہوجائے؟''

زاویار کو اپنی آواز ماضی کے کھنڈروں سے آتی سنائی دی۔

''بالکل۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ کبھی، کبھی ہم اپنوں کے لیے اور کبھی اپنے لیے۔ اپنی ذات کی خاطر دوسروں کو قربان کرڈالتے ہیں۔ یہ جو محبت ہوتی ہے ناں زاویار۔ یہ بڑی ظالم شے ہے۔ پھر چاہے یہ اپنے آپ سے ہو یا اپنوں سے۔ انسان اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے ڈالتا ہے۔'' سرفراز کے الفاظ اسے اپنے چہرے پر طمانچے کی طرح پڑتے محسوس ہوئے تھے۔

''تو کیا اسے دُرِ مکنون سے محبت نہیں تھی؟''

ایسی محبت جیسی آغا جان کو خود زاویار اور انصاری خاندان سے تھی۔ جس کی خاطر انہوں نے دُرِ مکنون کو قربان گاہ پر چڑھا دیا تھا۔ وہ چاہتے تو اپنے کانٹیکٹس استعمال کرکے دُرِ مکنون کو شوکت زمان کے بیٹے بابر زمان کے چنگل سے نکال سکتے تھے۔ مگر وہ اپنی فیملی، اپنے خاندان کے لیے کوئی اسکینڈل یا دشمنی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ یہ ان کی محبت تھی۔ دوسری طرف زاویار انصاری کی محبت تھی۔ جس کا اسے دعویٰ تھا کہ دُرِ مکنون اس کے دل کے ایوانوں میں بستی ہے۔ مگر اس کی یہ محبت موت کے خوف کے آگے ہار گئی تھی۔ اس نے کسی ''اپنے'' کے لیے نہیں۔ خود ''اپنے لیے'' دُرِ مکنون کو زندہ قبر میں اتار دیا تھا۔ احساسِ جرم اس کی روح کو کچوکے لگانے لگا۔

''تم سے اچھے تو آغا جان ہیں زاویار انصاری۔ جنہوں نے اپنے پیاروں کے لیے تمہاری محبت کو قربان کر ڈالا۔ جبکہ تم...... تم سے زیادہ قابل نفرین بھی کوئی ہوگا۔ جس نے اپنے لیے اپنے پیار کو بھینٹ چڑھا دیا۔'' کوئی اس کے اندر بہت استہزا اور حقارت سے بولا تھا۔

اور شاید یہ پہلی بار تھا کہ اس نے حالات کو اس زاویے سے دیکھا تھا۔ گزرے تین سالوں میں اس نے صرف اور صرف آغا جان سے نفرت کی تھی۔ ان کو موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ ان کو قصوروار اور اپنا مجرم سمجھا تھا۔

مگر آج پہلی بار سرفراز کے خیالات اور اس کے الفاظ اسے اس تمام معاملے کو ایک الگ ہی زاویے سے دیکھنے پر مجبور کر گئے تھے۔ آغا جان کے فیصلے کے اس پہلو پر اس نے شاید کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ یا اگر کیا بھی تھا تو غیر جانبدار ہو کر نہیں۔

''اس لیے میرے خیال میں تو تمہیں مجھ سے بالکل ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ میں نے جو بھی کیا اس میں محض تمہاری بھلائی ہی مدِنظر رہی۔'' سرفراز سر اٹھا کر سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس کے الفاظ زاویار کو لامحالہ خیالات کے ہجوم سے باہر کھینچ لائے۔ وہ یک دم اندرونی خلفشار کا شکار ہوا تھا۔ بس وہ سرفراز کو ہونٹ بھینچ کر دیکھے گیا۔

سرفراز نے محسوس کیا جیسے زاویار کی بصارتوں کا سماعتوں سے رابطہ منقطع ہے۔ لہٰذا کھنکھار کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

''کچھ آیا سمجھ شریف میں......!'' وہ ہلکے سے مسکرایا تھا۔

زاویار نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

''کچھ اور کہنا ہے تمہیں؟'' وہ سرخ آنکھوں سے سرفراز کو دیکھتے ہوئے یک دم سپاٹ لہجے میں پوچھنے لگا تھا۔

''مطلب......؟'' سرفراز بھونچکارہ گیا۔

''مطلب یہ کہ مجھے ایک کام یاد آ گیا ہے۔ اجازت چاہوں گا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

لہجہ اکھڑا، اکھڑا تھا اور آنکھوں میں ایک ناگفتہ بہ سا تاثر۔

''ناراض ہو کر جا رہے ہو۔'' سرفراز اٹھ کر اس کے مقابل آ گیا تھا۔

''نہیں۔ مگر میں اس وقت کچھ اچھا محسوس نہیں کر رہا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے آرام کی، سکون کی ضرورت ہے۔''

اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی تھکن تھی۔

''آخر وہ کس، کس سے ناراض ہوتا رہے گا۔''

''یقیناً تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ پچھلے کئی دنوں سے تم پر اوور برڈن ہے۔ کام مکمل ہو گیا ہے تو اچھا ہے ریلیکس کرو۔ البتہ تمہارے لیے ایک خبر تھی۔ کہو تو ابھی سنا دوں۔'' وہ اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے رسانیت سے بولا تھا۔

''کیسی خبر؟'' اس نے بھویں اچکائیں۔

''بابر زمان کا پتا چل گیا ہے۔ میں نے اسے ٹریس کر لیا ہے۔'' سرفراز نے گہری جانچتی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے وہ خبر سنائی کہ زاویار انصاری جیسے کسی خواب سے جاگ اٹھا۔

''واٹ۔ یو مین بابر زمان... آر یو شیور سرفراز؟'' اضطراری انداز میں سرفراز کے کندھے کو دونوں ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے اس نے لاشعوری طور پر دباؤ ڈالا تھا۔

''یس آئی ایم۔'' سرفراز کا انداز ہنوز وہی تھا۔

یہ جو "ب" ہے .... از عظمیٰ مشتاق، نارووال

اس بے ہنگم شور سے میں بہت بے چین ہوئی کیونکہ اس کی بے غم (بیگم) بے توجہی سے بالکونی میں کھڑی تھی۔ میں نے اپنی بے حد قریبی پڑوسن سے سن رکھا تھا کہ وہ بے رحم بہت بے دردی سے اس بیچارے لڑکے پر نہ صرف بے انتہا سختی کرتی تھی بلکہ اس کو بیکار اور بے باک ہونے کے طعنے بھی دیتی تھی۔ ایسی ہی بے شمار باتوں پر اس نے بے دریغ اسے تھپڑ مارنے شروع کیے۔ وہ بے جان سا ہو کر بے در کی دیوار سے جا لگا اور بے سکونی سے کراہنے لگا...... اس بے درد نے بیگانگی سے اس کی طرف دیکھا مگر وہ صرف اس لیے اس بے حس کی بے اعتنائی سہہ رہا تھا کہ وہ بیروزگار تھا مگر بے ایمان نہ تھا۔ اس کی کوئی بات بے وزن نہیں ہوتی تھی۔ نہ اسے بے تکی باتیں کرنے کی عادت تھی اور نہ وہ بے پر کی اڑاتا تھا۔

وہ بے ساختہ بے جی کے کمرے کی طرف آیا اور ہر بات بے دھڑک کہہ دی۔ بے جی نے اس کی بے بے کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ بے تحاشا خوش ہوا۔ بے بے کی اس بے وقت آمد سے اسے بے حد اطمینان ہوا۔ وہ کئی دن سے ان کا بے تابی سے منتظر تھا۔ آتے ہی بے بے نے اس بے رحم کی خبر لی اور بے تکان بولیں۔ "بے حیا، بے شرم تو نے خیال نہ کیا کہ یہ تیرا بھائی ہے۔ اس کا کردار بے مثال ہے، اس لیے اب میں بے نظیر سے اس کی بات پکی کر کے آئی ہوں...... اس کا باپ بے حیثیت نہیں ہے۔" وہ بے حد خوش تھا کہ اب بے در، بے گھر نہیں رہے گا۔

میری ب آپ کو بے حد بری لگی یا بے حد پسند آئی مگر بیکار سے بیگار بھلی یا بیگار سے بیکار۔ کیونکہ ہم بیکار ہیں اور بے بس بھی سو......

بے چینی سے ہی سہی بے پروا ہو کر بے حد انہماک سے پڑھ لیں۔

"آئی ڈونٹ بلیواٹ۔" خوشی اور اذیت کا ملا جلا احساس اس کے اندر اترا تھا۔ بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"یقین کرلو۔ آخر تین سال بعد سہی۔ میں نے اسے کھوج ہی لیا۔" سرفراز کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔

"کہاں ہے وہ؟" زاویار کی بے تابی قابل دید تھی۔

"Copenhagen" (ڈنمارک) سرفراز کے جواب پر اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"گویا پاکستان میں نہیں ہے وہ۔"

"نہیں، آج سے تین سال پہلے ایک لڑکی کو اس کی نجی جیل سے بازیاب کرایا گیا تھا۔ سنا ہے اس لڑکی کے فادر نے اغوا اور ریپ کا کیس دائر کیا تھا بابر زمان کے خلاف۔" سرفراز بتا رہا تھا۔ اور زاویار کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی درد اس کی رگوں کو چھیلتا جا رہا ہے۔ خون کے ساتھ جسم میں جیسے تیزاب دوڑ رہا تھا۔ جو اس کی ہستی کو خاکستر کرتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے لہو کی گردش اور دل کی دھڑکن تیز ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔

"اس کے کچھ مخالف بھی اس لڑکی کے فادر کے ساتھ مل گئے تھے۔ ممکن تھا کہ اس کو اس الزام میں پولیس گرفتار بھی کر لیتی۔ مگر اس لڑکی کے باپ کی ایک خطرناک روڈ ایکسڈنٹ میں ڈیتھ ہوگئی۔"

"اور وہ لڑکی یقیناً درمکنون ہی تھی اور وہ حادثہ اس کے بابا کے ساتھ ہی پیش آیا تھا۔" اس کا دل گواہی دے رہا تھا۔

"بابر زمان کے مخالفین نے اس حادثے کو قتل کا نام دیا اور بابر زمان پر ایک اور کیس بنا دیا گیا۔ الیکشن کا زمانہ تھا لہٰذا اس سارے مسئلے سے جان چھڑانے کے لیے شوکت زمان نے اپنے بیٹے کو پاکستان سے باہر منتقل

کر دیا۔" سرفراز ذرا سا رکا تھا۔

"اور وہ سارے کیسز جو اس کے خلاف بنائے گئے تھے؟" زاویار کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔

"وہ سب بابر زمان کے باہر جاتے ہی اس کے باپ نے رشوت کھلا کر بند کروا دیے اور اپنے مخالفین سے بھی اس نے آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کر لی۔"

"راسکل....." زاویار کے منہ سے مغلظات نکلنے لگے تھے۔

"پچھلے ڈھائی تین سالوں سے جب سے تم نے مجھے یہ کام سونپا تھا۔ میں اس کیس کے ہی پیچھے لگا ہوا تھا۔ مگر شوکت زمان نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی تھی کہ اس کا بیٹا کہاں ہے لیکن اب جبکہ قافلہ گزرنے کے بعد گرد بیٹھی ہے تو اس نے اپنے لاڈلے کو واپس بلا لیا ہے۔ اگلے چند ہفتوں میں وہ لاہور پہنچ رہا ہے۔"

ایک لمبی درد سے جڑی داستان کو سرفراز نے قصہ مختصر کر کے سنا دیا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ ان چند لمحوں میں زاویار انصاری کی ہستی ایک بار پھر زیروزبر ہو گئی تھی۔

"خبر پکی ہے۔؟" اس کی آواز اور لہجہ دونوں بھاری تھے۔

سرفراز نے دیکھا وہ جیسے خود کو بمشکل سنبھالے ہوئے تھا۔

"ہوں..... بالکل پکی ہے۔" سرفراز نے فکرمندی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر استفسار کیا۔ "کیا تمہارا بھی حساب نکلتا ہے اس کی طرف.....؟"

سوال تھا یا آتشیں بھالا..... سیدھا سینے میں پیوست ہوا۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔

"ہوں۔" سینے کی تہ سے گہری سانس نکلی۔ "بہت زیادہ حساب۔ یوں سمجھو ہر خسارہ اور ہر زیاں میرے ہی حصے میں آیا ہے۔"

"تو اب تم کیا کرو گے.....؟"

"اگلے چند دنوں میں، میں بھی لاہور جا رہا ہوں۔" یک دم ہی اس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا تو سرفراز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم جو بھی کرو۔ قانون کی حد میں رہ کر کرنا زاویار۔ کوئی کام خواہ کتنا ہی درست کیوں نہ ہو۔ اگر غلط طریقے سے کیا جائے تو وہ justified نہیں رہتا۔" سرفراز کے لہجے میں نصیحت اور تفکر دونوں تھے۔

جواباً وہ تلخی سے مسکرا دیا تھا۔

"ہونہہ..... یہ قانون اور ضابطے۔ بس تمہارے اور میرے جیسوں ہی کے لیے رہ گئے ہیں۔ جبکہ بابر زمان جیسے لوگ دندناتے پھرتے ہیں۔" وہ زہرخند ہو گیا تھا۔

"یہی تو فرق ہے ایک cop میں اور ایک criminal میں۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر دونوں ہی ایک جیسے ہوئے۔"

"یہ فرق تم جانو..... مگر جو ذبح کر دیا جاتا ہے ایسے درندوں کے ہاتھوں۔ اس کو اور اس کے لواحقین کو نہیں سمجھ میں آتی یہ لفاظی۔ وہ قانون شکنی کیے جاتے ہیں اور cop محض ضابطے کا پابند بنا..... انہیں شہر کا شہر پامال کرتا دیکھتا رہے۔ ٹوہیل وِد دِس سسٹم۔"

"ایسا بھی اندھیر نہیں ہے زاویار۔ اگر تمہارے پاس کوئی ثبوت، کوئی پوائنٹ ہے تو ہم اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔"

"اور کیا فائدہ ہوگا اس کا۔ وہ تو پہلے بھی چھوٹ چکا ہے قانون کے سو کالڈ مضبوط شکنجے سے۔"

"فائدہ ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ آج کی بات اور ہے..... حق و انصاف کا بول بالا ہوگا۔ یوں بھی یہ سسٹم کا پرابلم ہے زاویار۔ اتنی آسانی سے تو تبدیلی نہیں آئے گی ناں۔"

''تمہیں لگتا ہے کہ تبدیلی کبھی آئے گی بھی؟'' اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''آف کورس آئے گی۔'' سرفراز پُریقین تھا۔ ''اگر میرے تمہارے جیسے تعلیم یافتہ لوگ کوشش کریں گے تو ضرور آئے گی۔ اور ہم جیسے لوگ کوشش کر بھی رہے ہیں۔ کسی نہ کسی فورم پر یہ بات اٹھائی بھی جارہی ہے۔ جب بہت زیادہ اندھیرا ہو جائے تو سمجھ لو۔ سویرا کہیں قریب ہی ہے۔ اور اگر نہ بھی ہو تو ہم تم تو اپنے اپنے حصے کا چراغ جلاتے چلیں۔ سحر نہ سہی چراغاں تو ہو ہی جائے گا۔ کالی رات کا اندھیرا کچھ تو گھٹے گا'' سرفراز کا لہجہ عزم اور حسنِ ظن سے سرشار تھا۔

زاویار گو کہ دل سے بہت متفق نہیں تھا مگر بظاہر اس کی دلیل کے جواب میں کچھ کہہ بھی نہیں سکا اور خاموش ہو گیا۔

''لہٰذا تم ایسا کچھ نہیں کرو گے جو خلافِ قانون ہو۔ آئی ایم شیور تم مجھے لیٹ ڈاؤن .... بالکل نہیں کرو گے'' اپنے تئیں سرفراز نے سیلاب سے پہلے ہی بند باندھ دیا تھا۔

''ڈونٹ وری۔ ایسا کچھ کرنے نہیں جا رہا میں۔ ہاں البتہ آغا جان بہت بیمار ہیں۔ تم جانتے ہو۔ یہ بات میں تم کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ ان سے ملنے جانا ہے مجھے لاہور۔''

اس کے اندر وہ فیصلہ جو وہ عاصمہ، میمونہ پھوپی، صنوبر پھوپی اور شہرین کے کہنے پر بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ جو شہریار صاحب کے تحکم اور آغا جان کا منت بھرا فون اس سے نہیں کرا سکا تھا۔ اب لمحے کے دسویں حصے میں ہو گیا تھا

''اوکے۔ مگر دھیان رکھنا۔'' سرفراز کے چہرے پر بظاہر مسکراہٹ سہی۔ اس کی آنکھوں میں دبیز سنجیدگی تھی۔ وہ زاویار کو محض دیکھ ہی نہیں رہا تھا بلکہ جیسے پڑھ بھی رہا تھا۔

''سی یو دین۔'' زاویار اس کی عمیق نظروں سے خائف ہوتا پلٹ گیا۔

ڈرائیونگ کے دوران سرفراز کی کہی ہوئی باتیں لو کے تھپیڑوں کی طرح اسے جھلساتی رہیں۔

''گویا آغا جان کی کوئی غلطی نہیں۔ انہوں نے اپنے پیاروں کے لیے جو کیا وہ justified ہے؟ سارے گناہ ہر خطا۔ تمام قصور میرے ہیں!'' حسبِ عادت ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں بالوں میں پھنسائی ہوئی تھیں۔ احساسِ جرم اس پر کچھ اس طرح غالب تھا کہ اسے پتا بھی نہیں چلا وہ کار کس سمت چلا رہا ہے۔ چونکا تو وہ تب جب خود کو ''شیرازی ولا'' سے چند گز کے فاصلے پر پایا۔

''یہ میں کہاں آ گیا۔ کہاں آ پہنچا ہوں؟'' بے اختیار کار کو بریک لگائے۔

کار یک دم رکی تھی۔ نظریں بے اختیار شیرازی ولا کے گیٹ پر جا ٹکیں۔

وہ کافی فاصلے پر تھا مگر شیرازی ولاز کے گیٹ پر کھڑی کار کے پاس موجود دراز قد عکرمہ کو اس نے دور سے ہی پہچان لیا۔ اس کے پہلو میں کھڑا شخص اس سے بہت مشابہہ تھا۔ زاویار کو یقین ہوا کہ وہ دونوں آپس میں بھائی ہیں۔ دونوں کے مابین بڑے خوشگوار انداز میں گفتگو ہو رہی تھی۔ جس کو گیٹ سے باہر آنے والی خواتین کی وجہ سے بریک لگے۔

زاویار انصاری کی نگاہیں کیمل براؤن اور میرون کنٹراسٹ کے سوٹ میں ملبوس دُرِّ مکنون کو باہر نکلتا دیکھ کر جیسے منجمد سی ہو گئیں۔

''چند دنوں بعد وہ اسے دیکھنے کا حق بھی کھو دے گا۔ اسے سوچنے کی اجازت بھی چھن جائے گی اس سے۔'' اس کا دل جلنے لگا تھا۔ دُرِّ مکنون اپنی سادگی میں بہت پُروقار لگ رہی تھی۔ ساتھ چلتی دوسری عورت نے اسے جھک کر کچھ کہا تھا جس پر وہ جھینپ سی گئی تھی۔ اس عورت کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

یقیناً وہ عکرمہ کی قریبی عزیز تھی اور دُرِّ مکنون سے بے تکلف بھی۔

اسے یہ سادہ سے حلیے والی دُرِّ مکنون کو دیکھ کر لاہور والی دُرِّ مکنون یاد آ گئی۔ جو کس قدر ٹپ ٹاپ سے رہا کرتی

تھی۔ جس پر ہر رنگ خوب صورت لگتا تھا۔ جس کا لباس موسم اور فیشن کے مطابق ہوتا تھا۔ اسے جیولری کا بھی شوق تھا اور نفاست سے میک اپ کرنے کا بھی مگر آج وہ ان سب لوازمات سے کس قدر دور تھی۔

تاہم اس کی شخصیت کے گرد بنا حسن کا ہالہ اب بھی موجود تھا۔ جسے حزن و ملال نے چار چاند لگا دیے تھے۔

''دُرِمکنون......!'' زاویار کے دل نے جیسے اسے ٹوٹ کر پکارا تھا۔

پھر یہ شاید زاویار کی مسلسل احاطہ کرتی نگاہوں کا اثر تھا یا شاید اس کے دل سے نکلی سچی پکار کا۔ کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتی دُرِمکنون نے یک دم پلٹ کر متضاد رخ میں دیکھا تھا۔ اور جیسے ایک لمحے کو اس کا تنفس ٹھہر سا گیا۔

وائٹ اکارڈ اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا زاویار نگاہوں کا مرکز بنا۔ اتنی دور سے بھی زاویار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دُرِمکنون کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے سفید پڑ گیا ہے۔ پھر غالباً کار کے اندر سے کسی نے اسے پکارا تھا۔ جس پر چونک کر مڑتے ہوئے وہ خوفزدہ سی اندر بیٹھ گئی تھی۔ زاویار انصاری کے دل پر جیسے کوئی بوجھ آ گرا۔ وہ اِک بار پھر دُرِمکنون کو تکلیف دینے کا باعث بنا تھا۔

پھر نہ جانے کتنے ہی دیر وہ سڑکوں پر پٹرول پھونکتا پھرا۔ بابر زمان کی خبر اور دُرِمکنون کا ملنا اسے اندر سے مکمل طور پر اکھاڑ پچھاڑ کا شکار بنا گیا تھا۔ دُرِمکنون کو ایک نظر دیکھنے کے بعد تو رگوں میں جیسے لاوا دوڑنے لگا تھا۔ بابر زمان کی درندگی کے جیتے جاگتے شکار کی تباہی اس کے اندر جیسے آتش فشاں کو مزید دہکا گئی۔

☆......☆......☆

''کہہ دیا ہے ناں میں نے ایک بار کہ میں خود کھا لوں گا دوا۔ تم مجھے بار، بار یہ کیوں یاد دلاتی رہتی ہو کہ میں بیمار ہوں اور تم صحتمند۔''

آصف کی آواز غصے اور جھنجلاہٹ سے بھرپور تھی اور کھلی کھڑکی سے باہر تک آ رہی تھی۔

دُرِمکنون نے کشیدہ اعصاب سمیت یہ آواز سنی۔

آج زاویار کا شیرازی ولا کے باہر موجود ہونا ویسے ہی اسے متردد کیے ہوئے تھا۔ سدرہ اور عبید کے ساتھ آج وہ عکرمہ سمیت شاپنگ اور لنچ کے لیے باہر گئی تھی۔ گو کہ شام تک وہ لوٹ آئی تھی۔ مگر ذہن ابھی تک جیسے پانچ گھنٹے پہلے کے واقعے میں اٹکا ہوا تھا۔

سدرہ اور عبید کافی ٹائم ہوا اسے گھر ڈراپ کر گئے تھے۔ عکرمہ انسٹی ٹیوٹ جا چکا تھا۔ واپس آنے کے باوجود اس کا اوپر جانے کو دل نہیں چاہا۔ وہ بیک یارڈ میں بیٹھی اپنے اندر کے خوف سے لڑ رہی تھی۔ جو زاویار کا سامنا ہونے کی وجہ سے ایک بار پھر اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا کہ اس طرف کھلنے والی ردا کے کمرے کی کھڑکی سے باہر آتی آصف کی آواز نے اسے متوجہ کر لیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے آصف۔ میں نے ایسا کبھی نہیں جتایا۔ میں تو بس فکر کرتی ہوں۔ پریشان رہتی ہوں آپ کے لیے......''

''بند کرو بکواس۔ نہیں چاہیے مجھے تمہاری ہمدردی۔ کوئی ضرورت نہیں میرے لیے فکرمند یا پریشان ہونے کی، سمجھیں......!''

ردا کے تفکر اور منت بھرے انداز نے آصف کی جھنجلاہٹ کو شدید غصے میں تبدیل کر دیا تھا۔

کانچ کے گلاس کے چکنا چور ہونے کی صدا... باہر بیٹھی دُرِمکنون کو بھی سنائی دی تھی۔ وہ گھبرا کر سیڑھیوں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

آصف کی معذوری اور کئی مہینوں سے اس کمرے کی قید نے اسے بے انتہا چڑچڑا بنا دیا تھا۔ کون جانے یہ اس

کا احساسِ جرم تھا کہ وہ ردا کو ویسی خوب صورت زندگی نہیں دے سکا۔ جس کا اس نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا یا شاید معذور ہونے کا دکھ۔

شیرازی ولا کے مکینوں کے لیے وہ روز بروز تفکر کا باعث بنتا جا رہا تھا۔ ردا کا اس طرح بس کر بھی اجڑے ہوئے رہنا۔ یوں بھی سب کے دلوں کو دکھ دیتا تھا مستزاد آصف کا اس کے ساتھ جارحانہ یا اہانت آمیز رویہ اختیار کرنا۔ وہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتا تھا۔

دُرِّمکنون کو اندر سے اس کے مسلسل بڑبڑانے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ ردا پر بری طرح برس رہا تھا۔

دُرِّمکنون کو یک دم جیسے گھٹن کا احساس ہوا حالانکہ باہر بڑی تازہ ہوا چل رہی تھی۔ اسے لگا وہ زیادہ دیر آصف اور ردا کے بیچ کی یہ تکلیف دہ گفتگو نہیں سن سکے گی۔ اس لیے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے اور ابھی لاؤنج میں قدم رکھنے ہی لگی تھی کہ وہاں موجود سائرہ بیگم کو کسی سے بات کرتے دیکھ کر پلٹنا چاہا۔ مگر ان کے منہ سے نکلنے والے اپنے نام نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔

''یہ دُرِّمکنون اگر بیچ میں نہ آتی تو میں اماں اور مظفر سے ردا اور عکرمہ کے رشتے کی بات کب کی کر چکی ہوتی۔'' وہ جلے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ افروزہ موجود تھیں جن سے دل کی بات وہ بہ آسانی کر لیتی تھیں۔

دُرِّمکنون کی سانس جیسے عکرمہ اور ردا کے رشتے کا سن کر رک سی گئی۔

''یہ تم کیسے کرتیں۔ ردا تو آصف کی بیوی ہے۔ دونوں کے مابین نکاح کا بندھن ہے آفٹر آل۔''

اسے افروزہ کی تحیر میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''کیا خاک بندھن ہے یہ۔ شادی کی پہلی رات ہی آصف اسپتال جا پہنچا اور جب وہاں سے ڈسچارج ہوا تو ایک اپاہج کی شکل میں میری بیٹی کی بدبختی کا جلتا نشان بن کر رہ گیا۔ تم ہی بتاؤ افروزہ یہ شادی ہے؟ یہ کوئی رشتہ ہے۔ ردا اس کی بیوی ہے یا محض ایک نرس۔ وہ شوہر ہے اس کا یا صرف ایک پیشنٹ۔'' سائرہ جھلا اور تلملا کر بولیں۔

''کیا میری بیٹی نے صرف یہ دکھ اٹھانے کے لیے شادی کی تھی۔ کیا اسے خوش رہنے کا۔ ہنسنے کا کوئی حق نہیں؟'' ان کے لہجے میں ممتا کی تڑپ تھی۔ ''میں اسے تباہ ہونے نہیں دیکھ سکتی افروزہ میں نے سوچ لیا ہے کہ اسے خلع دلواؤں گی۔ آصف کے مکمل صحت یاب ہونے کے مجھے کوئی چانسز نظر نہیں آتے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ آصف کی ول پاور ہی اسے ٹھیک کر سکتی ہے۔ جبکہ آصف اپنی ول پاور مکمل طور پر کھو چکا ہے۔ وہ ایک مایوس فرسٹریٹڈ اور زندگی سے اکتایا ہوا انسان ہے۔ وہ میری ردا کو کبھی خوش نہیں رکھ سکے گا۔''

انہوں نے کچھ ایسے تیقن سے کہا کہ ردا کے کمرے سے آتی آصف کی آواز سنتی افروزہ بھی انکار نہ کر سکیں۔

''تم نے سنا...... کیسے بات کرتا ہے وہ ردا سے۔ بجائے اس کے کہ ردا کی خدمت سے خوش ہو۔ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ایسے سائیکو کیس کے ساتھ میں اپنی بیٹی کو کبھی نہیں رہنے دوں گی۔'' سائرہ انتہائی غصے اور غضب میں مبتلا کہہ رہی تھیں۔

باہر دم سادھے کھڑی دُرِّمکنون کو ان کے لہجے سے فیصلے کی بُو آئی۔

''تم دھیرج رکھو، اللہ بہتری کرے گا۔'' افروزہ نے دلداری سے کہا۔

''اللہ صرف اسی کے لیے بہتری کرتا ہے۔ جو اپنے لیے کوشش کرے افروزہ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اماں اور مظفر سے بات کرنے کا سوچا تھا۔ گاہے بگاہے میں ردا کو ڈھکے چھپے الفاظ میں اس شادی کے منطقی انجام کے بارے میں بتاتی بھی جا رہی تھی کہ اس منحوس لڑکی نے سارا پلان چوپٹ کر ڈالا۔ جیسے صوفیہ نے نقب لگائی تھی بالکل

اسی طرح دُرِّمکنون نے بھی اپنے ناز و ادا سے عکرمہ کو اپنے قبضے میں کرلیا۔''
وہ کس قدر صفائی سے الزام لگاتی جارہی تھیں۔ دُرِّمکنون کو لگا جیسے اس کی سانس سینے میں اٹک گئی ہو۔ اس کی آنکھیں اور دل جلنے لگا تھا۔
''ورنہ تم خود سوچو۔ عکرمہ جیسا ایجوکیٹڈ، اسمارٹ اور ہینڈسم بندہ اس فضول لڑکی کو چنتا۔''
ان کے لہجے میں حقارت اور اہانت تھی۔
درمکنون کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ آج کا دن بہت سخت تھا اس کے لیے۔
''خیر جوڑی تو دونوں کی اے ون لگے گی۔ دونوں ہی خوب صورت ہیں۔'' افروزہ نے اختلاف کیا تھا۔
اور سائرہ سے اختلاف کرنے کی جرأت صرف افروزہ ہی کرسکتی تھیں۔
''جوڑی صرف جسمانی لحاظ سے ہی تو نہیں بننی چاہیے افروزہ۔ انڈراسٹینڈنگ اور compatibility بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے اور پھر تعلیم اور صلاحیتوں میں دُرِّمکنون کا بھلا کوئی جوڑ ہے عکرمہ سے۔'' وہ تلملا ہی گئی تھیں۔
''چند ماہ پہلے عکرمہ اور فارینہ کے درمیان بڑھتی بے تکلفی اور انڈراسٹینڈنگ کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی تو پھر اچانک ایسا کیا ہوا۔ یقیناً یہ اس مکار لڑکی کے حسن و ادا کا جادو ہی ہوگا۔ جس نے عکرمہ جیسے calculated بندے کو اپنے دام میں پھنسایا۔ آخر صوفیہ کی بیٹی ہے ناں۔ صوفیہ کی ماں نے میری ماں کا حق مارا اور صوفیہ نے میرے حق پر ڈاکا ڈالا۔ اور آج یہ دُرِّمکنون میری بیٹی کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ اونہہ ''جیسی ماں ویسی جائی۔ نانی کے ڈھنگ نواسی آئی'' صحیح کہتے تھے بزرگ۔'' سائرہ کا لفظ، لفظ زہر میں ڈوبے تیر کے مانند تھا۔ دُرِّمکنون سکی اور تذلیل کے احساس کے باعث بے آواز رو پڑی تھی۔ شکر تھا کہ اس وقت لاؤنج میں کوئی اور نہیں تھا۔
''تمہاری سوچ اپنی جگہ سہی مگر مجھے درمکنون ایسی نہیں لگتی۔ ہوسکتا ہے عکرمہ سے یہ فیصلہ تمہاری ساس نے کروایا ہو۔ میں نے دیکھا ہے وہ بہت محبت کرتی ہیں درمکنون سے۔''
افروزہ کی آواز مستحکم تھی۔ سائرہ اختلاف نہ کرسکیں۔ دُرِّمکنون کو لگا جیسے کسی نے جلے پر مرہم رکھ دیا ہو۔
''میری ساس کو تو چھوڑو، مظفر کیا کم ہیں کسی سے۔ انہوں نے تو خود کو ہائی بلڈ پریشر کا مریض بنالیا ہے دُرِّمکنون کے غم میں۔'' سائرہ تنفر سے بولیں۔
''تو ہوسکتا ہے اسی وجہ سے عکرمہ نے یہ فیصلہ کیا ہو۔'' افروزہ اپنے موقف پر قائم تھیں۔
''ہاں تو یہ ہمدردی بھلا کتنے دن سنبھالے گا وہ۔ مرد کو اپنی بیوی سے ہر طرح کا آرام، سکھ اور خوشی چاہیے ہوتی ہے۔ چند دنوں میں خود ہی ہوش ٹھکانے آجائیں گے عکرمہ کے۔ جو لڑکی اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتی محض دھرتی کا بوجھ بن کر رہ گئی ہے۔ وہ بھلا اپنے شوہر کو کیا دے گی۔'' سائرہ نے بڑے تیقن سے مستقبل کا نقشہ کھینچا تھا۔
دُرِّمکنون کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ دل میں آیا۔ کچھ ایسا کھا کر سو رہے کہ دوبارہ جاگنے کی نوبت ہی نہ آسکے۔
اتنی نفرت، اہانت اور بغض ہے سائرہ بیگم کے دل میں اس کے لیے۔ یہ احساس اسے اندر سے کچھ اور شکستہ کرگیا۔
''خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں سائرہ۔ ملی ہوں میں درمکنون سے۔ شی از لائک اے نارمل گرل۔ بس ذرا بات کم کرتی ہے۔ otherwise she is perfectly alright!'' افروزہ نے ایک بار پھر متفق نہ ہوتے ہوئے سائرہ شیرازی کو ٹوکا تو وہ چپ کر گئیں۔ دُرِّمکنون کے ساتھ ہوئے حادثے کا تو انہوں نے افروزہ سے بھی ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی کرنا چاہتی تھیں۔ کچھ بھی تھا۔ بات بہت بدنامی کی تھی اور وہ شیرازی فیملی کے لیے کوئی اسکینڈل نہیں چاہتی تھیں۔
''ویسے عکرمہ سمجھدار ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔'' سائرہ کی خاموشی پر افروزہ ہی بولیں۔

''اونہہ، بڑا سمجھدار ہے وہ۔ اماں کے کہنے سے سر کٹانے کو تیار ہو جانے والا پوتا ہے۔ دُرِّ مکنون کے حسن وادا کے علاوہ مظفر اور اماں کے اصرار نے ہی راضی کیا ہوگا اسے۔ ترس کھایا ہے اس نے درِ مکنون پر۔'' اب کے سارا ملبہ عکرمہ پر گرادیا تھا انہوں نے۔ وہ بولیں تو ایک بار پھر لہجے میں پھنکار تھی۔

دُرِّ مکنون بے اختیار دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بیک یارڈ کی طرف بھاگی اور پھر آشیانے کے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ خود پر کنٹرول کھو چکی تھی۔

اور اگلے لمحے وہیں پچھلی طرف بنے چھت پر جاتے گولائی زینہ پر بیٹھ کر پھوٹ پڑی۔ جبکہ اندر لاؤنج میں بیٹھی سائرہ بیگم تن تن سے کہہ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں فیصلہ کُن چمک تھی۔

''مگر مجھے حالات کو بدلنا آتا ہے اور ایسا میں کر کے رہوں گی۔'' ان کا ذہن گویا منصوبہ سازی شروع کر چکا تھا۔ افروزہ نے انہیں کچھ سمجھانا چاہا مگر سائرہ بیگم نے قصداً موضوع بدل دیا۔

☆......☆......☆

دکھ، گھٹن، پچھتاوے اور روگ...... اسے لگنے لگا تھا جیسے اس کی زندگی گزشتہ تین سال سے ان چار الفاظ کا مجموعہ بن کے رہ گئی ہے۔

شام لمحہ لمحہ بیت رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کے ساتھ اس کا دل بھی ڈوبتا جا رہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دُرِّ مکنون کی شادی کا دن نزدیک آتا جا رہا تھا۔ اور وہ اس سے اس کے خوابوں اور بے نام سی امیدوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

''اور ان سب کا ذمے دار صرف ایک شخص ہے۔ اور وہ ہے بابر زمان!''

اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اب وہ راکنگ چیئر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔ اس کا خون کنپٹیوں میں گویا ٹھوکریں مار رہا تھا۔

''I will kill you Babar Zaman میں تمہیں برباد کردوں گا۔ جیسے تم نے میرا دل اور دُرِّ مکنون کی پوری زندگی اجاڑی ہے۔ تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔ کم از کم اتنے اطمینان اور سکون سے تو ہرگز نہیں۔'' اس کا دماغ تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ تانے بانے بن رہا تھا۔

اس کی گہری آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرانے لگی تھی۔ ساتھ ہی دھیرے، دھیرے اس کے لبوں پر زہریلا تبسم بکھرتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

''اور ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتوں سے تمہارا دل تنگ ہوتا ہے۔ تو تم اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے اور حمد کرتے رہو۔ اور سجدہ کرنے والوں میں شامل ہو۔'' (سورۂ حجر 97,98)

''دیکھو تو کتنا رحیم وشفیق ہے ہمارا رب کہ اس نے ہمیں ایسے ڈپریشن اور فرسٹریشن سے جو ہمیں دوسروں کی باتوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنے کا کس قدر خوب صورت اور بابرکت طریقہ اپنی اس مقدس کتاب کے ذریعے سکھایا ہے۔'' طاہرہ آنٹی کی خوب صورت آواز میں کی گئی تلاوت اور ترجمے کے باعث وہ خود کو پُرسکون سا محسوس کرنے لگی تھی کہ ان کی بات پر چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''کیوں؟ تم حیران کیوں ہوئیں۔ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ قرآن کی ہر آیت ہم سے ہم کلام ہوتی ہے۔ ہم سے کچھ راز و نیاز کرتی ہے۔ ہمیں کچھ وعظ ونصیحت کرتی ہے۔'' اپنی نظر کی عینک ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے اسے بہت پیار سے مسکرا کر دیکھا تھا۔

''پپ۔ پتا نہیں۔ میں نے کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔'' وہ گڑبڑا سی گئی۔
''تو دھیان دیا کرو بچے۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ''ہمارے ہر مسئلے کا حل ہے اس قرآن میں۔ اسے سمجھ کر پڑھوگی تو ہر گرہ کھلتی جائے گی۔ ہر فکر کا، ہر سوال کا جواب ملے گا تمہیں۔''
''قرآن تو میں بھی پڑھتی ہوں آنٹی۔ مگر مجھے اپنے کسی سوال کا جواب کبھی نہیں ملا۔'' وہ حیران سی کہنے لگی تھی۔
''ہاں۔ کیونکہ تم نے کبھی اسے اس نیت سے کھولا نہیں۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا دُرّی۔ ہم قرآن کو جس ارادے اور جس مقصد سے کھولیں گے۔ ہمیں اس سے وہی کچھ ملے گا۔ اگر ہم ہدایت کے لیے اس کی طرف رجوع کریں گے تو ہدایت ملے گی اور اگر محض دنیا مانگی تو صرف دنیا۔ عام طور پر ہم قرآن کو محض ثواب حاصل کرنے کی خاطر کھولتے ہیں۔ بنا اسے سمجھے۔ بغیر اس پر تدبر کیے۔ تو پھر وہ جو قرآن ہم سے کہہ رہا ہے۔ ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں اسے...... بھلا تم ہی بتاؤ۔'' طاہرہ بانو کا لہجہ ان کے نام کی طرح پاکیزہ تھا۔ وہ بنا کسی کوشش کے ان کی جانب متوجہ تھی۔
''جانتی ہو۔ میں اس وقت تم سے کیوں بات کر رہی ہوں؟'' انہوں نے استفسار کیا تھا۔ دُرِّ مکنون کا سر نفی میں ہل گیا۔
''کیونکہ تم مجھے سن رہی ہو۔ سمجھ رہی ہو۔ مجھے جواب دے رہی ہو۔'' وہ بولتے، بولتے رکیں۔
''قرآن بھی تمہیں جواب دے گا۔ جب تم اسے سنوگی، سمجھوگی اسے۔ جواب دوگی اور تمہارا جواب پتا ہے کیا ہے؟ تمہارا عمل۔ تو جب قرآن تم سے بات کرے تو دیوار نہ بن جانا۔ اسے جواب دینا۔ اس پر عمل کرکے۔ پھر دیکھنا وہ تمہارا دوست بن جائے گا۔''
''کیا ایسا ہو سکے گا آنٹی؟''
''بالکل... کیوں نہیں۔ اب دیکھو ناں تمہیں ایک تکلیف پہنچی اور قرآن نے تمہیں اس کا کتنا آسان اور بابرکت علاج بتایا۔ لہٰذا تسبیح و تحمید کیا کرو اور نفل عبادت کا اہتمام بھی۔ جب لوگوں کی باتوں سے دل تنگ پڑنے لگے، تھکنے لگے تو اللہ کی یاد ہی دل کو سکون دیتی ہے۔'' وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔
''یہ ڈپریشن اور فرسٹریشن دراصل مایوسی ہے اور مایوسی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ ہمارا جسم خاکی ہے اس لیے اس کی غذا بھی اسی مٹی سے آتی ہے۔ خواہ نباتات کی شکل میں ہو یا اس نباتات کو کھانے والے مویشیوں کی صورت۔ جبکہ ہماری روح اوپر سے آتی ہے۔ لہٰذا اس کی غذا بھی اوپر سے ہی بھیجی گئی ہے۔ اور وہ ہے قرآن۔ بس ہمیں اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔
''بے شک اللہ کا ذکر دلوں کو اطمینان دیتا ہے۔'' تو بس تم بھی اللہ کے ذکر کو ڈھال بنا لو۔ جب بھی شیطان تمہیں مایوسی کی طرف لے کر جائے اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرنا۔ اس شیطان کا کام ہی وسوسہ ڈالنا ہے۔ پھر چاہے وہ انسانوں کے ذریعے اپنا یہ کام کرے یا جنوں کے۔''
''مگر جو کچھ میں اپنے کانوں سے سن کر آرہی ہوں۔ کیا وہ بھی شیطانی وسوسہ ہے آنٹی!'' اس کا لہجہ گداز تھا۔ بھیگا، بھیگا سا۔
''نہیں۔ مگر وہ سب سن کر جو تمہارے دل میں آیا ہے۔ وہ ضرور وسوسہ ہے۔ یوں بھی سائرہ بھابی نے جو کچھ کہا وہ محض ان کی سوچ، ان کے اپنے مفروضات ہیں۔ عکرمہ نے تو ایسا کبھی نہیں کہا۔''
''تو کیا آپ کے خیال میں ''وہ'' یہ شادی اپنی خوشی سے کررہے ہیں؟'' دُرِّ مکنون کے لہجے میں محسوس کی جانے والی کرید اور بے تابی تھی۔ تفکر تھا۔ طاہرہ بانو کے لبوں پر شوخ سی مسکراہٹ تیر گئی۔
''ہوں، تو گویا یہ فکر ستائے ہوئے ہے ہماری دُرّی کو۔'' اب کے لہجے میں بھی شوخی تھی۔ ''میں نے سمجھا یہ شادی محض اماں اور مظفر بھائی کی خاطر کی جارہی ہے۔''

دُرِمکنون نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر نظر جھکا گئی۔
''کہو تو حلف اٹھوادوں عکرمہ سے!'' وہ اب اسے چھیڑ رہی تھیں۔
دُرِمکنون بجھے، بجھے انداز سے مسکرادی۔
''اس سے بھلا کیا ہوگا آنٹی۔ ممی کی زبان سے جو الفاظ نکل گئے ہیں۔ کیا وہ واپس پلٹ سکیں گے۔'' اس کا لہجہ درد سے چُور تھا۔
طاہرہ لاجواب سی ہوگئیں۔
''پتا نہیں، وہ کیوں کرتی ہیں میرے ساتھ ایسا۔ اُف کس قدر شدید نفرت ہے انہیں مجھ سے۔ کبھی، کبھی لگتا ہے۔ جیسے یہ نفرت مجھے اندر سے توڑ دے گی۔ زندہ رہنے کا دل نہیں چاہتا میرا۔''
طاہرہ کے سامنے وہ کھلی کتاب بن جاتی تھی۔ ایسی کھلی کتاب جسے وہ خود پڑھ کر سناتی تھی ان کو۔
''سائرہ بھابی کے برے رویّے کے مقابلے میں کتنے ہی لوگ تمہیں چاہتے بھی تو ہیں دُرّی۔ اسی شیرازی ولا میں مظفر بھائی اور اماں کی لازوال محبت کا مرکز ہو تم یہ بھی تو دیکھو۔ یہ لمحۂ تشکر ہے اسے شکوہ کرکے ضائع نہ کرو۔''
''پھول چاہے ہزار ہوں آنٹی۔ کانٹا ایک بھی چبھن دیتا ہے۔'' وہ ایک بار پھر رونے لگی تھی۔
''اور اس چبھن پر صبر کرنا ہی تو ایمان کی علامت ہے بچے۔ ذرا سوچو۔ اگر ہزاروں پھولوں کے بجائے صرف ایک پھول ہوتا۔ اور ایک کانٹے کی جگہ ہزار کانٹے ہوتے تو کیا صبر کر پاتیں تم؟'' ان کا سوال کڑا تھا۔
دُرِمکنون اپنا رونا بھول کر انہیں دیکھنے لگی۔
''یہ جو لمحۂ شکوہ ہوتا ہے ناں۔ دراصل وہ ہی مقامِ شکر ہوتا ہے۔ جسے ہم اپنی نادانی میں گنوا دیتے ہیں۔''
بردباری اور شفقت بھرے لہجے میں انہوں نے حکمت کا وہ موتی اسے تھمایا کہ وہ گنگ سی رہ گئی۔
''اور صبر ایک ایسا وصف ہے جو ہمارے اندر اس وقت تک پیدا ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ ہم اللہ کی جانب سے ملی ہوئی نعمتوں کا ادراک اور ان کا شکر ادا نہیں کرتے۔ یعنی صبر اور شکر ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔'' وہ اسے بہت عمدگی سے سمجھا رہی تھیں۔ احساسات کی الجھی ڈور سلجھا رہی تھیں۔
''غور کرنے والی بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے یہ نہیں کہا کہ تم صبر کرو۔ اپنے غم کو برداشت کرو۔ بلکہ ان کی توجہ ان نعمتوں کی طرف دلائی جو انہیں حاصل تھیں۔ ان کا فوکس بدل کر صبر کے بجائے شکر کی طرف کردیا۔'' انہوں نے ایک لمحہ توقف کیا۔
پھر مسکرا کر دُرِمکنون سے استفسار کیا جو انہیں بغور سن رہی تھی۔ جس کے رخساروں پر پھیلے آنسو اب خشک ہوچکے تھے۔
''جانتی ہو کیوں؟'' وہ مسکرائیں تو دُرِمکنون کا سر نفی میں ہل گیا۔
''کیونکہ کچھ کھو دینے پر صبر اس وقت تک نہیں آتا جب تک کہ حاصل شدہ نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا جائے۔ اور بندہ اس وقت تک شکر گزاری حاصل نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ وہ صبر آزما حالات سے گزار نہ دیا جائے۔ بدترین سے بدترین وقت بھی گزر ہی جاتا ہے دُرّی اور حسین سے حسین لمحات بھی قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں۔ تمہاری زندگی کا اگر خوب صورت دور گزر گیا ہے تو اذیت ناک لمحات بھی بیت چکے ہیں۔ اور جو ابھی گزر رہا ہے۔ یہ بھی گزر جائے گا..... یوں بھی یہ وعدہ کسی سے نہیں ہے کہ زندگی محض تفریح ہوگی۔ لہٰذا میری جان تم بھی اپنا دھیان سائرہ بھابی کی باتوں کی طرف سے ہٹا کر مثبت سوچوں میں لگاؤ۔ انڈراسٹینڈ کرنے کی کوشش کرو۔ وہ ماں ہیں۔ ردا کی فکر سے اپ سیٹ ہیں۔ جب بندہ ڈوبنے لگتا ہے تو اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار کر خود کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے میں اس کی زد میں جو بھی آتا ہے وہ اسے بھی اپنے ساتھ ڈبونے لگتا ہے۔ مگر تم ایسا مت ہونے دینا۔ اس غم سے ابھرنے کی ہر ممکن

جدوجہد کرنا جو تمہیں ہتہ آب لے جانے کی سعی کر رہا ہے، سمجھیں۔'' اسے محبت سے دیکھتے ہوئے وہ گویا تھیں۔
''بس اللہ کی یاد کو ڈھال بنالو۔ وہ مالک ہے۔ رب ہے۔ وہ سارے بگڑے کام بنا دے گا ان شاء اللہ۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں تم؟''
جواباً اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
درحقیقت انہوں نے اس کے دماغ کی بند کھڑکیوں کو کھول دیا تھا۔ ان کا لفظ، لفظ حقیقی معنوں میں گویا دل میں اترا تھا۔
''میں پوری کوشش کروں گی آنٹی کہ ان لائنز پر سوچ سکوں۔'' اس کے لبوں پر لمحہ بھر کے لیے مسکان ابھر کر غائب ہوگئی تھی۔
''تم ضرور کامیاب ہوگی میری بیٹی۔ بس آج میں جینا شروع کردو۔ کسی مفکر نے کیا خوب کہا ہے کہ زندگی ''کل، پل اور کل'' میں قید ہے۔ ایک وہ گزرا کل ہے جو کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اور ایک وہ آنے والا کل جو ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ بس یہ ''پل'' ۔ یہ لمحۂ موجود ہے ہماری مٹھی میں۔ جو کرنا ہے اسی میں کرلو۔ صاحبِ حال ہوجاؤ۔''
''کیا یہ انسان کے بس میں ہے آنٹی؟ تکلیف دہ یادوں سے تو ہر کوئی چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔ مگر کیا یہ آسان ہے؟''
''مانتی ہوں بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر انسان اپنے قصوروار کو معاف کردے تو دل کو سکون ضرور مل جاتا ہے۔ تم بھی اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر کے خود کو پُرسکون کرلو اور جو لوگ تم سے منہ موڑتے ہیں۔ ان کے بجائے اپنا رخ ان کی جانب کرلو جن کی زندگی کی خوشیاں تم سے جڑی ہیں۔''

☆......☆......☆

''الحمدللہ۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے میرے بچے کے دل میں نرمی ڈال دی۔ اسے گھر کا راستہ دکھا دیا۔'' صنوبر پھوپی کی خوشی دیدنی تھی۔ کسی ماں کی طرح مسرور ہوئی تھیں وہ۔
زاویار لاہور واپس آرہا ہے۔ یہ خبر کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ انصاری ہاؤس میں گویا خوشیوں کی بارات اترنے کو تھی۔
''ہاں مگر اچانک اسے یہ سوجھی کیا؟'' بیگم شہریار نے قدرے تیکھے پن سے حیرت کا اظہار کیا۔ ''کہاں تو سو جان سے انکاری تھا اور کہاں یہ کہ نہ صرف یہاں آنے پر تیار ہوگیا ہے۔ بلکہ شادی تک کی حامی بھرلی ہے اس نے۔'' بیگم شہریار کا لہجہ تیکھا سہی۔ بات غلط نہیں کی تھی انہوں نے زاویار کے آنے کی خبر سن کر صنوبر بھی آئی ہوئی تھیں۔ سب لوگ لان میں جمع تھے۔ درحقیقت حیرت اور کھٹک تو ہر دل میں تھی۔ مگر خوشی کے رنگ نے اسے پس منظر کا حصہ بنا دیا تھا۔
''آغا جان خود بلانے گئے تھے اسے کراچی۔ کیا تب بھی نہ آتا۔'' صنوبر پھوپی نے ماں سے کہا۔
''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ آغا جان کے بلانے پر بھی صاف انکار کردیا تھا اس نے۔'' شہریار انصاری کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا۔ بہن سے متفق نہ ہونے کا واضح اظہار کیا۔
''ہوسکتا ہے عاصمہ نے منایا ہو اسے۔'' میمونہ پھوپی نے نیا امکان ظاہر کیا۔
''بڑوں کی بات ماننے کے جراثیم نہیں ہیں اس میں۔ اللہ ہی بہتر جانے کیا بھید ہے اس کے اقرار میں۔'' مسز شہریار استہزائیہ سے انداز میں کہہ کر اٹھیں اور لان چھوڑ گئیں۔ کچھ تو زاویار کے لیے سب کے دل میں ایک مخصوص جگہ بھی محبت تھی اور کچھ اس کی جدائی نے بھی اس کی اہمیت کو بڑھا دیا تھا۔

ایسے میں بیگم شہریار اور شہریار انصاری کی منفی سوچیں اور باتوں سے سب کے دل مکدر ہوئے۔
''ایسی بھی بات نہیں۔ اتنا برا نہیں ہے وہ۔ بچہ ہے، بچے ضد کرتے ہی ہیں۔ بھابی کو تو اللہ واسطے کا بیر ہے اس سے۔''صنوبر ناگواری کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکیں۔
''جوزوی کے ساتھ ہوا جس کے بھی ساتھ ہوتا وہ ایسے ہی ری ایکٹ کرتا۔ اپنی ماں کی جگہ کسی دوسرے کو قبول کرنا آسان نہیں ہوتا۔ عاصمہ بھابی کی کمی پوری کرنے کے لیے آغا جان نے لاڈ پیار کی حد کر دی تھی۔ جس سے اس کا مزاج ذرا نازک ہو گیا ہے مگر ابھی کم عمر ہے۔ نادان ہے، وقت کے ساتھ، ساتھ ٹھیک ہو جائے گا۔''اقرار چچا نے بھی بہن کا ساتھ دیا۔
''اللہ کرے جیسا تم سب کہہ رہے ہو ایسا ہی ہو۔''شہریار انصاری کے لہجے میں خاصی مایوسی تھی۔ وہ اٹھے اور فقرہ مکمل کر کے اندر کی جانب بڑھ گئے۔ جہاں کچھ دیر پہلے بیگم شہریار گئی تھیں۔
''حد ہے شہریار بھائی سے بھی۔ بھابی تو سوتیلی ماں ہیں زوی کی۔ ان کی بیزاری اور بے اعتمادی تو سمجھ میں آتی ہے مگر شہریار بھائی کا تو سگا اکلوتا بیٹا ہے وہ۔ وہ کس حساب میں خفا رہتے ہیں اس سے۔''صنوبر پھوپی کو بھائی کا انداز ذرا نہ بھایا۔ اولاد کی کمی زاویار سے پوری کی تھی ہمیشہ۔ ان کی زندگی اور دل میں بہت خاص الخاص مقام تھا زاویار کا۔ اس کے لیے تو اکثر وہ شہریار بھائی سے بھی لڑ جایا کرتی تھیں۔ آغا جان کو بھی مجبور کر دیا کرتیں کہ وہ زاویار کی فرمائش پوری کریں۔
''جوان بیٹا۔ ایسے اچانک چھوڑ گیا تھا ان کو۔ شہریار بھائی کو بہت مایوس کیا زاویار نے۔ خفگی تو بنتی ہے ناں۔''اقرار چچا نے حقیقت پر مبنی بات کہی۔
''ہاں مگر اب تو واپس آ رہا ہے ناں وہ۔ صبح کا بھولا شام کو لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ میرے خیال میں تو ہمیں گزری باتوں کو فراموش ہی کر دینا چاہیے۔ اسی میں سب کی بہتری ہے۔''صنوبر پھر گویا ہوئی تھیں۔
''ہوں، ٹھیک کہتی ہو تم صنوبر۔''میمونہ بیگم نے گہری سانس بھری۔
''مگر پھر بھی بات ہے حیرت کی۔ زوی کا واپس آنا اور ساری باتیں مان جانا بعید از امکان تھا۔ پتا نہیں کیسے راضی ہوا ہے وہ۔''اپنے تحیر کا اظہار کرتے ہوئے وہ خوشی بھرے تردد کا شکار تھیں۔
سب کے اذہان میں یہ سوال کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ جس کا جواب صرف آغا جان کے پاس تھا۔ جو اپنے کمرے میں لان کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پاس کھڑے ڈوبتے سورج کا نظارہ کرتے ہوئے ان سب کی باتیں سن رہے تھے۔ ساتھ ہی زاویار کے ساتھ ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو حافظے میں ابھر رہی تھی۔
دو دن پہلے اچانک اس کا فون آیا تھا۔ آغا جان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا۔ انہیں لگا وہ سب کے کہنے سے، مجبور کرنے سے، محض ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے مروتاً کال ملا بیٹھا ہے۔
مگر خوشی انہیں بہت ہوئی۔ اس پوتے میں ان کی جان بند تھی جیسے۔ وہ اس سے رسمی قسم کی گفتگو کی توقع کر رہے تھے۔ مگر جو اس نے کہا وہ ان کی امید کے برخلاف تھا۔
''میں لاہور واپس آنا چاہتا ہوں آغا جان۔''
جملہ تھا یا جیسے کسی ساحر کا سحر۔ وہ اپنی جگہ چند لمحوں کے لیے جیسے گنگ رہ گئے۔
''میں بھی تمہیں واپس لانا چاہتا ہوں۔ آغا کی جان۔''خوشی اور تحیر کے باعث ان کے لبوں سے ٹھیک سے الفاظ بھی نہیں نکل رہے تھے۔ آواز کپکپا سی گئی۔
مسرت و انبساط کی حد تھی جیسے۔

''مگر میری دو شرائط ہیں۔'' جواباً اس کے ٹھنڈے لہجے میں جذبات سے عاری جملہ سننے کو ملا۔
آغا جان کے لیے یہ دوسرا شاک تھا۔ چند لمحے انہیں گویا خود کو سنبھالنے میں لگے۔ دوسری طرف وہ بڑے صبر سے ان کے بولنے کا منتظر تھا۔
''کہو بیٹا۔ میں سب ماننے کو تیار ہوں۔'' وہ جب بولے تو لہجے سے فیصلے کی بُو آرہی تھی۔
''سوچ لیں۔ مکر تو نہ جائیں گے۔''
''میں مکرنے نہیں کر گزرنے والوں میں سے ہوں زاویار انصاری۔ تم کہو...... تمہیں کیا چاہیے۔ کیا شرائط ہیں تمہاری؟'' زاویار کی سوچ اور اس کے بے رحمانہ اظہار سے انہیں دھچکا لگا تھا۔ مگر انہوں نے تحمل سے کام لیا۔ گزرے سالوں میں وہ سمجھ چکے تھے کہ زاویار ضد میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ اپنے خاندان کے اس اکلوتے چشم و چراغ سے انہیں آگے اپنی نسل چلانی ہے۔
اور جو کچھ تین سال پہلے ہو گزرا تھا اس کے بعد زاویار کی جو شخصیت سامنے آئی تھی۔ اس نے انہیں نہ صرف چونکایا بلکہ یہ بھی باور کرایا تھا کہ اس کے ساتھ معاملات کرنے کے لیے اب انہیں حالات و واقعات کو زاویار کی نظر سے ہی دیکھنا پڑے گا۔
''نمبر ایک مجھے آپ کے چند خاص کا نٹیکٹس اور...'' اس نے ذرا سا توقف کیا۔
آغا جان ہمہ تن گوش تھے۔
''اور پندرہ ملین کیش چاہیے۔'' اس کا مطالبہ واضح اور قطعی غیر متوقع تھا۔
''کیا کوئی کاروبار بڑھانا چاہتے ہو؟'' آغا جان قدرے حیرت سے بے اختیار سوال کر بیٹھے۔
''نہیں۔'' ''دل پہ رکھا سالوں پرانا بار اتارنا چاہتا ہوں۔'' (وہ بے آواز بولا) ''اور نمبر دو شرط یہ ہے کہ آپ مجھ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ یہ سب مجھے کیوں چاہیے اور نہ ہی ان شرائط کے بارے میں کسی اور سے کچھ کہیں گے۔ پاپا سے بھی نہیں۔'' اس نے آغا جان کے پُرشفقت سوال کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔
اس کی دونوں شرائط بڑی عجیب اور پُراسرار سی تھیں۔
''ویسے مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ سب کو اس بارے میں بتا بھی دیں تو بس مجھے ایموشنل ڈراموں سے چڑ ہوتی ہے۔'' ان کی خاموشی پر اس نے پھر سے کہنا شروع کیا تھا۔
''میں کسی فیملی ٹرائل سے گزرنا نہیں چاہتا۔''
وہ تسلسل سے اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔ اور آغا جان اس کے کھردرے غیر جذباتی لہجے اور فاصلے بچھاتے الفاظ کو سن رہے تھے، تول رہے تھے۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ خاموش ہو گیا۔
''اُف میرے مالک۔ کس قدر دور چلا گیا ہے۔ یہ ہم سے۔'' وہ دل ہی دل میں جیسے مضطرب ہوئے۔
''کتنا بدل گئے ہو تم زاویار۔'' اس کی خاموشی پر وہ بولے تو لہجے میں دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔
جواباً وہ طنز سے ہنس پڑا۔
''ایک سال میں انسان کے جسم کے سارے سیلز چینج ہو جاتے ہیں۔ اگر پھر بھی انسان ویسا ہی رہے تو پھر تف ہے اس تبدیلی پر۔ اور یوں بھی بدل تو آپ بھی بہت گئے ہیں آغا جان۔''
وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔
آغا جان اس کا اشارہ سمجھ گئے تھے۔
''اینی وے۔ میں خواہ کتنا ہی بدل کیوں نہ گیا ہوں۔ میرا یہ فیصلہ نہیں بدلے گا۔ اگر آپ ان دونوں

conditions کو قبول کرتے ہیں تو میں اسی ہفتے کی سیٹ بک کرالیتا ہوں۔'' اس کی آواز نے آغا جان کو خیالات کی یورش سے نکالا۔

''تم کیا کرنا چاہ رہے ہوزاویار۔ میں فکر مند ہو رہا ہوں۔ کہیں کوئی غلط کام تو نہیں کرنے لگے ہوتم؟'' اس بار لہجے میں قدرے سختی تھی۔ فکر مندی و تشویش تھی۔

''غلط کو صحیح کرنے لگا ہوں آغا جان۔ اطمینان رکھیں کچھ ایسا نہیں کروں گا جو میرے ضمیر یا خاندان کو گوارا نہ ہو۔'' زاویار نے گہری سانس بھری۔ وہ قطعاً سنجیدہ تھا۔ دورانِ گفتگو پہلی مرتبہ اس کے لفظوں سے اپنائیت کی مہک آتی محسوس ہوئی انہیں۔

''مجھے تم پر اعتبار ہے بیٹا۔ مگر تم ابھی کم عمر ہو، نا تجربے کار ہو۔ اس لیے رہنمائی کی ضرورت ہے تمہیں۔''

''سیدھے راستے پر چلنے کے لیے کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی آغا جان۔ یہ راستہ تو خود ہی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔'' بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے اپنا مطمحِ نظر واضح کیا تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے وہ تذبذب میں پڑ گئے۔ معاملہ پیسے اور تعلقات کا نہیں تھا۔ فکر پوتے کی تھی۔ نہ جانے اس نے اپنے دل میں کیا ٹھان لی تھی۔ بہر حال چند منٹوں میں ہی انہوں نے بہت کچھ سوچ لیا۔

اس کی بات ماننے میں ہی بہتری ہے۔ وہ یہاں لاہور ان کے پاس آجائے گا تو وہ اس کے معاملات پر نظر بھی رکھ سکیں گے۔ جبکہ انکار کی صورت میں نہ صرف وہ اس موقع کو ضائع کر دیں گے۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ زاویار کو اس بار مکمل مایوس کر کے وہ اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیں۔

تین سال پہلے ان کے منہ سے نکلے انکار نے ان کی نسلوں کے اکلوتے وارث کو قطب شمال پہنچا دیا تھا۔ اس

باردوبارہ یہ غلطی کرنے کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے کانٹیکٹس استعمال کرنے کی صورت میں وہ اسے ہمیشہ ٹریس کرسکیں گے کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

''ٹھیک ہے، میں تمہاری دونوں باتیں ماننے کو تیار ہوں۔'' کچھ دیر خاموشی کے وقفے کے بعد وہ بولے۔ تاہم جملے میں کچھ ادھورا پن تھا۔ زاویار کارواں، رواں متوجہ تھا۔

''مگر۔''

''مگر کیا......؟''

''تمہیں بھی میری ایک خواہش پوری کرنا ہوگی۔''

''وہ کیا......؟'' وہ جیسے چونکا۔

بنا دیکھے ہی انہیں اندازہ تھا کہ اس کے ماتھے پر ان گنت بل پڑ گئے ہوں گے۔

''تمہیں شہرین سے شادی کرنا ہوگی۔''

''ڈیل کر رہے ہیں مجھ سے؟'' اس کا لہجہ یک دم برف ہو گیا تھا۔

''نہیں۔'' جواباً انہوں نے بھی مستحکم لہجے میں کہا۔ ''ایک دادا اپنے لاڈلے پوتے سے اپنی ایک دیرینہ خواہش کا اظہار کر رہا ہے۔'' انداز میں شفقت ہی شفقت تھی۔ زاویار گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''او کے۔'' کتنی ہی دیر سوچ کے تانے بانے بنتے رہنے کے بعد بالآخر وہ بولا۔ ''مگر مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔''

''ٹیک یور ٹائم مائی سن۔''

درحقیقت ان کی خواہش کے اس اظہار پر وہ تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ ان سے اس واضح مطالبے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ گو کہ لاشعوری طور پر وہ ان سے ایسا ہی کچھ سننے کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ مگر یہ شہرین کی زندگی کا معاملہ تھا۔

''اور میری ڈیمانڈز......؟'' کچھ دیر بعد اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''وہ سب ہو جائے گا۔ مگر اتنا بڑا اماؤنٹ میرے اکاؤنٹ میں فی الحال نہیں ہے۔ البتہ اس مہینے کے آخر تک زمینوں اور باغوں سے منافع آنے والا ہے۔ تمہارا کام بن جائے گا۔ چونکہ تم نے کسی کو بتانے کے لیے منع کیا ہے۔ لہٰذا اس معاملے کو مجھے اکیلے ہی ہینڈل کرنا ہوگا۔''

"then you too take your time Agha jan" اس کا بے تاثر لہجے میں کہا گیا جملہ سماعتوں کا حصہ بنتے ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ اور اس وقت سے لے کر اب تک وہ خود یہ سوچ سوچ کر اپنی نیندیں گنوا چکے تھے کہ آخر زاویار انصاری کرنا کیا چاہتا ہے۔ اس کے ارادے کیا ہیں۔

☆......☆......☆

وہ شیرازی ولا واپس آئی تو پتا چلا باقی سب لوگ بھی اپنے اپنے کام نبٹا کر لوٹ آئے تھے۔ گھر میں یک دم پھر سے چہل پہل ہو گئی تھی۔ طاہرہ بانو کے سمجھانے کا کافی اثر ہوا تھا اس پر مگر یہ جو شیطان ساتھ، ساتھ دوڑتا ہے ناں لہو میں وہ انسان کے اندر وسوسے پیدا کرتا رہتا ہے۔ بار، بار پلٹ، پلٹ کر آتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو اضطراب اور پھر مایوسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ بھی اطمینان اور اضطراب کے درمیان چکر پھیریاں کھا رہی تھی۔

ڈنر ٹیبل پر سب موجود تھے اور بہت خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا تھا۔ سب سے پہلے دُرِمکنون نے ہی کھانے سے ہاتھ کھینچا تھا۔ حسبِ معمول فکر کا اثر اس کی بھوک پر پڑا تھا۔ جب سے عبید بھائی کی فیملی آئی تھی۔ معیز

اور معاذ عکرمہ کی توجہ اپنی جانب مرکوز رکھتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ برائے نام کھا کر اٹھ گئی تھی مگر عکرمہ نے اسے ٹوکا نہیں تھا۔

وہ سب سے نظر بچا کر اوپر آ گئی۔ نیچے زارا کے ساتھ voice chat چل رہی تھی۔ ٹیرس پر خاموشی مگر سکون تھا۔ لاؤنج سے آتی روشنی اور چاندنی نے اجالا سا کیا ہوا تھا۔ خوشگوار ہوا طبیعت پر اچھا اثر ڈال رہی تھی۔

اس کے ذہن میں طاہرہ اور عکرمہ کے کہے کئی فقرے تازہ ہونے لگے۔

''جب بارِ غم اٹھائے نہ اٹھ رہا ہو تو کسی کو معاف کر دینے سے بھی دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔'' کئی دن پہلے عکرمہ نے یہ مشورہ زاویار کے لیے دیا تھا۔

''اگر انسان اپنے قصوروار کو معاف کر دے تو سکون ضرور مل جاتا ہے۔ تم بھی اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر کے خود کو پُرسکون کر لو۔''

اور آج طاہرہ بانو نے بھی کم و بیش یہی بات سائرہ شیرازی کے حق میں کہی۔

''خدا کے لیے مجھے معاف کر دو دُرِّ مکنون۔ تمہاری چیخیں مجھے راتوں کو جگاتی ہیں۔ میں سالوں سے سو نہیں پایا۔'' لاشعور میں کہیں زاویار انصاری کی درد میں ڈوبی آواز بھی ابھر رہی تھی۔

''میں سب کو معاف کر دوں...... سب کو۔'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

''زاویار انصاری کو بھی، میمی کو بھی، اظہار بھائی کو بھی، سب کو...... ان سب کو معاف کر دوں۔'' اس کا گلا رندھنے لگا۔

''تیرے سارے بندے معافی کے طلب گار اور حقدار ہیں۔ بس ایک میں نہیں یا اللہ۔ کوئی مجھے کیوں نہیں معاف کرتا یا اللہ۔ کسی کو تیری اس گناہ گار بندی پر ترس کیوں نہیں آتا۔ آخر کیوں؟'' ریلنگ پر دونوں ہاتھ جمائے وہ آنسو اپنے اندر اتارنے کی سعی لاحاصل کر رہی تھی کہ اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سن کر جلدی سے گالوں کو دوپٹے سے رگڑ ڈالا۔

''کیا میں مخل ہو سکتا ہوں؟''

وہ عکرمہ کے آنے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ آج کل معاذ اور معیز رات گئے اس کے ساتھ جمے بیٹھے رہتے تھے...... کارڈز، کبھی پلے اسٹیشن تو کبھی ایکس باکس پر چچا بھتیجوں کی بازی جمتی تھی۔ وہ بمشکل سونے کے لیے اوپر آیا تا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ جیسے جیسے شادی کے دن نزدیک آ رہے تھے۔ دُرِّ مکنون خود میں سمٹتی جا رہی تھی۔ عکرمہ کے سامنے آنے سے حتی المقدور گریز کرتی۔

اس کے اس گریز کو سب ہی حیا پر محمول کرتے ہوئے اسے ٹوکتے نہیں تھے۔ عکرمہ بھی کم ہی اسے ڈسٹرب کرتا۔ ماسوائے سدرہ بھابی کے۔ جو اسے دیکھتے ہی شوخ فقرے کسنے لگتی تھیں۔ ایسے میں اگر زوہا گھر آئی ہوتی تو وہ بھی خوب ہی سدرہ کا ساتھ دیتی۔ جس پر عکرمہ ان کو مصنوعی خفگی سے دیکھ کر جوابی جملے اچھالتا رہتا۔ اور دُرِّ مکنون لامحالہ بے اختیار سرخ پڑ جاتی تھی۔

مگر جو کچھ آج اس کے کانوں نے سنا۔ اسے عجیب طرح کی یاسیت نے گھیر لیا تھا۔ طاہرہ آنٹی کی خوب صورت نصیحت سے لبریز گفتگو نے گو کہ ذہن کو بہت پُرسکون کیا تھا۔ لیکن ابھی نیچے کھانے کی ٹیبل پر سائرہ بیگم نے اسے جن کینہ توز معاندانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک بار پھر اندر سے زخمی ہو گئی تھی۔

اسے تو یہ ہی لگا تھا کہ عکرمہ نیچے بھتیجوں کے ساتھ مصروف ہوگا۔ لہٰذا اس وقت اس کی آمد اس کے لیے غیر متوقع تھی۔

''کیا میں نے ڈسٹرب کیا آپ کو؟''

وہ مڑی تو دیکھا عکرمہ چائے کے دو مگ اٹھائے اس کے نزدیک آچکا تھا۔ وہ شرمندہ سی ہوگئی۔ کہا کچھ نہیں محض اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''چائے کا ایک مگ آپ کے لیے ہے۔ لے لیں۔'' دونوں مگ اس کے سامنے کیے عکرمہ بولا تھا۔ ''کوئی سا بھی لے لیں۔''

اسے متذبذب دیکھ کر وہ بولا تو دُرِ مکنون نے ہاتھ بڑھا کر ایک مگ لے لیا۔

''میں نے دونوں ہی چکھے ہیں۔ شکر ٹھیک ہے دونوں میں۔''

اس کا اگلا فقرہ بہت غیر متوقع تھا۔ دُرِ مکنون نے ٹپٹا کر اس کی طرف دیکھا تو عکرمہ کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹ دلفریب انداز میں مسکرا دیے۔

دُرِ مکنون خفت کے باعث یک دم بلش کرنے لگی۔ منہ تک مگ لے جاتا ہاتھ راستے میں ہی ٹھٹک گیا تھا۔

''کم آن پی لیں۔ میں صرف مذاق کر رہا تھا۔'' اس کی شکل دیکھ کر عکرمہ ہولے سے ہنس دیا تھا۔

جس کے نتیجے میں وہ جھینپ کر سر جھکا گئی۔

''ویسے آپ کی اطلاع کے لیے جھوٹی چائے عموماً خاصی مزیدار ہوتی ہے۔ کبھی ٹرائے کر کے ضرور دیکھیے گا۔'' چائے کا اِک گھونٹ رسانیت سے لیتے ہوئے اس نے حظ اٹھانے والے انداز میں کہا تو بے اختیار دُرِ مکنون نے تیکھے چتونوں سے اسے دیکھا تھا۔

''اوکے، اوکے۔ ڈونٹ گیٹ اینگری۔ مت ٹرائے کریں۔ مرضی آپ کی۔'' وہ قصداً یوں بولا جیسے دُرِ مکنون کی تیکھی نظروں سے خائف ہوگیا ہو۔ انداز کچھ ایسا تھا کہ دُرِ مکنون کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔ بہت مختصر مگر بڑی... بے ساختہ سی ہنسی تھی اس کی۔ عکرمہ نے دلچسپی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''دیٹس لائک اے ویری گڈ گرل۔ اسی طرح ہنسا کریں۔ خوش رہا کریں اور آنے جانے والے غیر اہم لوگوں کی پروانہ کیا کریں۔'' چائے کا ایک اور مکمل سپ لیتے ہوئے اس نے جو کہا وہ دُرِ مکنون کو اپنی جگہ فریز کر گیا جیسے۔

اس نے دزدیدہ نظروں سے عکرمہ کی طرف دیکھا تھا۔ جو اپنی بات کہہ کر اب ریلنگ سے نیچے جھانک رہا تھا۔ نظریں نیچے لان کے سولر لیمپس پر جمی تھی۔

دُرِ مکنون کے لب ایک دوسرے میں یوں پیوست ہوئے جیسے اب کبھی الگ نہ ہوں گے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عکرمہ زاویار کی آمد سے واقف ہوگا۔ پورا دن اس نے ذرا بھی اسے احساس نہ ہونے دیا۔ شاپنگ کے دوران وہ اس سے کئی بار مخاطب ہوا مگر اسے گمان تک نہ ہونے دیا۔ وہ ایک بار پھر حسبِ معمول اس کے سیلف کنٹرول کی قائل ہوگئی۔

''اچھا، ذرا ایک بات بتائیں۔ آج زاویار صاحب کا سامنا ہوا تو آپ نے کھانے کو محض چکھ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ فرض کریں کل کو یہ حضرت شیرازی ولا کے سامنے والے بنگلے میں رہائش پزیر ہو جائیں تو کیا آپ کھانا کھانا چھوڑ دیں گی؟''

یک دم اس کی طرف مڑتے ہوئے وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

دُرِ مکنون پشیمان سی لب بستہ اسے سنے گئی۔

''اور جو کسی روز انہوں نے اس گھر کی دہلیز پار کرنے کی جرأت کر ڈالی تو پھر کیا کریں گی آپ؟ کیا سانس لینے سے بھی انکاری ہو جائیں گی؟'' اس کی آواز جتنی دھیمی تھی۔ لہجہ اسی قدر مستحکم تھا۔

''کانچ کی طرح نازک نہ بنیں کہ جو چاہے چور چور کرتا گزر جائے۔ خود کو مضبوط بنائیں۔ میں ہوں ناں آپ کے ساتھ چچا جان ہیں، دادی ہیں اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ ہے آپ کے ساتھ......'' یک دم اس کا لہجہ بہت نرم

ہو گیا تھا۔ بہت متردد سا۔

دُرِّمکنون کا دل پگھلنے کو ہو گیا۔

وہ ساتھ ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔

اس سے کیا کہتی۔ اس کا یہ ساتھ ہی تو اسے سائرہ بیگم کی نظروں میں معتوب بنائے ہوئے ہے۔

"آخر ان سے کیسے کہوں کہ میمی ان کے لیے کیا چاہتی ہیں۔ کیسے، کیسے خواب اور منصوبے بنائے ہوئے ہیں انہوں نے ردا اور ان کے لیے۔"

عکرمہ کے اس قدر خوب صورت اظہار کے باوجود وہ چاہتی بھی تو خوش نہیں ہو سکتی تھی کہ آج جو کچھ سائرہ بیگم کی زبانی سنا تھا۔ وہ اس کو اندر تک ادھیڑ گیا تھا۔ سوگواری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اچانک عکرمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"اونہوں۔ نو نیگیٹو تھنکنگ۔ بی پوزیٹو انڈر اسٹینڈ!" اب کے لہجے میں تحکم تھا۔ جواباً درمکنون گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

اسے خیال گزرا کہ شاید طاہرہ آنٹی نے بھی اس سے کچھ کہا ہے جبھی وہ بالخصوص اس کے پاس آیا تھا۔

اس کی گفتگو بھی بہت حوصلہ افزا تھی۔ جس میں ساتھ دینے کا وعدہ بھی تھا۔

"جب اللہ سبحانہ تعالیٰ اتنا دے تو ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔" اس کا استدلال اسے مثبت سوچ اپنانے کو کہہ رہا تھا۔

اس دوران سدرہ بھابی اوپر آ گئی تھیں۔

ان دونوں کو ساتھ دیکھا تو خوب چھیڑا۔ یہاں تک کہ عکرمہ کو وہاں سے جاتے ہی بنی۔ تاہم جاتے، جاتے اس نے جن نرم نظروں سے اسے دیکھا وہ اس کے حوصلے میں اضافے کا سبب بنی تھیں۔

☆......☆......☆

"میں، مزید تعلیم کے لیے ابروڈ Abroad جانے والا ہوں۔"

کانٹے کی مدد سے فرائڈ فش کھاتے ہوئے اس نے اچانک مگر بڑے آرام سے دھما کا کیا تھا۔ ڈنر ٹیبل پر موجود بقیہ تینوں نفوس یک دم ٹھٹک گئے۔

"کیا مطلب؟" حیرت اور شاک سے نکلتے ہوئے سب سے پہلے مومنہ نے سوال داغا تھا۔ جس کی آمد کے باعث زاویار نے اس موقع پر قصداً یہ اطلاع دی تھی۔

"مطلب یہ کہ میں اپلائڈ سائنسز میں پی ایچ ڈی کے لیے یو ایس جانے والا ہوں۔" اس نے نظر اٹھائے بغیر خود کو کھانے میں مصروف ظاہر کیا۔

جانتا تھا کہ عاصمہ کے چہرے کے تاثرات کا سامنا کرنا آسان نہ ہوگا۔

"Bro آپ نے ماما سے پوچھا تھا کیا؟" مہران نے بھی حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"ہاں.....تو اب بتا رہا ہوں ناں۔" بے اختیار اس کے لبوں سے فقرہ پھسلا۔

جس پر وہاں موجود عاصمہ سمیت مہران اور مومنہ نے ایسی گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھا جو تاسف سے بھی بھرپور تھیں۔

زاویار کے چہرے پر یک دم پشیمانی کے رنگ دوڑ گئے۔

"آئی مین، ماما سے ہی پوچھنے لگا تھا میں۔"

زندگی میں بہت کم مقامات ایسے آئے جب اسے اپنے کہے جملوں پر افسوس ہوا ہو۔ مگر آج درحقیقت وہ

شرمندہ ہوگیا تھا۔

''آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا ناں۔'' اب کے ماں کی طرف رخ پھیر کر دیکھا۔

''کیا میرے اعتراض کرنے سے تمہارے فیصلے پر کوئی اثر پڑے گا؟'' عاصمہ نے اسے یک ٹک دیکھتے ہوئے تھکے، تھکے سے انداز میں سوال کر ڈالا تھا۔

''آپ اپنی رضا و رغبت سے اجازت دیں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں آپ کو ناراض کر کے نہیں جانا چاہتا۔'' بلا ارادہ میز پر رکھے عاصمہ کے بائیں ہاتھ کو اپنے مضبوط مٹھی میں لیتے ہوئے۔ اس نے حقیقتاً دل کی گہرائی سے کہا تھا۔

کچھ تھا اس کے لمس اور آنکھوں میں۔ عاصمہ کے دل سے خوشی پھوٹی تھی جیسے۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ ان کی خوشی ناخوشی اس کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ احساس انتہائی خوش کن تھا ان کے لیے۔ چند ثانیے بیٹے کے چہرے کو شفقت سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ مسکرا دیں۔ اس بار ان کی مسکراہٹ میں طمانیت تھی۔

''میں اپنے بچوں کے خوابوں کے راستوں میں کبھی دیوار نہیں بنی، نہ کبھی بنوں گی۔ اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو میں بھی خوش ہوں۔'' انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ زاویار کے ہاتھ پر رکھ کر محبت سے تھپتھپایا تو ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''مجھے آپ سے اسی حوصلہ افزائی کی امید تھی۔'' اس کے دل پر پڑا جیسے کوئی بھاری بوجھ ہٹا۔ اس نے خود کو پُرسکون محسوس کیا اس لمحے۔

''مگر مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی زوی بھائی کہ آپ ہم سب کو چھوڑ کر جانے کا فیصلہ بھی کر سکتے ہیں۔ وہ بھی یوں اچانک۔'' مومنہ جذباتی ہوگئی تھی۔

زاویار نے عجیب سی مسرت میں گھر کر مہران اور مومنہ کی طرف دیکھا۔ یہ دونوں اس کے سگے بہن بھائی نہیں تھے۔ وہ تینوں ایک والد کی اولاد نہیں تھے ہاں ماں تو ایک تھی مگر ان دونوں کے لیے چند سالوں میں ہی وہ کس قدر اہم ہوگیا تھا۔

جبکہ لاہور میں شہریار انصاری کے بچوں ثنا اور شیبا سے اس کی کبھی نہ بن سکی۔ کچھ وہ بھی ان سب کو دل سے قبول نہیں کر سکا تھا۔ صرف عینی ہی تھی جو سگے، سوتیلے کا فرق مٹاتے ہوئے اس کے سر پر سوار رہا کرتی تھی۔ اس کی ہی ذاتی کاوشوں کی بدولت زاویار اور اس کے بیچ کی دیوار گری تھی۔ نہ وہ شیبا اور ثنا کی سنتی تھی نہ بیگم شہریار کی۔ باقی کزنز بھی اس سے کافی چھوٹی تھیں۔ سوائے شہرین اور خولہ کے۔ جن کے ساتھ اس کا بچپن گزرا تھا۔

مگر مہران اور مومنہ سے رحمی رشتہ تھا۔ جبھی وہ دونوں اس کے درشت رویّے کے باوجود جلد ہی اس کے نزدیک آگئے تھے۔ خاص طور پر مومنہ۔

''میں تم لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ محض اسٹڈی کی خاطر کچھ سال یہاں سے دور رہنا ہوگا۔ پھر واپس یہیں آؤں گا۔'' مومنہ سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ اور بھی نرم پڑ گیا۔ مومنہ لاجواب سی ہوگئی۔ جبکہ مہران نے سوال کیا۔

''کون سی یونیورسٹی میں اپلائی کرنے کا ارادہ ہے آپ کا۔''

''Vale اور Princeton دونوں ہی میری Priority ہیں۔'' اس نے قصداً یہ بتانے سے احتراز کیا کہ وہ ایسا کر چکا ہے۔ ان لائنز پر وہ کافی دنوں سے کام کر رہا تھا۔

''جانا کب تک ہوگا؟'' عاصمہ کے لہجے میں اداسی اترنے لگی تھی۔

''ابھی تھوڑا وقت ہے اس میں مگر اس سے پہلے میں کچھ دن آغا جان کی طرف گزارنے والا ہوں۔ وہ بہت مصر ہیں اور پاپا بھی۔'' اس بار ذرا نظر چراتے ہوئے اس نے کہا۔ تو ایک بار پھر ٹیبل پر خاموشی چھا گئی۔ پہلے

دھماکے سے زیادہ زوردار دھماکا تھا یہ۔

زاویار اور لاہور، آغا جان کے پاس جانے کے لیے مان جائے۔ یہ بات تو گویا امکان میں رہی تھی نہ ہی کسی کے سان وگمان میں۔

"are you sure bro? آپ واقعی وہاں جانے والے ہو۔ patch up ہو گیا اپنے پاپا سے آپ کا؟" مہران نے تحیر کو الفاظ دیے تھے۔

"آغا جان کافی بیمار رہنے لگے ہیں۔ جس کی وجہ سے صنوبر پھوپی اور اقرار چچا نے بہت بار بلایا ہے مجھے۔ میمونہ پھوپی بھی لاہور جا چکی ہیں۔ کیا کروں فیملی پریشر کو بھلا کہاں تک resist کیا جا سکتا ہے۔" اس نے مہران کے اصل سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے عذر تراشا۔ عاصمہ نے قدرے حیرت سے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں حیرانی سمیت تفکر تھا۔

زاویار کی زبان سے یہ الفاظ بڑے اجنبی اور نامانوس معلوم ہو رہے تھے۔ تاہم وہ اس کے تاثرات سے کچھ پا نہیں سکیں۔ پھر کچھ دیر ان چاروں کے مابین یہی موضوع زیرِ بحث رہا۔

ان تینوں کے پاس مختلف سوالات تھے مگر وہ ان سب کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ لہٰذا خلافِ معمول وخلافِ مزاج رسانیت سے جواب دیتا رہا۔ یہاں تک کہ بظاہر تینوں ہی مطمئن ہو گئے۔

اب یہ الگ بات کہ عاصمہ ظاہراً مسکراتے ہوئے بھی دل ہی دل میں بے حد اداس تھیں۔ مگر زاویار کے مزاج کے مطابق انہوں نے یہی درست سمجھا کہ اسے خوشی خوشی جانے دیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ایک بار پھر اسے کھو دیں۔ اور یہ ایک ایسی مخفی بلیک میلنگ تھی۔ جس نے اُدھر آغا جان کو اور اِدھر عاصمہ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ زاویار انصاری کے مطالبے کو مان لیں۔

"یا اللہ پتا نہیں...... اس بار زوی نے دل میں کیا ٹھانی ہے۔ اے پروردگار اس کو اپنی حفظ وامان میں رکھ اور حکمت عطا فرما۔" ماں کا اداس دل چپکے چپکے اپنے رب سے مناجات کر رہا تھا۔ جبکہ بظاہر وہ مسکرا کر اس کی پلاننگ سن رہی تھیں جو مومنہ کے پوچھنے پر وہ ان سب سے شیئر کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

اس کی آنکھ کھلی تو یک دم نامانوس سے شور کی آوازیں سماعت کا حصہ بنیں۔ چند ثانیے جیسے اسے سمجھ نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ نیچے لاؤنج سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ دادی بھی بستر پر نہیں تھیں۔ وہ بنا چپل کے ہی نیچے کی طرف چل دی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا دل "سب خیر ہو یا اللہ" کا ورد کر رہا تھا۔ آخری اسٹیپ پر پہنچ کر اس کے قدم رک گئے۔

لاؤنج میں ردا، مظفر صاحب کے گلے لگی زار و قطار رو رہی تھی۔ سائرہ بیگم اور دادی بھی آبدیدہ سی اس کے پاس کھڑی تھیں۔

دُرِ مکنون متوحش سی ان سب کو دیکھنے لگی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر ہوا کیا ہے۔

"ریلیکس ردا...... ریلیکس۔ میں دیکھتا ہوں آصف کو وہ یہیں کہیں ہوگا۔" مظفر صاحب بلکتی ہوئی بیٹی کو تھپکتے ہوئے از حد فکرمند تھے۔ تاہم اسے تسلی دیتے ہوئے انہوں نے اپنے لہجے کو مستحکم بنایا ہوا تھا۔

"کہیں کھویا نہیں ہے پاپا۔ وہ چلا گیا ہے۔ آصف مجھے چھوڑ گیا ہے۔ یہ دیکھیں یہ کیا لکھا ہے اس نے۔" ردا نے ان سے الگ ہوتے ہوئے ایک صفحہ ان کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تو وہ ششدر رہ گئے۔ تفکر سے بیوی کی طرف دیکھا۔ جو لب بھینچے آنکھوں سے بہتی نمی کو صاف کر رہی تھیں۔ ان کی خاموشی گواہ تھی کہ ردا ٹھیک کہہ رہی ہے۔

دُرِ مکنون کے پاؤں تلے جیسے زمین ہی نکل گئی۔ وہ خوفزدہ سی سب کی شکلیں ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔
مظفر صاحب نے صفحہ ردا کے ہاتھ سے لے کر پڑھا تو جیسے ڈھ سے گئے۔
''وہ ایسا کیسے کرسکتا ہے؟'' دکھ بھری حیرت نے انہیں جکڑ لیا تھا۔
''وہ ایسا کرسکتا ہے نہیں مظفر۔ وہ ایسا کر چکا ہے۔ وہ چلا گیا ہے ہماری بیٹی۔ اپنی نکاحی بیوی کو چھوڑ کر۔'' سائرہ یکدم غصے سے بولی تھیں۔
ردا بے اختیار ان کے گلے لگ کر رو پڑی تو ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔
''صبر میری جان صبر۔ ٹھیک ہو جائے گا سب۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔ چاہے جہاں بھی ہو وہ۔'' انہوں نے بیٹی کو گلے سے لگا لیا تھا۔
دادی ہکا بکا کبھی پوتی کے سر پر ہاتھ پھیرتیں تو کبھی صوفے پر تھکے، تھکے انداز میں بیٹھے بیٹے کے کندھے کو تھپکتیں۔
دُرِ مکنون کو لگا جیسے زمین نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا ہے۔ وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ سارے دکھ ساری تکلیفیں اپنی جگہ۔ اسے میمی خالہ کی آنکھوں سے نکلتے آنسو درد پہنچا رہے تھے۔ اس کا دل چاہا وہ آگے بڑھ کر ان کے آنسو اپنی پوروں پر چن لے مگر وہ یہ سب کرنے کی جرأت نہیں کر سکی۔
اس دوران عکرمہ بھی نیچے چلا آیا تھا۔ سیڑھیوں پر بت بنی دُرِ مکنون کی طرف دیکھا تو احساس ہوا۔ معاملہ سنگین ہے۔ وہ تیزی سے دادی اور چچا کی طرف آیا تھا۔
ردا کی سسکیاں وقفے، وقفے سے گونج رہی تھیں۔
''کیا ہوا ہے؟ سب خیریت تو ہے؟'' تشویش سے استفسار کیا۔
''نہیں بیٹا۔ خیریت نہیں ہے۔'' دادی یک دم رو پڑیں۔
''بھائی اور بھابی کہاں ہیں۔ وہ سب ٹھیک تو ہیں؟''
عبید اور سدرہ کل شام ہی بچوں سمیت دو ایک دن کے لیے اسلام آباد گئے تھے۔ اس کا پہلا دھیان ان سب کی طرف ہی گیا۔
''وہ سب الحمدللہ خیریت سے ہیں عکرمہ۔ آصف گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''
سائرہ نے ماں اور بیٹے کو نڈھال دیکھ کر جواب دیا تو عکرمہ بحرِ تحیر میں ڈوب گیا۔
''چلا گیا؟ کیا مطلب چلا گیا۔ اور کہاں چلا گیا وہ۔ ردا تم سے کچھ کہا تھا کیا...... اس نے بتایا تھا اپنے جانے کا؟'' عکرمہ کو اپنے اعصاب چٹختے ہوئے محسوس ہوئے۔ بلا ارادہ ردا سے استفسار کیا تو ردا ماں کے سینے سے الگ ہوئی۔
''نہیں...... عکرمہ بھائی۔ آصف نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ پتا نہیں کتنے دنوں سے جانے کی تیاری کر رہا تھا وہ۔ مجھے پتا بھی نہیں لگنے دیا اس نے۔'' وہ حیرت اور دکھ سے کہہ رہی تھی۔
''کہاں گیا ہے وہ؟ اور تمہیں کیسے پتا چلا اس کے جانے کا..؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ جس پر مظفر صاحب نے آصف کا مختصر سا خط اس کے سامنے کر دیا۔ جس میں آصف نے مختصراً اپنے جانے کا ذکر کیا تھا لیکن وہ کہاں جا رہا ہے اور کب واپس آئے گا اس بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا اس نے۔
عکرمہ نے گہری سانس بھر کر خط واپس تہ کر دیا۔ پھر ردا کی طرف دیکھا۔
''پریشان مت ہو ردا۔ آجائے گا وہ۔ میں پتا کرتا ہوں۔'' اس کا انداز محض دلاسا دینے والا ہی نہ تھا۔ وہ بہت اعتماد سے بولا تھا۔

''کہاں پتا کرو گے عکرمہ اس کا۔ کہاں جاؤ گے تم اس کے پیچھے۔ نہ وہ اغوا ہوا ہے نہ راستہ بھولا ہے۔ جو چھوڑ کر چلا جائے اسے کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے۔'' سائرہ بیگم کا لہجہ غصے اور تلملاہٹ سے بھرپور تھا۔ ردا کو دوبارہ سے اپنے نزدیک کرتے ہوئے وہ پھنکاری تھیں۔ جس پر وہاں موجود ہر شخص لب بستہ رہ گیا۔

انہوں نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ راستہ بھٹکے کو راہ سجھائی جا سکتی ہے مگر جو دانستہ کھو جائے اسے بھلا کس طرح واپس لایا جا سکتا ہے۔

مگر یہ صاف گوئی ردا کے دل کے تاروں کو چھیڑ گئی تھی۔

یک دم وہ ماں سے ہاتھ چھڑا کر کمرے کی طرف دوڑی تو مظفر صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''ردا، ردا...... میری جان، بات سنو میری۔'' سائرہ بیٹی کی طرف لپکیں لیکن اس سے پہلے ہی ردا کمرے میں جا کر دروازہ لاک کر چکی تھی۔

پھر انہوں نے کئی بار دستک دی مگر جواب ندارد۔ اس کی سسکیوں کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

ان کی پیہم کوشش کے باوجود دروازہ نہیں کھلا تھا۔ تنگ آ کر وہ پلٹیں۔ شومئی قسمت کہ دُرِ مکنون، مظفر صاحب کے پاس افسردہ سی کھڑی ان کی نگاہ کا مرکز بنی۔ ان کی رگوں میں جیسے شرارے دوڑ گئے۔ یک دم وہ اس پر جھپٹیں۔ یوں لگا جیسے ان کا سارا اشتعال دُرِ مکنون کی طرف منتقل ہو گیا ہو۔

''یہ ہے وہ منحوس وجود۔ جس کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔ جب سے یہ میرے گھر میں آئی ہے۔ میرے گھر کی ہر خوشی کو کھا گئی یہ۔ جیسے اس کی ماں نے میرا گھر بسنے سے پہلے اجاڑا تھا۔ یہ بسنے کے بعد اجاڑ رہی ہے۔ میں اسے فنا کر دوں گی۔'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دُرِ مکنون کا ماس ادھیڑ کر رکھ دیتیں۔

یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ لاؤنج میں موجود مظفر صاحب، اماں اور عکرمہ چند سیکنڈز کے لیے تو انہیں دیکھتے ہی رہ گئے۔

یک دم عکرمہ نے آگے بڑھ کر ان کو روکنے کی کوشش کی۔

''چچی جان پلیز۔ چھوڑیے دُرِ مکنون کو۔ یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔''

''کیا کر رہی ہوں میں۔ یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ اس سبز قدم نے میرے گھر کا سکون تباہ کر دیا ہے اور تم مجھے کہہ رہے ہو کہ میں اسے چھوڑ دوں۔''

دُرِ مکنون ''کاٹو تو بدن میں لہو نہیں'' کے مصداق بس یک ٹک انہیں دیکھ رہی تھی۔ جو اس کے بازوؤں کو دونوں ہاتھوں میں دبوچے بری طرح جھنجوڑ رہی تھیں۔ اس کے اعصاب اس وقت کچھ ایسے منجمد ہو گئے تھے کہ اس نے خود کو چھڑانے کی قطعاً کوشش نہیں کی تھی۔

''چچی جان you are hurting her۔thats enough پلیز جسٹ لیو ہر۔'' عکرمہ جھلا گیا تھا۔

''سائرہ چھوڑو اسے۔'' مظفر صاحب جیسے کسی بھیانک خواب سے جاگے۔ آگے بڑھ کر بیوی کے ہاتھوں سے دُرِ مکنون کو چھڑانے کی کوشش کی۔

''کیوں چھوڑوں اسے۔ اس نے میرے گھر کی ہر خوشی برباد کر دی ہے۔ نحوست ہے اس کے وجود میں۔ اپنے ماں باپ کو کھا گئی اور اب میرا گھر تباہ کر رہی ہے۔ آخر یہ مر کیوں نہیں جاتی۔''

مظفر صاحب کے مردانہ ہاتھوں کے آگے وہ پھڑ پھڑا کر رہ گئی تھیں۔ انگلیوں کی گرفت لامحالہ دُرِ مکنون کے بازوؤں پر ڈھیلی پڑ گئی۔ جسے دادی نے کسی سرعت سے آگے بڑھ کر سنبھال لیا تھا۔

''بکواس بند کرو سائرہ۔ ہوش میں آؤ۔ کیا کر رہی ہو تم؟''

مظفر صاحب کا ذہن اس وقت ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ ردا کے دکھ کے بعد سائرہ کی یہ جارحانہ حرکت جیسے ان

کے حواس مختل کر گئی تھی۔
''بس کرو سائرہ بیٹا۔ مت نکالو منہ سے ایسے الفاظ۔'' دادی جیسے تڑپ سی گئیں۔ جس پر سائرہ کے منہ سے مزید برے الفاظ نکلنے لگے تھے۔
عکرمہ نے تشویش سے دُرِّمکنون کی طرف دیکھا۔ جس کے پتھرائے ہوئے چہرے پر آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔
''دادی آپ دُرِّمکنون کو یہاں سے لے جائیں پلیز۔ میں چچی جان کو دیکھتا ہوں۔'' اس نے دادی سے درخواست کی پھر دُرِّمکنون کی طرف مڑا۔
''ریلیکس، بی ایزی۔ چچی جان ابھی اپنے حواسوں میں نہیں ہیں۔ آپ ان کی کوئی بات بھی دل پر نہ لیں اور فی الحال دادی کے ساتھ اوپر جائیں۔ شاباش!'' دُرِّمکنون کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ بہت متفکر ہو چلا تھا۔ جس نے اس کی بات یوں سنی جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو۔ تاہم دادی اسے کندھے سے تھام کر اوپر لے گئیں۔
سائرہ بیگم اب غصے سے چلّانے لگی تھیں۔ وہ چیخ، چیخ کر اسے برا بھلا کہے جا رہی تھیں۔ ہنگامہ زیادہ بڑھا تو ردا اور سیف کمروں سے گھبرا کر نکل آئے۔ ردا اپنا غم بھول کر ماں کی طرف بڑھی تھی۔ جو شوہر کے بازو جھٹک کر خود کو آزاد کرا چکی تھیں۔
''ممی۔ پلیز یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ سب جو میرے ساتھ ہوا۔ اس میں دُرِّمکنون کا کیا قصور ہے۔ آپ اسے کیوں کوس رہی ہیں؟'' اپنی پوسٹ گریجویٹ ماڈرن ماں کا یہ روپ درحقیقت اسے دہلا گیا تھا۔
''اسے نہیں تو کسے کہوں برا بھلا تمہیں؟'' انہوں نے یک دم بے حد غصے سے اسے بھی لتاڑا۔
''یا اس احسان فراموش آصف کو۔ جو تمہاری، ہماری، ہم سب کی محبت اور خدمتوں کو ٹھوکر مار کر چلا گیا ہے۔ یا تمہارے پاپا کو جنہوں نے اس منحوس لڑکی کو میرے سر پر لا کر بٹھا دیا ہے۔ آخر کیے دوں میں الزام کسے۔'' سائرہ ہسٹرک ہو کر یک دم رونے لگی تھیں۔ اس دوران اصغری ان کے لیے پانی لے آئی تھی۔
عکرمہ نے تشویش اور ترحم سے انہیں دیکھا اور پھر موبائل پر اپنے فیملی ڈاکٹر کا نمبر ملا کر ان سے بات کی۔ اور فون بند کر دیا۔ بظاہر وہ خاموش تھا۔ مگر اس کے اندر جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔ سائرہ بیگم کا رویہ دُرِّمکنون کے کمزور اعصاب پر کس طرح انداز ہوگا، اس کا اسے اندازہ تھا۔ اور درحقیقت وہ اندر سے خوفزدہ بھی ہو گیا تھا۔ دوسری طرف اس کا ذہن آصف کے اچانک چلے جانے سے الگ متفکر تھا۔
''آخر وہ کہاں جا سکتا ہے؟''
مظفر صاحب' سیف اور ردا کو دیکھ کر اسے ازحد پریشانی محسوس ہو رہی تھی مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔
''ریلیکس۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈونٹ وری۔''
یک دم اسے احساس ہوا۔ چچا جان کے پاس کھڑا سیف بہت متوحش لگ رہا ہے۔ اس نے اس کے کندھے پر بازو پھیلا کر اسے خود سے قریب کر لیا تھا۔
''کیا واقعی سب ٹھیک ہو جائے گا؟'' ردا نے اس کے کہنے پر بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں جیسے یہ سوال درج تھا۔
عکرمہ نے بے بسی سے نظر چرا لی۔ درحقیقت اس وقت وہ خود سے بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا۔
اچانک جیسے پورا گھر طوفان کی زد میں آ گیا تھا۔ ایسے طوفان کی زد میں جس کے اثر سے کوئی بھی خود کو بچا نہیں سکا تھا۔
(جاری ہے)

''میرا کوئی ارادہ نہیں ہے سنبل کی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کا۔ مجھے مجبور نہ ہی کریں تو بہتر ہوگا۔'' سارہ نے بے بسی سے اپنی ماں، تانیہ بیگم سے درخواست کی۔

''لو بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ سارا خاندان اکٹھا ہوگا' لوگ سو طرح کے سوال کریں گے ہم کس، کس کا منہ بند کریں گے' اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم اپنی تیاری رکھو، ندامد کرواؤ بہن کی...... پرسوں صبح ناشتے کے بعد روانگی ہے۔'' تانیہ تو یہ کہہ کر آرام سے کمرے سے باہر نکل گئیں مگر سارہ کو سوچوں کے گرداب میں الجھا دیا۔

وہ جانتی تھی کہ وہ اب لاکھ جتن کرلے اماں اپنا حکم منوا کر ہی رہیں گی کچھ عرصہ قبل کوئی بھی اسے ساتھ چلنے کی پیشکش کرتا تو وہ ہرگز بھی مسترد نہ کرتی' اچھلتی کودتی تیاری کرتی مگر اب تو جیسے اس کا دل مرجھا سا گیا تھا۔ اس کا تو سرے سے گھر سے باہر نکلنے کا ہی دل نہیں کرتا تھا۔ ہجوم بیکراں میں بھانت، بھانت کے چہرے لیے اور مختلف چہروں پر رقص کرتی استہزائیہ مسکراہٹ...... وہ بھی تو ٹوٹ کر بکھری تھی اور اس کے اس اندرونی خلفشار اور اضطراب کی وجہ اب کسی سے بھی تو ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

''میں سوچ رہی تھی کہ اب عادل کے لیے عطیہ کو ہاں کر ہی دوں...... وہ بار، بار سوال دراز کرتی ہے لیکن عادل اپنی سارہ کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے' ویسے تو میں اس رشتے کے حق میں نہیں تھی مگر اب جب سے سلیم کی

شادی کی ہے سوچتی ہوں کہ میں نے سراسر غلطی کر دی، بہن کی بیٹی یہ سوچ کر لائی تھی کہ عزت کرے گی مگر سلیم تو اب بیوی کی زبان ہی بولنے لگا ہے ایسے میں اگر سارہ اپنے گھر کی ہو جائے گی تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ میری پریشانی کم ہو جائے گی اب آپ برا نہ مانیں تو بتا دیں ویسے بھی ایک تو اپنی طرف رشتہ کر کے انجام دیکھ ہی چکی ہوں۔ اب سارہ کا آپ کی طرف رشتہ طے کر دینا چاہتی ہوں۔'' ان کی بات پر طارق صاحب نے پُرسوچ انداز میں بیگم کی طرف دیکھا۔

''میں نے کبھی بچوں کے مستقبل کے بارے میں تم کو پابند نہیں کیا' اس میں بھی سلیم کی خوشی تھی میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا... اور اب اگر عادل، سارہ کا خواہش مند ہے تو کوئی بات نہیں بلکہ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے کہ اپنی سارہ کو اگلے گھر چاہت سے لے جایا جائے۔ میں نے پہلے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور اب بھی میری طرف سے کوئی عذر نہیں' ہاں ایک اور بات اس معاملے میں ماؤں کے فرائض میں شامل ہے کہ ایک مرتبہ بیٹی سے شادی کے معاملے میں رضا مندی بھی ضرور معلوم کر لینی چاہیے...... اس لیے تم موقع دیکھ کر سارہ سے پہلے پوچھ لو اور اگر سارہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو پھر ان لوگوں کو ہاں کر دو...... بے شک عطیہ میری کزن ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ سارے معاملات تم خود طے کرو...... رشتے داری کی بنا پر میں کسی قسم کی کوئی بھی ڈھیل نہیں دینا چاہتا ہوں۔'' طارق صاحب کی ہاں کے بعد ثانیہ بیگم نے سارہ سے بات کی تھی۔

''دیکھو سارہ میں نے اس وقت تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ میں تم سے عادل کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں' تم جانتی ہو کہ تمہاری بھابی کے مزاج کیسے ہیں اور اب جبکہ وہ اس خاندان کو وارث دینے جا رہی ہے اس کے مزاج تو ملتے ہی نہیں، ہم یہ سب مجبوراً سہہ رہے ہیں کیونکہ ابھی ہم نے تمہارا اور ندا کا بھی فرض ادا کرنا ہے، ایک بار یہ فرض ادا ہو جائیں تو دل کو سکون مل جائے گا۔ اس لیے اب میں نے اور تمہارے ابا نے عادل کو تمہارے لیے پسند کیا ہے۔ ایک مرتبہ تم بھی اپنی رائے دے دو تا کہ کومل کے میکے سے آنے سے پہلے، پہلے ہی بات رسماً پکی کر کے منگنی کر دی جائے۔ تم جانتی ہو کومل کی عادت کو وہ ضرور اس میں بھی کوئی خلل ڈالنے کی کوشش کرے گی اور میں اب اسے ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی۔'' ان کے پوچھنے پر وہ سر جھکا کر مدھم سا مسکرائی تھی یعنی اسے بھی عادل پسند تھا۔

''محبت کے اڑن کھٹولے میں قدم رکھتے ہی زندگی کس قدر حسین ہو گئی تھی عادل کے نام کی انگوٹھی اس کی مخروطی انگلی میں جگمگانے لگی اور عادل کا گہرا نقش اس کے قلب و جاں میں جاگزیں ہوا تو محبت کے رنگین خواب دونوں کی آنکھوں میں چمکنے لگے تھے۔ محبت کے انوکھے رنگ اب چہرے پر تمازت بن کر چھا رہے تھے۔ عادل اور سارہ دونوں بے حد خوش تھے مگر جب کومل ماں کے گھر سے لوٹی تو اس کا موڈ ایک دم سے ہی خراب ہو گیا تھا۔

''تمہارے والدین مجھے دل سے قبول ہی نہیں کر سکتے اسی لیے تو اپنی ہر خوشی مجھ سے چھپانے میں ماہر ہیں، کیا میرے ہوتے یہ منگنی نہیں ہو سکتی تھی، کیا میں کوئی دخل اندازی کرتی' ارے میں بھی کھلے دل سے اس میں شریک ہوتی مگر آنٹی کے دل میں میرے لیے پتا نہیں کیوں اتنا کھوٹ ہے، اوپری دل سے بیٹی کہنے اور بیٹی سمجھنے میں زمین' آسمان کا فرق ہوتا ہے اور ان کے اس اقدام کے بعد میرا دل ہی ان کی جانب سے کھٹا ہو گیا ہے۔ مجھے اب اس کی شادی میں بھی شرکت کے لیے مت کہنا...... نہ ہی مجھے اس عادل کی آمد پر اس کی خاطر داری کے لیے بلاوا دیا جائے۔ ویسے مجھے تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے ورنہ اس قدر خاموشی اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی' لوگ تو خوشیوں کو بانٹتے ہیں مگر یہاں تو......'' اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بولی۔ یوں بھی ہر وقت بات بے بات سارہ کے کھلکھلاتے لب کومل کے لیے ناقابلِ برداشت تھے بعض اوقات کچھ لوگ از خود دشمنی اور عناد دل میں پال لیتے ہیں۔ کومل بھی ان میں سے ہی

تھی۔ آہستہ، آہستہ عادل کی آمد کومل کو کھٹکنے لگی تھی۔ ایک دن تو اس نے حد ہی کر دی۔

''آنٹی آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہنا چاہتی ہوں' عادل کی اس قدر آمد و رفت کسی طور بھی مناسب نہیں، بہتر ہوگا کہ شادی سے قبل ایک خاص حد تک فاصلے کو برقرار رکھا جائے۔'' کومل نے کہا تو تانیہ بیگم دھیمی مسکان لیے مسکرائیں۔

''بیٹا..... تمہاری بات بالکل درست ہے مگر عادل کوئی غیر نہیں، یہ اس کے ماموں کا گھر ہے۔ اس کا آنا تم ہی زیادہ محسوس کرتی ہو ورنہ وہ صرف ویک اینڈ پر ہی آتا ہے اور وہ بھی گھڑی دو گھڑی میرے سامنے ہی بیٹھ کر واپس چلا جاتا ہے۔ میرے خیال سے اس میں ایسی کوئی معیوب بات نہیں' وہ پہلے بھی اسی طرح خلوص سے آتا تھا۔ اب یوں اچانک میں اس پر پابندی عائد نہیں کر سکتی۔'' ساس کی بات اسے سخت ناگوار گزری اسی لیے بالکل ہی چپ ہو گئی مگر دل میں گہرا عناد پال لیا تھا۔

☆☆☆

عادل نے اچانک ہی ویزا لگنے اور بیرون ملک جانے کی جاں گسل اطلاع دی تھی سب ہی ایک دم سے محو حیرت تھے، خود سارہ کا رو، رو کر برا حال تھا اس نے تو سوچا تھا کہ اب وہ بہت جلد ہی عادل کی زندگی میں رنگ بھرنے اس کے آنگن میں قدم رکھ دے گی مگر عادل کے تو ارادے ہی اور تھے۔ بیرون ملک جانا اس کا دیرینہ خواب تھا، اس خواب کی تعبیر پانے کے لیے اس نے سارہ کی گریہ وزاری کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔ عطیہ نے بھی اس نازک موقع پر اپنے بیٹے کا ہی ساتھ دیا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔

''بھابی اگر ہمارے حالات اچھے ہوں گے تو پھر اس کے مثبت نتائج آپ کی بچی کے ہی مستقبل پر پڑیں گے، وہ ہی ایک خوشگوار زندگی بسر کرے گی۔ چند ماہ کی تو بات ہے پھر تو سب پہلے جیسا ہوگا۔'' عطیہ کی بات کے بعد کسی قسم کی بحث کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی تھی پھر عادل چلا گیا۔ اسے روتا، کرلاتا چھوڑ کر اور یہ چند ماہ' سالوں پر محیط ہوتے چلے گئے اور ہر سال واپس آنے کا وعدہ کر کے وہ ٹال جاتا۔

تین سالوں میں ہی عطیہ نے بہت خوب صورت بنگلا بنا لیا تھا، چھوٹی بیٹی فری کی شادی ہو گئی تھی مگر عادل نہیں آیا۔ اپنی بہن کی شادی میں شرکت سے بھی ضروری تھا کہ وہ بیش قیمت تحائف ارسال کر دے۔ کومل کی تضحیک آمیز نظریں اب سارہ کے دل پر پڑنے لگی تھیں' شروع میں عادل اکثر سارہ کو فون کیا کرتا مگر پھر رفتہ، رفتہ اس میں بھی کمی آ گئی تھی۔

سنبل (تایا زاد بہن) کی شادی میں کم و بیش سارا خاندان ہی شریک تھا۔ ندا سارہ کے ساتھ لگی بیٹھی تھی کومل ہر کسی سے مل رہی تھی ننھا شانی بھی اس کے ساتھ ہی لپٹا ہوا تھا' تھکان کے باوجود عرصے کے بعد سب سے مل کر تروتازگی کا احساس اجاگر ہو رہا تھا صرف سارہ حزن و ملال لیے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔

''ماشاء اللہ ندا کی کہیں بات چل رہی ہے کیا بہت نکھر گئی ہے۔'' آصفہ تائی نے ندا پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا تو تانیہ بیگم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

''ہم جب تک بڑی بچی کے فرض سے سبکدوش نہیں ہو جاتے چھوٹی کے لیے کیسے سوچ سکتے ہیں۔''

''اے لو یہ بھی خوب کہی تم نے اب کیا بڑی کے چکر میں چھوٹی کو بھی بٹھائے رکھو گی، کچھ عقل سے کام لو مجھے ندا اپنے سلمان کے لیے بہت پسند آئی ہے۔ اب تم ہاں کر دو اور اگلے ماہ رخصتی بھی دے دو، بھئی یہ نصیبوں کی بات ہوتی ہے کسی کا جلد نصیب کھل جاتا ہے اور کسی کے نصیب کی گرہیں کھلتے، کھلتے بالوں میں چاندی اتر آتی ہے، مجرم تم ہی قرار پاؤ گی' ارے میں تو کہتی ہوں کہ اس بڑی کا بھی کہیں اور دیکھنا شروع کر دو رشتہ، کیا معلوم ان لوگوں کی نیت میں ہی فتور آ گیا ہو۔'' ان کی بات میں واقعی وزن تھا۔

''بہن اب مزید انتظار ممکن نہیں ہے آپ عادل سے کہیں کہ واپس آ جائے اور بے شک شادی کے بعد واپس چلا جائے مگر اب ہم کب تک سارہ کو یونہی گھر

بٹھا کر رکھیں گے۔" تانیہ بیگم نے کھل کر ان سے بات کی اور عطیہ کو بے حد گراں گزری تھی اس لیے قدرے رکھائی سے بولیں۔

"ذرا تو صبر کریں فون آیا ہے عادل۔ آ رہا ہے چند دنوں میں۔" تانیہ بیگم کے دل میں سکون سا اتر آیا اگر ایسا ہو جاتا تو وہ دونوں بیٹیوں کے فرائض سے ایک ساتھ سبکدوش ہو سکتی تھیں۔

☆☆☆

"ایک کپ چائے مل جائے گی کیا؟" شازل نے کچن میں برتن دھونے کے بعد انہیں خشک کرتی سارہ سے پوچھا تو سارہ ایک دم چونکی۔

"جی کیوں نہیں، میں ابھی بنا دیتی ہوں۔" شازل (آصفہ تائی کا بھانجا) کو اس لڑکی سے بہت ہمدردی تھی۔ ساری شادی میں یہ لڑکی سب کی گفتگو کا محور اور چسکے کا ذریعہ بنی رہی تھی، ہر کسی کو اس کے مستقبل کی ٹوہ لگی ہوئی تھی۔ شازل نے کئی مرتبہ سارہ کو بھیگی پلکوں کے ساتھ سر جھکائے لگاتار کام کرتے دیکھا تھا۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ بن چکا ہے کہ لوگ احساس سے عاری ہو کر کسی بھی لڑکی کی شادی کے مسئلے کو لے کر بلا تکان دل کی بات کہہ جاتے ہیں، یہ جانے بنا کہ اس لڑکی کے شیشۂ دل پر لگی ذرا سی ٹھیس کیسے اسے بے مایہ کر جاتی ہے۔ شازل کرسی پر بیٹھا سارہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا جب اس نے اس کے سامنے چائے کا کپ رکھا۔ وہ پلٹ کر جانے ہی لگی تھی جبکہ شازل نے اسے پکارا۔

"سنو خوش رہا کرو، دنیا کا تو کام ہی یہی ہے، دل شکنی اور دل آزاری جیسے وار کرتی رہتی ہے۔" شازل کی بات پر سارہ کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ، ساتھ اضطراب بھی سمٹ آیا۔ وہ بنا کچھ کہے پلٹ گئی تھی۔

اور پھر ندا اور سلمان کی منگنی کر دی گئی۔ سارہ بہن کے لیے بہت خوش تھی مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ منگنی کے بعد ندا کے رنگ ڈھنگ بالکل بدل گئے تھے۔ ایک عجیب سا تفاخر اس کے چہرے پر مسکراہٹ بن کر چھلکنے لگا تھا، بات بے بات کھلکھلاتے لب بسا اوقات زہر بھی اگلنے لگتے۔ سارہ چھوٹی بہن کی دل شکنی والی بات بھی ہنس کر سہہ جاتی، اسے معلوم تھا کہ گھر میں بھاوج بھی موجود ہے جو مزید فساد پھیلانے کی کوشش کر سکتی ہے اس لیے پہلے قدم پر ہی صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتی رہی تھی۔

☆☆☆

کل کی فلائٹ سے عادل پاکستان واپس لوٹ رہا تھا۔ اسی خوشی میں سب خاندان کو مدعو کیا گیا تھا دل میں میٹھی سی کسک لیے وہ بھی محوِ انتظار تھی۔

"اے بہن کچھ دن بعد رکھ دیتیں یہ دعوت ابھی بچہ تھکا ہوا آئے گا۔" طاہرہ آپا نے کہا۔

"آپ کی بات ٹھیک ہے مگر اس کی ہی ضد تھی کہ سب کے لیے کوئی سرپرائز ہے سو مائیں تو وہی کرتی ہیں جو اولاد کہے۔" عطیہ بیگم بے حد خوش تھیں۔

پھر عادل کی آمد بھی ہو ہی گئی، دعوت میں سب ہی مدعو تھے۔ سارہ کا دل عادل کو دیکھ کر تیزی سے دھڑکنے لگا مگر اس کے پہلو میں انجان لڑکی کو دیکھ کر دھڑکن مدھم ہو کر بند سی ہونے لگی تھی، وہ کس قدر قریب تھی عادل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔

"میٹ مائی وائف پریشہ......" وہ سب سے ہی مخاطب تھا مگر عطیہ کو جیسے پہلے سے ہی معلوم تھا تبھی لپک کر بہو کو گلے سے لگایا۔

"ماشاء اللہ چشم بد دور؟" پریشہ محبت کے اس مظاہرے پر کسمسا سی گئی تھی۔

"یہ کون ہے؟" تانیہ بیگم نے بے یقینی سے پوچھا، انہیں اپنی ہی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی ایک لمحے کو دل چاہا کہ جواب ان کے حسبِ منشا ہو مگر ایسا نہیں ہوا۔ زندگی میں سب ہمارے منشا کے مطابق نہیں ہوتا بعض اوقات صبر کے گھونٹ کو امرت سمجھ کر پینا ہی پڑتا ہے۔

"یہ میری بہو ہے پریشے اور سارے خاندان کو مدعو کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ سب جان لیں کہ آج سے پریشے ہماری بہو ہے، میں کس، کس کو وضاحت دیتی، میرے بیٹے کی پسند اور خوشی ہی میری خواہش ہے،

بیٹا پری تم اب کمرے میں جا کر آرام کرو سفر کی تھکاوٹ ہوگئی ہوگی۔ میں مہمانوں کو کھانا کھلا کر رخصت کردوں پہلے۔'' عطیہ کی بات پر چہار سو چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ سب کو عطیہ سے اس رویے کی امید نہیں تھی مگر روپیہ انسان کو متکبر بنا دیتا ہے وہ اچھے برے کی تمیز سے عاری ہو جاتا ہے، وہ رشتے داری بھول جاتا ہے۔ اور انسانوں کو لگتا ہے کہ وہ روپے سے ہر شے اپنی دسترس میں رکھنے پر قادر ہے۔

تانیہ کی حالت بری ہو رہی تھی وہ لہرا کر زمین بوس ہوگئی تھیں۔ اس وقت طارق صاحب بھی ساتھ نہیں تھے کیونکہ انہیں کوئی آفس کا ضروری کام تھا انہوں نے کہا تھا کہ وہ نبٹا کے بعد میں آجائیں گے۔ اب ماں کو اس حالت میں دیکھ کر سارہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا تھا شازل نے آگے بڑھ کر تانیہ بیگم کو تھام لیا تھا۔

''برسوں بعد میرا بیٹا واپس لوٹا ہے یہاں پر نحوست نہ پھیلاؤ کہیں اور جا کر بے ہوشی کے ڈرامے کرو۔'' عطیہ بیگم کی بے لگام زبان زوروں پر تھی سب ہی خاموش تھے مگر کومل چپ نہ رہی۔

''ارے واہ، اسے کہتے ہیں ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری کس طرح بے شرموں کی طرح بیٹا میم لے آیا اور مزے کی بات کہ ماں کو معلوم بھی تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو صاف بتا دیتی ناں یہاں بلا کر یہ ڈراما رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ پہلے تو تمہارا بیٹا اسی سارہ کے لیے پاگل بنا تھا اب اتنی جلدی محبت کا بھوت بھی اتر گیا اور کیا ثبوت ہے کہ کچھ عرصے کے بعد یہ پری کو کسی کے لیے نہیں چھوڑے گا ہاں البتہ دولت پاؤں کی زنجیر بن گئی تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' کومل چبا، چبا کر بول رہی تھی۔

''کچھ تو لحاظ کرو تمہاری ساس کی طبیعت خراب ہے، چلو شازل گاڑی نکالو فوراً تانیہ کو اسپتال لے کر چلو۔'' طاہرہ نے سب کو چپ کروایا۔ ندا بھی پریشان تھی جبکہ سارہ خود کو موردِ الزام ٹھہرا کر مسلسل رو رہی تھی اس کے آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے فوری طور پر تانیہ کو اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے ان کو

اداس دسمبر

دسمبر کی سرد ٹھٹھرتی رات
اور دھند میں کمٹی مٹیالی چاندنی میں
تمہاری یاد کی سرسراتی چادر
جب
میرے شانوں سے ڈھلکنے لگی
تو اس پل
کہر میں لپٹی سرد
مدھم بے لباس ہوا بھی کہنے لگی
تنہائی کی بھیگی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر
اسے اب لوٹ آنا چاہیے
درد کی جھیلیں کر کے پار
ایک ہی رستے کو تکتے رہے بار بار
اشکوں کی ندیاں بھی بہنے لگیں
سمجھا دو آ کے ہمیں
کیا یہی ہے پیار......

فصیحہ آصف خان، ملتان

فوراً ہوش میں لانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ انہیں نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔

پورے دو دن بعد تانیہ بیگم کی حالت بہتر ہوئی تھی اور وہ تشویش ناک حالت سے باہر نکل آئی تھیں مگر لبوں پر قفل پڑ گئے تھے۔ چند دن اسپتال میں رہ کر ان کو گھر لے جایا گیا اور جانے سے پہلے ایک دن وہیں اسپتال کے کاریڈور میں سارہ سے شازل نے کہا تھا۔

''میں جانتا ہوں آپ بہت بہادر ہیں زندگی امتحان بھی لیتی ہے اس لیے آنے والے مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے اگر آپ ایسا سوچیں کہ وہ شخص ہی آپ کی رفاقت کے قابل نہیں ہے تو سوچنے کا انداز جینے کا ڈھنگ بھی بدل دے گا۔''

''مگر یہ تو سراسر خود فریبی ہوگی جبکہ مجھے معلوم ہے

اس نے سب کے سامنے اقرار کر کے مجھے چھوڑا ہے، مجھے رسوائی دی ہے ایسی ذلت جس کی کالک میرے چہرے پر نقش ہوگئی ہے۔'' سارہ کا لہجہ رندھا ہوا تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہوا' میں آپ کو بہت بہادر سمجھتا تھا ایسا کیوں سوچ رہی ہیں۔'' شازل کو واقعی اس کے اس بیان سے دلی رنج پہنچا تھا۔ پھر دوبارہ ان کی اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

کومل بھابی اگرچہ اس وقت تو ان کی حمایت میں بولی تھیں مگر اب گھر آ کر اپنی زبان کے نشتر تیز کر دیے تھے۔ سارہ سب سے چھپتی پھرتی تھی' سارا دن کچن میں یا گھر کے کاموں میں مصروف رہتی، بھتیجے کے کام کرتی، گھر سنبھالتی مگر کومل بھابی خوش ہونے والوں میں سے نہیں تھیں۔ ان کے آگے سارہ کے ہزار جتن بھی بیکار تھے۔

''کیا پکا رہی ہیں؟'' ندا نے کچن میں جھانک کر پوچھا۔

''امی کے لیے پرہیزی کھانے کے ساتھ گھر والوں کے لیے دم کا قیمہ اور کوفتہ پلاؤ۔'' سارہ نے مصروف انداز میں جواب دیا۔

''سلمان کی امی آ رہی ہیں۔'' ندا نے شوخ انداز میں کہا۔

''کیسی لگ رہی ہوں شکر ہے میں سلمان کی من پسند ہوں ورنہ میرا بھی آپ جیسا حال ہوتا۔'' ندا اپنی ہی رو میں بول گئی تھی اس بات سے قطع نظر کہ بہن پر کیا گزری ہوگی۔ سارہ نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی۔

پرپل کلر میں ہم رنگ چوڑیاں اور جیولری پہنے خوشی کی تمازت لیے اس کا چہرہ گلنار تھا۔ سارہ نے فوراً سے پیشتر اپنی نگاہیں پھیر لی کہیں اسے نظر ہی نہ لگ جائے۔

''ہم اب مزید انتظار نہیں کر سکتے' مہربانی کر کے مجھے اب ندا کی رخصتی دے دیں۔'' کمرے کی فضا ایک دم سے بوجھل سی ہوگئی تھی۔ تانیہ بیگم نے ملتجی نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا۔

''جی بہتر' ندا یوں بھی آپ کی امانت ہے ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔'' طارق صاحب نے قطعیت سے کہا پھر سارہ اور کومل نے سب کا منہ میٹھا کروایا، سارہ کو دیکھ کر تانیہ بیگم کی خوشی پھیکی پڑ گئی تھی۔ ایک ماں چاہ کر بھی اپنی سب بیٹیوں کو یکساں طور پر خوشی نہیں دے سکتی، بس دعا ہی دے سکتی ہے اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں صرف ذات باری تعالٰی ہے جو انسان کے مقدر میں خوشی لفظ رقم کر سکتی ہے۔

آہستہ، آہستہ تانیہ کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ شادی کی تاریخ رکھی جا چکی تھی۔ ندا تو کسی اور ہی جہاں میں آباد تھی سلمان کی محبت نے اسے مغرور بنا دیا تھا وہ اپنے بولوں سے اکثر سارہ کو دکھی کر دیا کرتی۔ انہی دونوں سارہ کے رشتے کی نئے سرے سے کوششیں شروع کر دی گئی تھیں۔ ابھی ایک ماہ تھا کیا معلوم سارہ کی قسمت بھی کھل جاتی...... رشتے داروں سے تو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ سارہ کو اپناتے سب کے سامنے ہی سارہ کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا تھا' ہر دوسرے دن بھانت، بھانت کے چہرے رونق افروز ہوتے اور سارہ دل پر پتھر رکھ کر نمائش کے سامان کے مانند پیش ہو جاتی۔ اس کا بس چلتا تو شادی لفظ کو ہی اپنی زیست کے صفحات سے ہمیشہ کے لیے کھرچ ڈالتی۔

عادل نے تو شاید دل لگی کا سامان کیا تھا مگر ہر لڑکی کا دل کسی کورے کاغذ کے مانند ہوتا ہے' دل کے پنوں پر پہلا نام جس کا درج ہو اسی سے تمام روپہلے خواب' روپہلی کرنیں محبت کی منسوب ہو جاتی ہیں' وہ بھی راتوں کو اب بھی عادل کے نام کے آنسو بہاتی، اسے وہ لمحے بھلائے نہیں بھولے تھے جب عادل نے پری کو محبت سے تھام رکھا تھا۔

''ویسے آپی اس دسمبر میں میری تو شادی ہو چکی ہوگی' میں پیا گھر چلی جاؤں گی، آپ بھابی کی باتیں سننے کے لیے پیچھے رہ جائیں گی' بھئی دکھ بھی ہوتا ہے مگر یہی زندگی ہے، کیا کیجیے۔'' افسوس اسے کتنا تھا وہ اس کے چہرے سے عیاں تھا جہاں صرف محظوظ ہوا جا رہا تھا، یہ اس کے قریبی رشتے تھے جو خود اسے تضحیک کا نشانہ بنا رہے تھے۔

''کل مٹھائی آئی تھی عادل بھائی کے گھر سے

پری ماں بننے والی ہے۔'' سارہ جو الماری میں کپڑے رکھ رہی تھی ایک لمحے کے لیے اس کے ہاتھوں میں لرزش سی آئی مگر وہ چپ چاپ دوبارہ اپنے کام میں مصروف رہی جیسے سنا ہی نہ ہو۔ ندا جی بھر کے بدمزہ ہوئی تھی۔

☆☆☆

راہداری عبور کر کے وہ سیدھا اندر داخل ہوا تھا۔

''السلام علیکم کیسی ہیں آپ؟'' وہ سلائی مشین لیے بیٹھی تھی' اس وقت شازل کی آمد کی بالکل توقع نہیں کر رہی تھی اس لیے بری طرح چونکی۔

''امی تو بھابی کے ساتھ بازار گئی ہوئی ہیں۔ ابھی آنے والی ہوں گی، آپ بیٹھیں' میں چائے لاتی ہوں۔'' سارہ نے سادگی سے کہا۔

''جی دروازے پر ندا نے بتایا تھا۔'' تب ہی عقب سے ندا آگئی۔

''کیا بات ہے آج کیسے راستہ بھول کر آگئے آپ؟'' ندا مزے سے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ ندا کے سوال پر شازل کی نظریں سارہ کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔

''یہ تو میں آنٹی کو ہی بتاؤں گا۔'' سارہ کچن میں چلی گئی تھی۔ جلدی سے اس نے بیسن گھول کر پکوڑے تلنے شروع کر دیے۔

شازل وہ شخص تھا جس نے مشکل وقت میں ان کا ساتھ دیا تھا، ایک لحاظ سے محسن بھی تھا۔ وہ جب چائے مع لوازمات باہر آئی تو سب آچکے تھے' چائے رکھ کر کچن میں آئی اور پھر رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی تھی جب عقب سے تانیہ بیگم نے آکر اس کا ماتھا چوم لیا۔

''جگ، جگ جیو بیٹی، جانتی ہو ابھی شازل کیوں آیا تھا تمہارے لیے آیا تھا اور پرسوں جمعے کے دن تمہارا اس سے باقاعدہ نکاح ہے اور پھر ندا کے ساتھ ہی میری یہ بیٹی بھی رخصت ہو کر اپنے گھر جائے گی...... ان شاءاللہ۔'' وہ محوِ حیرت کھڑی رہی۔

''یہ دیکھو شاپر اس میں تمہارے لیے کچھ ہے جاؤ باقی کا کام ندا کر لے گی۔'' ندا جو ماں کے ساتھ ہی کچن میں آئی تھی اس کا موڈ بے حد خراب ہو گیا تھا۔

''اگلے گھر جا رہی ہو گھر گرہستی میں دلچسپی لو سارا دن بہن کچن میں لگی رہتی ہے۔'' وہ اسے سرزنش کرتے ہوئے بولیں۔

''ہاں اب تو آپ کہیں گی بس رشتہ طے ہوتے ہی آپی کو بھی نخرے آگئے ہیں۔''

''زبان کیسے ٹر، ٹر چل رہی ہے ذرا ہاتھ بھی چلا لو۔'' وہ دونوں کو باتوں میں مصروف چھوڑ کر سیدھا اپنے کمرے میں آگئی۔

شاپر کھولا تو رنگا رنگ چوڑیاں اور دیدہ زیب لباس تھا ساتھ ہی ایک لفافہ بھی۔ سارہ نے اسے چاک کیا تو اندر سے ایک خوشبو دار رقعہ برآمد ہوا۔ اس نے اس کی سطر، سطر کو اپنے قلب میں جاگزیں ہوتے محسوس کیا تھا۔

''سارہ میں سدا کا بزدل ہوں حتیٰ کہ جب تمہاری منگنی کی بابت اطلاع ملی تو بالکل خاموشی سے ایک جانب ہو گیا تھا مگر پُرخلوص دل سے دعا دی کہ تم جہاں بھی جس کے ساتھ بھی رہو خوش رہو ہمیشہ...... مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہ مقدروں کے کھیل ہوتے ہیں...... بس آج قسمت نے مجھے دوبارہ موقع دیا ہے تو میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔ اتنا عرصہ ایک جنگ لڑی ہے امی سے صرف تمہاری خاطر اور دیکھ لو اب فاتح میں ہی ٹھہرا ہوں۔ بس اس دسمبر کے آخری دن تم میری زندگی میں بہار بن کر چھا جاؤ...... نیو ائیر ساتھ منائیں گے ہم ان شاءاللہ......! محبت ہے تم سے نہ جانے کب سے۔

تمہارا شازل۔''

اس کا دل عجب ہی لے پر دھڑکنے لگا تھا' چاہے جانے کا خوش کُن احساس اسے اپنی ہی نظر میں معتبر کر گیا اور اب وہ سب کی نظروں میں معتبر ہونے جا رہی تھی۔ سچ ہے قسمتوں کے فیصلے اوپر والے کے ہاتھ میں ہی ہیں ورنہ انسان تو دوسروں کو جینے بھی نہ دے۔

❀❀❀

موسم بدل رہا تھا۔ گرمی اپنے اختتامی مراحل میں تھی۔ ہلکی، ہلکی سرد ہوا کے جھونکے سہانی شام کی خوب صورتی کو بڑھا رہے تھے۔ چار پانچ دن میں گھر کے ماحول میں کافی فرق پڑا تھا۔ دونوں کا رویہ صائمہ کے ساتھ مصالحانہ تھا۔ وہ سمجھوتا کر چکی تھیں حالات سے لیکن پھوپی رقیہ ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھیں۔ وہ بھی چپ سادھے جیسے حالات کے دھارے پر غور کر رہی تھیں۔ ان کی چپ ان دونوں کے لیے ایک طرف سکون کا باعث تھی تو دوسری طرف پریشانی کی بات بھی تھی۔

وہ بھی ایک ایسی ہی سلونی سی خوشگوار شام تھی جب انمول کے موبائل پر میسج آیا۔

''انمول کہاں ہو؟ میں واپس آ گیا ہوں۔'' یوسف کا پیغام تھا۔ مارے خوشی کے انمول کے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے۔ ایمل نے غور سے اس کے چہرے پر بکھری توس قزح دیکھی۔

''کیا ہوا...... کیا یوسف بھائی آ گئے......؟'' ایمل نے درست اندازہ لگایا۔

''ہاں، ایمل ابھی اس کا میسج آیا ہے۔'' اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''مجھے فوری طور پر تم سے ملنا ہے یوسف۔'' اس نے میسج ٹائپ کیا۔

''تھوڑا صبر کرو...... کیوں اتنی بے قرار ہو رہی ہو؟'' یوسف کا شرارت بھرا میسج آیا۔

''مجھے جلدی ہے، بہت...... بات کو سمجھو...... ابھی ملو فوراً۔'' اس نے حکم جاری کیا۔

''سوری ڈیئر...... ابھی مشکل ہے۔'' وہ اسے تڑپا رہا تھا۔

''یوسف...... میری بات کو سمجھو...... ابھی آ جاؤ یہاں...... بلکہ میں آ جاتی ہوں تمہارے پاس...... مہر آنٹی

منی ناول

میں انمول

سعدیہ رئیس

نواں اور آخری حصہ

تو ابھی نہیں آئی ناں......" اس نے جلدی، جلدی میسج لکھا۔
"مذاق کر رہا تھا یار...... میں ابھی ماموں جان کے پاس پہنچا ہوں...... پرسوں تک پہنچ جاؤں گا......۔ ان شاءاللہ۔" اس کا اگلا میسج پڑھ کر وہ تپ اٹھی۔
"تمہارا یہ مذاق کسی دن گلے آجائے گا تمہارے، مذاق کی بھی حد ہوتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ زندگی مذاق بن جائے۔" اس نے جل بھُن کر اسے لکھ دیا۔ اور پھر موبائل ہی آف کر دیا۔
"ارے کیا ہوا...... پھر لڑائی ہو گئی؟" ایمل نے پوچھا۔
"پاگل ہے وہ...... مذاق سمجھ رہا ہے زندگی کو۔" اس کی آنکھوں میں آنسو ٹھہر گئے۔
"پریشان مت ہو...... یقیناً وہ آنے والا ہے۔ اتنے دن گزر گئے تو کچھ دن اور گزر جائیں گے۔ شکر ہے کہ منگنی کا چرچا بھی ختم...... وہ سارا ڈراما بابا کی شادی کا تھا...... ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی گئی تھی۔" ایمل نے سمجھایا۔
انمول کا موڈ خراب ہو گیا۔ بہت دنوں بعد وہ پچھلے برآمدے میں جا کر بیٹھ گئی۔ ایک عجیب سا نا معلوم دکھ اسے اپنے وجود میں بیٹھتا محسوس ہوا...... وہ کچھ گھبرا کر اندر لوٹ آئی۔ موبائل کھول کر دیکھا یوسف کا میسج آیا ہوا تھا۔
"miss you" چھوٹا سا لفظ تھا مگر دل کے ایوانوں کو جگمگا گیا۔ وہ اس چھوٹے سے لفظ کے سحر میں ڈوبی جانے کب نیند کی مہربان وادیوں میں چلی گئی۔
صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ اسے حیرت ہوئی ایمل اس سے پہلے اٹھ چکی تھی۔ وہ ابھی بستر پر بیٹھی آنکھیں مسل رہی تھی کہ ایمل چلی آئی۔
"توبہ ہے...... آج کا سارا دن خراب گزرے گا۔ صبح سے دماغ خراب کیا ہوا ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔
"اب کیا ہوا؟" ساری سستی اور نیند غائب ہو گئی۔
"وہ آ رہے ہیں اُن کے گھر والے......" ایمل نے ناگواری سے اطلاع دی۔
"کک...... کیا کون آ رہا ہے؟ پھوپی رقیہ کے گھر والے آ رہے ہیں کیا؟" انمول نے تصدیق چاہی۔ "شکر ہے...... جائیں یہاں سے تو سکون ہو۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر شکرانہ ادا کیا۔
"مگر اس سے پہلے آپ کو کشٹ اٹھانا پڑے گا۔

پورے گھر کو ہلا رکھا ہے انہوں نے خوب صفائی کروائی جارہی ہے، خاص الخاص لوگ آرہے ہیں ناں...... شام کو بڑی دعوت کا اہتمام ہے۔'' ایمل نے تفصیل سے بتایا۔

''تو ہم کیا کریں آرہے ہیں تو......'' انمول نے منہ بنایا۔

''آپ کے لیے...... یعنی ہمارے لیے آرڈر ہے کہ اچھی طرح تیار ہوجائیں۔ مہمانوں سے تمیز سے ملیں۔'' ایمل نے منہ بنا کر حکم نامہ سنایا۔

اس کا کوئی ارادہ نہ تھا دعوت میں شامل ہونے کا مگر وقار آفندی نے خاص طور پر بلا کر تاکید کی۔ صائمہ بھی اچھے سے کپڑے پہن کر تیار ہوگئی تھیں سو اسے بھی بادل ناخواستہ تیار ہونا پڑا۔

سرشام عصر کے فوراً بعد ہی متوقع مہمان آگئے۔ دو، تین لوگ اور ڈھیروں تحائف سے لدے پھندے۔

''یہ جنید ہے...... یہ محب اور یہ میری بیٹی کومل......'' پھوپی رقیہ نے سب سے فرداً فرداً تعارف کرایا۔

وکیل صاحب اپنی وضع قطع اور شخصیت سے الگ ہی پہچان میں آرہے تھے۔ انمول کو ان سب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ رسمی سا بیٹھ کر اندر کمرے میں آگئی...... باہر سب باتیں کررہے تھے، مہمانداری ہورہی تھی، ایمل نہ جانے کس کام میں مصروف تھی کہ اندر آئی ہی نہیں......

کچھ ہی دیر بعد وقار آفندی اندر چلے آئے۔ وہ انہیں یوں اپنے پاس دیکھ کر چونک گئی۔

''اکیلی کیوں بیٹھی ہے میری بیٹی؟'' انہوں نے پیار سے پوچھا۔

''کچھ نہیں بابا...... بس ایسے ہی......'' وہ جبراً مسکرائی۔

''اچھا...... کوئی بات تو نہیں...... اداس تو نہیں؟'' اس کے پاس بیٹھ کر انہوں نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''نہیں بابا...... بس ایسے ہی ماما کا خیال آگیا تھا۔'' اس کی پلکیں بھیگ سی گئیں۔

''ہوں...... ہاں اس موقع پر زیب کی کمی مجھے بھی محسوس ہورہی ہے اور انمول بیٹا آپ کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ اب اس غم کے حصار سے خود کو نکال لیں۔ اس لیے میں نے جو بہتر سمجھا ہے وہی کررہا ہوں...... امید ہے کہ تم اچھی بیٹی کی طرح میری بات کو سمجھو گی اور مانو گی......''

اسے سمجھاتے، سمجھاتے نہ جانے وہ کیا کہنا شروع ہوگئے تھے۔ انمول کو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ان کی باتوں میں غیر معمولی سی تمہید تھی۔ وہ کچھ کہے بنا ان کو دیکھتی رہی۔

''بیٹا آج آپ کی منگنی ہے آپا کے بیٹے جنید سے......'' کچھ توقف کے بعد انہوں نے دھیرے سے اطلاع دی۔

''جی بابا......؟ منگنی!'' وہ منگنی پر اتنا نہ چونکی جتنا آپا کے فرزند کو سن کر چونکی تھی، جو کچھ انہوں نے یہاں رہ کر اس کے ساتھ کیا تھا اس کے بعد ان کے بیٹے سے منگنی کرنے کو بالکل تیار نہ تھی۔

''بابا...... میں ابھی منگنی نہیں کروں گی...... میں نے آپ کو منع کیا تھا اور آپ نے بھی کہا تھا کہ میری ہر بات مانیں گے۔'' وہ ناراضی سے بولی۔

''مگر یہ منگنی والی بات تو پہلے سے ڈن ہے ناں...... ابھی جو کہو گی وہ کروں گا۔ منگنی کو میں ٹال نہیں سکتا بیٹا، بھائی صاحب اتنی دور سے آئے ہیں خاص طور پر، تمہارے لیے تحائف بھی لائے ہیں اور بیٹا جی ایک بات غور سے سن لو کہ تمہاری ماما کے بعد مجھے سب سے زیادہ بھروسا اپنی بیٹی پر ہے، تم مجھے مایوس کرہی نہیں سکتیں انمول کیونکہ تم میری زیب کا پرتو ہو...... اسی کی طرح تابعدار، خوش اخلاق اور سمجھدار سی۔'' وقار آفندی کے محبت بھرے لفظوں نے اس کے گرد ایسا جال بُن دیا جس نے اسے بالکل بے بس کردیا...... وہ مزید انکار نہ کرپائی مگر دل ماتم کناں تھا...... محبت کی دہلیز پر سر پٹخ رہا تھا۔

ایمل گجرے اور کامدار سوٹ لے کر آئی تو وہ بدک گئی۔

''یہ میں نہیں پہنوں گی...... انہیں جو کرنا ہے کرلیں...... ایسے ہی ٹھیک ہے۔'' اس نے منع کردیا۔

''پاگل ہو، وہ اپنے بیٹے کے مان سے لے کر آئے ہیں سب، میں انہیں کیا کہہ کر منع کروں......'' ایمل پریشان ہوگئی۔

''مجھے یہ منگنی قبول ہی نہیں ہے...... میں یہ منگنی توڑ دوں گی...... مجھے رکھنی ہی نہیں یہ منگنی......'' اس نے تنفر سے کہا۔

''ٹھیک ہے توڑ دینا مگر ابھی تو یہ سب کرنا پڑے گا۔ ورنہ پھوپی صاحبہ حشر اٹھا دیں گی۔'' ایمل نے سمجھایا۔

باہر دروازے پر کھڑی آپا خاتون کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

''اس لڑکی کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے۔ میں وکیل

صاحب کو کیا منہ دکھاؤں گی۔'' وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

سنہری سی شام کا حسن زرق برق ملبوسات کی چمک دمک نے کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ وہ کمرے میں بت بنی بیٹھی تھی۔ سبز کامدار دوپٹے کے ہالے میں انمول کا حزن بکھیرتا حسن دمک رہا تھا۔ صائمہ آنٹی نے اس کا ہلکا پھلکا میک اپ کر دیا تھا۔ کافی دیر بعد اسے لاؤنج میں لے جایا گیا جہاں پُر اشتیاق نظروں کے حصار میں اسے الجھن ہونے لگی۔ اسے بڑے صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے ایک طرف بابا تھے اور دوسری طرف آپا خاتون......

''ہاں تو وقار میاں اجازت ہے؟'' آپا خاتون نے اجازت چاہی۔

''جی آپا...... مگر وہی عرض ہے کہ ابھی صرف......'' وقار آفندی کی بات درمیان میں رہ گئی۔

''منگنی غیر اسلامی رسم ہے اور نکاح سنت ہے۔ تو بس اسی وجہ سے میں منگنی کے بجائے نکاح کرنا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے سب کچھ خود طے کر لیا تھا۔ اس موضوع پر ان دونوں کی پہلے بھی بات ہو چکی تھی وقار صاحب ان سے متفق نہ تھے مگر پھر سمجھانے پر نیم رضامند ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے انمول کو آگاہ کر دیں گے مگر جلدی، جلدی میں اس کا وقت نہیں مل سکا تھا۔ نکاح خواں کا انتظام انہوں نے گھر بیٹھے ہی کر لیا تھا۔ ایک فون ملا کر کسی نکاح خواں کو بھی بلا لیا تھا۔

''میاں، ہٹ کی پکی ہیں یہ...... مان لو...... کوئی چارہ نہیں اب اور کوئی حرج بھی نہیں، گھر ہی کی بات ہے...... یہاں کون سی غیریت اور اجنبیت ہے کہ جانچ پڑتال کا قلق رہ گیا ہو۔'' وکیل صاحب نے شگفتگی سے ان کی سوچ کی راہ ہموار کی۔ اور انمول جو سر جھکائے بیٹھی تھی اس کے اندر آتش فشاں سا ابلنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اپنا دوپٹا نوچ کر پھینک دے اور یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے...... یہ سب تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''انمول بیٹا میری عزت رکھ لینا۔'' وقار آفندی نے اس کے کان میں چبھتی ہوئی سرگوشی کی۔

انمول کے ہاتھ پیر سرد پڑ گئے، دل کی رفتار مدھم پڑ گئی۔ اسے لگا کہ وہ مر جائے گی...... ہر بار قبول ہے پر اس کو جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی...... مگر اسے کچھ بھی نہ ہوا...... ایک لمحے میں اس کی ہستی ایک انجان شخص کے نام کر دی گئی اور وہ سانس لیتی رہی...... مگر ایسے لگ رہا تھا کہ وہ ایک بے جان لاشہ بن گئی ہے جو سانسوں کی میت اٹھائے انجان سمت چلا جا رہا ہے۔

''مبارک سلامت کے شور سے اسے وحشت ہونے لگی۔ ڈھیروں آنسو گولہ بن کر حلق میں اٹکے اور دامن میں گرنے کے بجائے دل پر گرنے لگے۔ وہ محبت کو کھو چکی تھی ہمیشہ کے لیے...... تقدیر نے پانسہ پلٹ دیا تھا وہ یوسف کے بجائے کسی اور کی ہو گئی تھی۔ زندگی کی گاڑی نے اچانک رخ بدل لیا تھا یوں جیسے کانٹا بدلنے پر ریل گاڑی پٹڑی بدل لیتی ہے۔

اب اسے ایک انجان پٹڑی پر، نئے اور اجنبی راستوں سے آشنا ہونے کے لیے چلنا تھا۔ بابا نے کب اسے گلے لگا کر مبارکباد دی اسے کچھ معلوم نہ تھا۔

''ارے اس کے تو ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے...... غش آ گیا شاید...... پانی لاؤ......'' کسی نے اسے تھام کر وہیں صوفے پر لٹا دیا۔ وہ رات سب کے درمیان کچھ عجیب سی گزری...... زبردستی کے شریکِ سفر کو وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی سو آنکھیں موندے پڑی رہی۔

اگلی صبح ہلچل لیے نمودار ہوئی۔ مہمانوں کی موجودگی، ناشتے کے انتظامات اور نہ ختم ہونے والی باتیں...... وہ ناشتا کر کے بیٹھی تھی کہ آپا خاتون آ گئیں۔

''کیسی طبیعت ہے میری جان کی...... کچھ بہتر ہوئی؟'' انہوں نے پاس بیٹھ کر شفقت سے پوچھا۔

اسے ان کی آمد بے حد ناگوار گزری تھی مگر اب چند گھنٹوں کی برداشت رہ گئی تھی سو صبر کر کے بیٹھی رہی۔

''بیٹا نہا دھو کر یہ والے کپڑے پہن لینا، سب آئے ہوئے ہیں اور تمہیں دیکھنے اور تم سے ملنے اور باتیں کرنے کا سب کو اشتیاق ہو رہا ہے۔ اچھی سی تیار ہو جاؤ......'' آپا خاتون نے پیار بھرے انداز میں ہدایات دیں جسے اسے کڑوی گولی کی طرح نگلنا پڑا۔

دوپہر کھانے سے پہلے اس کا دماغ پک چکا تھا۔ وہ سب اسے گھیرے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ عین سامنے زبردستی کے شریکِ سفر براجمان تھے۔ اس کی گہری نظروں کی حدت سے وہ جھلس رہی تھی۔ ایک، ایک لمحہ

وہاں گزارنا عذاب ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے وقار میاں...... عصر تک ہم سب کی روانگی ہے۔ ہمیں اجازت دو خوشی، خوشی اور کہا سنا معاف کرنا۔'' کھانے کے بعد اچانک آپا خاتون نے وقار آفندی کو مخاطب کیا۔

''جی آپا...... میری طرف سے کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو اس کے لیے بھی معذرت......'' انہوں نے بھی فوراً حساب برابر کیا۔

''بھئی میرے سر سے تو بوجھ اتر گیا، تمہارے اکیلے پن کی بڑی فکر تھی مجھ کو...... اب صائمہ آگئی ہے، سدا خوش رہو تم دونوں...... ایسا ہے کہ میرا پروگرام تو نہیں تھا مگر اب دولہا کی طرف سے رخصتی کا تقاضا آگیا ہے۔'' آپا خاتون نے نرمی سے مسکراتے ہوئے انمول کے نازک حواسوں پر بم گرادیا جیسے۔

''رخصتی! مگر آپا ہماری یہ بات تو نہیں ہوئی تھی۔'' وقار آفندی حیران پریشان تھے۔

''ہاں، تھی تو نہیں مگر اب یہ ہے کہ انمول پر تمہارا اختیار نہیں رہا۔ اپنے شوہر کی مرضی کی پابند ہے وہ...... سو بخوشی رخصت کردو بیٹی کو......'' انہوں نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ وقار آفندی لاجواب سے ہوگئے۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں نکاح کے بعد اب انمول پر اس کے شوہر کا حق تھا۔

''مگر آپا...... ایسے کیسے......؟ ہمیں تو جہیز بھی بنانا ہے...... ایک بڑی تقریب کرنی ہے انمول کی شادی کی......'' صائمہ اچھی بیوی کی طرح ان کی مدد کو آئیں۔

''جی آپا...... میں اپنی بیٹی کی طریقے کے ساتھ دھوم دھام سے رخصتی کرنا چاہتا ہوں......'' وقار آفندی نے صائمہ کی بات سے فوراً ہی اپنی بات جوڑ لی۔

''اے بھئی یہ سب دنیا دار لوگوں کی باتیں ہیں...... ہمیں جہیز نہیں چاہیے، خدا کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس...... رہی دھوم دھام تو خیر ہے آگے وقت پڑا ہے ان باتوں کے لیے اور بہت سے موقع آئیں گے۔ اب یوں ہے تو یونہی سہی تم دیکھنا یہ رخصتی بھی لوگ مدتوں یاد رکھیں گے۔'' وہ اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں۔

انمول کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان سب کے درمیان سے سلیمانی ٹوپی پہن کر غائب ہوجائے...... آپا خاتون نے اس کی زندگی کی ہر خوشی کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ان سب کے مسکراتے چہرے نوچ لے...... ان سب کی خوشیوں کو ان سے چھین لے جس طرح اس کی خوشی کو چھین لیا گیا تھا اس سے۔

وقتِ رخصت اس کا احتجاج بھی اس کے ہونٹوں پر دم توڑ گیا تھا کہ وقار آفندی کی نصیحتوں اور التجاؤں نے کچھ بولنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ وہ ان سب سے بھی خائف اور بدظن تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس ساری منصوبہ بندی میں وہ اپنی آپا کے ساتھ شریک تھے۔

جہیز کی مد میں وقار آفندی نے ایک خطیر کیش اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروادیا تھا۔

''سب کچھ اپنی مرضی اور پسند سے خرید لینا جنید کے ساتھ جا کر اور ہاں کپڑے ذرا گہرے رنگوں کے بنانا، تمہارا رنگ فیئر ہے ناں بہت اٹھیں گے تمہارے اوپر گہرے رنگ...... پریشان نہ ہو سب بہتر ہوجائے گا۔'' صائمہ آنٹی کی نصیحتیں اور باتیں اس نے آنچل کی اوٹ میں سنیں...... اور سنی ان سنی کردیں۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں مگر وہ آنسو بہانا نہیں چاہتی تھی لیکن جب ایمل اس کے گلے لگی تو اس کا بلکنا اسے بھی رلا گیا تھا۔

یہ سب کچھ جیسے اس کے لیے اچانک تھا ویسے ہی ایمل کے لیے حیران کن اور پریشان کن تھا۔

یہ ازل سے طے ہے کہ ہر لڑکی کو ایک نہ ایک دن بابل کا آنگن چھوڑنا پڑتا ہے۔ نئے راستوں، نئے رشتوں میں مدغم ہو کر وقت کے ساتھ، ساتھ اس کی شخصیت، عادتوں اور مزاج میں بھی تبدیلی آجاتی ہے کیونکہ صنفِ نازک میں ہمیشہ سے لچک ہوتی ہے وہ موم کے مانند پگھل کر ہر سانچے میں ڈھل جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب یہ ضد پر آجائے تو...... سب کچھ تاراج کردیتی ہے۔ تب وہ... اتنی بے لچک ہوجاتی ہے کہ جھکنے سے بہتر ٹوٹنے کو فوقیت دیتی ہے۔

انمول کی رخصتی بھی کوئی نئی نہیں تھی۔ ہر لڑکی کی طرح وہ بھی رخصت ہوئی تھی۔ مگر ناموافق اور غیر متوقع حالات نے اسے سب سے بدظن، بدگمان کردیا تھا۔ سب سے

بڑھ کر وہ اپنی سب سے قیمتی چیز کو کھو چکی تھی۔ وہ دو حصوں میں بٹی ہوئی ایک ادھوری سی تصویر تھی جس کا دوسرا حصہ ابھی لگنا باقی تھا۔ اس کی شخصیت میں گہرا خلا سا پڑ گیا تھا اور وہ اس خلا میں اندر ہی اندر کہیں گرتی جا رہی تھی۔

تھکا دینے والے سفر نے اس کو روند ڈالا۔ کراچی سے فیصل آباد تک کے سفر کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ سب سے بڑھ کر دوری اور جدائی کا جو عذاب وہ بھگت رہی تھی اس میں زمینی فاصلہ بھی اسی قدر بڑھ گیا تھا۔ دکھ کے بے کراں احساس نے اسے مار ڈالا تھا۔

اسے طویل سفر کے بعد گھر پہنچ کر ایک خوب صورت سے بیڈ روم میں آرام کے لیے پہنچا دیا گیا تھا۔ خوب صورت بیڈ کور، تازہ پھولوں کے گلدستے اور جلدی میں تیاری کی گئی سیج...... جو چند پھولوں کی لڑیوں سے آراستہ کی گئی تھی۔ ہلکی خوشبو سے کمرا مہک رہا تھا اور یہ خوشبو انمول کے ارمانوں کو جلا سلگا کر بھسم کر رہی تھی۔ اسے آرام تو کیا آتا، تھکن اور غصے نے مل کر نیند ہی اڑا دی تھی۔ اسے وہ کانٹوں کا بستر لگ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی پھر بھی چین نہ آیا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت اس کی نام نہاد نند کومل اور حورعین اندر داخل ہوئیں۔

''ارے...... اٹھ کیوں گئیں...... آرام کرو بھئی۔'' کومل نے پاس آ کر کہا۔

''ہاں...... ابھی تو آرام کا موقع مل رہا ہے پھر نہیں ملے گا۔'' حورعین نے شرارت سے کہا۔

انمول بگڑے تیور لیے برہم، برہم سی بیٹھی رہی۔

''ٹھیک ہے اگر نہیں لیٹا جا رہا تو پہلے کھانا کھا لو...... بھابی ذرا انتظام کرا دیں۔'' کومل نے حورعین کو ہدایات دی۔

''ہائے ان کا حال تو ٹھیک کر دو پہلے...... بکھرے، بکھرے سے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔'' حورعین شوخ ہو رہی تھی۔ اس کی بکھری لٹیں، بے خواب آنکھیں اس کی حالت زار صاف ظاہر کر رہی تھیں۔

''ہاں کر لیں گے، کھانا یہیں لے آئیں آپ، آرام سے کھا لیں گی یہ۔'' کومل نے سمجھداری سے فیصلہ کرتے ہوئے حورعین سے کہا۔

''مجھے فریش ہونا ہے۔'' بالآخر اسے بولنا پڑا۔ یہ کامدار جوڑا اسے ویسے بھی زہر لگ رہا تھا اور اب بری طرح چبھ رہا تھا۔ حورعین اور کومل شرارتی سی مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگیں۔

''اب تو سب کچھ برداشت کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی......'' حورعین نے انجانے میں تیر چلایا۔ اس کی شرارتی مسکراہٹ جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھی۔

''اونہہ...... بکواس کرنے کی عادت ہے اپنی ساس کی طرح۔'' اس نے دل میں سوچا۔

کچھ ہی دیر میں دو تین قسم کے کھانوں سے سجی ٹرالی اس کے سامنے آ گئی۔ بریانی اور تندوری چکن کے علاوہ میٹھے میں ربڑی تھی لیکن اس سے کچھ بھی نہ کھایا گیا۔

''ارے تم تو کچھ کھا ہی نہیں رہیں۔'' کومل کو تشویش ہو رہی تھی۔

حورعین، جنید کو لے کر آ گئی۔ ان سب کی چھیڑ خانیوں میں اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔

''اب تم ہی کچھ کھلا پلا دو...... ہم سے تو کھا نہیں رہیں یہ......'' حورعین نے لاڈ بھرے انداز میں دیور کو اس کی طرف دھکیلا۔

جو تھوڑا بہت وہ چکھا چکھی کر رہی تھی جنید کے پاس بیٹھتے ہی اس سے بھی گئی۔ اپنے قریب اس کا وجود اسے بری طرح کھل رہا تھا اور وہ اسی قدر اپنائیت اور لگاوٹ سے اس کی پلیٹ میں کھانا ڈال رہا تھا۔

''بی ایزی...... آرام سے کھاؤ بھئی...... دیکھو اب ہمارے سوا کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ کوئی تمہیں نہیں دیکھ رہا...... آرام سے کھاؤ......'' وہ اصرار کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں چاشنی اور انداز میں لگاوٹ تھی۔ وہ بار، بار اس کی طرف جھک رہا تھا۔ کبھی کچھ پوچھنے کے لیے اور کبھی کچھ دینے کے لیے...... اس کی نظروں کی تپش سے اسے کوفت ہو رہی تھی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے لیے نئی جگہ اور نئے لوگ ہیں مگر اب ہمارا رشتہ بہت مضبوط ہو گیا ہے۔ نکاح کے دو بولوں میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ اب ہم اجنبی نہیں رہے...... ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔'' یک لخت اس نے اس کا سرد ہاتھ تھام لیا۔ انمول کے اندر جیسے دکھ

اور اذیت کی لہریں سی اٹھیں۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کی مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

''آہم...... آہم......'' ہلکی سی دستک کے بعد کومل فوراً ہی اندر آگئی اور جنید کو سرعت سے تھاما ہوا ہاتھ چھوڑنا پڑا۔

''ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے جناب......'' کومل نے خالص تھانیدارانہ انداز میں کہا۔

''بڑے غلط وقت پر انٹری ماری ہے آپ نے۔'' جنید بدمزہ سا ہو گیا۔

''وعدہ ہے کہ آپ کو بھی وقت دیا جائے گا مگر ابھی یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔'' کومل نے چڑایا۔

وہ دونوں کی چھیڑ چھاڑ والی باتوں پر کوفت محسوس کر رہی تھی۔

حرمین اور نیلم نے اس کا برائیڈل ڈریس لا کر دیا۔ امبر نے میک اپ کٹ دراز سے نکالی۔ حورعین نے بال سیٹ کیے۔ کومل نے میک اپ کیا۔ حرمین نے کومل کا ساتھ دیا۔ امبر نے ڈبے میں سے جیولری نکال کر دی۔ کسی نے بندے پہنائے، کسی نے چوڑیاں۔

وہ دل ہی دل میں سب کو نوازتی رہی اور کلستی رہی...... یہ کیسا وقت آگیا تھا کہ وہ اس ستم پر آہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بس لب بھینچے اس ستم ظریفی پر کڑھ رہی تھی۔ تیار کرنے کے بعد اسے سب کے درمیان لاؤنج میں لے کر آگئے۔ وہ سر جھکائے روایتی سے انداز میں بیٹھ گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ...... آس پاس کون، کون ہے۔ رات گئے وہ اندر کمرے میں آئی تو ایک نئی مشکل جنید کی صورت میں سر پر سوار تھی۔

''اُف...... اس سے کیسے نمٹوں گی؟'' سوچ، سوچ کر وہ بے حال ہو رہی تھی۔ کچھ نہ سوجھا تو رونا ہی شروع کر دیا۔ نارسائی کا کرب آنسوؤں کی صورت بہنا شروع ہوا تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جنید اندر داخل ہوا تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ نئی نویلی دلہن پوری دلجمعی سے رونے دھونے میں مشغول تھی۔

''ارے...... تم کو کیا ہوا؟ انی پرابلم...... آپا کو بلاؤں؟''

''آپا......'' وہ حواس باختہ سا بلانے کو دوڑا ہی چاہتا تھا کہ بے اختیار اس نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ اور اپنی اس حرکت پر خود ہی خجل ہو کر ہاتھ چھوڑ دیا جبکہ جنید کے ہونٹوں پر دلفریب سی مسکان دوڑ گئی۔

''پلیز آپ کسی کو نہ بلائیں...... میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں...... پلیز میری ہیلپ کریں۔ بہت اچانک...... اچانک ہوا ہے...... میں ابھی رخصتی کے لیے......'' کہتے، کہتے اس کی آواز لرزنے لگی۔

''اوہ نو...... تم تو بہت اپ سیٹ ہو۔ بی ایزی انمول...... ماں جی نے یہ سب کچھ صرف تمہاری بھلائی اور اچھائی کے لیے کیا ہے۔ تم اس کو ایزی لو۔ نو ٹینشن پلیز...... بی ریلیکس......'' وہ نرمی سے سمجھانے لگا۔

''آئم سوری میں نے تم کو...... سوری آپ کو پریشان کیا مگر پلیز...... میں ابھی کسی نئے رشتے کو...... میرا مطلب ہے کہ میں ابھی...... آئم ناٹ ریڈی فار نیو ریلیشن شپ......'' وہ سسکیاں سی بھر کر آہستگی سے جو سمجھانا چاہ رہی تھی اسے کہتے خود بھی ہچکچا رہی تھی۔

''نو سوری...... مجھے اچھا لگا تم نے مجھے تم کہا۔ یہی اپنائیت کی بات ہے اور ریلیکس رہو...... ہم پہلے دوست ہیں پھر میاں، بیوی بنیں گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں انمول، جو کہو گی وہ کروں گا اور اس سے زیادہ کیا اطمینان دلاؤں تم کو۔'' اس کے پاس بیٹھ کر اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔ انمول کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اپنی بات اس تک پہنچا چکی ہے سو ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔

''انمول مجھے معلوم ہے کہ تم نے بہت دکھ دیکھا ہے۔ تم ممانی کی وفات کی وجہ سے اپ سیٹ ہو مگر دیکھو ہر لڑکی کو ایک دن اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ تم وہاں اکیلی رہتیں...... اور میں یہاں...... سو سوری کہ تم میری وجہ سے ڈسٹرب ہوئیں مگر میں اس دل کا کیا کرتا انمول......! تمہیں ایک بار دیکھا تو وہاں اکیلا چھوڑنے پر راضی ہی نہیں ہوا۔ اس مقدس رشتے کا کرشمہ دیکھو انمول کہ میرے دل میں تمہارے لیے کتنی محبت ہے......'' اس کا ہر لفظ اس کے کانوں میں امرت کے بجائے زہر بن کر ٹپک رہا تھا۔ یہ سیج تو اسے صرف یوسف کے لیے سجانی تھی...... یہ روپ تو اسے صرف یوسف کے لیے سنوارنا تھا...... اسے اپنی مانگ میں یوسف کے نام کی بندیا لگانی تھی۔

مگر وہ اب اپنی خواہشوں اور خوابوں کے مقتل میں کھڑی، صبر کے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی۔

☆☆☆

اسے یہاں وی آئی پی پروٹوکول مل رہا تھا۔ آپا خاتون ہر اٹھتے قدم پر بسم اللہ پڑھ رہی تھیں۔ دعائیں پڑھ کر اس پر پھونک رہی تھیں تین چار دن میں ہی وہ اپنے گرد چکراتے لوگوں سے پریشان ہوگئی۔ اسے کہاں عادت تھی اتنے لوگوں کی۔ سارا دن مشکل سے کٹتا اور رات عذاب بن کر اترتی..... جنید اور اس کے درمیان اگر چہ خاموش معاہدہ بند لفظوں میں طے ہو چکا تھا مگر اس کی شوخیاں، بے تکلفی اور قربت اسے اسی قدر گراں گزر رہی تھی۔ وہ اپنے تئیں اس کا خیال رکھ رہا تھا اور اس کے گریز کو اس کی شرم سمجھ رہا تھا۔ وہ جس قدر بھی اس پر جذبے لٹا رہا تھا انمول اتنی ہی بے اعتنائی برت رہی تھی۔ ہر گزرتا دن اس کے لیے امتحان بھی تھا اور طوفان بھی۔ اس نے جنید کو بہت سے بہانوں سے خود سے دور رکھا تھا مگر کب تک اس طوفان کو سنبھال سکتی تھی۔ گھر میں ہلچل اور رونق اسی کے آنے کی وجہ سے تھی اور وہ سب سے اتنی ہی بیزار تھی۔

''انمول یہ..... انمول وہ..... انمول یہاں..... انمول اِدھر..... انمول ایسے.....'' آپا خاتون تو اس پر نثار تھیں اور وہ ان سے اسی قدر روکھی بنی ہوئی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں کے خواب نوچنے والی وہی تھیں۔ وہ ان سے نفرت کرتی تھی..... شدید نفرت..... لیکن اپنی خوشی میں انہیں محسوس ہی نہیں ہوا۔

''انمول کو گھما پھراؤ جو جی..... وہ کیا سوچ رہی ہوگی کہ تم اس کو کہیں باہر لے کر ہی نہیں گئے۔'' ایک روز اچانک انہوں نے نیا حکم جاری کیا تھا۔

جنید تو جیسے منتظر ہی تھا فوراً تیار ہوگیا۔

''اوہو، مجھے نہیں ہے گھومنے پھرنے کا شوق.....'' وہ اکتا کر بولی۔

''کیسی لڑکی ہو تم، کوئی شوق ہی نہیں ہے۔ لڑکیاں تو باہر جانے کے بہانے ڈھونڈتی ہیں..... اور..... اور وہ دل کے نہاں خانوں میں چھپے جذبوں تک کو پہچان لیتی ہیں اور ایک تم ہو کہ میری لو دیتی آنکھوں سے نظر چرا لیتی ہو..... میری آنکھوں میں کیوں نہیں دیکھتیں تم..... دیکھو..... اِدھر دیکھو.....'' وہ ایک دم ہی وہ اس کے بے حد ..... قریب آ گیا کہ اس کے جذبوں کی گرمی اس کے وجود میں آتش فشاں سی بن گئی۔ ایک لاوا تھا حسرت، دکھ، غصے اور نفرت کا جو باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ اس نے گھبرا کر پیچھے ہٹنا چاہا مگر وہ اس کے گرد بازو کا حصار کر چکا تھا۔

''اُف.....'' اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کی بڑھتی ہوئی جسارتوں اور نظروں کی طلب نے اسے بے حال سا کر دیا۔

''پلیز..... اس وقت میرے سر میں درد ہو رہا ہے، بہت شدید ہو رہا ہے۔ میں ابھی کہیں نہیں جا سکتی۔'' ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ سی پڑ گئیں اور چہرہ تمتما اٹھا۔

''ارے کیا ہوگیا؟ ابھی تو ٹھیک تھیں؟'' وہ پریشان ہوگیا۔ ''کہیں بخار تو نہیں ہوگیا.....'' اس نے اس کا ماتھا چھوا..... جیسے کوئی ڈنک چبھ گیا ہو۔

''مجھے سر درد کی ٹیبلیٹ لادو..... مجھے آرام کرنا ہے پلیز..... میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' اس نے سر جھٹک کر اس کا ہاتھ ہٹایا اور خود سر تا پیر چادر تان لی۔ وہ کچھ خائف سا پیچھے ہٹ گیا۔ انمول کا رویہ اسے کھٹکنے لگا تھا۔

وہ کمرے سے باہر آیا تو آپا خاتون لاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں۔ اس کا اترا ہوا چہرہ ان سے چھپا نہ رہا۔

''کیا ہوا جو جی..... آؤٹنگ پر نہیں گئے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''پتا نہیں کیا بات ہے، اس کے اکثر ہی سر میں درد ہو جاتا ہے۔'' وہ بجھا بجھا سا بولا۔

''ہاں ہو جائے گی ٹھیک آہستہ آہستہ..... نیا گھر، نئی جگہ ہے اس کے لیے..... وہ دراصل ماں کے بہت قریب تھی۔ زیب کا صدمہ بھلا نہیں پا رہی وہ..... میں نے بتایا تو تھا تمہیں۔'' وہ اسی قدر سکون سے تھیں۔

''تم اسے کسی دن شاپنگ پر لے جاؤ..... شادی بھی جلد بازی میں ہوئی۔ کوئی دھوم دھڑکا تیاری بھی نہیں ہو سکی۔ شاید یہ وجہ ہو کہ اس کا دل ٹوٹ گیا ہو۔ اتنی جلد بازی میں وہ ذہنی طور پر رخصتی کے لیے تیار بھی نہیں تھی۔ وہ تو بس میں نے ہی جلدی مچائی کیونکہ میں بھی کسی کو دکھانا چاہتی تھی کہ عزت دار گھرانے کی بہو کس طرح چاؤ سے رخصت ہو کر آتی ہے۔ ریت و رواج کے مطابق اسے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ اسے پوچھا اور سمجھا بھی جاتا ہے۔'' اسے سمجھاتے، سمجھاتے وہ اپنے دل کی بات بھی کر گئیں۔

جنید چپ سادھے ان کی بات سنتا رہا۔ ظفری کے

مایوس کرنے کے بعد انہیں ساری امیدیں اسی سے تھیں اور اس نے بھی ماں کا مان رکھا تھا مگر اب انمول اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، وہ تو پروں پر پانی بھی نہیں پڑنے دے رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے پاس ڈھیر ساری شاپنگ بکھری پڑی تھی اور وہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔ یہ ساری زبردستی کی شاپنگ آپا خاتون کی ایما پر جنید نے اسے کروائی تھی۔ حد تو یہ تھی کہ اس کے بیڈ روم کے نئے پردے بھی بنوائے انہوں نے۔ کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کی کمی تھی اس کی جگہ فینسی ڈریسنگ لا کر رکھی گئی تھی جس کے بیضوی آئینے پر لکڑی کا کٹ ورک فریم تھا۔ بے حد اسٹائلش سی ڈریسنگ ٹیبل سب ہی کو پسند آئی تھی۔ آئینے کے آگے چھوٹی سی جگہ تھی اور پھر اس کے نیچے دو شیلف بنے ہوئے تھے جو گلاس کے تھے۔ حورعین اور نیلم نے زبردستی کر کے اسے نیا اسٹائلش سا سوٹ پہننے پر مجبور کر دیا۔ ہلکے گلابی اور فان رنگ کی آمیزش کا سوٹ تھا جس پر ان گولڈن رنگ سے چھوٹے ستاروں کے ساتھ گل بوٹوں کی کڑھائی کی گئی تھی۔ فرنٹ پر چوڑی گولڈن بیل کپڑوں پر بنے کام سے ہم آہنگ تھی۔ ہلکے پھلکے میک اپ اور آپا خاتون کے دیے آویزے پہن کر اس کی گلابی رنگت دمکنے لگی کہ آئینے میں خود پر نظر پڑی تو نظریں خیرہ سی ہو گئیں...... سینے میں ہوک سی اٹھی اور وہ اداس ہو گئی۔ یوسف کی شبیہہ دل سے مٹی کب تھی جو وہ بھول پاتی...... آج بھی وہ پورے طمطراق سے اس کے دل میں جلوہ افروز تھا۔

جنید کی نظریں تو اس پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ آنے بہانے اس کے گرد چکرا رہا تھا۔ اور وہ اسی قدر گھبرا رہی تھی۔

''خیر نہیں ہے آج تو تمہاری...... بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' حورعین کے شریر سے فقرے نے گھبراہٹ دو چند کر دی۔

''دیکھ نہیں رہیں کیا حال ہو رہا ہے جنید کا......''

اس نے پھر سرگوشی کی۔ انمول کا موڈ بے حد خراب ہو گیا۔ وہ ان سب کے درمیان سے اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ بہت دن بعد اس نے اپنا موبائل کھول کر دیکھا۔ یوسف کے ڈھیروں میسجز تھے۔ ایمل کی مسڈ کالز لاتعداد تھیں...... اس نے جلدی سے موبائل آف کر دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو اس راز کی بھنک پڑے۔ وہ کسی بھی الجھاؤ سے پہلے حالات کو سلجھانا چاہتی تھی۔ اسے بس اس وقت کو ٹالنا تھا۔ اتنی ہنگامی رخصتی کے بعد اس نے میکے والوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ چند ایک بار لینڈ لائن پر وقار آفندی اور ایمل نے زبردستی اس سے بات کی تھی۔ اسے آپا خاتون کے کہنے پر بات کرنی پڑی، وہ ان پر کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس زبردستی کے بنجوگ سے چھٹکارا پا کر رہے گی۔ ابھی وہ انہی باتوں پر غور کر رہی تھی کہ جنید اندر آ گیا اس نے ہاتھ میں تھما موبائل تکیے کے نیچے کر دیا۔

''کیا ہوا انمول...... سب کے درمیان سے اٹھ کر کیوں چلی آئیں؟'' جنید نے تعجب سے پوچھا۔

''ایسے ہی...... کسی کو اعتراض ہے کیا......؟ اب اپنی پرائیویسی بھی ہوتی ہے انسان کی۔'' اس نے نروٹھے پن سے کہا۔ روانی میں وہ قابلِ غور بات کر گئی تھی۔ جنید ایک لمحے تو بول ہی نہ سکا۔ اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت تھی۔

''ہم...... تو یہ وجہ ہے اس بیزاری کی...... پرائیویسی چاہیے تم کو...... تو فکر کی کوئی گل ہی نہیں...... یہ کمرا اور یہ چار دیواری ہماری پرائیویسی تو ہے۔ یہاں کوئی دخل نہیں دے سکتا...... ہاں کمرے سے باہر کی دنیا الگ ہے...... وہاں ایک خاندان اور اس کے افراد ہیں جن کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ لیکن یہاں کوئی مخل نہیں ہو سکتا...... شکر ہے کہ تم کو میرا خیال آیا۔ پہلے کہہ دیتیں یار......'' وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک آتشِ شوق تھا جو انمول کو جھلسائے دے رہا تھا۔ اس کا دل اسی قدر سکڑ کر چھوٹا سا ہو گیا۔ جنید کے عزائم اس کی آنکھوں سے جھلک رہے تھے۔

''میں جوائنٹ فیملی سسٹم میں کبھی نہیں رہی۔ اتنے شور میں میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔ مجھے اب بھی عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔'' اس کو اچانک ہی نئی بات سوجھی۔

''یہ گھبراہٹ کہیں میری وجہ سے تو نہیں......'' وہ جو بیڈ سے اترنے کو پر تول رہی تھی اس کے بے حد قریب ہو کر

جنید نے معنی خیزی سے پوچھا۔ اس صورتِ حال نے اسے بوکھلا سا دیا اور بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''ارے..... اب کیا ہوا.....؟ میں نے کیا کہہ دیا؟'' جنید پریشان ہو گیا۔

''مجھے سچ میں بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے..... عجیب سی طبیعت ہو رہی ہے میری.....'' راہِ فرار کا ایک ہی راستہ تھا اس کے پاس۔

''چلو باہر لان کا چکر لگا لیتے ہیں یا پھر باہر چلتے ہیں کولڈ ڈرنک پی لینا..... طبیعت سنبھل جائے گی۔'' وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اس وقت انمول نے بھی ایک لمحے کی دیر نہ لگائی۔

کھلی فضا میں اسے پھر بھی کافی تسلی رہی۔ جنید کی باتوں کو ہوں، ہاں کر کے ٹالنا بھی اس کی عادت بن گئی تھی۔ وہ بڑی خوب صورتی سے اس کڑے وقت کو ٹالتی آرہی تھی۔ مگر کب تک.....؟ جب یہ سوال ذہن میں آتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔

واپسی میں گھر کے بیشتر حصوں کی لائٹ بند ہو چکی تھی۔ دائیں طرف بنے علیحدہ سے پورشن میں کھڑکی سے لائٹ جلتی نظر آرہی تھی۔ عموماً وہاں سناٹا رہا کرتا تھا۔ اتنے دنوں میں پہلی بار اسے وہاں کسی کی موجودگی کے آثار نظر آئے تھے۔

''یہاں کون رہتا ہے؟'' وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''یہاں..... وہ.....'' جنید ایک پل کے لیے ہچکچایا۔

''کرائے دار ہیں ہمارے.....'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتی وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔ جب وہ دس پندرہ منٹ بعد کمرے میں لوٹا تو وہ گہری نیند کا تاثر دینے میں کامیاب رہی تھی لیکن دکھ کے نوکیلے کانٹے اسے کرید رہے تھے اور اس کا تکیہ بھیگتی رات کے ساتھ بھیگتا ہی جا رہا تھا۔

☆☆☆

دن بے حد پھیکے اور بور سے گزر رہے تھے اس کے لیے اب زندگی میں کوئی کشش نہیں رہی تھی..... سچ تو یہ تھا کہ وہ اس بے معنی، بے رنگ سی زندگی سے اتنے مختصر عرصے میں ہی تھک گئی تھی۔ آخر وہ کب تک اپنا دفاع کرتی؟

وہ جس قدر جنید سے اجتناب برت رہی تھی وہ اسی قدر اس کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ اس کا گریز، اس کے غم، صدمے، اچانک رخصتی اور نئی جگہ پر آنے سے تعبیر کیا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے اب تک اس کی بچت بھی ہو رہی تھی۔

جنید اس کا دل لگانے بلکہ دل بہلانے کا ہر حربہ استعمال کر رہا تھا مگر وہ تھی کہ کچھ بھی خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔ وہ زبردستی اسے شاپنگ کے لیے لے کر گیا آؤٹنگ پر لے گیا مگر انمول کے سپاٹ سے ردِعمل نے اسے بددل سا کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ بددلی، بدگمانی میں بدلتی اور دونوں کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہو جاتی۔ ایمل کی منگنی کی خبر اس کے لیے پروانۂ آزادی ثابت ہوئی۔

اس کی ساری بیزاری اور خاموشی ٹوٹ گئی۔ اس کے چہرے پر الوہی سی خوشی اور چمک پھیل گئی..... لب خود بخود مسکرانے لگے۔ فکر سے پاک، خوشی سے ہمکنار چہرہ جیسے لو دینے لگا اور جنید نے اس کے پاس آکر بے اختیار اسے تھام لیا۔ کچھ اس طرح کہ وہ چاہ کر بھی اس کی گرفت سے نہ نکل پائی..... کسمسا کر رہ گئی۔

''بہت خوب صورت لگ رہی ہو..... ایسے ہی خوش رہا کرو ہمیشہ..... قسم سے دل بے ایمان ہو رہا ہے اب تو.....'' وہ جیسے بے خود سا ہوا جا رہا تھا۔ وہ اس کے قرب کے سحر میں بن پیے ہی مدہوش سا ہو رہا تھا اور انمول کا جیسے سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

بیڈ پر رنگ برنگے کپڑوں کا ڈھیر تھا..... سوٹ کیس کھلا پڑا تھا اور وہ خود اس کے حصار میں بے بس کھڑی تھی۔ اس کے وجود پر جنید کے ملبوس سے اٹھتی خوشبو چھاتی جا رہی تھی۔

''پلیز جنید..... مجھے سامان پیک کرنے دو.....'' ایک انجان سی قوت کے بل پر اس نے یک دم جنید کو دھکیل کر خود سے دور کر دیا۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا کہ ان ہی دنوں میں مجھے بھی اپنے آفس کے کام سے جانا ہے تو میں بھی وہیں رہوں گا، تم اپنے گھر میں رہنا اور میں آفس کی اکاموڈیشن میں۔'' جنید نے بے اختیار اس کے دونوں ہاتھ تھام کر پھر اسے خود سے قریب کر لیا۔

انمول نے ٹپٹا کر ہاتھ چھڑائے اور چند قدم پیچھے

ہوگئی۔ بیڈ پر سے ایک سوٹ اٹھا کر جنید کو دکھانے لگی۔ یہ سب کچھ وہ غیر ارادی کر گئی تھی کہ دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا اسے۔

''یہ سوٹ کیسا لگے گا مجھ پر؟'' اس نے سی گرین رنگ کا سوٹ اپنے ساتھ لگا کر پوچھا۔

''تم مجھے ہر روپ میں ہی اچھی لگتی ہو، جو پہنتی ہو وہ تم پر سج جاتا ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر خلوص سے بولا۔

انمول نے اس کی آنکھوں سے چھلکتی محبت، سچائی اور خلوص سے نظر چرالی۔ اس کا دل بے ربط سے انداز میں دھڑکا جیسے وہ چور ہے۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ ایسی کھوٹ بھری اور ریاکاری والی زندگی بالکل بھی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ بس صحیح وقت کے انتظار میں تھی...... اور وہ وقت اب قریب آتا جارہا تھا۔ محبوب کے ہجر نے اسے مرجھا دیا تھا مگر اب وصل یار سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اور یہ دمکتی خوشی جنید کو کچھ اور بھی اس کی طرف مائل کررہی تھی۔

''خواہ مخواہ ہی...... کوئی بھی نہیں......'' جنید کی بات کا اس نے بمشکل جواب دیا۔ وہ چار قدم چل کر پھر اس کے قریب آگیا اور اس کی ٹھوڑی کو ہاتھ سے چھوکر اونچا کرلیا تاکہ وہ اس سے نظر ملا سکے۔

''بس ایک گڑبڑ ہے تم میں......'' وہ اس کے چہرے سے لٹ ہٹاتے ہوئے بولا۔

انمول کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اور دیکھے ہی چلا جارہا تھا جیسے اس کی نظریں اس کے وجود کے پار اس کے خیالات اور احساسات کو ٹٹول رہی ہوں۔

''کک...... کیا مطلب......؟'' وہ اتنی آہستہ بولی کہ اس کے صرف لب ہلتے محسوس ہوئے...... جنید کی نظروں کی تپش اور جذبوں کی آنچ اس کے وجود کو راکھ کررہی تھی۔ اسے اپنا آپ منافق لگ رہا تھا۔ وہ اس کو دھوکا دے رہی تھی اور اس سے مخلص نہ تھی اس احساس سے زمین میں گڑتی جارہی تھی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی اور چہرے پر دکھ و اذیت کے ساتھ خوف اور شرمندگی جھلکنے لگی۔ آنکھوں میں امڈتی نمی کو چھپانے میں وہ کامیاب نہ ہوپائی۔

''ارے...... تم تو سیریس ہوگئیں...... کیا ہوگیا یار...... میں تو مذاق کررہا تھا...... میرا مطلب یہ ہے کہ تم بس ریزرو بہت رہتی ہو...... تھوڑی چپ اور سنجیدہ طبیعت کی ہو بس......'' وہ گھبرا کر وضاحتیں دینے لگا۔

''پلیز...... میری طبیعت خراب ہورہی ہے...... میرا بی پی لو ہورہا ہے شاید......'' وہ یک دم نقاہت محسوس کرتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ جنید نے تشویش سے اس کے ماتھے پر چمکتے پسینے کی بوندوں کو دیکھا۔

''بیٹھو آرام سے...... میں حرمین یا بھابی سے اسکوائش بنوا کر لاتا ہوں......'' اس کا کاندھا تھپک کر وہ عجلت میں باہر نکل گیا اور انمول نے جان چھوٹنے پر گہری سانس خارج کی۔

ہجر کی رات بالآخر ڈھل گئی تھی لیکن دل میں عجیب بے قراری تھی۔ خدشے اور وہم اسے ستا رہے تھے لیکن وہ خود فریبی میں مبتلا تھی۔ برسوں کی پنپتی محبت اس کے کھوکھلے ہوتے وجود کو پھر سے سیراب کرگئی تھی۔ وہ وہی دیکھ رہی تھی جو دیکھنا چاہتی تھی...... وہ وہی سننا چاہتی تھی جس کو سننے کے لیے اس کی سماعتیں منتظر تھیں۔ وہ اپنے خوابوں کی روشنی اور خواہشوں کے سراب میں بھٹک رہی تھی۔ دراصل نہ وہ دیکھ رہی تھی اور نہ سن رہی تھی۔

ایمل کی منگنی تو بہانہ بن گئی تھی۔ اسے ایمل کی منگنی سے زیادہ یوسف سے ملاقات کی خوشی تھی۔ تجدید محبت نے اسے باغی اور سرکش بنا دیا تھا۔ یوسف کا بھی اس کے بغیر برا حال تھا...... دونوں طرف دہکتی آگ تھی جو سب کچھ خس و خاشاک کرنے کو تیار تھی۔ اور وہ ان شعلوں پر چل رہی تھی۔

ایک بار پھر وعدے، ملاقاتیں اور نئی زندگی کے نئے سپنے بُنے جارہے تھے۔ بھڑکتی ہوئی آگ بھسم کیے دے رہی تھی اور وہ ان رقص کرتے شعلوں کے ہم قدم اپنی دریدہ محبت کا تار، تار ملبوس پہنے سر بازار کھڑی تسبیح محبت پڑھ رہی تھی۔ اس امید کے ساتھ کہ وہ اپنی مٹھی میں وقت کو قید کرلے گی...... وہ پھر سے چاند، جگنو، پھول اور ستاروں کے دیس میں پہنچ گئی تھی وہ اب واپسی نہیں چاہتی تھی۔

اس کے پاس وقت کم تھا، اس دن گرمی اگرچہ زیادہ تھی مگر اس نے پروا نہیں کی۔ جویریہ کی معرفت وہ ایک خاتون ایڈووکیٹ سے ملنے گئی تھی اس کے ساتھ

یوسف بھی گیا تھا۔ وہ جنید سے خلع لینا چاہتی تھی اور خاتون وکیل نے اسے چند دن مزید سوچ بچار کے دیے تھے جبکہ وہ فوری فیصلہ چاہتی تھی۔

''بی بی یہ فیصلے جلد بازی اور جذباتیت میں نہیں کیے جاتے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ ایک بار پھر غور کرلیں۔ اپنے دل کو ٹٹولیں کہیں کوئی رتی بھر بھی مصالحت کی گنجائش ہے تو میرا مشورہ ہے کہ اس رشتے کو ختم نہ کریں...... کیونکہ ہمارے معاشرے میں طلاق یافتہ لڑکی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور پھر سارے مسائل کا اسے ہی اکیلے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔'' انہوں نے پیشہ ورانہ انداز میں رائے دی۔

''جی مگر...... لیکن اگر میں پھر بھی خلع حاصل کرنا چاہوں گی تو ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا ہوگا......؟'' وہ فوری اس مسئلے کا حل جاننا چاہتی تھی۔

''دیکھو بیٹی تم ابھی کم عمر ہو...... مجھے تو اس فیلڈ میں زمانہ بیت گیا۔ میں ایسے، ایسے کیس دیکھ چکی ہوں کہ بعد میں عورت اور مرد دونوں اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں...... فتوے لیے جاتے ہیں...... مگر سب لاحاصل رہتا ہے۔ تیر ایک بار کمان سے نکل جائے تو پلٹ کر نہیں آتا......'' وہ مدبرانہ انداز میں مسکرائیں۔ انمول کے چہرے پر پھیلی جارحیت اور انداز میں موجود جذباتیت کو بغور دیکھا۔ پھر جان گئیں کہ...۔ وہ کچھ نہیں سمجھنا چاہتی۔

''سب سے پہلا اسٹیپ تو ہم نوٹس بھجوانے کا کرتے ہیں...... اس کے بعد دیگر اقدام کیے جاتے ہیں کیس کی صورت حال دیکھتے ہوئے۔ شناختی کارڈ، نکاح نامے اور دوسری ایسی ہی چیزوں کی فوٹو اسٹیٹ کرانی پڑے گی تم کو...... وہ تو میں تمہیں ساتھ، ساتھ بتاتی رہوں گی۔'' انہوں نے سرسری سے انداز میں ہلکی پھلکی معلومات دیں۔ وہ کافی مایوس اور بددل سی ہوگئی تھی۔

''یہ تو لمبا پراسس ہے...... کیسے ہوگا یہ سب؟''

واپسی پر وہ جویریہ کے ساتھ اس کے ماموں کے گھر آگئی تھی۔

''جب قدم اٹھا ہی لیا ہے تو ہو جائے گا کچھ نہ کچھ...... تم پریشان نہ ہو۔'' جویریہ نے اسے سمجھایا۔

''مگر وہ تو میرے سر پر بلا کی طرح سوار ہے۔ وہ مجھے لے جانا چاہتا ہے جلدی... اور میری سمجھ میں نہیں

آرہا کہ کیسے اسے سمجھاؤں......'' انمول بیچارگی سے بولی۔
''پالیسی اپناؤ یار......ڈپلومیسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے بھئی......'' سب لوگوں کے درمیان رہ کر جویریہ کافی تیز ہوگئی تھی۔
''کیا مطلب......؟'' انمول بالکل نہ سمجھی۔
''ارے بھئی تھوڑی مکھن پالش کرو......تھوڑا پیار جتاؤ......جھوٹا ہی سہی......تم دیکھنا فوراً مان لے گا تمہاری بات......'' جویریہ نے آنکھ مار کر اسٹائل سے کہا۔
''ہائے جویریہ......کتنی تیز ہوگئی ہو تم......'' انمول نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔
''وقت سب سے بڑا استاد ہے......وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے لڑکی......جو سبق ہم اپنے اسکولوں میں نہیں پڑھتے وہ وقت ہمیں پڑھا دیتا ہے......'' وہ ستر سالہ جہاندیدہ عورت کی طرح لگ رہی تھی اسے سمجھاتے ہوئے۔
''مطلب......یعنی میں اس چغد سے پیار......امپاسبل......میں پیچھا چھڑانے کے چکر میں ہوں اور تم......انتہائی واہیات اور فضول مشورہ ہے یہ۔'' اس کا مشورہ اس نے فوراً رد کردیا۔
''ارے سیکھ لو لڑکی دنیا داری، ورنہ تمہاری یہ صاف گوئی کل کو تمہیں بہت سی آزمائشوں میں ڈال سکتی ہے......دریا میں رہ کر مگر مچھ سے کیا بیر......میں نے تو یہی کیا انمول، مجھے ممانی کو مٹھی میں لینا پڑا اور دیکھو کاشف خود میری مٹھی میں آگیا۔'' جویریہ کی باتیں اس کے دل کو لگ رہی تھیں۔ مگر ان پر عمل کرتے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی اور شاید یہ جویریہ کی باتوں ہی کا اثر تھا کہ اگلے روز شام کو جنید آیا تو اس نے خاص توجہ سے اس سے بات کی......اس کی اتنی سی عنایت پر ہی جنید کا چہرہ کھل اٹھا۔
''مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ یہ تم ہو انمول......! اتنے عرصے بعد تم نے مجھ سے پہلی بار اتنی اپنائیت اور پیار سے بات کی ہے۔ لگ رہا ہے کہ طبیعت سیٹ ہوگئی تمہاری......'' اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔
اس نے ارد گرد کی پروا کیے بغیر جوش و جذبات میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''ہاں......مجھے کچھ بہتر محسوس ہو رہا ہے مگر جنید......دراصل مجھے اپنے ڈاکومنٹس کی فکر ہے۔ میں وہ لیے بغیر نہیں جانا چاہتی......پلیز میری خاطر مجھے تھوڑا ٹائم اور دے دو۔'' اس نے جویریہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے لہجے میں چاشنی بھر کر اور پیار سمو کر کہا۔ اور یہ سب کچھ وہ بمشکل کر پا رہی تھی۔ اس کی بات سنتے ہی جنید کا کھلا مسکراتا چہرہ بجھ سا گیا۔ اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہی گہری نظریں جو آر پار ہوتی محسوس ہوتیں جیسے اس کے اندر کے سارے راز کھوجنے والی......کھوج کر کسی فیصلے یا کسی نتیجے پر پہنچنے والی نظریں......اسے گھبراہٹ ہونے لگی......اس وقت اسے خود اپنا آپ بہت گرا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ فطرتاً اندر باہر سے ایک کھوٹ سے پاک لڑکی تھی۔ اسے دوغلے لوگوں سے نفرت تھی لیکن آج وہی دوغلا پن اپنانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اس کے مساموں میں نمی اتر آئی۔
''انمول ایک بات بتاؤ......کیا سچ میں یہی وجہ ہے؟ کوئی اور بات تو نہیں جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو؟'' اس نے سرسراتی سی آواز میں اس سے پوچھا۔
''نن......نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں......'' اس کی زبان ہلکی سی لڑکھڑا گئی۔
''مجھے لگ رہا ہے کہ تم میرے گھر والوں کے ساتھ ایزی فیل نہیں کر رہیں......تمہیں ان کے ساتھ رہنا اچھا نہیں لگ رہا......اسی لیے جانے سے منع کر رہی ہو۔'' ذہن میں کلبلاتے سوال کو بالآخر اس نے زبان دے ہی دی۔
''ارے......نہیں تو......ایسی تو کوئی بات نہیں......''
وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کے اندر کے راز کو پا چکا ہے اس کے خدشے کی نوعیت سن کر بے ساختہ مسکرا دی۔ جنید نے والہانہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''تمہیں پتا ہے انمول تم مسکراتے ہوئے بہت پیاری لگتی ہو......جیسے کوئی کلی چٹک رہی ہو......کوئی ان چھوئی، نوخیز سی کلی......'' اس کے لہجے میں خمار سا بھر گیا۔ وہ جو اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا نہ جانے کب اس کے بے حد قریب ہوگیا تھا۔
''جنید پلیز......ایمل چائے لے کر آنے والی ہوگی......'' اس نے احساس دلایا تو وہ کچھ سنبھل کر پیچھے ہٹ گیا۔
''یار......میں چائے پینے کے موڈ میں نہیں ہوں......

میں...... تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں...... چلو آؤٹنگ پر چلتے ہیں......'' اس نے فوری فیصلہ کیا۔

''اس وقت؟ جنید میں ابھی بالکل بھی تیار نہیں ہوں...... میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے مگر تم نے بتایا نہیں......'' اس نے یاد دلایا۔

''آں...... ہاں کیا پوچھا تھا؟'' اس کے حواس خوابیدہ سے ہو رہے تھے۔

''اچھا...... وہ...... تم فکر نہ کرو...... میں کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گا...... لیکن کل اس وقت تیار رہنا، میرے ساتھ آؤٹنگ پر چلنا......'' اس بار اس نے پوچھا نہیں صرف آرڈر دیا تھا۔ انمول کو بادلِ ناخواستہ حامی بھرنی پڑی۔ اسے ڈپلومیسی سے کام لے کر اس سے اپنی بات منوائی تھی۔ اسی وقت صائمہ آنٹی چلی آئیں اور جنید کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''ارے ابھی تو آئے تھے، کیا ہوا؟'' انہوں نے تشویش سے انمول کو دیکھا مگر وہ بالکل سکون سے بیٹھی تھی۔

''جی آنٹی، ایک ضروری کام یاد آ گیا۔ کل آؤں گا ان شاء اللہ......'' اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

''اچھا...... چائے تو پی لیتے...... ایمل نے بنالی ہے چائے......'' صائمہ آنٹی نے اصرار کیا۔

''اور میں چائے بنا کر لے بھی آئی۔'' ایمل ٹرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئی اور نعرہ لگا کر کہا۔

''تمہاری چائے ادھار رہی...... پھر کبھی سہی۔'' جنید نے عجلت میں کہا۔

''جی نہیں...... ادھار محبت کی قینچی ہے...... محبت میں کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا۔'' ایمل نے شگفتگی سے جواب دیا۔

صائمہ آنٹی اور ایمل کے اصرار پر اسے چائے پینے کے لیے رکنا پڑا اور یہ اضافی وقت انمول کے لیے دوبھر ہوگیا۔ وہ سارا وقت نظر بچا، بچا کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ انمول نے گھبرا کر پانی کا گلاس منہ سے لگالیا۔ وہ پانی پی کر سیراب ہوگئی اور جنید کی نظروں کی پیاس اسی قدر بڑھ گئی تھی۔

''اچھی سی تیار ہونا کل شام کو......'' چلتے وقت اس نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ اور انمول کلس کر رہ گئی۔

☆☆☆

اپنے خوابوں کے تعاقب میں بھاگتے، بھاگتے وہ جانے کس انجان نگر میں نکل آئی تھی کہ جہاں نہ سر پر آسمان نظر آرہا تھا، نہ زمین قدموں تلے جمی ہوئی تھی۔ ڈھلتی دھوپ بادام کے درخت کے چوڑے سرخ سبز پتوں پر چمکتی اسے گزرے دن یاد دلا رہی تھی۔ اس کی یادوں کے دریچوں میں صرف ایک ہی شخص براجمان تھا...... یوسف کی شبیہہ نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑادی۔

''کیا میں اپنے من کی مراد پالوں گی۔'' اس نے خود سے سوال کیا۔ وہ اس وقت اکیلے چھت پر بیٹھی تھی.

''ارے کیا اکیلے، اکیلے بول رہی ہو؟ مل تو گئی تم کو من کی مراد اور اب کیا چاہیے۔'' ایمل نہ جانے کب وہاں آئی کہ اس کی یہ آواز سرگوشی سن لی۔

''پلیز ایمل اپنا بے تکا لیکچر شروع نہ کر دینا۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''انمول، انمول...... میں تمہاری دشمن تو نہیں...... میں تمہاری بہن ہوں، تم سے محبت کرتی ہوں۔'' ایمل اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی اور اس کے شانے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ دیا۔

''بہت اچھا ساتھ دے رہی ہو تم۔'' وہ استہزائیہ ہنسی۔

''تم سے اچھی تو جویریہ ہے، کم از کم میری فیلنگز کو سمجھ تو رہی ہے۔'' وہ اپنی بہن سے ہی بدگمان تھی۔ ایمل کو بے حد افسوس ہوا۔

''سوری انمول...... تمہاری دوستی میں خود اس کی بھی آنکھیں بند ہوگئی ہیں۔ اگر وہ دل کے بجائے دماغ سے کام لے تو ایسا مشورہ نہ دیتی بھی تمہیں...... تمہاری غلط بات پر تم کو ضرور ٹوکتی......'' ایمل بولنا شروع ہوئی۔

''پلیز ایمل...... نو لیکچر......'' وہ بیزاری سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بے رخی سے نیچے کی طرف جانے لگی۔

''انمول...... رکو میری بات سنو...... خدارا خوابوں کی دنیا سے نکل آؤ...... یہ جو کھیل تم کھیل رہی ہو یہ آگ اور پانی کا کھیل ہے۔ یاد رکھو آگ اور پانی کا کوئی میل نہیں ہوتا...... تمہاری جگ ہنسائی ہوگی انمول اور تم یہ رسوائی سہہ نہ پاؤ گی، کیوں کر رہی ہو۔'' ایمل جیسے ضبط کھو بیٹھی ایک دم بلند آواز سے چیخ پڑی تھی اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی، تڑپ تھی۔ آنے والے بھیانک دنوں اور کالی راتوں کا خوف تھا۔

مگر انمول جیسے سب سے بے نیاز، بس اپنے خوابوں کو چھین کر حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کی شوریدہ سر تمنائیں، ادھورے خواب، ناکام حسرتیں، ہجر کی دوشیزہ کا روپ دھارے، زلفیں بکھرائے سر پٹخ رہی تھیں۔

چار سو تنہائی، خاموشی اور تاریکی تھی...... وہ اپنی محبت کی شاہراہ پر تنہا کھڑی تھی...... گہری شام میں چاند کا سفر شروع ہو چکا تھا۔

در بدر بھٹکتا تنہا چاند...... اسے اپنا آپ بھی اس چاند کی طرح لگا۔ دل بے اختیار بھر آیا اور وہ سسک پڑی...... ایمل کی باتوں نے اس کا دل دکھا دیا تھا۔ وہ اپنے خوابوں میں اپنی مرضی کے رنگ بھرنا چاہتی تھی اور بہت... پُرامید بھی تھی مگر ایمل کی حوصلہ توڑنے والی باتوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ ایمل کہہ سن کر خود نیچے جا چکی تھی۔

''ارے کیا ہوا...... کیوں رو رہی ہو؟'' یوسف جانے کب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جو ایک آن میں تمام حدود کو پھلانگتا اس تک پہنچ گیا تھا۔

''یوسف...... میں بہت پریشان ہوں...... یہ کام آسان نہیں لگ رہا...... ہم یہ کیسے پہنچ کر پائیں گے......'' اس کے لہجے میں حد درجہ پریشانی تھی۔

''ہاں...... مشکل تو ہے مگر ناممکن نہیں...... اگر مجھے آنے میں دیر نہ ہوتی تو یہ سب نہ ہوتا...... پہلے ماں جی کی طبیعت خراب ہوگئی پھر ماموں نے وہاں بلا لیا کیونکہ شمع جی کی طبیعت بگڑ گئی تھی...... مگر تم گھبراؤ مت، ہمارے پاس ایک راستہ ہے۔'' یوسف بھی بہت کچھ سوچ کر آیا تھا اس کے پاس۔ ''گاؤں میں جو زمین میرے نام ہے میں اسے بیچ کر چھوٹا موٹا اپارٹمنٹ لے لوں گا اس طرح رہائش کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا لیکن آگے اور بہت سے مسائل ہوں گے جن کو فیس کرنا پڑے گا...... پتا نہیں کیوں ہو گیا یہ سب۔'' بات کرتے، کرتے اس نے ملال بھرے انداز میں اپنی ہتھیلی پر مکا مارا۔

''اچھا خاصا اماں کو راضی کر لیا تھا میں نے کہ میں اپنی پسند سے شادی کروں گا۔ اب یہاں تو صورت حال بدل گئی۔ اماں کسی شادی شدہ، مطلقہ لڑکی کے لیے بھی راضی نہیں ہوں گی۔ جو کرنا ہے ہمیں ہی مل کر کرنا ہے۔'' یوسف نے جذباتیت سے کہا۔

''یوسف......!'' انمول نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ یوسف نے انجانے میں اس کو مطلقہ کہہ کر اس پر سنگ باری کر دی تھی۔

''یہ اسٹیپ میں تمہارے لیے ہی اٹھا رہی ہوں یوسف...... کم از کم تم تو مجھے مطلقہ نہ کہو۔'' اس کی آواز کانپ سی گئی۔

''سوسوری انمول...... میرے منہ سے خود بخود نکل گیا...... لیکن انمول میں تو دنیا والوں کی زبان بول رہا تھا۔ میرے دل میں تمہارا مقام بہت اونچا ہے۔ آگے ہمارے لیے ایک تنگ اور پتھریلا راستہ ہے لوگوں کی انگلیاں اٹھیں گی تم پر...... ہم کو وہ سب بھی برداشت کرنا ہوگا انمول......'' اس نے بے رحمی سے حقیقت کا پردہ چاک کیا کہ انمول تڑپ ہی گئی۔

''یوسف مجھے ڈر لگ رہا ہے...... یہ سب کیسے ہو گا؟'' اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

''میرے ہوتے کیوں ڈر لگ رہا ہے تمہیں...... میں تمہارے ساتھ ہوں...... ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا کبھی۔'' وہ اس کے بے حد نزدیک آ گیا۔ اس کا سرد ہاتھ تھام لیا جو ہولے، ہولے کپکپا رہا تھا۔

''فکر نہ کرو۔'' اس کے وجود کے گرد بازو پھیلا کر اس نے اسے قریب کر لیا۔ اس کے اندر کہیں کوئی کرلایا۔ اس کی روح جیسے بھاری بوجھ تلے کراہی...... اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے اگلے ہی پل یوسف کو پیچھے دھکیل دیا۔

''یوسف...... یوسف کہیں ہم غلط تو نہیں کر رہے......'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

''کیا غلط...... ہم غلط نہیں ہیں انمول...... ہمارے ساتھ غلط کیا گیا ہے...... وہی لوگ جن کی انگلیاں اٹھانے سے تم ڈر رہی ہو، انہی لوگوں نے تم کو سولی پر چڑھایا ہے...... یہ روایتوں کے ٹھیکیدار اور دوسروں کے خوابوں کے بیوپاری ہیں...... یہ صرف تماشا دیکھتے ہیں...... مزہ لیتے ہیں۔ زندگی ہماری ہے، کوئی کھیل نہیں ہے...... اس زندگی کو ہمیں جینا ہے۔'' یوسف کی باتوں نے اس کے حوصلے کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا سا دے دیا۔

''چھوڑو یہ فکر، پریشانی...... آؤ ہم اچھی، اچھی باتیں کریں...... خوابوں کی، چندا کی، تاروں کی چاندنی

کی، شفق کی بارش اور سمندر کی، ساگر کی، پیار کے دریا کی۔"
اس کی سماعتوں میں محبت کی رم جھم رس گھولنے لگی...... وہ ساری رات کیف و سرور کی رات تھی جس میں یوسف کی سرگوشیاں اس کے من کو گدگداتی رہیں۔
صبح وہ خلافِ معمول کچھ خوش تھی۔ ایمل اس سے کھنچی، کھنچی اور خفا سی تھی۔ اسے اپنے کل والے رویے کی بدصورتی کا احساس شدت سے ہوا۔
"ایمل...... آئی ایم سوری...... اس وقت میں بہت ڈسٹرب تھی...... پلیز ایمل۔" اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔
ایمل جو اس سے بظاہر انجان بنی اپنی وارڈ روب میں کپڑے لٹکا رہی تھی اس کے پیچھے کھڑے ہو کر اس نے زبردستی اسے اپنی طرف گھما ڈالا۔
ایمل نے بس ایک گہری نظر سے اسے دیکھا...... کیا تھا ان نظروں میں شکوہ، خفگی اور سرد مہری۔
"بس میں نے کل جو سب بکواس کی ہے اسے بھول جاؤ، تم تو میری اچھی سی بہن ہو۔" اس نے پیار سے اس کی تھوڑی کو چھوا مگر خلافِ توقع ایمل نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور دوبارہ الماری کی طرف مڑ گئی۔
"ایمل...... میری اچھی بہن مجھ سے تمہاری بے رخی سہی نہیں جا رہی...... پلیز ایمل...... اب تو مان جاؤ ناں......" وہ ٹلنے پر تیار نہیں تھی۔ ایمل ایک دم ہی اس کی طرف پلٹی اس کی نظروں میں اب تاسف اور ہمدردی تھی۔
"نفس کا بے لگام گھوڑا انسان کو سوائے رسوائی کے کہیں لے کر نہیں جاتا۔ کسی کی خوشیوں کو کچل کر تم اپنا محل بناؤ گی تو تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا انمول...... ایک چھوٹی سی بھول کبھی، کبھی ساری عمر کی سزا بن جاتی ہے۔" اس کے لہجے میں اب بھی ناراضی تھی۔
"اچھا ناں، تم تو پوری نصیحت بیگم لگ رہی ہو...... آج شام جا تو رہی ہوں جنید کے ساتھ آؤٹنگ پر۔" اسے منانے کے لیے اس نے بطورِ خاص بتایا۔
"اچھا......" وہ کچھ تمسخرانہ انداز میں بولی۔
"چھت پر سے کب آئی تھیں نیچے؟" اس کا لہجہ سرسری مگر انداز بہت اجنبی سا تھا۔
انمول کو لگا جیسے اس کے اور ایمل کے درمیان سرد مہری اور اجنبیت کی دیوار کھڑی ہے۔ ایمل کی نظروں میں اس کے لیے ملامت اور ناپسندیدگی تھی وہ ندامت سے مزید کچھ نہ بول سکی۔
"تم آگ سے کھیل رہی ہو انمول...... زندگی بھر پچھتاوؤں کے انگاروں میں جلتی رہو گی تم۔" اس کے لہجے میں ایسی تپش تھی کہ انمول میں اس کی تاب نہ رہی تھی۔ دکھ، نفرت، اجنبیت اور بیگانگی وہ ایک دم ڈھے سی گئی۔
"اس طرح تم خود کو بھی دھوکا دے رہی ہو انمول...... اگر تمہیں یہ رشتہ منظور نہیں تھا تو نکاح نامے پر دستخط سے انکار کر دیتیں...... تم اس پاک اور مقدس رشتے کا مذاق اڑا رہی ہو...... تم جنید سے مخلص نہیں ہو تو اس کو صاف بتا دو...... تم نے اس کو بھی دھوکے میں رکھا ہوا ہے اور بابا کو بھی...... ہمت ہے تو بابا کو سب کچھ بتا دو...... یہ بہتر ہے اس دکھ سے جو بعد میں انہیں ملے گا۔" اس کے لہجے میں کہیں بھی لچک نہیں تھی۔ سرد سے سپاٹ انداز میں کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں اور انمول اپنے ریزہ، ریزہ وجود سمیت پاتال میں گرتی رہی۔
ایمل کی باتوں نے اسے ایک بار پھر متزلزل کر دیا...... وہ پوری جان سے ہل کر رہ گئی تھی۔
وہ محبت اور نفرت کے بھنور میں دائرہ در دائرہ پھنسی بے حال ہو رہی تھی...... وہ نفرت بھی سہہ نہیں پا رہی تھی اور محبت سے دستبردار ہونے کو بھی تیار نہیں تھی۔ یوسف کی جگہ وہ کسی کو نہیں دے سکتی تھی۔
"میں نے کب کسی کی خوشیوں کو کچلا ہے...... سب نے مل کر مجھے برباد کر دیا...... میں بربادِ محبت ہوں، ہاں میں بربادِ محبت ہوں... یوسف ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سب نے ہمارا تماشا بنا دیا ہے، ہمیں کھلونا سمجھ لیا ہے......" دل کسی ضدی بچے کی طرح مچل، مچل کر دہائی دینے لگا۔
"یوسف صرف میرا ہے...... وہ میرا ساتھ دے رہا ہے پھر میں کیوں کسی سے ڈروں......" وہ اپنے جذبات و خیالات کی لہروں کے تلاطم میں کچھ بھی سوچ نہیں پا رہی تھی۔ شام تک اس کا سر بھاری ہو گیا تھا۔ اس کا اب ارادہ بدل گیا تھا۔ وہ جنید کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جنید کو کھل کر صاف، صاف بتا دے گی۔ آج وہ جنید کے ساتھ یہی سوچ کر باہر جا رہی تھی۔

اس نے ایک کپ گرما گرم چائے پی اور پھر دل لگا کر جی جان سے تیار ہوئی۔ زعفرانی اور سرخ رنگ کی آمیزش کے خوب صورت سوٹ میں جیسے وہ نکھر سی گئی تھی لیکن اسے ایمل کی عجیب نظروں سے الجھن ہو رہی تھی۔

''نہ دو تم میرا ساتھ، میں خود ہی کچھ کرلوں گی اور جنید کو سب کچھ بتادوں گی۔'' اس نے دل ہی دل میں کلس کر ایمل کو مخاطب کیا۔

پہلی بار ایسا ہوا کہ جنید کی آمد پر اس کو الجھن محسوس نہ ہوئی۔ آر یا پار اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔

''جو ہو سو ہو..... طوفان آکر گزر ہی جائے گا۔'' اس نے خود کو سمجھالیا۔ باہر سے آوازیں آرہی تھیں۔ صائمہ آنٹی اور ایمل، جنید سے باتیں کررہی تھیں۔ وہ جان بوجھ کر کمرے میں رکی رہی جب تک کہ بلاوا نہ آجاتا۔

اسی وقت صائمہ آنٹی کمرے میں چلی آئیں اور اسے یوں نک سک تک تیار اور ہشاش بشاش دیکھ کر ٹھنک گئیں اور ہلکے سے مسکرادیں۔

''جنید آگئے ہیں بیٹا.....'' انہوں نے اطلاع دی۔

''جی مجھے معلوم ہے، میں بس آہی رہی تھی۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''سامان پیک کرلو..... بیٹا جو بھی تھوڑا بہت ہے، ایمل کے ساتھ مل کر پیک کرلو..... وہ جلدی میں ہے ارجنٹ جانا ہے تمہیں، وہاں وکیل صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے..... تمہیں فوراً جانا ہوگا۔'' صائمہ آنٹی کی اگلی بات سن کر اس کے ہوش و حواس ٹھکانے پر آگئے۔

''جی..... کیا.....؟ مگر..... لیکن وہ۔'' اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ وہ کچھ بول پارہی تھی۔ اس کے سارے ارادے، عزائم اور منصوبہ بندی کو خاک کر کے تقدیر ایک بار پھر اسے بے دست و پا کرچکی تھی۔

''ارے، اگر مگر کا ٹائم نہیں ہے..... جلدی نکلنا ہے تم لوگوں کو۔'' صائمہ آنٹی نے تاکید کی۔

''مگر بابا.....'' وہ اپنی بات مکمل نہ کرپائی۔

''تمہارے بابا کو فون کردیا ہے پہنچنے والے ہوں گے، اس وقت اہم بات یہ ہے کہ تم کو فوراً جانا ہے..... بابا سے فون پر بھی بات کرسکتی ہو بعد میں۔ جانے کب عقل آئے گی تمہیں۔'' انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر ایمل نے جلدی، جلدی سارا سامان پیک کردیا۔ وہ تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے زندگی کے بدلتے رنگ دیکھ رہی تھی۔ اس نے سوچا کچھ اور تھا اور ہو کچھ اور رہا تھا۔ روانگی سے پانچ منٹ پہلے وقار صاحب بھی آگئے۔ صائمہ آنٹی اور وقار صاحب اپنی گاڑی میں ان دونوں کو اسٹیشن لے کر گئے..... سارے راستے اسے چپ لگی رہی۔ آناً فاناً صورتِ حال ہی بدل گئی تھی۔

وقت تو جیسے اس کی مرضی اور موڈ کے تابع تھا..... وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ ہر فیصلہ اپنی مرضی سے کرسکتی ہے لیکن منشائے رب کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ سارا سفر خاموشی سے گزرا۔ وہ اس دھچکے سے نکل ہی نہیں پارہی تھی۔

''کیا یار انمول ..... بور کردیا تم نے تو..... کچھ تو بولو بھئی.....'' جنید نے ایک دو بار اس سے فرمائش کی۔ مگر وہ کیا بولتی..... وہ تو مہر بہ لب بیٹھی پلٹی ہوئی بساط پر غور کررہی تھی۔

''اچھا..... تھوڑا سا مسکرا ہی دو.....'' اس نے اگلی فرمائش کی تو وہ تپ گئی۔ بیزار نظروں سے اسے دیکھا اور منہ دوسری طرف کرلیا۔

''یار لوگ سمجھیں گے کہ میں تم کو اغوا کر کے لے جارہا ہوں.....'' چند ساعتوں کے بعد اس کے بالکل قریب اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اسے اس کی بے تکلفی اور قربت سے الجھن ہونے لگی۔

''پلیز، میرے سر میں درد ہو رہا ہے بہت۔'' وہ چڑ کر بولی۔

کل کے شیریں لہجے کے برعکس اس کا لہجہ اب بالکل بدل گیا تھا مگر اپنی خوشی میں جنید کی اٹکھیلیاں ختم نہ ہو رہی تھیں۔

''پھر سر میں درد..... ارے یار..... اوکے ٹھیک ہے، اب شکر ہے کہ تم کچھ تو بولیں اور قسم سے خالص بیویوں کی طرح بولی ہو۔ اچھا ہے لوگوں کی غلط فہمی تو دور ہوگئی ہوگی ورنہ وہ ہم کو کچھ اور سمجھ رہے تھے..... یعنی ایک لڑکا اور ایک لڑکی.....'' وہ شرارتی انداز میں بولا۔

''جنید پلیز.....'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو غصے میں بھی..... یار

غصہ نہ کرو زیادہ...... میں نے جان بوجھ کر تھوڑی کیا ہے سب......بس ابا جی کی بیماری کی وجہ سے تمہیں ایسے اچانک لے جانا پڑا......تم فکر نہ کرو تمہارا سرٹیفکٹ میں نکلوا دوں گا، چچا سے کہہ دوں گا......وہ کروا دیں گے یہ کام۔'' وہ دھیرے، دھیرے سمجھانے لگا لیکن وہ ترچھا رخ کیے منہ پُھلا کر بیٹھی رہی۔ اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اس کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا۔ اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے کچھ سکون سے آنکھیں موند لیں مگر بند آنکھوں تلے یوسف کی مسکراتی شبیہہ اسے بے چین کر گئی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو سامنے جنید کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے کپ اور لفافے میں بسکٹ تھے۔

''میڈم کے لیے چائے لے کر آیا ہوں......پکڑو جلدی سے اپنا کپ......'' اسے لامحالہ کپ تھامنا پڑا۔ سارے راستے وہ اسی طرح اس کی ناز برداری کرتا رہا اور وہ ویسی ہی بیزار اور لاتعلق بیٹھی رہی۔

ریل کا سفر اس کے لیے دوبھر ہو گیا تھا۔ سر میں سچ مچ درد ہونے لگا تھا مگر اس سے کہیں بڑھ کر وہ درد تھا جو اس کے دل میں بسا ہوا تھا۔ بند آنکھوں تلے اشکوں کا چراغاں ہوتا رہا اور وہ اپنی آنکھیں رگڑتی رہی۔

زندگی کی گاڑی ایک بار پھر پٹڑی بدل چکی تھی۔ وہ تو اپنی منزل کو پانے کے لیے اندھا دھند دوڑ رہی تھی مگر نہ جانے کیسے کانٹا بدل جاتا......اور پٹڑی بدل جاتی......کہ وہ واپس اسی راستے پر پہنچ جاتی جہاں جانا نہیں چاہتی تھی۔ گھر پہنچنے پر آپا خاتون نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ وہ لب بھینچے ضبط کی تصویر بنی سرد مہری سے سب سے ملی، وکیل صاحب ناسازیٔ طبع کے باعث صاحبِ فراش تھے۔

''اب اتنے بھی بیمار نہیں جتنا کہ ڈراما کیا گیا ہے۔'' اس نے تنفر سے سوچا۔

اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھکن کا بہانہ کر کے منہ سر لپیٹ کر پڑ گئی۔ درحقیقت تو وہ ایک بار پھر ہجر کا کرب سہہ رہی تھی اور اپنی ناکام ہوتی محبت کا سوگ منا رہی تھی۔ اس نام نہاد رشتے سے پیچھا چھڑانا اتنا آسان نہیں لگ رہا تھا جتنا کہ وہ سمجھ رہی تھی۔

جنید کب کمرے میں آیا اور کب سویا، کب تک جاگتا رہا ہوگا اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ رات کے دوسرے پہر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے کروٹ بدلی تو قریب ہی جنید سو رہا تھا۔ اس کی اس جسارت پر اسے شدید غصہ آیا۔ اٹھنا چاہا تو ایک بار پھر چونک گئی۔ اس کے ہاتھ پر جنید کا ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے سرعت سے ہاتھ کھینچنا چاہا مگر ناکام رہی......الجھ کر جنید کو دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں مگر لبوں پر شریری مسکراہٹ تھی۔ اچانک اس نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ نیند کے خمار میں بھری آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے اور نگاہوں میں تقاضا تھا۔

''کہاں بھاگ رہی ہو؟ ہم......'' وہ غنودہ سی آواز میں بولا۔

''کک......کہیں نہیں، مجھے پیاس لگ رہی تھی۔'' اس کا حلق یک دم ہی خشک ہو گیا۔

''پیاس......ارے مگر پیاسا تو میں بھی ہوں......میری پیاس کون بجھائے گا۔'' اس کی نظروں میں نشہ سا ڈول رہا تھا۔

انمول نے پوری قوت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بلاوجہ کھانسنے لگی یہاں تک کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان آنسوؤں میں ناکامی اور محرومی تھی۔

''ارے انمول کیا ہوا......؟'' جنید سچ مچ پریشان ہو گیا۔

''پانی پلیز......پلیز پانی......'' وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔ جنید نے فوراً روم فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور اسے گلاس میں ڈال کر پانی دیا۔ انمول نے دو چار گھونٹ بمشکل لیے مگر اب اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔ جنید بیچارگی سے اسے دیکھنے لگا۔

''اچھی مشکل پلے پڑ گئی......اس کے تو آنسو ہی نہیں رکتے......جب دیکھو برسات......'' اس نے بیزاری سے سوچا۔ ''اب کیا ہو گیا بھئی......کیا مسئلہ ہے آخر......؟'' وہ خواب زدہ آنکھوں میں لاچاری سمو کر اسے دیکھنے لگا۔

''جنید......میں نے ابھی ایک بہت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے سوری......'' اسے بروقت بہانہ سوجھ گیا۔

''اُف......اب یہ رات بھی ڈراؤنے خواب کی نذر......'' جنید نے ٹھنڈی حسرت بھری سانس بھر کر اسے دیکھا۔

اُدھر انمول کو اب خود پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ جنید سے دوٹوک بات کرنے کے بجائے الٹے سیدھے جواز پیش کر رہی تھی۔

''اٹس او کے...... ریلیکس رہو...... اماں کہتی ہیں کہ برا خواب آئے تو اعوذ باللہ پڑھ کر بائیں طرف تھتکار دیا کرو......'' اس نے بمشکل اپنے جذبات کو تھپک کر اسے دلاسا دیا۔

''سنو...... وہ مجھے ایک بات کرنی ہے تم سے۔'' بالآخر ہمت کر کے اس نے دوٹوک بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

''رات کے تین بجے کون سی ایسی بات کرنی ہے تم کو...... ہاں بولو کیا بات ہے۔'' جنید نے چڑے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''وہ اصل میں ناں...... بات یہ ہے کہ...... کہ اصل میں ناں اگر میرا کوئی کام ادھورا رہ جائے تو میں بہت ڈسٹرب ہو جاتی ہوں...... اور...... اور مجھے اس طرح برے، برے خواب آتے رہتے ہیں......'' وہ کہنا کچھ چاہتی تھی مگر بول کچھ اور رہی تھی۔

''تو......؟'' جنید نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

'' تو پھر یہ کہ...... وہ میرا سرٹیفکیٹ ہے ناں...... جب تک وہ نہیں نکلے گا تب تک میں اپنا کوئی ذاتی کام اور ذاتی خوشی پوری نہیں کر سکتی...... کیونکہ وہ میں نے منت مانی ہوئی ہے کہ جب تک سرٹیفکٹ نہیں نکلواؤں گی تب تک......'' وہ تھوک نگل کر مزید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پائی۔ جنید کے چہرے پر ناقابلِ فہم تاثرات ابھر آئے۔

''میں سمجھ رہا تھا کہ تم صرف دیکھنے میں ہی سیدھی لگتی ہو مگر تم تو اچھی خاصی بیوقوف ہو۔'' اگلے پل وہ برہمی سے گویا ہوا۔ انمول نے چونک کر اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھے، دل ڈول سا گیا۔ وہ اسے جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ تمہاری عجیب و غریب تاویلیں میری سمجھ سے باہر ہیں...... تمہارا بچپنا ہی نہیں گیا ابھی تک...... یہ کیسی فضول باتیں کر رہی ہو تم؟'' وہ ڈپٹ کر بولا۔ ''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم کچھ چھپا رہی ہو؟ کوئی مسئلہ ہے تمہارے ساتھ شاید دیکھو خود کو جتنا چھپاؤ گی لوگ تم کو اتنا ہی... کھوجیں گے۔ بولو کیا بات ہے؟'' اس کے لہجے میں سختی تھی۔ انمول کے رکے ہوئے آنسو پھر برس پڑے۔ اس بار وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اتنے آگے آ کر محبت کے سب سے آخری مقام پر پہنچ کر وہ خود کو بے بس اور کمزور محسوس کر رہی تھی۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا وہ کسی دوسرے کے لیے تو کیا خود اپنے لیے بھی کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔

''اوہ نو یار......'' جنید نے بیزاری سے ہتھیلی پر مکا مارا۔

''اب میں نے کیا کہہ دیا آخر......'' وہ جھنجلا کر بولا۔ جذبات کا خمار اتر گیا تھا اب اس کے مزاج میں... چڑچڑاہٹ سی آ گئی تھی۔

''مجھ سے آج تک کسی سے اونچی آواز...... میں بات نہیں کی اور تم مجھ پر چلّا رہے ہو؟'' وہ خود پر قابو پا کر بولی۔

''واٹ......؟ میں چلّا رہا ہوں؟'' وہ متحیر رہ گیا۔ وہ خاموش رہی کچھ نہ بولی۔

''میں ایسی ہی ہوں...... میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے تو کوئی بھی ٹھیک نہیں کر سکتا۔ جب تک میرا سرٹیفکیٹ نہیں آئے گا میرا موڈ ٹھیک نہیں ہوگا......'' اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

جنید چند ساعت تک اسے دیکھتا رہا...... انمول کی شخصیت میں کہیں کچھ کمی لگی...... اسے اس بے ضرر سی لڑکی میں گہرا بھید نظر آ رہا تھا مگر وہ اس تک پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ اب جنید کی شکی اور گہری نظروں سے انمول کچھ گھبرا سی گئی۔ اس نے گھبرا کر نظر بچائی اور دوسری سمت دیکھنے لگی۔ اس کی نم آنکھوں میں اتری گلابیت، چہرے پر پھیلا ہراس و اجتناب اور کچھ الجھی لٹیں اسے مزید دلکش بنا رہی تھیں۔ جنید اسے دیکھتا ہی رہ گیا اور ایک بار پھر اس نے خود کو اس کے آگے بے بس پایا۔ اس کا چین قرار لوٹنے کے بعد وہ اتنی معصوم بن جاتی کہ جنید سے کچھ بن نہ پاتا...... اب بھی یہی ہوا۔

''اٹس او کے...... موڈ ٹھیک کر لو اپنا...... ریلیکس رہو...... لیکن مائنڈ اٹ پلیز اب کبھی ایسا نہ ہو......'' اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ ''موڈ صرف تمہارا ہی خراب نہیں ہو سکتا، میرا بھی ہو سکتا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس نے سرگوشیانہ سے انداز میں کہا۔ اس کا انداز دھمکی آمیز تھا...... جیسے آخری وارننگ دے رہا ہو...... انمول کے وجود میں کپکپاہٹ سی ہوئی۔ اس کے بعد وہ رکا نہیں اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

انمول کمرے میں تنہا رہ گئی۔ اس نے گہری سانس بھری۔
وہ ان حالات سے لڑتے، لڑتے تھکنے لگی تھی۔ اس کے اعصاب شکستہ ہو رہے تھے۔ کافی دیر تک اس کی واپسی نہ ہوئی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی دروازے تک گئی۔ تھوڑا سا دروازہ کھول کر جھانکا...... باہر نیم تاریکی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گھر کے سب نفوس سو رہے تھے۔ وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ لاؤنج میں ہلکی روشنی کا جھماکا دیکھا تو دروازے سے جھانکا وہ صوفے پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں ریموٹ تھا اور چینل پر چینل بدل رہا تھا۔

انمول کو اپنی کمزوری پر ایک بار پھر غصہ آیا۔ وہ چاہنے کے باوجود اس سے صاف بات نہ کر پائی تھی۔ اسے تقدیر نے مات دی تھی وہ اپنی تدبیر سے حالات بدلنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

وہ جنید کے سامنے یہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی اس نے واپس نہ آنے کا ارادہ کر رکھا تھا مگر وہ ایک بار پھر جنید کی طرف دھکیل دی گئی تھی۔ وہ دبے پاؤں واپس کمرے میں آگئی...... بیگ سے اپنا موبائل نکالا۔ کمرے کے دروازے سے پشت لگا کر کھڑی ہوگئی اور موبائل کھول لیا۔

یوسف کے ڈھیروں میسج تھے...... اس کا دل بے ترتیب سا دھڑکا...... یقیناً وہ بھی اس کی طرح بے قرار تھا۔ اس کے لیے تڑپ رہا تھا...... لیکن میسج پڑھتے کے ساتھ ہی اس کی رنگت بدل گئی۔

''بے ایمان، دھوکے باز لڑکی...... چلی گئیں پھر دوبارہ......''

''ہمارے درمیان یہ معاہدہ نہیں ہوا تھا۔''

''تم مجھے بتائے بغیر اور ملے بغیر ہی چلی گئیں اس لنگور کے ساتھ۔''

''تم ایک بار سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟ تم اس کے ساتھ ہو یا میرے ساتھ۔''

''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم چلی جاؤ گی...... مجھے تمہارا یقین نہیں رہا اب......''

''تم کو دوبارہ جانے کی کیا ضرورت تھی...... تم کیسے برداشت کر رہی ہو اس لنگور کو...... میں یہاں انگاروں پر لوٹ رہا ہوں...... جل رہا ہوں میں...... تم صرف میری ہو...... مگر مجھے لگتا ہے کہ تم میری نہیں رہیں...... تم...... تم فراڈ کر رہی ہو میرے ساتھ۔''

''بتاؤ مجھے تم کیوں چلی گئیں...... میری نیت میری محبت تو صاف ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ تمہارا دامن صاف نہیں رہا۔'' اور بھی نہ جانے کتنے ایسے ہی میسجز تھے۔ بے ربط...... سے، الٹے سیدھے میسجز......

انمول کا پارا چڑھنے لگا...... غصے، دکھ اور حیرت سے اس کا برا حال ہو گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب یوسف نے لکھا ہے۔ الزام تراشی، شک و شبہ، طنز، طعنے اور بے اعتباری، سبھی کچھ تھا اس کی باتوں میں۔ وہ نڈھال سی ہوگئی۔ اسے اپنے وجود سے روح سلب ہوتی محسوس ہوئی۔ جیسے سب کچھ ختم ہو گیا۔ آج محبت نے محبت کو پامال کر دیا تھا۔ خود اپنی ہی نظروں سے گرا دیا تھا۔

نہ جانے کب، کس طرح وہ بیڈ تک آئی...... اس کے نیم جاں وجود میں سکت نہیں رہی تھی۔ اس نے جیسے تیسے موبائل کو بیگ میں کپڑوں کے نیچے چھپایا اور خود بیڈ پر ڈھیر ہوگئی۔ وہ جیسے خود سے بھی بے خبر ہوگئی تھی۔ اس نے یوسف کے کسی بھی میسج کا جواب نہیں دیا تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ وقت کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ جنید کمرے میں موجود نہ تھا۔ اس کے سوئے ہوئے اعصاب یک دم چوکنا ہو گئے۔ وہ بہت گہری نیند کے بعد جاگی تھی کہ ذہن اب تک بوجھل تھا لیکن اسے یاد آ گیا تھا سب کچھ۔

جنید کے ساتھ کی گئی باتیں اور اس کے بعد یوسف کی دل دکھانے والی باتیں...... وہ کمبل ایک طرف ہٹا کر اٹھ گئی۔ لائٹ جلا کر وقت دیکھا تو اوسان خطا ہو گئے۔ گھڑی کی سوئیاں 1 بجا رہی تھیں۔

''دوپہر کا ایک بجا ہے یا رات کا......؟'' اسے اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ دن کی اجلی روشنی چہار طرف پھیلی تھی۔ اسے کچھ اطمینان ہوا۔ واش روم جا کر منہ ہاتھ دھویا پھر اندر کمرے میں آکر بال بنائے۔ ملگجے سے لباس پر تنقیدی سی نظر ڈالی۔ اس کا ہینڈ کیری بیگ اور سفری اٹیچی میں سامان ابھی تک پیک تھا لیکن کچھ ملبوسات الماری میں بھی

موجود تھے۔ اس نے ایک جوڑے کا انتخاب کرلیا۔ کپڑے بدل کر کچھ دیر سوچتی رہی۔ جنید کی آمد کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اس کی غیر موجودگی اس کے لیے باعث سکون ہی تھی مگر اس طرح اس کا بالکل غائب ہونا بھی الجھن میں ڈال رہا تھا لیکن اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔

اگرچہ دل دکھ سے لبریز تھا...... یوسف کی باتوں نے روح میں گھاؤ سے ڈال دیے تھے۔ مگر دکھ، سکھ، خوشی، غم کے ساتھ انسان کا پیٹ بھی اس کے ساتھ لگا ہے...... اس کا مرجانے کو جی چاہ رہا تھا مگر وہ اپنی مرضی سے مر نہیں سکتی تھی، زندہ رہنے کے لیے کچھ لقمے تو زہر مار کرنے ہی تھے۔ وہ آہستگی سے کمرے سے باہر آگئی جہاں زندگی اپنے معمول پر رواں دواں تھی۔ کچن میں پکتے کھانے کی خوشبو سب طرح پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کچھ ہچکچاتی ... کچن کی طرف گئی۔ حورعین اوون پر رکھی پتیلی میں چمچہ ہلا رہی تھی، وہ اس کی آمد سے بے خبر تھی۔

''ارے اٹھ گئیں تم...... بہت تھکن ہوگئی تھی ناں......'' اپنے پیچھے آپا خاتون کی چہکتی پاٹ دار آواز سن کر وہ چونک کر پلٹی۔ ان کی آواز پر حورعین نے بھی پلٹ کر دیکھا...... قریبی کمرے سے حرمین بھی نکل کر آگئی۔

''تو جاگ گئیں آپ......'' حرمین کی آواز میں خوشی کی کھنک تھی۔

''ناشتا بنادوں انمول......؟'' حورعین نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں بناؤ ناشتا جلدی سے...... بھوک سے چہرہ دیکھو کیسا کملا رہا ہے۔'' اس کے جواب دینے سے پہلے آپا خاتون نے حکم جاری کردیا۔

''بیٹھو انمول...... جنید نے منع کیا تھا تم کو اٹھانے سے...... کہہ رہا تھا کہ بہت تھک رہی ہو تم...... وہ خود تو دس بجے ہی چلا گیا تھا۔'' وہ خود سے ہی اسے بتانا شروع ہوگئیں۔ گرم پراٹھا اور آملیٹ سامنے آیا تو وہ خود کو نہ روک سکی...... حورعین نے آپا خاتون کو بھی چائے دی اور خود دوبارہ کچن میں چلی گئی۔

جب تک اس نے ناشتا کیا آپا خاتون دنیا جہان کی باتیں کرچکی تھیں۔ ایسی باتیں جن میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ خود بھی جیسے بیزار سی ہو رہی تھی۔

ناشتے کے بعد وہ حرمین کے ساتھ لان میں آگئی جہاں سب طرف چمکتی دھوپ کا راج تھا۔

''یہ والے پودے جو ہیں ناں یہ سارے بابا کی پسند کے ہیں اور اس طرف دادی کے پسندیدہ پھول لگے ہیں مگر مجھے تو ہمیشہ سے گلاب کا پھول پسند ہے۔'' حرمین روانی سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی۔

''ہوں...... اچھا......!'' اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ اس وقت اسے حرمین کی موجودگی بری لگ رہی تھی۔ وہ اس وقت اکیلے میں اپنے بارے میں، آنے والے وقت کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔

''جو جی چاچو اس لان پر بہت محنت کرتے ہیں...... اس وقت یہ سارے خوب صورت پھول پودے ان کی خاص توجہ کے باعث نظر آرہے ہیں۔ چاچو کو بھی پھول بہت پسند ہیں۔'' وہ موتیا کے پھول توڑتے ہوئے بول رہی تھی۔

انمول نے اسے کوئی جواب نہیں دیا بس خاموشی سے سنتی رہی اور چاروں طرف ناقدانہ نظروں سے دیکھتی رہی۔

''آپ کو کون سا پھول پسند ہے چاچی؟'' حرمین نے پلٹ کر اچانک پوچھا۔ حرمین نے ہاتھ میں موجود پھول قمیص کے دامن میں بھر لیے تھے۔ اپنے اشتیاق میں وہ اس کی بیزاری محسوس نہیں کرپارہی تھی۔

''مجھے......؟'' وہ اچانک سوال پر کچھ گڑبڑا سی گئی۔

''سب ہی پھول اچھے ہوتے ہیں...... موتیا بھی اچھا پھول ہے۔'' اس نے مبہم سا انداز اختیار کیا۔

''واہ...... یہ کیا بات ہوئی، کوئی ایک پھول تو خاص طور پر پسند ہوگا ناں......'' حرمین نے اصرار بھرے انداز میں کہا۔

اسی اثنا میں برابر والے پورشن کے گیٹ کے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی اور اسی پل گیٹ کے باہر سے کسی اجنبی نے جھانکا...... وہ چہرہ اس کے لیے اجنبی ہی تھا مگر نہ جانے کیوں اسے مانوس سا لگا۔

''حرمین...... ذرا باجی کے کمرے سے میری نیلی فائل لاکر دے دو۔'' آنے والے نے بے تکلفی سے حرمین کو مخاطب کیا۔

''جی اچھا......'' حرمین تیزی سے پلٹ گئی۔

وہ خاموش تماشائی کی طرح سب دیکھتی رہی، کچھ

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

شہر	نمبر	شہر	نمبر	شہر	نمبر
کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپورAK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بوروالہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	چوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459		

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

ہی دیر میں حرمین واپس لوٹ آئی، جھولی میں بھرے پھول وہ اندر ہی رکھ آئی تھی۔
''یہ کون ہیں حرمین......؟''اس نے سوال کیا۔
''یہ......وہ......یہ ہمارے کرائے دار ہیں۔''حرمین نے خوداعتمادی سے جواب دینا چاہا مگر زبان لڑکھڑا سی گئی۔
''کرائے دار......مگر وہ تو ابا جی کہہ کر بلا رہے تھے۔''اسے جستجو ہوگئی۔
''پتا نہیں چاچی مجھے، آپ دادی سے پوچھیے گا۔''
حرمین نے جان چھڑائی اور اندر کا رخ کرلیا۔
وہ بہت سے سوالات لیے کمرے میں آگئی۔ سارا دن بور گزرا۔ جنید تو صبح سے ایسا غائب ہوا کہ دوبارہ پلٹا ہی نہیں......جنید کی غیر موجودگی بھی اس کے لیے پریشان کن رہی۔ اکیلے بیٹھ کر یوسف کی دلخراش باتیں یاد آئیں تو آبدیدہ ہوگئی۔ چاہا کہ اس کو کوئی سخت سا جواب دے موبائل نکال کر کھولا......یوسف کی لاتعداد مسڈ کالز تھیں۔ اس کا دل برا ہوگیا۔ زخم ایک بار پھر ہرا ہوگیا......اس نے موبائل کو پھر سائلنٹ پر کرکے بیگ میں ڈال دیا۔ وہ سارا دن سوچ بچار میں گزرا۔ حالات کسی طور قابو میں نہیں آرہے تھے۔ یوسف اور اس کی محبت میں شک کی دراڑ بھی پڑ گئی تھی۔ وہ مخمصے میں تھی کہ آیا اسی زندگی کو قبول کرلے یا واپس پلٹ جائے۔
جنید کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ یہاں تک کہ رات اتر آئی۔ اسے وحشت، گھبراہٹ ہونے لگی۔ جنید کی یہ ...بے رخی اور لاتعلقی اسے بہت کھل رہی تھی۔ اس کی اس خاموشی اور گریز سے اسے الجھن ہورہی تھی۔
''جنید تو ضروری کام سے اسلام آباد گیا ہے، تم کو فون کررہا تھا مگر تمہارا فون بند تھا شاید......موبائل کو سامنے رکھا کرو بیٹا......کوئی ضروری اور اہم بات ہو تو۔''رات کا کھانا کھاتے وقت آپا خاتون نے اسے اطلاع دی۔
''جی......''اس خبر نے اسے چونکا دیا۔
''کہاں گم صم ہو بیٹا، موبائل کہاں ہے تمہارا؟''
آپا خاتون نے استفسار کیا۔
''جی......وہ ابھی سامان بیگ میں ہی ہے۔ میں نے دیکھا ہی نہیں موبائل۔''اس نے جواب دیا۔
''حد ہے......سارا دن گزر گیا۔ اپنا سامان تو سیٹ کرلیتیں پہلے......اب یاد سے موبائل سامنے رکھ لینا......فون کرلے گا وہ تم کو......''انہوں نے ہدایت کی۔
ان کی ساری باتیں اس نے نیم دلی سے سنیں اور خاص توجہ نہیں دی۔ کھانے کے بعد کچھ دیر تک بیٹھنے کا ارادہ تھا مگر کومل اور اذان کی اچانک آمد سے مزید وہاں بیٹھنے پر مجبور ہوگئی۔ محب اور حورعین بھی وہیں موجود تھے۔ نیلم اور امبر، حرمین کے پاس بیٹھی آپس میں سرگوشیاں کررہی تھیں اور کبھی، کبھی کرکے ہنسے جارہی تھیں۔ وہاں سب خوش تھے ایک سوائے انمول کے......وہ ایک مکمل منظر تھا۔ وکیل صاحب بھی بڑے شگفتہ موڈ میں اپنے داماد سے بات چیت کررہے تھے بس ایک جنید وہاں نہیں تھا۔ حالانکہ وہ اس کو سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر وہ خود ہی اس کے خیالوں میں چلا آیا۔ وہ بے چین سی ہوگئی لیکن اسے خود اپنی بے چینی کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ ان سب کی باتیں غائب دماغی سے سن رہی تھی شاید وہ اس وقت ان سب کے درمیان موجود ہوتے ہوئے بھی غیر موجود تھی۔
اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ اسے اپنے آس پاس بیٹھے لوگ اپنے رقیب لگ رہے تھے۔ دکھ نئے سرے سے ابھر آیا......محرومی کے اس احساس نے اسے ان سب سے نفرت کرنے پر مجبور کردیا۔
رات گئے محفل برخاست ہوئی تب وہ کمرے میں چلی آئی......جہاں گہری خاموشی تھی۔ سجا سجایا خوب صورت کمرا......مگر اداسی کی دبیز چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ ایپلک کے کام کی دیدہ زیب خوش رنگ بیڈ شیٹ سے مزین بیڈ مگر وہاں ویرانیوں کا ڈیرا تھا۔
وہ چند لمحوں تک بت بنی خالی کمرے کو دیکھتی رہی......اس کا دل آباد نہ ہوا تھا تو کمرا بھی آباد نہیں ہوا تھا۔ عجیب بے رونقی تھی......جنید کا کچھ پتا نہیں تھا اسے اچانک خیال آیا تو اس نے اپنا موبائل نکال لیا لیکن جنید کی کوئی کال نہیں آئی تھی البتہ کچھ نئے میسج آئے ہوئے تھے۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان باکس کھول لیا۔
دل و ذہن میں کدورت اور غصے کا غبار سا بھرنے لگا وہ سب یوسف کے میسج تھے۔''سوری ڈیئر......میں غصے میں نہ جانے کیا کچھ لکھ بیٹھا......''اس کا معذرت بھرا میسج سرفہرست تھا۔

''آئی ایم سوری...... سوسوری...... رئیلی سوری......''
دوسرا میسج یہ تھا۔

''سوری، سوری، سوری، سوری......'' تیسرے میسج میں اسکرین اس لفظ ''سوری'' سے بھری ہوئی تھی۔

اگلے میسج میں ہاتھ جوڑنے والی تصویر بھیج رکھی تھی۔ کوئی اداس شکل کی اور کوئی رونی صورت......

اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب اس کے لبوں پر ہنسی بکھری...... اندر کی یاسیت، اداسی اور بیزاری جیسے آن کی آن میں غائب ہوگئی تھی۔

''اب غصہ تھوک دو اور یہ بتاؤ کہ کب واپس آرہی ہو...... میں تمہارے آنے کے بعد زمین بیچ دوں گا۔ میں نے زمین فروخت کرنے کی بات کرلی ہے، اب تم اپنا پروگرام بتادو......'' آخری میسج میں اس نے آگے کا لائحہ عمل پوچھا تھا۔ انمول نے شانت احساس کے ساتھ آنکھیں موند کر لمبی سانس بھری۔ یوسف کی طرف سے دل میں جو ... بال آیا تھا وہ اس کی اتنی معذرتوں کے بعد دل سے نکل گیا تھا۔ وہ اسے فوری جواب دینا چاہتی تھی مگر ابھی اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اب اسے کراچی جانے کے لیے کیا ڈراما کرنا ہے، جنید سے بات کرنے کے بعد ہی وہ کوئی نیا پروگرام سیٹ کرنا چاہتی تھی۔ اور ابھی تو اسے یوسف کو اور سیدھا کرنا تھا اس لیے اسے نظر انداز کیا اور میسج کا جواب نہ دیا۔

''اچھا ہے پریشان ہو...... مجھے دو دن تک پریشان رکھا اب خود بھی بھگتے۔'' اس نے مسکرا کر سوچا۔

وہ کپڑے بدل کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ اسے لاشعوری طور پر جنید کا انتظار تھا مگر اب اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ اکیلے کمرے میں اسے وحشت ہونے لگی۔ بے شک جنید کی موجودگی سے اسے الجھن ہوتی تھی مگر اب معلوم ہوا کہ اس کا دم غنیمت تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سوچنے لگی۔ کروٹیں بدلتے، بدلتے جانے کس پہر نیند آئی۔ صبح اٹھی تو پپوٹے بوجھل ہورہے تھے۔ جنید رات بھر نہیں آیا تھا۔ اسے تشویش ہونے لگی، وہ واقعی کام سے گیا تھا یا اس سے فرار کی راہ تلاش کی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے موبائل چیک کیا مگر وہاں بھی خاموشی تھی۔ جنید نے اسے کال نہیں کی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے بہت زیادہ محسوس ہورہی تھی جنید کی یہ خاموشی......

''اسے مجھے بتانا تو چاہیے تھا۔'' دل نے کئی بار خاموش دہائی دی۔

''کیوں بتاتا......؟ تم نے کون سا اس کا حق دیا اس کو......'' کسی نے اندر سے اسے گھر کا۔ وہ اپنی سوچ پر خود ہی نادم ہوگئی ساتھ پریشان بھی۔

نہ جانے وہ ایسا کیوں سوچ رہی تھی...... اسے خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ سارا دن ایسا ہی گزرا...... بوجھل...... بے چین اور مضطرب سا...... کومل رات کو گھر چلی گئی تھی البتہ امبر اور نیلم وہیں رک گئی تھیں۔ وہ کمرے سے باہر نکلی تو دن عروج پر تھا اور ساتھ ہی ان سب کی شوخیاں بھی عروج پر تھیں۔

اسے ہاتھوں میں ہاتھ لیا گیا...... سب اسے اہمیت دے رہے تھے۔ نیلم اس سے بات کرنے کو بے چین تھی تو حرمین کو اپنی پڑی تھی۔ انزلہ اس کے نزدیک بیٹھی اس کا سراپا شوق سے دیکھ رہی تھی۔ امبر اسے اپنی مہندی کا ڈیزائن دکھا رہی تھی اور وہ ان سب کی باتوں کا جواب ہوں، ہاں میں دے رہی تھی۔ اسے ان لوگوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو جلد ہی وہاں سے چلے جانا تھا۔

''جنید کو دیکھو کیسے ارجنٹ کال پر بھاگا چلا گیا۔ کسی کمپنی سے ڈیل تھی بس دوڑا چلا گیا۔ نئی دلہن کو چھوڑ کر......'' آپا خاتون اس کی شکل دیکھتے ہی شروع ہوگئیں۔ وہ جز بز ہوتی رہی...... ان کو تو بس بولنے سے مطلب تھا۔ اتنے لوگوں میں بڑی سے بڑی بات کر جاتی تھیں۔

''فون کیا اس نے تم کو......؟'' انہوں نے اچانک سوال کیا۔

''جی...... ہاں...... وہ...... نہیں میرے موبائل میں چارجنگ نہیں ہے۔'' وہ ٹپٹا گئی۔

''کیسا موبائل ہے کہ چارجنگ ختم ہوجاتی ہے۔ جنید آئے تو اس سے کہوں گی کہ تم کو نیا موبائل دلوادے۔'' آپا خاتون نے بہ آواز بلند اپنا فیصلہ سنایا۔

اس نے رشک سے ان کو دیکھا...... اپنی مرضی کی زندگی جی رہی تھیں وہ...... اپنے گھر کی بے تاج حکمران...... اپنے شوہر کے دل پر قابض...... کوئی دکھ نہ درد...... دوپہر سے

سہ پہر گزری اور شام اتر آئی...... جنید کی واپسی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

''یہ مجھے یہاں اکیلے چھوڑ کر خود کہاں چلا گیا؟''

اسے غصہ آنے لگا۔ ''میرے ہر کام میں دیر ہوتی جا رہی ہے، مجھے جلدی یہاں سے نکلنا ہے۔'' وہ خود ہی منصوبے بناتی رہی۔

''میں جنید سے صاف بات کرلوں گی...... میں اسے بتادوں گی کہ میں اسے پسند نہیں کرتی......'' اس نے دل مضبوط کر کے ارادہ باندھا۔

''آر یا پار...... ہوا کرے بدنامی...... ویسے بھی میں کون سا خوش ہوں؟'' وہ ایک بار پھر صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کرتی رہی۔

لاؤنج میں آئی تو کوئی مزاحیہ فلم چل رہی تھی ساتھ ہی چائے کا دور بھی چل رہا تھا۔ آپا خاتون اور وکیل صاحب اپنے کمرے میں تھے۔

''آیئے ممانی...... بیٹھیے...... ہمارے ساتھ مووی دیکھ لیں۔'' نیلم نے پیشکش کی۔ وہاں بیٹھنے کے خیال سے اس کا دم الجھنے لگا۔

''میں ابھی پانی پی کر آتی ہوں......'' اس نے جان بچائی۔

وہ لاؤنج سے نکل کر کچن کی طرف آ گئی جہاں ایک گمبھیر سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ کچھ برتن سنک میں پڑے تھے۔ شیلف خالی تھا البتہ چولہے پر دودھ کی پتیلی اور دوپہر کے کھانے کی دیگچی رکھی ہوئی تھی۔ ابھی وہ کچن کا سرسری سا جائزہ لے رہی تھی کہ دبی، دبی سی ہنسی کی آواز سن کر چونک گئی۔ کچن کا پچھلا دروازہ جو راہداری میں کھلتا تھا نیم وا تھا۔ اس نے جھانک کر دیکھا دیوار سے ٹیک لگائے حرمین کھڑی تھی اور موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ کس سے باتیں کر رہی ہے۔ اس نے دو منٹ کھڑے ہو کر مزید اطمینان کیا اور غور سے اس کی باتیں سنیں۔

''میں ابھی ملنے نہیں آ سکتی۔ آج کل گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں، چاچو کی نئی دلہن آئی ہوئی ہیں گھر میں......'' وہ کسی سے کہہ رہی تھی۔

''نہیں بھئی، اب کوچنگ آنا مشکل ہے۔ دادی ویسے ہی چاچو سے ناراض ہیں۔ اجازت ملنی مشکل ہے۔'' اس نے مزید بات کی۔

''کسی دن کہیں اور جانے کا بہانہ کر کے کوچنگ آ جاؤں گی...... ہاں ٹھیک ہے پھر مل کر بات کریں گے۔'' اس نے پروگرام ترتیب دیا۔

نہ جانے دوسری طرف سے کیا کہا گیا وہ ایک بار پھر دبی، دبی سی ہنسی ہنس دی۔

''بہت وہ ہو تم......'' اس نے اٹھلا کر کہا۔

اس کی بات جاری ہی تھی کہ وہ دبے قدموں اس کے پیچھے پہنچ گئی اور جیسے ہی وہ مسکراتے ہوئے پلٹی تو سامنے کھڑی انمول کو دیکھ کر حرمین کا چہرہ فق ہو گیا۔

''کس سے باتیں کر رہی تھیں حرمین......؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کک...... کوئی نہیں میری دوست تھی؟'' وہ کچھ بدحواس سی بولی۔

''میں نے تمہاری ساری باتیں سن لی ہیں۔'' اس نے آرام سے اطلاع دی۔ حرمین کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے بے یقین نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ڈرو مت...... میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔'' اسے پریشان دیکھ کر اسے رحم آ گیا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ اس نے ابھی، ابھی اسی وقت فوری طور پر آپا خاتون سے اپنی زندگی برباد کرنے کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

''جب ان کی اپنی پوتی گھر سے بھاگے گی اور عزت پر بٹا لگائے گی تب پتا چلے گا ان کو کہ بیٹی کی حفاظت کیسے کرنی چاہیے...... اونہہ بہکانے کے لیے میرے بابا ہی ملے تھے انہیں۔'' اس نے تنفر سے سوچا۔

''وہ میرا کلاس فیلو ہے صرف...... ایسی تو کوئی بات نہیں...... دراصل دادی بہت سخت ہیں......'' حرمین نے تھوک نگل کر صفائی دی۔ انمول کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ بڑا خوب صورت موقع ملا تھا اسے بدلہ لینے کا۔

''مگر مجھے تو یہ فرینڈ شپ لگ رہی ہے بلکہ اس سے بھی اوپر کوئی اور بات......؟'' اس نے پورے وثوق سے کہا۔

''نہیں تو...... وہ تو مجھ سے نوٹس مانگ رہا تھا۔'' حرمین نے جھٹلانے کی کوشش کی۔

''حرمین...... مجھ پر بھروسا کرو...... میں کسی کو کچھ

نہیں بتاؤں گی بلکہ میں تمہاری مدد کروں گی۔'' اس کی... پُرخلوص پیشکش نے حرمین کو حوصلہ دیا۔

''مگر چاچی......'' وہ کوئی اور جواز دینا چاہتی تھی۔

''اونہوں ......نو اگر مگر......جلدی بتاؤ کون ہے وہ......؟ کیا نام ہے اس کا؟ تمہارے کو چنگ میں پڑھتا ہے ناں......'' اس نے شریر سے دوستانہ انداز میں پوچھا جیسے برسوں سے دونوں کی دوستی ہو۔

''دیکھو حرمین مجھے اپنی دوست سمجھو......اگر کوئی مشکل ہوگی تو میں تمہیں اس کا حل نکال کر دوں گی...... تمہیں اس تک پہنچنے کا راستہ دکھاؤں گی۔ میں کنزرویٹو لوگوں میں سے نہیں ہوں......دقیانوسی خیالات نہیں میرے......مجھے اپنا دوست سمجھو حرمین......'' اس کے نرم دوستانہ لفظوں نے جادو سا کر دیا۔ حرمین کو سب بتاتے ہی بن پڑی......اور وہ ساری بات سن کر خفیف سے پُرسوچ انداز میں سر ہلاتی رہی۔

''مجھے بھی ملواؤ کبھی اپنے اُس سے......'' اس نے اشتیاق سے کہا۔ اوپر سے تو وہ مسکرا رہی تھی مگر اندر ہی اندر دل میں ایک کمینی سی خوشی مچل رہی تھی۔ آپا خاتون کو نیچا دکھا کر اسے سکون مل سکتا تھا۔

''چاچی پلیز کسی کو بتانا مت......'' اس نے عاجزی سے درخواست کی۔

وہ مسکرا دی۔ مکڑی اب جال بُن چکی تھی اور اس میں ایک مکھی آ کر پھنس گئی تھی۔ وہ رات بھی اس نے اکیلے گزاری......سونی، سونی......بے قرار سی رات، رات بھر وہ خوابوں میں کسی انجان جنگل میں بھٹکتی رہی جہاں ہر طرف خزاں کا ڈیرا تھا اور ٹنڈ منڈ خشک اور ویران درخت تھے۔ آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل گئی۔ پیاس کے مارے گلا خشک ہو رہا تھا سب طرف گہری رات کا اسرار اور تاریکی کا بسیرا تھا۔ اسے ایک بار پھر شدت سے جنید کی کمی محسوس ہوئی۔ وہ یقیناً اس سے دامن بچا رہا تھا۔

''کہاں چلا گیا وہ مجھے منجھدار میں چھوڑ کر......مجھے کنارے پر تو جانے دیتا......کب آئے گا آخر وہ......؟'' اس نے جھنجلا کر سوچا۔ کئی بار جی میں آئی کہ اس کو فون ملائے مگر پھر کچھ سوچ کر نہیں ملایا۔

''بلاوجہ خوش فہمی کا شکار ہو جائے گا۔'' دل نے تاویل دی اور وہ رک گئی۔ اس کے بعد اسے نیند نہ آئی۔ یونہی بیٹھے، بیٹھے وہ یوسف کے خیالوں میں کھو گئی۔ اسے شدت سے یوسف کی طلب ہوئی۔

دل نہ مانا اور اس نے بے اختیار یوسف کا نمبر ملا دیا......مگر اس کا فون پاور آف تھا......اس نے جھلا کر موبائل کو بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ جہاں کہیں بھی کوئی راستہ نکالتی وہاں کچھ نہ کچھ رکاوٹ آڑے آ جاتی۔ وہ چاہنے کے باوجود یوسف سے بات نہ کر پاتی۔ البتہ دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر اس نے ایک میسج لکھ دیا۔

''یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو''

آخری الفاظ لکھتے وقت اس کی آنکھیں دھندلا سی گئی تھیں......وہ رات بھی بہت بے کیف اور بے مقصد سی گزری......آنسوؤں کی برسات میں جانے کب اس کی آنکھ لگی تھی اسے معلوم نہ ہوا۔ صبح اٹھی تو خالی کمرے اور اکیلے پن نے اس کا استقبال کیا۔ اس کا دل بوجھل ہو گیا۔

جنید کا یوں منظر سے ہٹ جانا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک دم ہی اپنا رویہ بدل لیا تھا۔ شاید وہ اس کی آنکھوں میں بے وفائی کے رنگ پہچان چکا تھا......اسی لیے اس سے دور چلا گیا تھا......وہ خود ہی قیاس کیے جا رہی تھی۔

اس نے اس کے موبائل پر بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا......اسے اپنا آپ بہت اکیلا اور تنہا سا لگا......کوئی بھی اس کے پاس نہیں تھا......کوئی ہمدرد، نہ دوست، غمخوار جو دل میں براجمان تھا وہ بھی کوسوں دور......فاصلے راستوں کے بھی......اور سماجی نظام کے بھی......

ایمل سے صرف ایک ہی بار مختصر بات کی تھی کیونکہ وہ سارے زمانے کے ساتھ ایمل سے بھی ناراض تھی۔ ایمل نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

''انمول......اٹھ گئیں کیا؟'' ابھی وہ باہر جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ حور عین دروازہ بجا کر اندر آ گئی۔

''خیریت......طبیعت تو ٹھیک ہے، کیسا سرخ ہو رہا ہے تمہارا چہرہ......بخار تو نہیں ہو گیا؟'' اس نے تشویش سے پاس آ کر ماتھا چھوا۔

''کچھ نہیں ہوا مجھے......ابھی سو کر اٹھی ہوں......'' اس نے جبراً جواب دیا۔

''ہم...... جب رات بھر جاگو گی تو صبح جلدی کیسے اٹھو گی...... مس کر رہی ہو ناں ہمارے دیور جی کو؟'' حورعین نے شرارت سے پوچھا۔

اس کا موڈ بری طرح خراب ہوگیا جنید کے ذکر پر...... جنید کی اس روپوشی نے اسے بہت پریشان کردیا تھا۔

''میں کیوں مس کروں گی اسے۔'' وہ تُنکی سے بولی۔

''اوہ ہاں، میں تو بھول ہی گئی...... اب تو موبائل ہوتا ہے سب کے پاس کیسی دوری اور کیسی جدائی...... جی بھر کر رات بھر باتیں ہوئی ہوں گی جب ہی دن کے دو بجے تک سوتی رہیں تم۔'' حورعین نے شرارت سے چھیڑا۔

''دو بج گئے۔'' اس انکشاف پر وہ چونک گئی۔ دو دن سے یہی وقت ہو رہا تھا اسے اٹھنے میں...... اس نے کسلمندی سے بکھرے بال سمیٹنے شروع کردیے۔

''اگر چائے پینی ہے تو بتادو...... میں بنادیتی ہوں ورنہ اب تو کھانا لگ رہا ہے۔'' حورعین نے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے، میں بھی کھانا کھالوں گی سب کے ساتھ۔'' اس نے فوری فیصلہ سنایا۔ حلیہ درست کر کے وہ کمرے سے باہر آئی تو کھانا لگ چکا تھا۔ حسب معمول حرمین اسے دیکھ کر پُرجوش نہ ہوئی بلکہ کچھ ہچکچاہٹ سی اس کے رویے میں آگئی تھی۔

''اٹھ گئیں تم...... بہت تھکن ہوگئی تم کو سفر کی کہ اب تک نہیں اتری......'' آپا خاتون نے اس کی شکل دیکھتے ہی کہا۔ جانے وہ طنز کر رہی تھیں یا فکرمندی سے کہہ رہی تھیں۔ اسے تو بہت برا لگا ان کا کہنا۔

''مجھے تو یاد ہی نہیں آیا روز رات کو پتا نہیں دودھ بھی لے رہی ہو تم یا نہیں......'' انہوں نے بغور اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔

اس نے کلس کر پہلو بدلا۔ ان کی جھوٹی محبت کے مظاہرے اسے زہر لگنے لگے تھے۔ ساری خوشیاں خراب کردی تھیں انہوں نے...... گھر کا ماحول ہی بدل دیا تھا بلکہ اس کی پوری زندگی ہی بدل دی تھی انہوں نے...... بابا کی دوسری شادی کروادی اور اسے یہاں پھنسا دیا تھا۔ ان کی وجہ سے ہجر کا عذاب بھگت رہی تھی وہ۔

''بلکہ ایسا کرو تم ایک گلاس دودھ پی لو پہلے...... شکل دیکھو کیسی اتر رہی ہے؟'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح اپنی ہی بات کی دوسرے کی مرضی جانے بغیر......

''نہیں شکریہ...... میں ابھی دودھ نہیں پیوں گی۔ ورنہ پھر کھانا نہیں کھایا جائے گا۔'' اس نے خشک سے انداز میں کہا۔

کھانے کے دوران بھی وہ خاموش رہی...... اتنی خاموش کہ آپا خاتون کو بہت زیادہ محسوس ہوا۔

''تم فکر نہ کرو آجائے گا جنید دو چار روز میں...... ارجنٹ کام سے جانا پڑ گیا اسے...... اور مجھے تو معلوم ہی عین وقت پر ہوا ورنہ میں روک لیتی اس کو۔'' وہ وضاحتیں دینے لگیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں...... میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے سپاٹ سے انداز میں کہا۔

''ایسا کرنا کھانے کے بعد چائے بنالینا...... ایک کپ مجھے بھی دینا ہاں بس چینی ذرا کم ڈالنا۔'' انہوں نے روانی سے فرمان جاری کیا۔

انمول نے کوئی جواب نہ دیا اسے ان کا بولنا ہی برا لگ رہا تھا۔

''آیا تھا جنید کا فون، تم تو گھوڑے بیچ کر سو رہی تھیں، مجھ سے ہی بات کرلی اس نے۔ کہہ رہا تھا کہ تم کال اٹینڈ نہیں کر رہیں تو میں نے بتایا کہ تم ابھی تک سو رہی ہو۔'' اس کی ناگواری کو محسوس کیے بغیر وہ اسے بتاتی رہیں، اس نے دل میں شکر ادا کیا کہ کسی بھی قسم کے سوال جواب سے بچ گئی ورنہ پھر وہی روز کا سوال ہوتا کہ جنید سے فون پر بات ہوگئی۔

کھانے کے بعد اسے خود بھی چائے کی طلب ہونے لگی کیونکہ اس نے صبح کی چائے بھی نہیں پی تھی۔ وہ چائے بنانے لگی تو حرمین چلی آئی۔

''لائیں چاچی...... میں چائے بنادیتی ہوں......'' اس نے پیشکش کی۔

''نہیں بھئی، میں بنالوں گی خود ہی...... تم بتاؤ کیا پروگرام سیٹ کیا وکی سے؟'' اس نے رازدارانہ سے انداز میں ہلکی آواز میں پوچھا۔

حرمین کی سٹی گم ہوگئی اس نے گھبرا کر میز سے برتن سمیٹتی ماں کو دیکھا کہ کہیں ان تک آواز نہ چلی گئی ہو لیکن حورین نے اپنی مصروفیت میں ان دونوں کی کانا پھوسی پر

غور بھی نہیں کیا تھا۔
چائے بنا کر اس نے حرمین کو دی کہ آپا خاتون کو دے آئے...... وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ صبح کی اٹھی ہوئی تھیں تو اب لیٹنا ضروری تھا۔ اور حورعین بھی اب آرام کرنا چاہتی تھی سو وہ اپنی چائے لے کر کمرے میں آ گئی اور حرمین کو بھی وہیں آنے کو کہہ دیا۔
''پیار کیا تو ڈرنا کیا...... حرمین تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو......'' حرمین کمرے میں آئی تو اس نے اکسایا۔
''نہیں ڈر تو نہیں رہی ہیں احتیاط کر رہی ہوں۔ دادی کو معلوم نہ ہو ورنہ وہ برا حشر کر دیں گی میرا......'' اس نے خوفزدہ انداز میں کہا۔
''تو پھر یہ محبت تو فلاپ ہو جائے گی اس طرح......'' اس نے مزید فکر مند کر دیا۔
''خدا نہ کرے چاچی...... بہت چاہتا ہے وہ مجھے...... بس ابھی اس کی جاب نہیں ہے پڑھتا ہے وہ ابھی تو اس وجہ سے جب تک ہم خاموش ہیں۔ اس کے بعد وہ طریقے کے مطابق ہاتھ مانگے گا میرا۔'' اس نے وثوق اور مان سے کہا۔
''اور تمہارے گھر والے کر دیں گے اس کے ساتھ شادی؟'' اس نے پوچھا۔
''یہ تو نہیں معلوم...... لیکن اگر ہم نے آپس کا تعلق ظاہر کیا تو پھر مشکل ہے لیکن وکی کہتا ہے کہ وہ کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔'' اسے پورا یقین تھا۔
''اچھا...... بہت یقین ہے تمہیں...... لیکن تم اپنی محبت میں اتنا گھبرا رہی ہو تو آگے کیسے سارے مراحل طے کرو گی؟'' اس نے سوال کیا۔
''وقت آئے گا تو سب ہو جائے گا۔'' اسے امید تھی۔
''کم از کم ملنا ملانا تو جاری رکھو...... دس پندرہ دن میں ایک ملاقات تو کر لیا کرو ناں اس بیچارے سے۔'' وہ زہر خند ہوئی۔ مگر حرمین ناسمجھی کے عالم میں سنتی رہی۔
''میرا وہاں جانا مشکل ہے ناں چاچی...... پہلے تو کوچنگ جاتی تھی تو روز ملاقات ہو جاتی تھی۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔
''تو یہاں بلا لو اسے...... ہوتا کون ہے گھر میں...... پچھلے حصے میں تو ویسے بھی اس وقت سناٹا ہوتا ہے۔'' اس نے راہ دکھائی۔
حرمین سوچ میں پڑ گئی جیسے دل چاہ بھی رہا ہے اور ڈر بھی رہی ہے......
''میں تمہاری رازدار ہوں حرمین...... تم مجھ پر اعتبار کرو...... یہ بات لیک آؤٹ...... نہیں ہو گی...... اچھا ہے ایک بار میں بھی اس سے مل لوں اور اس کو دیکھ لوں تاکہ تمہارے لیے راہ ہموار کروں۔'' اس نے اکسایا۔
''دیکھ تو آپ اب بھی سکتی ہیں۔ کوچنگ اسٹوڈنٹس کے گروپ فوٹو میں وہ بھی موجود ہے۔'' اتنی زیادہ اہمیت اور بھروسا ملنے پر حرمین چہکنے لگی۔ اس نے موبائل میں تصویر نکال کر اس کے سامنے کر دی اور تصویر دیکھ کر ایک لمحے کو انمول گنگ رہ گئی۔ وہ جویریہ کے بھائی وقاص کی تصویر تھی۔ وہی وقاص جو لڑکیوں سے فلرٹ کرنے میں مشہور تھا اور حرمین کو اس پر اندھا اعتماد تھا۔ وہ اس کی فلرٹ محبت پر اندھا اعتماد کیے ہوئی تھی۔
''ہم...... کیوٹ ہے...... اچھا لگ رہا ہے، تمہارے ساتھ جچے گا۔'' اس نے بمشکل اپنی حیرت پر قابو پا کر مسکرا کر کہا۔
''اب مزہ آئے گا...... اب بنے گا آپا خاتون کی عزت کا تماشا......'' اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔
''لڑکا اچھا ہے...... ملتی رہو اس سے...... اگر لفٹ نہیں کرواؤ گی تو وہ بددل ہو جائے گا تم سے......'' اس نے مفت مشورہ دیا۔
حرمین کا چہرہ اس کی اتنی سی تعریف پر ہی کھل اٹھا تھا۔
''پھر کب بلا رہی ہو اسے بلکہ چھوڑو ابھی...... ابھی تو بہت وقت ہے بس تم اس سے ملنے جاتی رہو...... میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس نے جھوٹا آسرا دینے کے ساتھ اس کو ملاقاتوں پر اکسایا تاکہ آپا خاتون کی عزت کا خوب اچھی طرح تماشا بن سکے۔ جبکہ ایک رازدار دوست اور ساتھی میسر آنے کے بعد حرمین کے چہرے پر طمانیت تھی۔ آج بھی جنید کی آمد کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن آج اس نے حرمین کو رات اپنے پاس روکنے کے بارے میں سوچ لیا تھا۔ حرمین اس کے مطلب کی ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ اس کی کمزوری آ چکی تھی، وہ حرمین کو اپنے مفاد میں بھی استعمال کر سکتی تھی۔ وہ اس سے بہت سی باتیں معلوم کر سکتی تھی۔ چند گھنٹوں میں ہی اس کی اور حرمین کی پکی

دوستی ہوگئی تھی۔
تیسرے پہر ہی باہر چہل پہل ہوگئی تھی۔ وہ کمرے سے نکل آئی۔ کوئی آیا ہوا تھا اور آپا خاتون کی آواز لاؤنج سے آرہی تھی۔ یعنی جو کوئی بھی تھا لاؤنج میں موجود تھا۔ اس نے تھوڑا آگے ہو کر دیکھا۔ ایک مسکین صورت درمیانی عمر کی، گہری رنگت والی مرنجاں مرنج سی عورت وہاں سر جھکائے کھڑی تھی۔ وکیل صاحب بھی وہاں موجود تھے۔
''یقیناً کوئی اہم معاملہ ہے؟'' اس نے وہیں کھڑے، کھڑے اندازہ لگایا۔
''اندر ہی آجاؤ انمول......'' حورعین جانے کب اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ٹہوکا مارا تو وہ اس کے ساتھ ہی اندر چلی آئی۔
''گھر کا سارا اوپر کا کام کرنا ہوگا، کام صفائی ستھرائی کا چاہیے۔ تنخواہ ٹھیک ٹھاک دوں گی۔ روٹی اور کپڑا ہماری طرف سے الگ ہوگا۔ بولو کیا کہتی ہو......؟''
آپا خاتون نے اس عورت سے پوچھا۔
''ٹھیک ہے جی...... بہت شکریہ بیگم صاحبہ......بس آپ کی سرپرستی چاہیے مجھ کو......ایک باعزت ٹھکانا مل جائے وہی بہت ہے......'' ان...ذرا سی عنایات پر ہی تشکر سے اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں جنہیں اس نے اپنے میلے دوپٹے سے پونچھ لیا۔
''تمہارا کمرا کچن کے پاس ہی ہے......حرمین سے کہو کہ اسے برآمدے کا حصہ دکھا دو......خود ہی صفائی کرلے گی اور چھت پر جو پلنگ رکھا ہے وہ منگوا لو ہدایت ہے۔'' آپا خاتون نے حورعین کو ہدایت دی۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے پیچھے وہ عورت بھی چلی گئی۔
اس نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ عورت اسے دیکھی بھالی سی لگی لیکن وہ پہچان نہ پائی۔
''وکیل صاحب کے دوست ملک صاحب ایک فلاحی ادارہ چلاتے ہیں جہاں بے سہارا لڑکیوں کو رکھا جاتا ہے...... یہ ابھی وہیں سے آئی ہے۔ مصیبت کی ماری ہے بیچاری......بھری دنیا میں اکیلی ہے کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ملک صاحب کی ضمانت پر میں نے اسے رکھ لیا ہے تاکہ گھر چلانے میں تم لوگوں کو بھی آسانی ہو اور یہ جو ہدایت ہر وقت شتر بے مہار کی طرح منہ اٹھا کر اندر چلا آتا ہے، یہ بھی اندر نہ آئے......'' انہوں نے تفصیل بتائی۔
اس نے ان کی تفصیل پر زیادہ غور نہیں کیا۔ بس اس کا ذہن الجھ سا گیا تھا۔ کہیں اٹک سا گیا تھا۔
جیسے اس کی زندگی ایک جگہ ٹھہر سی گئی تھی۔ آگے بڑھ رہی تھی نہ پیچھے پلٹ رہی تھی۔ وہ جس کام کو جلدی کرنا چاہ رہی تھی اس میں دیر ہوئے جارہی تھی۔ آپا خاتون کے گھر کے نظام میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جس ویسے رہنا ہی نہیں تھا تو پھر وہاں کے بارے میں جان کر کیا کرتی۔
جنید کے غائب ہوجانے پر اسے اب شدید غصہ آرہا تھا۔ اس کی یہ حرکت اسے بہت گراں گزر رہی تھی۔ بغیر بتائے بھی گیا اور پھر نہ کوئی فون اور نہ کوئی رابطہ......ادھر یوسف ہر روز اسے میسج بھیج رہا تھا مگر وہ اسے کوئی ٹھیک جواب نہیں دے پارہی تھی کہ آگے کا کوئی راستہ نہیں نکل رہا تھا۔
اس نے سوچ لیا تھا کہ آج رات کو حرمین سے جنید کو کال کروائے گی، وہ حرمین کے ذریعے اپنی بات جنید تک پہنچانے کا ارادہ کرچکی تھی۔ بس اسے مناسب وقت کا انتظار تھا۔
حرمین اب اس کے کسی بھی کام کو منع نہیں کرسکتی تھی کیونکہ اس کی کمزوری اس کے ہاتھ آچکی تھی۔ وہ ایک طویل دن تھا یا......پھر شاید اسے ہی لگ رہا تھا۔ ہر ناپسندیدہ راستہ اتنا ہی زیادہ طویل ہوجاتا ہے اور وہ بھی ایک ایسے راستے پر چل رہی تھی جس پر چلنا نہیں چاہتی تھی۔
شام کے بڑھتے ہوئے سائے جیسے دن کی روشنی کو الوداع کہہ رہے تھے۔ ہلکی مدھر ہوا چلنے لگی تھی۔ وہ اکیلی بیٹھی روز و شب کے خساروں کا حساب کررہی تھی۔ ابھی تک اس کے حصے میں خسارہ ہی آیا تھا۔ سب اپنے، اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ آپا خاتون فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھیں۔ حورعین، انزلہ کو ہوم ورک کرانے کے ساتھ رات کے کھانے کا انتظام کررہی تھی اور حرمین نئی آنے والی ملازمہ سے کمرا صاف کروا رہی تھی۔ اسے اپنا وجود بیکار اور زندگی بے مقصد سی لگی۔ اسی وقت حرمین چلی آئی۔ اس کے ساتھ وہ مدقوق شکل کی ناتواں سی ملازمہ بھی کھڑی تھی۔
''چاچی......چھت پر چلتے ہیں......پلنگ اتروانا

نئے سال کی آمد پر

دعا کی صورت میں اس کی خاطر
جو میرے ہونٹوں سے لفظ نکلے
جو میری آنکھوں سے اشک نکلے
انہی کے بدلے میں اے خدایا
تو جب بھی اس کا نصیب لکھنا
عظیم لکھنا، کمال لکھنا
کبھی نہ حرفِ زوال لکھنا
وہ ساری خوشیاں
وہ ساری راحت
اسی کے ماہ و سال لکھنا

دعا گو: تمثیلہ لطیف، جوڑ ہالہ

وقت دادا سے کہہ کر نکاح پڑھوا دیا تھا دونوں کا......'' اس نے مزید تفصیلات بتائیں۔

''چچ چچ...... بہت افسوس ہوا یہ سن کر...... تمہاری دادی کا طرزِ عمل ٹھیک نہیں...... یہ روک ٹوک اور ہر وقت کی پابندیاں بدظن کر دیتی ہیں بچوں کو۔ مجھے تمہارے ظفری چاچو اور چاچی سے ہمدردی ہو رہی ہے۔ بہت برا ہوا ان کے ساتھ۔'' اس نے کھلے دل سے اظہارِ خیال کیا۔ بڑے عرصے بعد اسے حالِ دل سنانے کے لیے کوئی سامع میسر آیا تھا۔

''انہی کا تو کوچنگ ہے جہاں میں جاتی تھی۔ چاچی بہت تعلیم یافتہ ہیں، کوچنگ اور اسکول مل کر چلا رہے ہیں دونوں......'' اس نے مزید معلومات دیں۔

''مجھے تو ان سے ملنے کا شوق ہو رہا ہے۔ چلیں گے کسی دن ان کی طرف......'' اس نے فوری فیصلہ کیا۔

''ہاں......لیکن چھپ کر ملنا پڑے گا...... میں بھی چھپ کر ملتی ہوں ان سے۔'' اس کی خواہش سن کر حرمین خوش ہو گئی اور اپنی سادگی میں اپنا ایک اور راز اسے بتا دیا۔

نئی ملازمہ پلنگ کو فولڈ کر کے اور سر پر لے کر سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی تھی۔ اسے اس پر بہت رحم آیا۔ وہ اپنے دھان پان سے ناتواں وجود کے حساب سے ہے اس سے۔'' حرمین نے پیشکش کی جسے اس نے بلا تردد قبول کر لیا۔ پہلے ہی وہ بور ہو چکی تھی۔ وہ فوراً تیار ہو گئی۔ لیکن سامنے کھڑی ملازمہ کو دیکھ کر پھر ٹھٹک سی گئی۔ وہ اسے شناسا سی لگ رہی تھی۔

اس کے چہرے پر محرومیوں، دکھوں اور تکلیفوں کی ایک لمبی کہانی بکھری ہوئی تھی۔ وہ دونوں کے ساتھ چھت پر چلی آئی۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے سرشار سا کر دیا۔ کچھ دیر پہلے طبیعت پر چھائی کلفت از خود دور ہو گئی۔

''تم یہ پلنگ جھاڑ کر صاف کر لو...... اور وہاں ٹرنک میں ایک موٹی دری رکھی ہے وہ بھی اپنے استعمال میں لے لینا۔'' حرمین نے ایک چھوٹے سے کچے کمرے میں رکھے سامان کی طرف اشارہ کر کے اس کو وہاں بھیج دیا۔ اور خود اس کے پاس کھڑی ہو گئی...... برابر میں بنا پورشن وہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک خاتون راہداری میں کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ اسی وقت دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔

''یہ کون لوگ ہیں حرمین؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''یہ...... کرائے دار ہیں......'' حرمین نے سنبھل کر سوچا سمجھا جواب دیا۔

''حرمین، اب ہم دوست ہیں پلیز مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟ اس دن یہی صاحب آئے تھے ناں گیٹ پر......'' اس نے حرمین کو جذباتی طور پر اکسایا۔ وہ ایک لمحے کو خاموش سی ہو گئی مگر پھر بات کو چھپا نہ سکی۔

''یہ ظفری چاچو ہیں اور ان کے ساتھ ان کی وائف ہیں سمیرا چاچی......'' اس نے دبی آواز میں بتایا۔

''تو یہ الگ کیوں رہتے ہیں؟'' اسے تجسس ہوا۔

حرمین نے مختصراً الفاظ میں تمام کہانی کہہ سنائی...... یہ انکشاف اس کے لیے بالکل نیا تھا۔

''اوہو...... یعنی چراغ تلے اندھیرا...... دوسروں کو نصیحتیں اور خود اپنے گھر میں اپنی ناک کے نیچے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔'' وہ دانت پیس کر تنفر سے سوچتی چلی گئی۔

''دادی ان سے ملتی نہیں ہیں، وہ ظفری چاچو سے ناراض ہیں۔ نہ ہی انہوں نے چاچی کو دل سے قبول کیا۔ بس مجبوری کا بندھن نبھ رہا ہے۔ ان کی امی نے مرتے

سے زیادہ بوجھ اٹھا رہی تھی۔

''ارے رک جاؤ...... تم کیسے لے کر جاؤ گی اکیلے یہ پلنگ...... ہدایت اتار لے گا اس کو نیچے۔'' اس نے منع کیا۔

وہ ایک پل کو رکی ترچھے ہو کر اسے دیکھا اور مسکرا دی...... انمول اس کی مسکراہٹ دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھہر اسی گئی۔ ایسا عجیب سوز آمیز سکون اور صبر تھا اس کی مسکراہٹ میں کہ انمول کا دل الجھ سا گیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے بے اختیار پوچھا۔

اس کے پوچھنے پر اس نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''بختو ہے میرا نام جی......'' اس کے لہجے میں کانچ کی چبھن تھی...... درد بھرا تھا۔

انمول ایک بار پھر اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ سنبھل، سنبھل کر زینہ اتر رہی تھی۔ وہ بھی پیچھے ہی اترنے لگی۔ آخری سیڑھی پر وہ تھوڑا سا لڑکھڑائی۔

''ارے سنبھل کر......'' انمول نے فوراً کہا۔

''ہاں جی...... کوشش تو بہت کی سنبھل کر چلنے کی...... مگر انسان ہوں کبھی نہ کبھی تو قدم لڑکھڑا ہی جاتے ہیں...... اور اگر ایک بار پاؤں پھسل جائے تو کوئی اٹھانے کے لیے نہیں آتا......'' اس کی بات میں ہزار دکھوں کی کوئی داستان چھپی تھی۔ اس نے پلٹ کر ایک بار پھر انمول کو غور سے دیکھا اور پھر آگے بڑھ گئی۔ انمول بلا وجہ ہی وہاں کھڑی رہی اسے کچھ عجیب محسوس ہو رہا تھا مگر سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس کی گہری آنکھوں میں کھوج تھی انمول کو لگا جیسے اس نے اس کا بھید پالیا ہے۔ وہ کمرے میں آئی تو خالی کمرے کا خالی پن اسے ڈرانے لگا۔ اس نے وقت گزاری کے لیے موبائل نکال لیا۔ یوسف کے ڈھیروں میسجز تھے۔ ہر میسج جواب طلب تھا...... اور جنید کے آنے تک اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''لگتا ہے تم مجھے بھول گئی ہو...... بتاؤ انمول تم آخر کب ڈراپ سین کرو گی اس دردناک کہانی کا......'' اس کا آخری میسج خاصا جارحانہ اور مایوسی بھرا تھا۔ اس نے چاہا کہ اس کو کال کرلے مگر اسی وقت دروازے پر کھٹکا ہوا۔ اس نے فوراً موبائل بند کر کے دراز میں ڈال دیا۔ اس کا خیال تھا کہ حرمین آئی ہوگی مگر جنید کو سامنے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔

وہ پہلے کے مقابل میں کمزور، اداس اور مضمحل سا لگ رہا تھا۔ شگفتگی و شوخی کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔ وہ خود بخود ہی بیڈ سے اتر کر اس کے قریب آگئی۔

''تم...... آگئے......؟ مجھے بتائے بغیر کہاں چلے گئے تھے؟'' وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی اس نے گہری نظر اس پر ڈالی اور کوئی جواب دیے بغیر اس کے برابر سے ہو کر آگے بڑھ گیا۔ وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

''حیرت ہے کہ تم اپنے علاوہ کسی اور کے لیے بھی سوچتی ہو......'' اپنی گھڑی سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے طنزیہ سے لہجے میں کہا۔ وہ یکسر بدلا ہوا لگ رہا تھا۔

''جنید...... آئی ایم سیریس...... میں...... مجھے...... کم از کم مجھے انفارم کرنا چاہیے تھا تم کو...... اور فون بھی نہیں کیا تم نے۔'' وہ اس سے الجھنے لگی۔

''میں سیریس ہی ہوں محترمہ انمول صاحبہ...... میں بھی دیکھنا چاہ رہا تھا کہ میرے ہونے نہ ہونے سے تم کو کتنا فرق پڑتا ہے...... مجھے بہت افسوس ہوا کہ تم نے ایک بار بھی مجھے فون کر کے یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ میں ایسے کیوں چلا گیا؟'' وہ الٹا اسی سے جواب طلب کر رہا تھا۔

''جنید......!'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تمہیں میرا یوں بولنا برا لگ رہا ہے مگر اس کی ذمے دار تم خود ہو...... تم اپنے رویے پر بھی غور کرو...... جب سے شادی ہوئی ہے تمہارا یہی سلوک ہے میرے ساتھ......'' وہ جیسے برس پڑا اس پر...... ضبط کی تمام حدود وہ پار کر چکا تھا اور اب اس سے رہا نہیں جا رہا تھا۔

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے جنید...... میں اب مزید وقت ضائع نہیں کروں گی تمہارا......'' اس نے ہمت کر کے آخری اور حتمی بات کرنے کا ارادہ کر ہی لیا۔

''ہاں ٹھیک ہے، تمہارے پاس کل تک کا وقت ہے...... سوچ لو اچھی طرح کیا چاہتی ہو تم......'' اس نے بے نیاز سے انداز میں کافی روکھے لہجے میں کہا۔ وہ اپنا بیگ رکھ کر واش روم میں چلا گیا اور انمول جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔

''یہ کہاں گیا تھا؟ کہیں اسے کچھ معلوم تو نہیں ہو گیا...... کہیں یہ یوسف سے مل کر تو نہیں آرہا......'' وہ جتنا

سوچ رہی تھی اتنی ہی پریشان ہو رہی تھی۔ اسے اپنے کسی سوال کا شافی جواب نہ ملا۔

''اس نے مجھے کل تک کا وقت کیوں دیا ہے؟ کل کیا ہوگا؟'' وہ فکرمند ہوگئی۔ وہ واش روم سے باہر نکلا تو اسے وہیں اِستادہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''تم ابھی تک یہاں کھڑی ہو......؟ کیسی بیوی ہو تم؟ شوہر گھر آیا ہے تو اس کو کھانے کو بھی نہیں پوچھ رہیں......'' اس نے تاسف سے کہا۔

وہ چونک کر جیسے اپنے خیالوں کی دنیا سے نکلی تو وہ تروتازہ ہشاش بشاش سا اس کے پاس کھڑا اسے باتیں سنا رہا تھا۔

''کھانا، ہاں کھانا لگاتی ہوں......'' وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی مگر پوچھ بیٹھی۔

''کھانا کھالیا ہے میں نے...... چائے بنا دو بہترین سی......'' اس نے شاہانہ انداز میں حکم دیا۔

وہ اس کے بدلے تیور، حاکمانہ انداز اور بے نیازی پر جی بھر کر حیران ہوتی رہی...... اب تک تو وہ اس سے بہت فدویانہ انداز میں پیش آ رہا تھا۔ چائے بنانے سے لے کر چائے دینے تک وہ اس سے بات کرنے کے تانے بانے بنتی رہی مگر چائے پینے کے بعد وہ کمرے سے باہر چلا گیا اور وہ بھرپورے کمرے میں اکیلی رہ گئی۔

اس کے جانے کے بعد اس نے آرام اور سکون سے جنید پر حقیقت واضح کرنے کے لیے لفظ جوڑے......

''اگر خود بات نہ کر سکی تو حرمین کو آلۂ کار بنالوں گی یا تمام بات پرچے پر لکھ کر اسے دے دوں گی۔ اسے میری بات ماننی پڑے گی۔'' وہ بات کرنے کے مختلف طریقے سوچتی رہی۔

وہ رات گئے تک جنید کی منتظر رہی مگر وہ کمرے میں نہ آیا اور نیند کی دیوی اس پر مہربان ہوگئی۔

بہت طویل راستہ تھا۔ سیدھی سی راہ گزر تھی مگر بہت تنگ راہ گزر تھی۔ اس کے دونوں اطراف میں ٹنڈ منڈ درختوں کی شاخیں تھیں جو اس کے کپڑوں سے لپٹی جا رہی تھیں۔ وہ ایک خزاں رسیدہ جنگل میں بھٹک رہی تھی۔ معاً اسی راہ پر اسے بہت سے پھول نظر آئے۔ وہ بے خودی میں چلتی ان پھولوں تک گئی۔

''نہیں......نہیں مت جاؤ وہاں......'' کوئی زور سے چیخا۔ اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا...... وہاں کوئی نہیں تھا...... خوش رنگ پھول اسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ وہ بے خودی میں ان پر چلنے لگی اور اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں میں ہزاروں سوئیاں کھب گئیں۔

''سی......سی کرتے ہوئے اس نے پاؤں اٹھایا نیچے دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔ وہاں پھولوں کے بجائے کانٹے بکھرے تھے۔ اس کے پاؤں سے لہو رس رہا تھا۔ تیز ہواؤں کے جھکڑوں سے ٹنڈ منڈ درختوں کی برہنہ شاخیں اسے دبوچنے کو اس کی طرف لپکنے لگیں۔

''انمول، انمول رک جاؤ......مت جاؤ وہاں......'' اسے ماما کی آواز سنائی دی۔

''ماما...... ماما......'' وہ چلّا اٹھی۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہانپ رہی تھی۔ جنید اس کے گال تھپتھپا رہا تھا۔

''جاگ جاؤ انمول، آنکھیں کھولو...... کیا ہوا ہے؟'' اس کے سر کے نیچے ہاتھ لگائے وہ دوسرے ہاتھ سے اس کا گال تھپتھپا رہا تھا۔

''ماما، ماما...... میرے پاؤں......'' وہ بے ربط بول رہی تھی۔

''انمول ڈر گئی ہو تم...... کچھ نہیں ہوا......'' جنید نرمی سے بولا۔

اس نے حیرت سے جنید کو دیکھا...... وہ اس کے بے حد قریب بیٹھا تھا۔ اس کی نظروں میں والہانہ پن تھا...... وہ خوف کے مارے اس کے حصار میں دبکی ہوئی تھی۔ وہ کچھ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی اور گہری سانس بھر کر بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

''مجھے مس کیا تھا ناں......؟ سچ بتاؤ ناں......'' اس نے اچانک اس سے پوچھا۔

''میری کمی محسوس ہوئی تھی ناں......؟'' اس نے پھر پوچھا۔

انمول نے دکھ اور اذیت سے آنکھیں بھینچ لیں۔ وہ جنید کی محبت کی توہین کر رہی تھی۔ اسے نظر انداز کر کے، اس سے بے وفائی کر کے...... اس نے ساری دنیا کے سامنے ایجاب و قبول کیا تھا مگر دل سے اسے قبول نہیں کیا

تھا۔ وہ منافقت کر رہی تھی۔ اس کی فکر مندی اور چاہت‘ شرمسار کر رہے تھے۔ وہ اپنی غرض اور خواہش کے لیے اسے دھوکا دے رہی تھی۔ اس نے ابھی اور اسی وقت اسے سب بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

’’جنید...... مجھے معاف کر دو...... مم...... میں تمہاری مجرم ہوں...... میں...... مم...... میں تمہارے ساتھ......‘‘ وہ بولنا شروع ہوئی۔

’’اونہہ نو سوری...... نو ایکسکیوز...... مجھے معلوم ہے تم ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو...... بلکہ میری طرف سے سوری کہ میں نے تم کو تنگ کیا۔ بغیر بتائے چلا گیا اور واپس آ کر بھی تم سے ٹھیک سے بات نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح تم میری طرف شاید مائل ہو جاؤ گی۔‘‘ وہ الٹا اسے وضاحت، دلاسے اور تسلیاں دینے لگا۔

انمول کی بات پھر مکمل نہ ہو پائی۔ وہ ایسے بات کرتا تھا کہ پھر وہ مزید بول ہی نہیں پاتی تھی۔

’’جنید میری پوری بات تو سن لو......‘‘ اس نے ایک بار اور کوشش کرنی چاہی۔

’’صبح بات کرنا...... تم آرام کرو ابھی......‘‘ اس نے منہ پر انگلی رکھ کر منع کر دیا۔ وہ دھیرے، دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہا تھا...... اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

بند پلکوں تلے ماما کی شبیہہ ابھر آئی۔ کانٹوں بھرا جنگل یاد آ گیا۔ اس نے خوف سے جھرجھری لی۔

’’یہ کیسا خواب تھا...... میں کس راستے پر چل رہی تھی۔‘‘ وہ غنودہ سے اعصاب کے ساتھ سوچتی رہی۔

صبح بہت روشن اور دلفریب تھی۔ جنید اس کے اٹھنے کا منتظر تھا۔ نہ جانے وہ کب جاگا تھا مگر اس کا تر و تازہ سراپا یہ بتا رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے جاگ رہا ہے۔

’’انمول! صبح بخیر...... کیسی ہو اب، فریش ہو؟‘‘ اس نے نرمی سے پوچھا۔

’’ہوں...... ہاں......‘‘ وہ زیادہ نہ بولی۔

’’آج شام کو چاچا، چاچی آئیں گے۔ میں نے تمہارا اسٹوفکیٹ منگوایا ہے ان سے۔ بڑے جتن کیے ہیں تمہارے سرٹیفکٹ کے لیے۔ دو تین روز تک ڈپلی کیٹ نکلوایا ہے انہوں نے...... تمہاری فرمائش پلس منت پوری کر دی میں نے اب پلیز اور کوئی احمقانہ منت نہ مانگ لینا۔ پہلے ہی ہمارے گولڈن ڈیز تمہاری اداسی کی نذر ہو گئے۔ اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔ میں اب خود کو مزید نہیں روک سکتا۔ شام کو اچھی سی تیار ہو جانا۔ چاچا‘ چاچی آئیں گے۔‘‘ اس پر نیا انکشاف کر کے وہ اور اپنا حالِ دل سنا کر اس نے تحکم سے مزید ہدایات دیں۔

’’مگر......‘‘ اس نے منع کرنا چاہا۔

’’سوری...... مجھے کوئی فولش ایکسکیوز نہیں دینا۔‘‘ اس نے سختی سے کہا۔

وہ چپ رہ گئی۔ اس کے لیے ہر لمحہ محال ہو رہا تھا۔

صبح ناشتے کے بعد ہی لاؤنج میں محفل جم گئی۔ وہ اسے دستیاب ہی نہ ہوا۔

دوپہر تک بھی وہ اس سے بات نہ کر پائی۔ نہ جانے کیا مصروف تھا وہ۔ سرِ شام اس نے اسے تیار ہونے کو کہہ دیا تھا۔ وہ تنہائیاں چاہتی تھی مگر اس وقت وہ بری طرح پھنسی تھی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ جنید کے اٹل انداز نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلی تو لاؤنج سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں مگر تیز آواز پر وہ چونکی، لاؤنج میں آپا خاتون کی آواز گونج رہی تھی۔

’’میں اس لڑکی کو ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔ میں اس سے ملنا نہیں چاہتی۔‘‘ وہ غصے سے بول رہی تھیں، ان کے سامنے صوفے پر ظفری اور سمیرا بیٹھے تھے۔

’’مگر وہ ہماری بہو ہے اب...... بھاگ کر نہیں آئی وہ...... نکاح ہوا ہے اس کا ظفر کے ساتھ...... آپ اس بات کو بھی تو سمجھیں ناں......‘‘ وکیل صاحب دونوں کی وکالت کر رہے تھے۔

’’ہاں ٹھیک ہے ہو گیا نکاح...... اب اپنے گھر میں رہے...... دے تو دیا اس کو اپنا الگ پورشن...... یہاں نہ آئے۔‘‘ وہ ہٹ دھرمی سے بولیں۔

’’اس نے گل کھلایا جبھی تو ماں اس حال کو پہنچی کہ اسپتال پہنچ گئی۔ بدنامی ہوئی سو الگ...... وہ لاچار عورت اور کر بھی کیا سکتی تھی سوائے ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے کے...... یہ تو اس کو سوچنا چاہیے تھا کہ میں کر کیا رہی ہوں......‘‘ وہ سنگدلی کی انتہاؤں پر تھیں۔

’’اماں پلیز...... یہ اکیلی قصور وار نہیں، میں بھی قصور وار ہوں، تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔‘‘ ظفر نے

تڑپ کر سمیرا کی صفائی دی۔

''جو ہوا سو ہوا..... اپنے گھر خوش رہو تم..... بس اسے یہاں نہ لایا کرو..... میں اسے کبھی وہ درجہ نہیں دے سکتی جو حور عین اور انمول کا ہے۔'' آپا خاتون نے صاف لفظوں میں بتادیا۔

ظفر اور سمیرا کا چہرہ اتر گیا۔ سمیرا کی تو رونے کے باعث آنکھیں بھی سوج رہی تھیں۔

''یہ..... یہ سب کیا ہورہا ہے؟'' اس نے حیرت سے جنید سے پوچھا۔

''یہ ہر دوسرے ہفتے کا تماشا ہے۔ وہ دونوں آتے ہیں، معافی مانگتے ہیں یہ میرا بھائی ظفر اور اس کی بیوی سمیرا ہے، دونوں کی پسند کی شادی ہے مگر اماں معاف نہیں کرتیں..... وہ کہتی ہیں کہ وہ اپنی عزت کھو چکی ہے۔ ان کی نظر میں سمیرا کی کوئی عزت نہیں وہ اپنی مرضی سے ہم لوگ میں شامل ہوئی ہے۔'' جنید نے افسردگی سے بتایا۔

''یہ تو بہت غلط بات ہے۔'' اسے بھی افسوس ہوا۔

''ابا جی ان دونوں کے نکاح میں شامل تھے لیکن اماں بخشنے پر راضی نہیں بالفرض اگر راضی ہو بھی گئیں تو ان کی نظر میں سمیرا کا کبھی وہ درجہ نہیں ہوگا جو ہونا چاہیے۔ یہی ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔'' وہ تاسف سے بولا۔

''پسند کی شادی جرم تو نہیں.....'' اس نے آہستہ سے آواز میں کہا۔

''ہاں..... مذہب بھی پسند کی شادی کی اجازت دیتا ہے مگر لوگوں نے خود اپنی روایات بنالی ہیں، اب کیا کرسکتے ہیں۔'' وہ لاچاری سے بولا۔

''چچ، چچ.....'' اس نے افسوس کا اظہار کیا۔

بختو کچن میں برتن دھو رہی تھی۔ چولھے پر چائے کا پانی چڑھا تھا۔ دودھ ابلنے کو تھا۔ اس نے جلدی سے جاکر چولھا بند کردیا۔

''آپ..... آپ کے والد وقار صاحب ہیں ناں؟'' اچانک بختو نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے پوچھا تو وہ چونک گئی۔

''تم میرے بابا کو کیسے جانتی ہو؟'' اس نے زور سے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ بختو کے چہرے پر غمزدہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''میں بدنصیب بختو ہوں..... مرزا صاحب کی بڑی بیٹی..... یاد ہوگا آپ کو جو گھر سے بھاگ گئی تھی.....'' اس نے انکشاف کیا۔

''کیا..... تم فریدہ کی بڑی بہن ہو..... اوہ..... یہ کیا حال ہوگیا تمہارا.....'' اس کے لیے یہ بہت حیرت انگیز اور باعث دکھ خبر تھی۔

''بھاگی ہوئی لڑکی کی کوئی عزت نہیں رہتی..... وہ بے مول ہوجاتی ہے، رل جاتی ہے، معاشرہ اس کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھتا..... رشتے دار اسے دوبارہ قبول نہیں کرتے..... پھر وہ سڑکوں پر فقیر بن کر یا چوباروں کی زینت بن کر باقی زندگی گزار دیتی ہے۔ یا پھر میری طرح دوسروں کی جوتیاں سیدھی کرکے زندہ لاش کی طرح زندگی گزارتی ہے۔'' اس کی آواز میں درد تھا۔ ایسا درد جو نس، نس میں زہر بن کر پھیل جاتا ہے۔ جو روز مارتا ہے اور موت بھی نہیں آتی۔

''میں نے تمہیں اسی دن پہچان لیا تھا۔ تم فریدہ سے کھیلنے کے لیے آتی تھیں ناں اور تمہاری چھوٹی بہن بھی تمہارے ساتھ آتی تھی۔ بس کچھ شک تھا مجھے لگ رہا تھا کہ مجھے غلط فہمی ہورہی ہے مگر پھر دو دن بعد یقین ہوگیا کہ میں نے تمہیں ٹھیک پہچانا ہے۔'' بختو نے اسے رشک بھری نظروں سے دیکھا۔

''ہاں، مگر میں تم کو بالکل نہیں پہچانی..... بس ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کہیں دیکھا ہوا ہے..... تم اتنا بدل بھی تو گئیں ناں اور اس وقت میں چھوٹی بھی تھی۔'' بختو کو اس حال میں دیکھ کر وہ بمشکل اسے جواب دینے کے قابل ہوئی۔ اس کی گندمی کھلتی ہوئی رنگت سیاہی مائل ہوگئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور پچکے ہوئے گالوں پر باریک لکیریں..... وہ کسی طور پر بھی فریدہ کی بڑی بہن نہیں لگ رہی تھی۔

''بدل کیا گئی میرا تو حلیہ ہی بگڑ گیا ہے..... بس نصیب کو خود اپنے ہاتھوں خراب کرلیا ہے میں نے..... مولوی کے گھر پیدا ہوئی..... ابا کی سختیوں اور پابندیوں سے گھبرا کر بغاوت کی۔ گھر سے نکلنے کے بعد چار دن میں ہی عزت رُل گئی۔ جو مجھے پیار کا آسرا دے کر بھگا لے گیا تھا وہی میرا بیوپاری بن گیا..... اسی نے مجھے بازار میں

بٹھایا اور میری بولی لگائی...... اور محبت...... محبت تو وہاں کہیں نہیں تھی۔ وہاں تو بس نوحے تھے اور بین تھے جو میری روح میں گونج رہے تھے...... یا پھر ہوس تھی...... بھوک تھی...... تب معلوم پڑا کہ محبت کیا ہے؟ محبت تو سراب ہے، دھوکا ہے، سولی تو جب بھی چڑھنی تھی اور سولی پراب بھی چڑھی ہوں...... قربانی تو ہر حال میں مجھے ہی دینی تھی عتاب سہنا ہی تھا تو عزت سے سہہ لیتی یوں سر بازار رسوا تو نہ ہوتی۔ بس عقل ہی نہ تھی جب...... جو دل میں آیا وہ کیا...... کسی بھلے مانس نے ملک جی کے ادارے تک پہنچا دیا ورنہ میں تو وہ موتی ہوں جو زمانے کی ٹھوکروں سے اپنی آب و تاب کھو چکا ہے۔ اماں، ابا نے بڑی محبت سے میرا نام بختاور رکھا تھا مگر میں اتنی ہی... بدبخت نکلی...... میں کھوئی محبتوں کے سحر میں جکڑ کر حقیقی محبتوں کو فراموش کر گئی...... جہاں عزت، مان اور اعتبار سب کچھ ہوتا ہے۔'' بختاور کو بھی عرصے بعد کوئی ایسا ہمدرد اور شناسا میسر آیا کہ وہ بولتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح چمکے جنہیں اس نے کمال مہارت سے اپنے اندر ہی کہیں اتار لیا۔

وہ اس کی روداد سن کر انگشت بدنداں کھڑی رہ گئی۔ ان دونوں کے درمیان گہرا سناٹا چپ کی بکل مارے در آیا۔

بختو کی باتوں نے اس کی آنکھوں سے پردہ سرکا دیا تھا۔ اسے لگا جیسے اب سے پہلے وہ کسی لق و دق صحرا میں تن تنہا بھٹک رہی تھی جہاں کہیں بھی ٹھنڈی چھاؤں نہ تھی۔ اسے اپنے آس پاس ہواؤں کا شور سنائی دیا۔ اسے رات والا خواب پوری جزئیات کے ساتھ یاد آ گیا۔ جہاں وہ کانٹوں بھرے راستے پر لہو، لہو پاؤں لیے چلتی جا رہی تھی اور ماما اسے آواز دے کر روک رہی تھیں۔

وہ کوئی معمولی خواب نہیں تھا...... وہ ماما کی آواز تھی...... یا غیب سے کوئی آواز تھی جو اسے آگے جانے سے روک رہی تھی۔

اس نے خالی نظروں سے بختو کے چہرے کو دیکھا جسے زمانے کی سختیوں نے پتھر کر دیا تھا۔ اس کے اصل نقوش اور روپ سروپ سب ماند پڑ چکا تھا۔ اب اس کے چہرے پر زمانوں کی دھول تھی جس نے اس کی شخصیت کو مسخ کر دیا تھا۔

اس کی خوب صورتی اور عزت کو گرد آلو کر دیا تھا۔ اب وہاں پچھتاوا تھا رشتوں کو کھونے کا...... عزت کے پامال ہونے کا...... دربدری کا...... اور رُل جانے کا۔

وہ اسے ایک حرف بھی تسلی کا نہ کہہ پائی...... خاموشی سے اندر کی طرف مڑ گئی...... اس وقت ظفر اور سمیرا ایک بار پھر نا کام لوٹ رہے تھے۔ بے شک وہ دونوں اس وقت ایک دوسرے کا مضبوط سہارا تھے مگر مان، محبت، اعتبار اور عزت کے معاملے میں انہیں رد کر دیا گیا تھا۔

اسے بہت زور کا چکر آیا...... اس کے شکستہ اعصاب میں اب مزید کچھ سہنے کی تاب نہ تھی۔

جو بات وہ اتنے عرصے میں سمجھ نہ پائی تھی وہ بات بختو اور سمیرا نے اسے ایک لمحے میں سمجھا دی تھی۔ وہ جس راہ کو گل و گلزار سمجھ رہی تھی وہ دراصل ایک کٹھن کانٹوں بھرا راستہ تھا۔ وہ اپنے ناتواں وجود کو بمشکل گھسیٹتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔

ابھی اسے بہت سے فیصلے اور بڑے، بڑے کام کرنے تھے۔ سب سے پہلا کام حرمین کو ایک ایسے راستے پر چلنے سے روکنا تھا جس میں کہیں سایہ نہیں ملتا اور دوسرا کام بھی اس نے اسی وقت ہی کر لیا۔

اس نے دراز میں سے اپنا موبائل نکالا۔ یوسف کے تین چار میسج آئے ہوئے تھے۔ کسی میں اصرار...... کسی میں اقرار اور کسی میں سوال تھا۔ ایک شکستہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر دم توڑ گئی۔ اس نے پلکیں جھپک کر سارے آنسو ایک ہی بار...... آخری بار ہمیشہ کے لیے اپنے اندر اپنی محبت کے مدفن پر برسا دیے کیونکہ وہ محبت کو عزت پر قربان کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

وہ اپنی موجودہ زندگی اور رشتوں کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی محبت کو ہار چکی تھی۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے میسج ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔

''بے شک محبت بہت خوب صورت ہے مگر عزت انمول ہوتی ہے۔'' اس نے بٹن کو چھوتے ہوئے محبت کو آخری بار، آخری سلام کرتے ہوئے الوداع کہہ دیا۔

انسان محبت کے بغیر تو جی لیتا ہے مگر عزت کے بغیر جیتے جی مر جاتا ہے۔ اور یہ بات اسے اب سمجھ آ گئی تھی۔

(ختم شد)

نکمی ماں

روبینہ یوسف

جہاں آرا نے وظیفے کی آخری تسبیح ختم کی ۔ایاز آفس چلا گیا تھا۔ جانے سے پہلے ماں سے دعا لینا نہیں بھولا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے سے باہر آئیں کہ گھر کا جائزہ لیں کیونکہ ان کی بہو عمارہ نے تو اب دن چڑھے تک سونا تھا۔

''اُف توبہ اب تو برکتیں ہی اٹھ گئی ہیں، رات بھر کا جاگنا اور دوپہر تک سونا...... کیا زمانے تھے ہمارے...... عشا کے بعد سب سونے کی تیاری کرتے اور فجر کے بعد سے ہی گھروں میں زندگی مسکراتی تھی۔ جھٹپٹے کے وقت سارے کام نمٹ جاتے تھے۔ راتوں کو جلد سونے کا رواج تھا۔ اب تو نحوست کی وجہ سے پھول اپنی خوشبو اور بہاریں اپنے رنگ تک کھو چکی ہیں آ...... ہائے......''

وہ انہی خیالوں میں غلطاں تھیں کہ عمارہ کی تیز آواز

انہیں اپنے قریب ہی سنائی دی۔
''اماں.....! بھئی منے نے رات بھر سونے نہیں دیا.....ذرا اس کو دیکھ لیں تو میں ذرا آرام کرلوں۔''
''آئے ......کیوں نہیں سویا میرا بچہ ......مجھے دو......'' وہ فکر مند ہوئیں۔
''اماں دانت نکال رہا ہے ناں......آپ کو جیسے پتا نہیں کیا؟'' وہ کچھ اکتاہٹ سے جمائی لیتے ہوئے بولی۔
''رات کو ہی بتاتیں تو میں سہاگا کھیل کر کے شہد میں ملا کر اس کے مسوڑھوں پر مل دیتی۔'' انہوں نے اپنے تئیں حل بتایا تھا۔
''اب ہر بات آپ کو بتانی پڑے گی۔ بس سارا دن تسبیحاں گھماتی رہتی ہیں اور اسے دم کرانے کو مجھے امام صاحب کے پاس بھیجنا پڑتا ہے۔'' عمارہ منہ بنا کر اپنی بات پوری کر کے وہاں سے جا چکی تھی۔ منّا ہلکا ہلکا سسک رہا تھا۔ جہاں آرا نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ پیار بھری حدت نے بچے پر خمار طاری کردیا۔ وہ اسے تھپکنے لگیں۔ آہستہ، آہستہ منا سو گیا۔ انہوں نے احتیاط سے اسے اپنے برابر میں لٹایا......اور دکھی دل کے ساتھ سوچنے لگیں۔
''عمارہ کبھی مجھ سے خوش نہیں رہتی......نہ کوئی نند نہ دیور نہ سسر، ایک میری جان ہے اور ایاز ہے......کتنی ناشکری ہے یہ۔'' انہیں اپنی سسرال کا بھرا پُرا گھر یاد آگیا۔ جہاں تہوار تو تہوار، عام دنوں میں بھی رونق ہی رہا کرتی۔ سب لوگ بہت اچھے تھے، ساس ذرا سخت گیر تھیں اور سختی بھی کیا......وہ پرانے زمانوں کی وضعدار قسم کی خاتون تھیں۔ گھر میں تہذیبی رچاؤ پوری طرح بسا ہوا تھا۔ ہر موسم پوری... جولانیوں کے ساتھ منایا جاتا۔ برسات کے پکوان تیار ہوتے اور رنگ برنگی چُنریاں رنگی جاتیں......ربیع الاول کے مقدس مہینے میں گھر، گھر قرآن خوانی و محفل میلاد ہوتی۔ رجب میں کونڈوں کی بہار ہوتی، شعبان میں مرادیں پوری کرنے کا مہینہ ہوتا تو رمضان روح کی لطافت کے سامان کرتا......سحری اور افطار کی تیاریاں، ایک دوسرے کی دعوتیں......اور آس پڑوس کی بھی خبر گیری......پھر عید گویا نیکیوں کو جوبن عطا کرتی۔ اب تو ہر بات خواب ہو چکی تھی۔ بازاری کھانے آتے، ہر طرح کے تیار مسالوں کے پیکٹس بازار میں دستیاب جو ہیں۔
جہاں آرا کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے تو وہ اٹھ کر باہر چلی آئیں۔ منا سکون سے سو رہا تھا۔ ان کی بہو اگرچہ لاکھوں میں ایک تھی مگر اب پتا نہیں اسے کیا ہوتا جا رہا تھا، شوہر اسے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ بھی اسے اپنی بیٹی ہی سمجھتی تھیں مگر کبھی، کبھی عمارہ......ایک معما بن کر رہ جاتی......ان کی معمولی سی ٹوک سے بھی چڑ جاتی۔
گیارہ بجے کے قریب عمارہ اٹھی تو منا ابھی تک سو رہا تھا۔ ایاز شام ڈھلے واپس آتا تھا۔ جہاں آرا خود ناشتا کر چکی تھیں۔ عمارہ کے لیے انہوں نے ٹوسٹ اور آملیٹ بنا کر رکھ دیا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر چائے بھی دم پر رکھ دی۔
''آج زینت کام پر نہیں آئے گی۔ صبح اس کا فون آیا تھا۔'' جہاں آرا اسے بتانے لگیں۔
''اوہو کام چور کہیں کی......پھر بنا دیا ہوگا کوئی نیا بہانہ۔'' وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولی۔
''ہاں کہہ رہی تھی کہ شوہر کو لے کر اسپتال جانا ہے۔'' وہ دھیرے سے بتانے لگیں۔ عمارہ کی بڑبڑاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔
''لاک ڈاؤن کی وجہ سے ہڈیاں گھس گئیں کام کر کر کے......اب ماسی صاحبہ کے آئے دن کے بہانے سنو......میں تو پہلی تاریخ کو اس کا حساب کردوں گی۔''
''اس کا شوہر سچ میں بیمار ہے، کیوں بیچاری کی روزی پر لات مارتی ہو؟'' وہ دبی زبان سے بولیں۔
''بیٹے کی کمائی کا ذرا احساس نہیں آپ کو......؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''جو بھی ماسی آتی ہے آپ اسے سر چڑھا لیتی ہیں۔ ہماری امی جان تو خوب کام نکلواتی ہیں ماسیوں سے۔ مجال نہیں جو اتوار کے علاوہ چھٹی کرے کوئی......مگر آپ تو......''
بہو کی بات پر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

جانتی تھیں کہ آج عمارہ کو ہی سارا کام کرنا پڑے گا۔ اب ان کے بازوؤں میں دم نہیں رہا تھا کہ جھاڑو پوچا کرتیں یا کپڑے نچوڑتیں۔ سارا دن اب اس نے انہیں جلی کٹی سنائی تھیں۔ کچن سے اٹھا پٹخ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

جہاں آرا نے صحن میں آ کر پودوں کو پانی دینا شروع کر دیا۔ یہ شوق بھی انہی کا تھا۔ دن بھر موتیے کی خوشبو سے صحن مہکتا تو رات کو رات کی رانی فیاضی سے اپنی خوشبو لٹاتی۔ کڑی پتا ان کی ضرورت تھا کہ جب ان کا بی پی ہائی ہوتا تو چند پتے کڑی پتے کے منہ میں رکھ لیتیں تو دل ذرا ٹھکانے آ جاتا۔ وہ بڑے انہماک سے ایک، ایک پتا دھو رہی تھیں کہ عمارہ پھر ان کے سر ہو گئی۔

”گوشت اور کوئی سبزی لا دیں اور ذرا دیکھ کر لائیے گا...... پچھلی بار بھی آپ چھیچھڑے اٹھا لائی تھیں۔“ ہمیشہ کی صابر جہاں آرا کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی۔

”اور ہاں درزی سے کپڑے بھی لانے ہیں، دو بار فون آ چکا ہے اس کا......“

”اچھا میں لیتی آؤں گی۔“

”آپ کو تو پتا ہے میں بازاروں میں ان کے بغیر نہیں جاتی اور ان کو آتے، آتے مغرب ہو جاتی ہے، آپ سارا دن فارغ رہتی ہیں تو یہ چھوٹے، چھوٹے کام کروا لیتی ہوں۔“

اور جہاں آرا کی فراغت کا سارا محلہ گواہ تھا۔ ایک چکر ان کا روز بازار کا لگتا تھا کہ ایاز کو تازہ سبزی اور گوشت پسند تھا۔ اس معاملے میں وہ بالکل اپنے مرحوم باپ پر گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی جہاں آرا کبھی، کبھی دن میں دو اور تین چکر بھی لگا لیتی تھیں۔ گھر کی ضرورتیں بھلا کبھی پوری ہوئی ہیں اور گھر میں بھی ان کو کیا آرام تھا۔ عمارہ کپڑے دھوتی تو وہ ساتھ، ساتھ پھیلاتی جاتیں۔ بچہ مستقل ان کے پاس رہتا۔ اس کو کھلانا پلانا، نہلانا، سب ان کے ذمے تھا۔ ننھا پوتا انہیں اپنے ایاز کا پرتو نظر آتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ساٹھ کی ہونے کے باوجود ابھی تک بیماریوں سے بچی ہوئی تھیں۔ خود کو مصروف کر رکھا تھا انہوں نے۔ جب وہ بازار جانے کے لیے نکلنے لگیں تو عمارہ نے پیچھے سے آواز لگائی۔

”وہ صائمہ کے ہاں کمیٹی کے پیسے بھی دینے ہیں۔ یہ لیجیے...... گلیوں، گلیوں نکل جائیے گا بلاوجہ رکشے میں دھکے کھائیں گی۔“ کپکپاتے کمزور ہاتھوں سے انہوں نے پیسے تھام لیے۔ صائمہ کا گھر ان کے گھر سے کافی دور تھا۔ انہوں نے خاموش نظروں سے لحہ بہ لحہ بلند ہوتے سورج کو دیکھا اور بہو کا فرمان سنا اور پھر اسی خاموشی سے سر جھکائے باہر نکل آئیں۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کے بعد جب وہ ہانپتی کانپتی گھر میں داخل ہوئیں تو منے کے رونے اور عمارہ کی بڑبڑاہٹ نے ان کا استقبال کیا۔

”اتنی دیر لگا دی اماں آپ نے...... منا رو، رو کر ہلکان ہو رہا ہے...... اوپر سے سارا کام بھی پڑا ہوا ہے۔“

”میں تمہارا ہاتھ بٹا دوں گی ذرا دم تو لینے دو......“ وہ بولیں۔ ”تم جاؤ اسے مجھے دے دو۔“ بچے کو لے کر وہ نڈھال ہو کر وہیں بیٹھ گئیں۔ منا اب چپ ہو کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔

”کیوں ستاتے ہو ماں کو منے میاں شرارتی کہیں کے۔ اِدھر آؤ میرے پاس۔“

ذرا دیر کے بعد عمارہ پھر ان کے سر پر موجود تھی ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری پکڑے کہہ رہی تھی۔

”اب جلدی سے کاٹ دیں لہسن، ادرک بس یہی ہے۔ آپ کو بتانا ہی بھول گئی۔ اچھا میں نے مشین میں کپڑے ڈال دیے ہیں۔“

”ہاں یہاں رکھ دو، میں ذرا پانی پی کر آتی ہوں......“ جہاں آرا خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے گویا ہوئیں۔ عمارہ اپنا فون بجنے پر جلدی سے پلٹ گئی۔

”ہاں امی جان...... صبح سے آپ کو یاد کر رہی تھی۔“ وہ چہکتی آواز میں بولی۔ ”قسم سے بہت یاد آ رہی ہے آپ کی۔“

جہاں آرا پانی پی کر واپس آ کر بیٹھ گئیں، آٹھ ماہ کا

منّا حلق سے آوازیں نکال رہا تھا اور اپنے کھلونوں پر ہاتھ مار رہا تھا۔ جہاں آرا نے تیزی سے سبزی بنانا شروع کی۔ کھانے کو دیر ہو جاتی تو..... کمزوری سے ان کے ہاتھ پیر کانپنے لگتے۔ صبح کا ہلکا ناشتا کیے ہوئیں تھیں۔ منّا اب سکون سے بیٹھا سامنے درخت کی گھنی لہراتی شاخوں کو انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے جلدی سے سبزی بنائی، پیاز کاٹی، لہسن ادرک پیسا، اس سارے عرصے کے دوران عمارہ مسلسل فون پر مصروف رہی۔ انہوں نے چولھا جلا کر ہنڈیا چڑھائی تو کپڑوں کی دھلائی کی مشین چلانے لگیں۔ ساتھ ہی ڈور بیل بجنے لگی۔ عمارہ منّے کو اُٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ انہوں نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے پہلے جا کر واشنگ مشین کی آواز بند کی پھر بولائی ہوئی جا کر دروازہ کھولا تو سامنے بیٹا کھڑا تھا۔ جہاں آرا کا چہرہ کھل سا گیا۔ مگر ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایاز نے بگڑے تیوروں سے کہا۔

''مسلسل دس منٹ سے بیل بجا رہا ہوں، عمارہ کہاں ہے؟ میں کھانا چڑھا رہی تھی بیٹا' وہ تو اپنے کمرے میں ہے۔''

''اماں وہ افسری آپا کی طبیعت خراب ہے، کل سے اسپتال میں ہیں، مجھے ابھی پتا چلا تو سوچا کہ جلدی چھٹی لے کر آپ کو اسپتال لے جاؤں.....''

''ارے کیا ہوا اسے؟'' جہاں آرا گھبرا گئیں۔ افسری بیگم ان کی خالہ زاد بہن تھیں۔

''بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ گرمی بھی تو کس قدر بڑھ گئی ہے۔ آپ بھی احتیاط کریں..... یہ اتنی گرمی میں آپ کو کھانا پکانے کی کیا ضرورت تھی؟ عمارہ سے کہہ دیا ہوتا؟'' اب جہاں آرا اسے کیا بتاتیں کہ وہ اس قیامت کی دھوپ میں ڈھائی گھنٹے تک گھر سے باہر رہی ہیں۔ بولیں تو صرف اتنا.....

''ارے موسم تو بدلتے رہتے ہیں..... اب کیا انسان ہاتھ چھوڑ کر بیٹھ جائے۔'' ایاز انہیں تیار ہونے کا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں عمارہ نے جو اچانک شوہر کو دیکھا تو اس کا رنگ اڑ گیا۔

''وہ..... میں..... میں تو امی جان سے ضروری بات کر رہی تھی۔''

''دس منٹ تک بیل بجاتا رہا ہوں؟''

''ارے تو اماں کہاں تھیں؟'' وہ بوکھلاتے ہوئے بولی۔

''انہوں نے ہی کھولا تھا دروازہ..... کتنی بے پروا ہو تم..... چھوڑ دو یہ حرکتیں۔'' وہ غصے سے دانت بھینچتے ہوئے بولا۔

''ویسے لگ تو نہیں رہا کہ اس وقت کھانے کو کچھ ہوگا..... دیکھو اگر فریج میں کچھ ہے تو لادو افسری خالہ کو دیکھنے جا رہے ہیں میں اور اماں؟''

''سوری..... کھانا تو تیار نہیں ہے مگر کباب رکھے ہیں فریزر میں..... بس دو منٹ میں لائی۔''

''رہنے دو، مجھے تمہارے دو منٹ پتا ہیں..... یہ بتاؤ کہ اماں نے بھی کچھ کھایا یا نہیں؟'' وہ ادھ کھلے دروازے پر کھڑا تھا جبھی جہاں آرا کی آواز ابھری۔

''لو بھلا تمہارے بغیر میں کچھ کھا سکتی ہوں؟'' دیکھا تو وہ ہاتھ میں دہی بڑوں کا ڈونگا اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔

''واہ اماں واہ..... بہت دل چاہ رہا تھا دہی بڑے کھانے کو..... یہ بتائیں کہ ماؤں کو الہام ہوتے ہیں کیا؟''

''الہام ہی سمجھو..... آجاؤ عمارہ..... اور ہاں جگ میں لسی رکھی ہے..... گلاس لے کر آجاؤ.....'' میٹھے، مدھر لمحوں میں ممتا جیت چکی تھی۔

ایاز کی نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ روزانہ گھر میں یہی کہانی ہوتی ہوگی..... عمارہ اسے آفس بھیج کر سو جاتی تھی۔ اماں اکیلی منے کو بھی سنبھالتی تھیں اور ماسی سے گھر کے کام بھی کرواتی تھیں۔ مگر بہو کی نظر میں، کتنی نکمی ماں تھی وہ.....

☆☆☆

اس دن ہوا کچھ یوں کہ عمارہ صبح سے ہی اٹھ گئی تھی اور کھانا بھی بنا لیا۔ اماں سے بھی ہنس ،ہنس کر باتیں کرتی رہی..... جہاں آرا دل ہی دل میں حیران تھیں مگر بولیں کچھ

نہیں...... آخر کچھ دیر کے بعد بلی تھیلے سے نکل ہی آئی۔
''اماں وہ جو ڈراما ہے ناں میں بہت شوق سے دیکھتی تھی...... ارے وہی......'' اس نے ملتجی انداز میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
''ہاں' ارے کم بخت کیا نام تھا اس کا خیر چھوڑو......'' وہ بغور اس کی بات سننے لگیں۔
''اس کی آخری قسط آج سینما پر دکھائی جا رہی ہے...... تو صرف دو گھنٹوں کی تو بات ہے...... وہ میں منے کو امی کی طرف چھوڑ دیتی مگر آج کل ان کے گھٹنوں میں بہت تکلیف ہے۔ اور ہاں کھانا بنا دیا ہے میں نے...... آپ کی پسند کی مونگ کی پھریری دال، پودینے کی چٹنی کے ساتھ بنائی ہے...... ایاز اپنی پسند کے پسندے دیکھ کر خوش ہو جائیں گے...... تو...... میں چلی جاؤں اماں......؟''
''سدا سہاگن رہو میری بچی...... کتنا خیال کرتی ہو میرا......'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔
''بس میں دو گھنٹے میں آجاؤں گی۔ اپنا خیال رکھیے گا۔'' تیار تو وہ تھی ہی بس ساس کے کہنے کی دیر تھی۔ باہر نکل گئی۔
عمارہ کے جانے کے بعد انہوں نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ نماز میں ابھی کافی دیر تھی۔ منا زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ وہ جا کر تیل کی شیشی اٹھا لائیں اور اس کے سر پر تیل لگانے لگیں...... مہربان ہاتھوں کے لمس نے منے کو اور پُرجوش کر دیا۔ وہ دادی سے لپٹنے لگا۔ پھر جہاں آرا نے بچے کو نہلایا۔ دلیا جو کہ عمارہ بنا کر گئی تھی اسے کھلایا پیٹ بھر جانے کے بعد منے کی پلکیں بھاری ہونے لگیں تو انہوں نے اس کے جھولے میں اسے لٹا دیا۔ اور ہلکورے دینے لگیں...... جلد ہی وہ سو گیا۔ برسات کے بعد کپڑوں کی الماری سیلن زدہ سی ہو رہی تھی۔ وہ کپڑوں کو دھوپ لگوانے کے خیال سے اٹھیں۔ احتیاط سے الماری کا پٹ کھولا کہ کہیں منا نہ جاگ جائے۔ کپڑوں کو نکال کر احتیاط سے باہر الگنی پر پھیلایا۔ وہیں کپڑوں کے نیچے رکھے لفافے میں ان کے کنگن رکھے تھے۔ مدت ہوئی بیوہ ہونے کے بعد انہوں نے سارے گہنے، زیور اٹھا کر رکھ دیے تھے۔ اپنے شوہر کو یاد کر کے آج بھی ان کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتیں۔ یہ کنگن بھی انہی وقتوں کے بنے ہوئے تھے۔ وہ لاشعوری طور پر کنگن اپنی کلائی میں ڈال کر ان پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ ان کے شوہر کی آواز، سرسراتی ہوئی ماضی کی بازگشت بن کر ان کے وجود میں اترنے لگی۔
''میں جب مر جاؤں گا ناں جہاں آرا بیگم تو یہ کنگن تمہیں میری یاد دلائیں گے...... دیکھو ان کو کبھی ہاتھوں سے نہ اتارنا۔''
''چلیے ہٹیے یہ کیا کہہ دیا آپ نے......'' وہ پیار بھری ناراضی سے بولیں۔ ''اللہ مجھے آپ کے ہاتھوں سے دفن ہونا نصیب کرے۔''
''ارے تو کیا عمرِ خضر لکھوا کر لائے ہیں ہم...... جانا تو ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔
جہاں آرا کی آنکھیں جھلملانے لگیں...... وہ الماری کو ٹٹول کر وقت کی گرد تلے دبی یادوں کے پھیر کو کریدنے لگیں...... لمحے آہستہ، آہستہ سرک کر وقت کے پاتال میں گرتے رہے...... نہ جانے کتنا وقت بیت گیا۔ وہ چونکیں اس وقت جب منے کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ انہوں نے دہل کر پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ جھولا خالی تھا۔ اصل میں جھولا نیچا تھا نہ جانے کیسے بچہ اتر گیا۔ وہ بے اختیار باہر کی طرف بھاگیں۔ ایک دلخراش منظر ان کا منتظر تھا۔ منے نے نیند سے جاگنے کے بعد صحن میں لگے گملوں سے مٹھی بھر کر مٹی کھالی تھی۔ اب اس کا رنگ نیلا ہو رہا تھا آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔ جہاں آرا کے لبوں سے دعائیں چیخوں کی صورت نکلنے لگیں۔
''رحم کرنا پروردگار...... ہائے...... کوئی ہے...... کوئی ہے...... مرا بچہ، منا...... ارے میرے اللہ......''
وہ سخت بے بسی محسوس کر رہی تھیں۔ انہوں نے بھاگ کر دروازہ کھولا...... گلی میں سناٹا تھا۔ دھوپ کے تیز ہوتے ہی سایوں نے زندگی کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ وہ

دیوانہ وار دوڑتے ہوئے آئیں۔ منے کو گود میں بھرا۔ منہ میں ہاتھ ڈال کر مٹی نکالی۔ اور اس کی پیٹھ تھپکنے لگیں۔ پیچھے پلٹیں تو حواس باختہ سی کھڑی عمارہ نظر آئی۔ عمارہ نے جھپٹ کر منے کو ان کی گود سے لیا اور چیختے ہوئے باہر بھاگی۔

''ہائے اماں کیا کردیا میرے بچے کو..... اپنے ہار سنگار میں لگی رہیں۔ ہائے میرا بچہ۔'' جہاں آرا کا لرزتا، کانپتا ہاتھ بے اختیار ان کے دل پر جا پڑا..... تو اپنی کلائی کے کنگنوں پر نظر پڑی..... شرمندگی سے وہ پانی، پانی ہوگئیں..... پھوٹ، پھوٹ کر رودیں۔

''ہائے لعنت ہو مجھ پر..... میرا منّا..... ہائے میرا منّا.....'' وہ روتے ہوئے دروازے میں آ کھڑی ہوئیں۔ یقیناً عمارہ قریب ہی اسپتال میں منے کو لے کر گئی ہوگی۔ انہوں نے کمرے میں جاکر سر پر دوپٹا ڈالا چند مڑے تڑے پرس میں ٹھونسے اور گھر کو تالا لگا کر اسپتال کی طرف بھاگیں۔ ان کی امید پوری ہوئی، عمارہ وہاں ہی موجود تھی۔ منّا اندر ایمرجنسی میں تھا۔ اس کا معدہ واش کیا جارہا تھا۔ وہ کسی کمزور ٹہنی کی طرح کانپتی اس کے پاس جاکر کھڑی ہوئیں۔ عمارہ نے نفرت سے منہ پھیرلیا۔

''کک..... کیسا ہے..... وہ؟ بتاؤ ناں.....؟''

''چین آگیا آپ کو.....؟ میری ذرا سی خوشی برداشت نہیں ہوئی آپ سے..... سارا دن آخر کرتی ہی کیا ہیں آپ.....؟ نکموں کی طرح تسبیح گھماتی رہتی ہیں تاکہ کام نہ کرنا پڑے۔''

''اللہ گواہ ہے کہ..... کہ.....'' وہ سسکتی ہوئی آواز میں بولیں۔

''بس، بس رہنے دیں۔ مجھے کسی گواہی کی ضرورت نہیں سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے میں نے.....'' ان کی بات کاٹتے ہوئے وہ بولیں۔

''ایاز کو فون کردیا؟'' وہ آنسو پیتے ہوئے بولیں۔

''جی کردیا.....'' وہ سخت انداز میں بولی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایاز بھی آگیا۔ عمارہ چور بنی کھڑی تھی۔ کس دل سے بتاتی کہ وہ سینما گئی ہوئی تھی۔ ایاز نے اس کی جان نکال لینی تھی۔

''آخر یہ کیسے ہوا؟ عمارہ تم نے منے کا خیال نہیں رکھا؟ کیا کررہی تھیں تم؟''

وہ سر سے پیر تک ساس کے سامنے ایک التجا بن گئی۔ جیسے اس کا بھانڈا پھوٹا تو بہت برا ہوگا..... ایاز جان دیتا تھا بچے پر۔ جبھی جہاں آرا نے عمارہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''یہ بیچاری تو گھر کے کاموں میں مصروف تھی۔ میں ہی کم بخت ماری منے کا خیال نہ رکھ سکی۔ مجھے معاف کردو بیٹا.....'' عمارہ کی سسکیاں بلند تھیں۔

''ارے اماں کیسی باتیں کررہی ہیں آپ کوئی دشمن تھوڑی ہیں ہماری..... سب ٹھیک ہوجائے گا۔ عمارہ تم اماں کو لے کر گھر جاؤ.....''

''مگر وہ منا.....'' عمارہ تڑپ کر بولی۔

''میں اسے لے کر آتا ہوں..... ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے میری..... وہ ہوش میں ہے اور بہتر ہے۔'' جہاں آرا اور عمارہ بیک وقت بولیں ''اللہ کا شکر ہے۔''

چند لمحوں کے بعد عمارہ ساس کا ہاتھ پکڑ کر جب گھر میں داخل ہوئی تو ایک بدلی ہوئی عورت تھی۔

''اماں پیاری اماں..... مجھے معاف کردیں۔ میں نے، میں نے آپ کو بہت ستایا..... اماں.....'' جہاں آرا نے عمارہ کو گلے سے لگالیا۔

''چل پگلی..... اولاد تو ستاتی ہی ہے ماؤں کو..... چل اپنا حلیہ درست کرلے..... اور جلدی سے کھانا لگالے..... میں ذرا شکرانے کے نفل پڑھ لوں.....''

عمارہ سسکتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔

''میری پیاری اماں میں وعدہ کرتی ہوں آج کے بعد آپ کو کوئی دکھ نہیں دوں گی۔ مجھے معاف کردیں۔''

دھوپ کی تمازت واقعی ڈھلنے لگی تھی۔ جب تک ایاز منے کو لے کر گھر آتا شام کی دلہن مسکراتی، لجاتی، خوشبو بکھیرتی ان کے آنگن میں اتر آئی تھی..... ننھی عورت نے کام جو کر دکھایا تھا۔

❀❀❀

ناولٹ

وہ ہجر جو ہم کو لازم تھا

شیریں حیدر

''مجھ سے شادی کرو گی مایا؟'' اس نے سیدھے سبھاؤ سوال کیا تھا، بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے۔

''تم آئس کریم یا برگر کھانے کو تو نہیں پوچھ رہے ہو پی جے!'' میں دل میں بہت گھبرائی تھی مگر اپنے اعتماد کا بھرم تو قائم رکھنا تھا ناں۔

''تم جانتی ہو مایا کہ ہمارے درمیان یہ سوال کسی بھی وقت، پٹاری سے سانپ کی طرح...... کسی کے منہ سے بھی نکلنے ہی والا تھا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''سوچوں گی۔'' میں نے ہولے سے کہا۔
''سوچ کر بتاؤں گی۔'' میں بھی جانتی تھی کہ اس کے اور میرے بیچ دوستی اب فقط دوستی نہیں رہی تھی۔ ہم کالج میں پڑھائی کے وقت سے ایک دوسرے کو جانتے تھے، کالج کے بعد ہماری راہیں جدا ہوئیں مگر ایک ہی شہر کی فضاؤں میں سانس لیتے تھے اور کئی بار بغیر کوشش کے اور زیادہ تر کوشش کر کے ملتے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ہر موضوع پر بات کر سکتے تھے، ہر مسئلہ زیرِ بحث لا سکتے تھے اور ایک دوسرے کو مسائل کا بہترین حل نہ صرف بتا سکتے تھے بلکہ جو کچھ عملی طور پر ہو پاتا تھا، وہ بھی کرتے تھے۔
''کیا سوچنا ہے تم نے مایا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا اپنے والدین اور بھائیوں سے مشورہ کرنا ہے؟''
''میرے والدین تمہیں جانتے ہیں پی جے اور میرے بھائیوں کو تمہیں جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''پھر کیا رکاوٹ ہے جواب دینے میں، کم از کم ہاں یا نہ میں جواب تو دو ناں!''
''تو تم کیا چاہتے ہو، ہاں یا نہ؟'' میں نے اسے چھیڑنے کو پوچھا۔
''میں نے تمہیں پروپوز کیا ہے تو تمہیں علم ہے کہ میں کیا جواب چاہتا ہوں...... لیکن اگر تمہیں انکار کرنا ہے تو تمہیں انکار کی وجہ بھی بتانا ہوگی۔'' اس نے مجھے گھورا۔
''کیوں، یہ شرط کیوں؟'' میں نے حیرت سے اپنے اس طالب کو دیکھا۔
''یار اس لیے کہ اگر تمہارے انکار کے بعد میں کسی اور لڑکی کو کل کلاں کو پروپوز کروں تو مجھے علم تو ہو کہ وہ کس وجہ سے انکار کر سکتی ہے۔''
''پی جے......'' میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی موٹی سی کتاب اس کے کندھے پر ماری۔ ''نام تو لو تم کسی اور کا بھی۔''
''تو اور کیا کروں گا اگر تم نے انکار......''
''انکار کیوں......'' کہتے، کہتے رک گئی، میں ایک دم بلش کر گئی۔ ''ویسے پی جے...... ایسی باتیں لڑکیوں کے والدین سے کی جاتی ہیں۔''
''وہ تو ظاہر ہے، میری اماں ہی آ کر تمہارے اماں، باوا سے بات کریں گی، میں تو فقط یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے، مجھ میں کچھ ناپسند تو نہیں؟''
''ناپسند ہے تو۔''
''کیا؟'' اس کا منہ لٹک گیا۔
''سب سے پہلے تو مجھے تمہارا نام ہی پسند نہیں ہے پی جے، اتنا فضول سا نام ہے۔''
''تم ہاں کہو...... نام بھی بدل لوں گا۔'' اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

☆☆☆

''میں نے اپنا نام پیراں جوگا المعروف، پی جے، سے بدل کر، چوہدری مہتاب رکھ لیا ہے۔ آئندہ مجھے اسی نام سے لکھا اور پکارا جائے اور میرے تمام کاغذات میں بھی میرے نام کی درستگی کر لی جائے۔'' ٹھیک ہے ناں؟'' اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا میرے سامنے رکھا جس پر یہ عبارت لکھی تھی اس نے۔
''ہاں ٹھیک ہے...... ویسے پی جے... بڑا ہی عجیب سا نام لگتا ہے مجھے تمہارا، ایک تو تمہارے والدین نے نام عجیب رکھا، پیراں جوگا...... اوپر سے تم نے اس سے چھٹکارا پانے کے لیے جس مختصر نام کا انتخاب کیا، وہ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بن گیا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔
''جب میں نے اپنے نام کو پی جے بنایا تو اس وقت سلیپنگ سوٹ کو پی جے کوئی نہیں کہتا تھا مایا۔'' اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔
''تم نے کبھی اپنے والدین سے پوچھا تھا کہ انہوں نے تمہارا اتنا ''خوب صورت'' نام کیوں رکھا؟'' میں نے لفظ ''خوب صورت'' پر زور دے کر اسے مزید چڑایا۔
''تمہیں اس وقت تو عجیب لگ رہا ہے اور تمہارے اصرار پر میں اپنا نام تبدیل بھی کر رہا ہوں مگر ایسا منفرد نام تمہیں فلمی دنیا میں کہیں نظر نہیں آئے گا...... تم نے شاید لوگوں کے عجیب، عجیب نام نہیں

سنے، میزان والا، باٹا والا، آلو والیہ، سپاری والا، باٹلی والا، سہراب والا، تیل والا...... وغیرہ، وغیرہ۔''

''یہ سب لوگوں کے پیدائشی نام نہیں ہیں پی جے...... یہ نام لوگوں کے کاروبار کی وجہ سے مشہور ہو گئے ہیں۔''

''پھر بھی تم دیکھو، یہ سب نام ان کے خاندانوں میں نسل در نسل چل رہے ہیں، ان کے پوتے اور پڑپوتے بھی جو ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں، ان کے ناموں کا لاحقہ ابھی تک وہی ہے اور وہ لوگ اس پر فخر محسوس کرتے ہیں۔''

''تم اگر نہیں چاہتے تو تم اپنا نام تبدیل نہیں کرو۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ اسے نہیں کہہ سکی مگر جانتی تھی کہ میں ایسے نام والے شخص سے ہمیشہ کے لیے منسوب نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے اتنا عجیب لگتا تھا یہ سوچ کر بھی کہ مجھے کل کلاں کو لوگ مایا پیراں جوگا کہیں، مایا پی جے یا بیگم پیراں جوگا کے نام سے جانی جاؤں۔

''تمہیں اچھا نہیں لگے گا جب کوئی کہے گا...... ڈاکٹر مایا پیراں جوگا؟'' اس نے گویا میرے ذہن کو پڑھ لیا تھا۔

''نہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے ایک لفظی جواب دیا۔

اس سے محبت ہوئی تو اس وقت مجھے اس کا نام تک نہیں معلوم تھا اور ہوتا بھی تو کیا، محبت تو ویسے ہی دیوانی ہوتی ہے، اسے کہاں نام، خاندان، حیثیت، ذات، قوم یا مذہب نظر آتا ہے۔ ہماری محبت اتنی حادثاتی تھی کہ اسے کسی حادثے کے نتیجے میں ہی وجود میں آنا تھا۔ ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے...... میں نے چند بار ڈرائیونگ کی کلاسیں لی تھیں، ابھی پریکٹس نہیں کی تھی مگر جی چاہتا تھا کہ میں بھی گاڑی چلاؤں۔ ڈرائیور کے انکار کے باوجود، اس روز میں نے اس سے اصرار کر کے گاڑی چلانے کے لیے لے لی اور کالج کے پارکنگ لاٹ میں ہی ریورس کرتے ہوئے 'ٹھک' کی آواز کے ساتھ دوسری گاڑی سے ٹکرا دی۔ حادثہ جو میری غلطی سے ہوا مگر اس گاڑی کے مالک پی جے نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اپنے نقصان کی پروا نہیں کی تھی بلکہ مجھے اسپتال بھی خود لے کر گیا کیونکہ میری کمر اور گردن میں شدید جھٹکا آیا تھا۔ میری گاڑی سمیت مجھے ابتدائی طبی امداد کے بعد میرے گھر بھی پہنچایا تھا۔

''میں اپنے والدین کی شادی کے کئی برسوں کے بعد ان کے ہاں اکلوتی اور بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والی اولاد تھا مایا...... اماں نے کسی پیر کے دربار پر جا کر منت مانی تھی کہ اپنا پہلا بچہ وہ ان پیر صاحب کو دے دیں گی۔ جب میں پیدا ہوا اور اماں مجھے ان کی درگاہ پر پیش کرنے کے لیے گئیں تو ان پیر صاحب نے انکار کر دیا کہ ایسا وہ نہیں کرتے تھے۔ اماں کا اصرار تھا کہ یہ بچہ ان کی دعا سے تھا اس لیے ان کا پہلا حق تھا۔ اماں کے اپنے الفاظ تھے کہ وہ بچہ پیراں جوگا تھا، پیر صاحب نے جواب میں کہا کہ وہ جہاں بھی ہوگا، پیراں جوگا ہی ہوگا۔ اماں کی قربانی تو انہوں نے قبول نہیں کی مگر اماں کو مجھے پکارنے کے لیے پیراں جوگا ہی مناسب لگا اور یوں وہی میرا نام ٹھہرا۔'' اس نے وضاحت کی تو مجھے مناسب نہ لگا کہ میں اس کی اماں کو اس کے سامنے منہ پھاڑ کر جاہل کہہ دیتی۔

''تم اپنا نام تبدیل کر لو پی جے، مجھے بہت عجیب لگتا ہے تمہیں پی جے کہنا بھی۔'' میں نے اس سے درخواست کی تھی۔ جانتی تھی کہ محبت کی...... آگ یکطرفہ نہیں تھی، وہ اس درجے پر تھا جہاں میں اسے اسی آگ میں جل کر بھسم ہونے کو کہتی تو بھی وہ ہو جاتا۔

''تو تم کچھ اور کہہ لیا کرو......''

''مثلاً میں اور کیا کہہ لیا کروں؟'' میں نے ابرو اچکا کر سوال کیا۔

''تم مجھے پیار سے پیرو بھی کہہ سکتی ہو۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''پیرو کہنے سے تو تم اور بھی فقیر لگو گے...... اور ویسے بھی دیکھوں گی کہ تم پر پیار آتا بھی ہے کہ نہیں۔'' میں بھی ہنسی۔

''کوئی اور چارہ نہیں؟'' اس کے چہرے پر یتیمی برسنے لگی۔

''کوئی اور چارہ نہیں پی جے۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔ ''اگر تم میرے سنگ زندگی بتانا چاہتے ہو تو تمہیں میری اس خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔''

''ویسے اماں...... اماں کو برا لگے گا۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔ وہ یوں لگ رہا تھا جیسے اب بھی اماں کا دودھ پیتا ہو۔

''اماں کو بتانا ہی نہیں...... وہ اسی نام سے پکارتی رہیں، انہوں نے کون سا اخبار میں اشتہار پڑھ لینا ہے یا تمہاری سندیں چیک کر لیں گی۔'' میں نے اسے دلاسا اور ہمت دی۔

''مجھے شباب نام اچھا لگتا ہے...... پھر شباب رکھ لوں؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''شباب...... پورا نام کیا ہوگا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''شباب کیرانوی......'' اس کا شباب کیرانوی جیسے پرانے ہدایت کار سے متاثر ہونا فطری تھا کہ وہ فلم کی دنیا کا آدمی تھا۔

ایم بی اے کر کے اس نے جس کاروبار میں ہاتھ ڈالا تھا وہ فلم بنانے کا تھا۔ سرمایہ کوئی مسئلہ نہ تھا، چھوٹے بجٹ کی ایک دو فلموں سے ہی اس نے کامیابی کی سیڑھی پر قدم رکھ دیا تھا کہ اس کی فلمیں معاشرے کے تلخ حقائق پر ہوتیں، غربت کے گرد گھومتیں اور اس کے لیے اسے حقیقی سیٹ بہ آسانی مل جاتے جو کہ شہر کے پرانے اور غربا کے علاقے تھے۔ تنگ گلیاں، ابلتی ہوئی نالیاں، پلوں کے نیچے پیدا ہو کر وہیں جوان ہو کر مر جانے والے نسل در نسل خاندان، تنگ محلوں میں رہتی ہوئی کئی، کئی ہاتھوں سے ''گزر'' کر وقت سے پہلے جوان ہو جانے والی لڑکیاں جو اپنے جسم کو اپنی کمائی کا ذریعہ سمجھ لیتی ہیں۔ اس کی پہلی دو تین فلموں نے معاشرے کے ضمیر کو جھنجوڑ دیا تھا اور اس کی فلمیں سپر ہٹ ہوئی تھیں۔

''کچھ نیا سا نام ہو ناں پی جے۔''

''تم بتاؤ کوئی نام؟'' مجھے اس نے فوراً مشکل میں ڈال دیا تھا۔ میں نے کب سوچا تھا کہ وہ مجھے ہی نام تجویز کرنے کو کہہ دے گا۔

''میں سوچ کر بتاؤں گی......'' میں نے اس سے کہا تھا۔

''اشتہار میں نے تیار کر رکھا ہے مایا، تم نام سوچنے کو وقت مانگ رہی ہو۔ اگر تمہیں میرا نام پسند نہیں تو کم از کم وہ نام تو بتا دو جو کہ تمہیں پسند ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''تم کوئی ایسا نام رکھو جس کے حروف بہت اچھے ہوں، انہیں بلانے سے طاقت کا احساس ہوتا ہو۔'' میں نے تجویز کیا۔

''کیا مطلب میں اپنا نام چنگیز خان، ہلاکو خان، ریمبو، کنگ کانگ، محمد علی کلے، انوکی یا جھارا ٹائپ رکھ لوں؟'' اس نے پوچھا۔ ''یا پھر بیٹ مین، اسپائیڈر مین، سپر مین؟''

''مذاق نہیں پی جے۔'' میں نے منہ بسورا۔

''اس میں مذاق کیا ہوا؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں واقعی تمہاری اس بات کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''میرا مطلب ہے کہ نام ایسا ہو جسے مختصر کر کے اس کے ابتدائی حروف بلائے جائیں تو علم ہو کہ کوئی بلند مرتبہ آدمی ہے...... آج کل یہی فیشن ہے اور فلمی دنیا میں تو اب یہ رجحان زیادہ ہے کہ نام کے ابتدائی حروف پہچان بن جاتے ہیں، مثلاً ڈی سی، اے سی، سی ایم، پی ایم۔'' میں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔

''اوہ۔'' اس نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ ''اب سمجھا، خیال تو اچھا ہے...... پی ایم تو زیادہ ہی طاقت ور ہو جاتا ہے، میرا خیال ہے کہ ڈی سی یا زیادہ سے زیادہ سی ایم تک چل جائے گا۔'' اس کے کہنے کے بعد ہم نے نام بہ آواز بلند سوچنا شروع کر دیے۔ ڈی سی سے، دلاور چوہدری اور سی ایم سے چوہدری مہتاب پر اتفاق ہوا تھا۔ مہتاب، شباب سے ہم قافیہ بھی تھا اور رم سے

شروع ہوتا تھا، میرے نام کی طرح...... تو وہ پی جے کو زیادہ بھایا تھا اور یوں اس وقت ہم اس اشتہار کو تکمیل کے مراحل تک پہنچا چکے تھے۔

اس مرحلے سے اگلا مرحلہ...... ہمارے والدین کے ذریعے باقاعدہ بات چیت طے کر کے شادی کی تاریخ مقرر کرنا تھا۔ وہ سارے مراحل بھی جیسے چٹکیوں میں طے ہوئے اور ہم جلد ہی ایک ہو گئے۔ ہمارے درمیان سماج کی کوئی ظالم دیوار حائل نہ ہوئی تھی، راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

☆☆☆

''لاہور میں فلمی دنیا کا مستقبل تاریک ہو رہا ہے مایا، میں کچھ عرصے کے لیے کراچی جا کر اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہوں۔'' اس نے مجھے اپنی بانہوں کے حلقے میں لے کر کہا تھا۔

''مگر میری اتنی اچھی ملازمت ہے لاہور میں مہتاب۔'' میں نے مخالفت کی۔

''تمہیں کراچی میں اس سے بہتر ملازمت مل جائے گی مایا، کون ڈاکٹر ہے جو بھوکا مرتا ہے، ایک تو تم اتنی اچھی ڈاکٹر ہو اوپر سے پلاسٹک سرجن، تمہیں وہاں کوئی کمی نہیں ہو گی آپشنز کی میری جان۔'' اس نے کہا۔

''وہ بھی اگر تمہارا ملازمت کرنا اتنا ہی ضروری ہے تو۔''

''تمہارے لیے تمہارا کام جتنا اہم ہے، اتنا ہی میرے لیے میری ملازمت اہم ہے مہتاب۔''

''یقین کرو مایا، مجھے تو تمہاری ملازمت ہی غیر ضروری لگتی ہے، کیا ضرورت ہے تمہیں یوں دن رات اپنا سر کھپانے کی، کوئی کمی ہے ہمیں؟''

''بات کمی اور زیادتی کی نہیں ہے مہتاب، میری ملازمت میری ضرورت سے بڑھ کر، میرا جنون ہے، جس طرح تمہارا ایک جنون ہے۔''

''اس وقت اہم یہ ہے کہ ہم اکٹھے ہوں، اب ہمیں اپنی فیملی شروع کرنے کا سوچنا چاہیے مایا...... اماں پوتے پوتی کی حسرت دل میں لیے دنیا سے چلی گئیں۔ اب تمہاری امی ہیں، ان کے پاس ہم جب بھی جاتے ہیں تو ان کا یہی سوال ہوتا ہے۔''

''جانتی ہوں مہتاب...... جانے اللہ کو کیا منظور ہے، بچے کی خواہش میرے دل میں بھی پنپتی ہے۔ ہم دونوں ڈاکٹر سے چیک اپ بھی کروا چکے ہیں، اب کیا دیر ہے، وہ تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔''

''کراچی چلتے ہیں، تم وہاں سیٹ نہ ہو سکیں تو ہم واپس آجائیں گے...... پکا وعدہ ہے مایا۔'' اس نے کہا۔ ''وہاں بھی کسی ڈاکٹر کو دکھا لیں گے، ضرورت محسوس ہوئی تو فرٹیلیٹی کا علاج کروا لیں گے۔'' اس نے اس نکتے پر بات کی تو میں زیادہ مزاحمت نہ کر سکی تھی۔

☆☆☆

''میں آپ کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں رہتی ہوں بہن۔'' میں دروازہ کھول کر اس کے بیچ میں کھڑی تھی، اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی، اس پر نفیس سا سفید رنگ کا ٹرے کور تھا، اس کے اندر سے بھی بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ''میں نے سوچا کہ نئے ہمسائے آئے ہیں، انہیں مل بھی لوں اور اپنا تعارف بھی کروا دوں، یوں تو ہر بندہ دوسرے بندے کے کام آتا ہے مگر ہمسایوں کے حقوق تو سب سے بڑھ کر ہیں......'' وہ میری طرف ٹرے بڑھاتی ہوئی بولی۔

''جی جی...... اندر آئیے ناں۔'' میں نے ہٹ کر اسے راستہ دیا۔

''ارے نہیں بہن پھر کبھی آؤں گی، ابھی تو آپ کے شوہر گھر پر ہوں گے...... میں اکیلی عورت کسی ایسے وقت میں آؤں گی جب آپ گھر پر تنہا ہو گی۔'' اس نے کہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ایک تو وہ اکیلی تھی، کنواری، مطلقہ یا بیوہ، اس کی وضاحت کم از کم پہلی ملاقات میں نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ اسے ہم میاں بیوی کے گھر کے اندر اور باہر ہونے کے اوقات کا بھی علم تھا۔

''کوئی بات نہیں...... آپ اندر آئیں۔ میرے شوہر سو رہے ہیں، ہم تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ سکتے ہیں، کم از کم ...ایک گلاس جوس تو پی لیں آپ۔'' میں نے اصرار کیا۔

''پھر آؤں گی کبھی، گھر پر میرا بیٹا اکیلا ہے، جاگ

گیا تو پریشان ہوگا۔'' اس نے ٹرے میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور پلٹ کر اپنے فلیٹ میں چلی گئی۔

مہتاب تو چاہتا تھا کہ ہم کسی اچھے علاقے میں بڑا سا گھر لیتے مگر مجھے اعتراض تھا کہ ہم دونوں کا گھر پر وقت ہی کتنا گزرتا تھا۔ یہ فلیٹ مجھے محفوظ لگا تھا کہ زیادہ تر مہتاب رات رات بھر اپنے شوٹ کے سلسلے میں باہر رہتا تھا اور کئی بار تو یہ سلسلہ کئی راتوں تک بھی چلتا تھا اگر وہ اندرون سندھ وغیرہ کی کسی لوکیشن پر کام کر رہا ہوتا تھا، اس وقت بھی اس کی ایک بڑی فلم تھر کے علاقے میں شوٹ ہو رہی تھی۔ میں نے شروع میں بتایا تھا کہ اسے حقیقی لوکیشنز پر کام کرنا زیادہ پسند تھا۔ اس لیے صحرا کے رہنے والوں کی زندگیوں پر فلم بن رہی تھی تو وہ وہیں بنتا تھی۔ اسے مصنوعی سیٹ بنا کر کام کرنے کی عادت نہ تھی۔ مجھے چونکہ ان حالات میں زیادہ تر اکیلے ہی گھر پر رہنا ہوتا تھا اس لیے، کسی بھی مہنگے علاقے میں کسی بڑے گھر میں رہنا، آبیل مجھے مار، کے مترادف تھا۔ مہتاب کی مخالفت کے باوجود میں نے اصرار کر کے اس فلیٹ کو پسند کیا تھا۔ بعد ازاں مجھے اندازہ ہوا تھا کہ بعض فیصلے قدرت ہم سے اس لیے کرواتی ہے کہ اس سے ہماری زندگیوں کے رخ بدل سکیں۔

☆☆☆

''چھ دفعہ اس نے کچھ نہ کچھ بنا کر بھیجا ہے مہتاب، مجھے اتنا برا لگتا ہے لیکن کوشش کے باوجود مجھے وقت ہی نہیں ملتا کہ کچھ خاص بناؤں اور اس کے ہاں بھیجوں۔'' میں نے اس کی لائی ہوئی حلیم کھاتے ہوئے کہا۔

''ذائقہ بہت ہے ویسے اس کے ہاتھ میں۔'' مہتاب نے دل سے تعریف کی۔ مجھے اس پر کوئی رنج نہ ہوا کہ واقعی اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا، اب تک اس نے جو کچھ بھی بھیجا تھا وہ قابلِ تعریف تھا۔ میں اس کی خالی پلیٹیں لوٹاتے ہوئے دل میں شرمندہ بھی ہوتی تھی لیکن کوئی حل نہ تھا میرے پاس اس کا۔

''سوچ رہی ہوں کہ کوئی پھل وغیرہ اس کے ہاں بھجوا دوں یا کوئی خشک میوہ جات۔''

''کچھ پکا ہوا کسی ریسٹورنٹ سے لا کر بھجوا سکتے ہیں۔'' مہتاب نے تجویز دی تھی۔

''ارے نہیں، یوں تو برا لگے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم انہیں مدعو کر کے کہیں باہر کھانا کھانے چلیں۔ اکیلی عورت ہے، ابھی تک تو اس سے اتنی ملاقات بھی نہیں ہوئی کہ اس کے بارے میں جان سکتی۔ وہ اتنی اچھی ہمسائی ہے اور ہم ابھی تک یہ بھی نہیں جانتے کہ اس کے ساتھ مسائل کیا ہیں، اکیلی عورت رہتی کیسے ہے، ذریعۂ آمدن کیا ہے!''

''ہاں...... یہ اچھی تجویز ہے، تم اسے لے کر کسی جگہ باہر کھانے پر چلی جاؤ۔'' مہتاب نے حلیم کو چاٹ کر صاف کیا تھا۔

''میں اکیلی؟ میں اس سے کیا باتیں کروں گی اکیلی...... تم بھی ساتھ چلو مہتاب۔''

''میں عورتوں کے ساتھ جاتا اچھا لگوں گا کیا؟''

''اس کا ایک بیٹا بھی ہے مہتاب۔'' میں نے اصرار کیا اور اس وقت تک کیا جب تک کہ مہتاب نے حامی نہ بھر لی۔ اب اسی کو بتانا تھا کہ وہ کس دن وقت نکال سکتا تھا انہیں کھانے پر لے کر جانے کے لیے۔

☆☆☆

''ہیں تو دم پخت کباب مگر اس میں خوشبو چپل کبابوں جیسی ہے۔'' اس نے اپنی ماہرانہ رائے دی تھی۔

''اچھا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ کو کیسے علم ہوا؟''

''تم مجھے کویتا کہہ سکتی ہو مایا۔'' اس نے اپنا نام انوکھے انداز میں بتایا تو مہتاب کو اس کے نام نے چونکا دیا۔ اسے فلمی نام بہت اچھے لگتے تھے، مجھے بھی کئی بار وہ لاڈ سے مایا میم صاحب کہہ کر پکارتا تھا۔

''بہت پیارا نام ہے تمہارا کویتا۔'' میں نے دل سے تعریف کی۔ ''آپ جناب کے تکلف میں تھی کہ جانے تم کتنی بڑی ہوگی مجھ سے...... مگر تم لگ بھگ میری ہی عمر کی ہوگی۔ بیٹا بھی تو ابھی صرف سات سال کا ہے، میں بھی کہ جانے کتنا بڑا ہوگا، اسی لیے تو مہتاب

سے کہا کہ ساتھ چلیں۔''

''ایک بیوہ عورت کو یہ معاشرہ کہاں اتنا حق دیتا ہے کہ وہ بن سنور کر رہے، اچھی لگے یا اس کی اصل عمر اور خوب صورتی کسی کو نظر آئے.....'' اس نے اتنا خوب صورت مکالمہ بولا تھا کہ مروت اور تکلف کی جانہ ہوتی تو مہتاب پھڑک اٹھتے۔

''بیٹے کا کیا نام ہے بہن؟'' مہتاب نے اس سے پہلی بار مخاطب ہو کر کچھ پوچھا تھا۔

''اسد سعید نام ہے اس کا۔ سعید میرے مرحوم شوہر کا نام تھا، گھر سے دفتر گئے تھے، راستے میں ایک انجان گولی کا نشانہ بن کر لوگوں کے کندھوں پر واپس لوٹے۔ زندگی کا رخ بدل گیا، میں نے بہت کٹھن حالات کا سامنا کیا۔ دشمن تو دشمن، اپنوں نے بھی رخ پھیر لیا تھا...... سسرال والوں کی پوری کوشش تھی کہ میرے جینے کا واحد جواز، میرا بیٹا بھی مجھ سے چھین لیں۔ میں نے ان سب سے بچنے کے لیے قانونی جنگ بھی لڑی اور پھر اس فلیٹ میں رہنے لگی کہ یہاں سکون اور تحفظ کا احساس ہے اور اب قسمت سے آپ جیسے اچھے ہمسائے بھی مل گئے ہیں۔'' اس نے اپنا پورا تعارف کروا دیا تھا۔

''اوہو......'' میں نے تاسف سے کہا۔ ''تمہیں جب بھی کوئی مشکل یا ضرورت ہو تو خود کو تنہا نہ سمجھنا۔'' میں نے میز پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''اس میٹھے میں تھوڑی سی کڑواہٹ ہے، لگتا ہے کہ انہوں نے جیلاٹن زیادہ ڈال دی ہے اور کریم بھی شاید پرانی ہے۔'' اس نے میٹھے پر اپنی ماہرانہ رائے دی تھی۔ ''مہتاب بھائی، انہیں کہیں ذرا اپنے شیف کو تو بلائیں۔'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا، وہ کیا کرنے والی تھی۔

''جی......'' کہہ کر مہتاب نے ویٹر سے کہا تھا کہ وہ اپنے شیف کو بلا کر لائے۔ شیف کے آنے پر اس نے اسے بتایا کہ اس نے اس روز کھانا پکانے میں کیا، کیا غلطیاں کی تھیں۔ شیف کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا،

نیا سال

تم نے مجھ سے کہا تھا ناں کہ
تمہارا ساتھ میں دوں گا
اپنے ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ کر کہا تھا ناں کہ
بھری دنیا سے ٹکرا کر تمہارا ساتھ میں دوں گا
نہ بدلوں گا کبھی جیسے یہ موسم بدلتے ہیں
بدلتی رُتوں میں بھی
تمہارا ساتھ میں دوں گا
میرا اعتبار کرنا میں لوٹ آؤں گا
تمہاری ان ہی باتوں سے مجبور ہو کر
تمہارا یقین کر بیٹھی
تمہیں اپنا مان کر
تمہارا اعتبار کر بیٹھی
مگر اے دشمنِ جاناں
تمہارے جھوٹے عہد و پیمان سے
تو یہ موسم بھی اچھے نکلے
تم عہد کر کے نہ لوٹے
اور یہ موسم پھر سے لوٹ آئے
نئے سال کے آغاز پر کہا تھا ناں کہ
میں لوٹ آؤں گا
ابھی تک تم نہیں لوٹے پر دیکھو
نیا سال لوٹ آیا ہے

شاعرہ: ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

انتخاب: مہرین کنول ضیا، لیہ

اس سے قبل شاید اس کا کسی ایسی صورت حال سے سامنا نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں کھانے کے بارے میں اتنا کیسے اندازہ ہوتا ہے کویتا...... میں تو بہت متاثر ہوئی ہوں۔''

''کھانا پکانا نہ صرف میری روزی روٹی کا باعث ہے بلکہ یہ میرا عشق بھی ہے۔ میں کھانا اس طرح پکاتی ہوں جس خشوع اور خضوع سے عبادت کی جاتی ہے۔'' اس نے جذب سے کہا تھا۔

میں نے ابھی تک اس کے ہاتھ کا پکا ہوا جو کچھ بھی کھایا تھا، اس کے بعد مجھے اس کے اس بیان پر کوئی شک نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ شوہر کے انتقال کے بعد اس کے ہاتھ میں سوائے کھانا پکانے کے ہنر کے کچھ اور نہ تھا۔ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود کبھی گھر سے نکل کر نوکری نہیں کی تھی اور نہ ہی کوئی تجربہ اور سفارش تھی کہ اسے کوئی ملازمت ملتی یوں اس نے کھانا پکانے میں ہی قسمت آزمانے کا سوچا۔ پہلے وہ کسی اور علاقے میں ایک خستہ حال سے کرایے کے مکان میں رہتی تھی۔ آن لائن اس نے چھوٹے سے پیمانے سے لوگوں کے لیے آرڈر پر کھانا پکانا شروع کیا، کھانا آن لائن آرڈر ہوتا اور لوگ آ کر تیار کھانا اس کے گھر سے وصول کر لیتے تھے۔ جوں، جوں اس کا کام بڑھتا گیا اسے اندازہ ہونے لگا کہ بھانت، بھانت کے لوگوں کو اپنے گھر کا پتا دے کر وہ اپنے لیے خطرات پیدا کر رہی تھی۔ سب کو علم ہو جاتا کہ وہ ایک جوان عورت ہے جو اپنے چھوٹے سے بیٹے کے ساتھ تنہا رہتی ہے۔

تب اس نے کام کا طریقہ بدلا، کھانے کے آرڈر اسی طرح آن لائن لیتی اور کھانا تیار کر کے لوگوں کے گھروں پر بھجوانے لگی۔ اس کے لیے اس نے اپنی بہن کے سسرالی خاندان کے ایک بااعتماد نوجوان کو موٹر سائیکل لے کر دیا تھا، اس نے پہلے تنہا یہ کام کیا تھا اب اس کے ساتھ بھی مزید لڑکے تھے جو کویتا کا بنایا ہوا تازہ کھانا ان لوگوں تک پہنچاتے تھے جو کھانا آرڈر کرتے تھے۔ اس کے لیے وہ جو اضافی رقم لوگوں سے وصول کرتی تھی وہ اس لڑکے کا عوضانہ ہوتی تھی جس سے بچت کر کے اس نے بھی اپنے ساتھ چند اور نوجوانوں کو لگا کر ایک کوریئر کمپنی بنا لی تھی۔ کویتا کے کاروبار کی برکت سے ایک بیکار نوجوان کی زندگی بھی سنور گئی تھی۔

''تمہیں مشکل نہیں لگتا اتنا کھانا تنہا بنانا، کوئی خانساماں رکھ لو ساتھ کام کرنے کے لیے۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔

''کھانا پکانا مجھے کبھی مشکل نہیں لگا......اب میں نے سبزیوں کی کٹائی وغیرہ کے لیے ایک ملازمہ رکھی ہے، جب میں کام کرتی ہوں تو وہ ساتھ، ساتھ باورچی خانہ صاف کرتی ہے، برتن دھوتی جاتی ہے اور میرے ساتھ کھانے کی پیکنگ میں بھی مدد کرتی ہے۔ کھانے کا ذائقہ ہر ہاتھ کا مختلف ہوتا ہے...... مجھے جتنا اعتماد اپنے ہاتھ پر ہے، اتنا کسی اور کے ہاتھ پر نہیں ہو سکتا۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تم کھانا بہت اچھا بناتی ہو...... کیوں مہتاب؟''

''ہاں واقعی...... کویتا بہن کے ہاتھ کے بنے کھانے میں بہت منفرد ذائقہ ہوتا ہے۔'' مہتاب اس وقت سے خاموش بیٹھے صرف سن رہے تھے، میں نے جان بوجھ کر انہیں گفتگو میں گھسیٹا تھا۔

''لیکن اگر تم کھانا لو گی تو نہ صرف رعایتی نرخوں پر ملے گا بلکہ ڈلیوری کے چارجز بھی نہیں لوں گی۔'' اس نے شوخی سے کہا۔ ''ہمسائیوں کے اتنے حقوق تو ہوتے ہیں ناں۔'' وہ ہنسی تو میں بھی ہنس دی۔ لیکن اس کے اس شوخ فقرے نے مجھے ایک نئی راہ سجھائی تھی۔ اگر ہم اس کے ہمسائے تھے تو وہ بھی تو ہماری ہمسائی تھی، اس کے بھی تو ایسے ہی حقوق تھے ناں۔ ہم بھی تو کھانا عموماً باہر ہی کھاتے تھے۔ کبھی میں گھر لوٹتے ہوئے کچھ پکا پکایا باہر سے لے آتی تھی، کبھی ہم فون پر آرڈر کر کے منگواتے تھے۔ گھر پر تو کھانا میں مہینے میں دو چار دن ہی بنا پاتی تھی۔ ہماری مصروف زندگیوں میں کھانا پکانے کے لیے وقت نکالنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

''میں کھانا تم سے ایک شرط پر لوں گی۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا شرط ہے بہنا؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''تم فری ڈیلیوری دوگی......''

''وہ تو کہا ہے میں نے۔''

''لیکن کھانا تم انہی نرخوں پر دوگی، جن نرخوں پر تم باقی لوگوں کو دیتی ہو۔'' میں نے اپنی شرط پیش کی۔

''یہ کیا بات ہوئی، بندہ کسی کو بہن، بھائی بھی کہے اور پھر ان سے کاروباری انداز میں بات بھی کرے۔''

''یا تم مجھے بہن کہہ لو یا مہتاب کو بھائی، کم از کم ہم دونوں کو اپنے بہن، بھائی تو نہ بنا لو، ہم آپس میں بھی بہن بھائی بن جاتے ہیں اس طرح تو۔'' اس پر ہم سب کا قہقہہ ابلا اور اس کی گود میں سر رکھے سویا ہوا اس کا معصوم بچہ چونک اٹھا۔ ''مذاق نہیں کر رہی کویتا، میں واقعی چاہتی ہوں کہ ہم اپنا کھانا...... تین وقت کا، تم سے خریدا کریں۔ دیکھو ہم باہر سے بھی تو خرید کر کھاتے ہیں ناں اور کہیں مہنگا۔ پھر ہمیں یہ یقین بھی نہیں ہوتا کہ اس کھانے کی تیاری میں حفظانِ صحت اور صفائی کا کتنا خیال رکھا جاتا ہے۔ جب ہم نے باہر کا کھانا ہی کھانا ہے تو سب سے پہلا حق تو ہم پر تمہارا ہی ہے ناں۔''

''ہوں......'' اس نے کھوئے سے انداز میں کہا۔

''ناشتا ہم صرف چھٹی کے دن لیا کریں گے، باقی دو وقت کا کھانا تم تیار کر دیا کرنا، جب ہم میں سے کوئی بھی گھر لوٹے گا تو تم سے کھانا لے لیا کرے گا۔''

''کچھ عجیب سا لگ رہا ہے مجھے مایا، تم سے میں کھانے کے پیسے لوں گی؟''

''دیکھو کویتا، کام تو کام ہے...... میں اگر تمہارا علاج کروں گی تو میں تم سے پیسے لوں گی ناں؟'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''مہتاب اگر تم سے کوئی اسکرپٹ لکھوائے تو تمہیں اس کے پیسے دے گا ناں، تم مہتاب کی بنی ہوئی فلم دیکھنے جاؤ گی تو اس کے ٹکٹ خرید کر دیکھو گی ناں۔''

''وہ سب باتیں اپنی جگہ درست مگر......'' وہ اب بھی ہچکچاہٹ میں تھی۔

''ویسے یہ آئیڈیا تم نے بہت اچھا دیا ہے مایا، کویتا بہن کے کہانی سنانے کے انداز سے میں بھی بہت متاثر ہوا ہوں، مجھے لگتا ہے کہ ان میں کہانی اور مکالمے لکھنے کی صلاحیت ہے۔''

''رہنے دیں مہتاب بھائی۔ میں جو کام کر رہی ہوں، وہی ٹھیک ہے اور آپ مجھے اسی کا معاوضہ دے لیا کریں۔'' وہ ہنسی۔

''تمہارے سینے میں بہت درد مند دل ہے مایا، جانتی ہوں، مسیحائی کرتی ہو تو اس کے ڈھنگ سے بھی واقف ہو، میری ضرورت کو یوں بے کہے اور اتنی باقاعدگی سے پورا کرنے کا انوکھا خیال صرف تمہارے ہی دل میں آ سکتا تھا......'' اس کی آنکھیں بات کرتے ہوئے نم ہو گئی تھیں۔

''ایسی بات نہیں ہے کویتا، میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہماری ضرورت تم سے اور تمہاری ہم سے پوری ہو رہی ہے......'' گاڑی سے اتر کر میں نے اسے خدا حافظ کہا اور اپنے گھر لوٹ آئی۔ سکون کی سانس لی کہ میں ایک ایسی فکر سے آزاد ہو گئی تھی جو کہ ہر خاتونِ خانہ کی سب سے بڑی فکر ہوتی ہے کہ کیا پکایا جائے۔

☆☆☆

''مایا، تم کتنی دیر میں تیار ہو سکتی ہو؟'' مہتاب کی آواز میں لرزش تھی۔

''کہاں جانا ہے مہتاب؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''لاہور......''

''کتنے عرصے کے لیے؟ کیوں؟''

''تمہاری امی کی طبیعت خراب ہے، میں نے صرف جانے کی ٹکٹیں لی ہیں، واپسی کا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''

''ان کی طبیعت ہی خراب ہے ناں، کچھ اور تو بات نہیں مہتاب؟'' میں سسکی، میرا دل لرز رہا تھا۔

''تم انکل سے بات کر کے چیک کر سکتی ہو۔''

''فلائٹ کتنے بجے ہے مہتاب؟'' میں نے اس

کی بات پر یقین کرلیا۔

''شام کو چھ بجے......'' اس نے بتایا۔ ''گھر سے چار بجے نکلنا ہوگا میری جان۔''

''اوہو......صرف چار گھنٹے ہیں میرے پاس، میں تیار ہوتی ہوں۔'' میں نے اپنے سینئر ڈاکٹر کو بتایا اور گھر پہنچی تو ان چار گھنٹوں میں سے بھی ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ کو یتا میرے یوں بے وقت لوٹنے پر حیران ہوتی ہوئی آئی تھی اور سبب جان کر مجھے چند منٹ کا کہہ کر چلی گئی۔ چند منٹ میں وہ لوٹی اور بتایا کہ اسے کھانا بھجوانا تھا، وہ بھجوا رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے میری پیکنگ میں میری مدد کی اور جب میں شاور لے رہی تھی تو اسی دوران وہ اپنے گھر جا کر ہمارا کھانا لے آئی تھی اور میز پر کھانا لگا رکھا تھا۔ مہتاب بھی پہنچ گئے تو میرے انکار کے باوجود اس نے مجھے کھانا کھلایا تھا۔

''پریشانی میں خالی پیٹ رہنا ٹھیک نہیں ہوتا، میں اس لیے نہیں کہہ رہی کہ تم نے مجھے اس کھانے کے پیسے دینا ہیں بلکہ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ جانے اس کے بعد کس طرح کی صورتِ حال کا سامنا ہو، کب کھانا ملے۔''

''بہت شکریہ کو یتا، اتنا خیال کرتی ہو تم، ایسا یقیناً کوئی بہن ہی کر سکتی ہے۔'' میں نے اس کے ہاتھ تھام کر کہا۔

''چلو اچھا ہوا کہ تم نے مجھے خود ہی بہن بنا لیا، مجھے تو شوق تھا کہ تمہاری نند بنتی لیکن اگر تمہیں بہن چاہیے تو میں حاضر ہوں۔''

''ہاں کو یتا...... میری کوئی بہن نہیں ہے، نند بھی نہیں ہے مگر بہن جیسا پیارا رشتہ دنیا میں اور کون سا ہے۔''

مہتاب کی تیاری کے دوران ہی اس نے میز سے سب کچھ سمیٹ دیا تھا، برتن دھو دیے تھے اور اسے خدا حافظ کہہ کر گھر کو لاک کر کے ہم نے چابی اسی کے حوالے کر دی تھی کہ جانے ہمیں کتنے دن لگ جائیں، کوئی ایمر جنسی صورتِ حال نہ پیدا ہو جائے کہ گھر کھولنا پڑ جائے کہ اکثر بارشوں وغیرہ میں زیادہ پانی جمع ہو جانے سے پانی بالکونی سے اندر آنا شروع ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

بستر پر پڑی وہ ساکت وصامت عورت کوئی اور ہوگی، میری امی جان تو ویسی نہ تھیں۔ دل کے شدید دورے نے ان کے وجود سے تازگی، بشاشت اور مسکراہٹ سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ ہوش وحواس سے بیگانہ تھیں، انہیں کچھ علم نہیں تھا کہ ان کے گرد کون تھا اور کیا ہو رہا تھا، میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور انہیں اس طرح بہوؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ سب کے اپنے گھر تھے اور ان گھروں کے مسائل...... سب سے بڑھ کر ان کے بچوں کے اسکولوں، ٹیوشنز اور دیگر ایکٹیوٹیز کے لیے لانے اور لے جانے کی مصروفیات۔ فقط میں ان مصروفیات سے عاری تھی اور یوں بھی بیٹی ہونے کی حیثیت سے، میں انہیں یوں چھوڑ کر اپنی دنیا میں لوٹ کر کیسے چلی جاتی۔

ابو جان تو خود امی جان کے محتاج تھے اور وہ دونوں اپنے گھر میں اپنے ملازمین کے ساتھ تنہا رہتے تھے۔ بچوں کی انہیں کوئی محتاجی نہ تھی، ایک انہیں ملنے اور دیکھنے کی تڑپ ہوتی تھی اور اس تڑپ کو قرار بھی تبھی ملتا تھا جب ان کے بیٹوں کے پاس وقت ہوتا تھا۔ مہینوں اپنی شکلیں نہ دکھاتے اور جب آتے بھی تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوتے۔ ان کے رویوں سے نہ صرف وہ کٹتے تھے، میں بھی بے چین رہتی تھی اور لاہور چھوڑ کر کراچی نہ جانے کی خواہش میں سب سے اہم کردار اسی ایک وجہ کا تھا۔ بھائیوں کی والدین کی طرف سے بے پروائی مارتی تھی، بھابیوں سے کوئی شکوہ کیوں کرتی۔ اپنی سی کوشش کرتی تھی کہ میں ان کا جتنا بھی خیال رکھ سکوں رکھوں۔

بھائیوں نے بھی میری طرح پسند کی شادیاں کی تھیں ظاہر ہے عملی زندگی کا کسی کو کوئی تجربہ نہ تھا اور ان سب نے ایسی بیویاں چنیں جنہیں صرف شوہروں سے غرض تھی، سسرال ... والے ان کے لیے گلاب کے کانٹوں جیسے تھے۔ مہتاب نہ صرف اچھا شوہر ثابت ہوا تھا بلکہ وہ میرے والدین کے حق میں بھی اچھا تھا اور

میرے والدین کو خوشی تھی کہ میرا انتخاب ان کے بیٹوں کی نسبت بہتر تھا۔ جب تک مہتاب کی امی زندہ رہیں، میں نے ان کی ہر ممکن خدمت کی، انہیں اپنے ساتھ رکھا، مہتاب کے لاکھ سر پٹخنے پر بھی وہ گاؤں چھوڑنے کو تیار نہ ہوتیں مگر میرے اصرار پر وہ انکار نہ کرسکیں اور تو اور مہتاب کو جس بات پر اماں کی ناراضی کا شک تھا، وہ بھی نہ ہوئی۔ بیٹے کا نیا نام سن کر وہ بہت خوش ہوئیں، نام کا مطلب پوچھا اور کہنے لگیں کہ ان جیسی سادہ عورت کیا جانے کہ چاند جیسے بیٹے کو مہتاب بھی کہہ سکتے ہیں۔ مہتاب اس بات پر خوش تھے کہ اماں کے ساتھ میرا رویہ بہت دوستانہ تھا اور اماں میرے ساتھ راضی اور خوش تھیں۔ بس ہمارے گھر میں، پوتے کی کلکاریاں سننے کی خواہش دل میں لیے، ایک رات وہ ایسا سوئیں کہ اگلی صبح جاگی نہیں۔ ہم ان کی شفقت سے محروم ہو گئے مگر ماں باپ کی دعائیں تو ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں۔

☆☆☆

''تمہارے اس فیصلے کو میں بیوقوفی کہوں تو وہ بہت چھوٹا لفظ ہے مایا۔'' وہ چیخا۔ ایک دن پہلے ہی تو ہم کراچی لوٹے تھے اور میں نے اسے بتایا تھا کہ میرے کراچی لوٹ کر آنے کا مقصد، اپنا سامان لے کر اور ملازمت چھوڑ کر لاہور واپس جانا تھا۔

''مہتاب...... پلیز، سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''مایا تم نے اپنے بارے میں تو سوچ لیا ہے مگر ایک لمحے کے لیے بھی سوچا ہے کہ میں اپنے اس اہم اور میگا پراجیکٹ کو یوں بیچ میں کیسے چھوڑ دوں؟'' اس کا لہجہ التجائیہ ہو گیا تھا۔ ''ایک سال، میری جان، ایک سال دے دو۔ پھر لوٹ جائیں گے۔''

''میں نے تم سے کب کہا ہے مہتاب کہ تم اپنا میگا پراجیکٹ ادھورا چھوڑ دو، تم اپنا کام جاری رکھو، مجھے امی جان کے لیے لاہور جانا ہوگا اور وہ ابھی، اس کے لیے میں ایک سال کا انتظار نہیں کرسکتی۔''

''ہم انہیں یہاں لے آتے ہیں اپنے پاس مایا۔''

''تم نے ان کی حالت دیکھی ہے ناں مہتاب، وہ اسپتال سے گھر جانے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں۔ ان کی دیکھ بھال میری ذمے داری ہے......'' میں نے رسان سے کہا۔

''انکل کہہ رہے تھے کہ وہ ان کے لیے کوئی آیا رکھ لیں گے، ان کی دیکھ بھال تو اب اسپتال میں ہی ہو گی ناں مایا۔'' اس نے حجت کی۔ یقیناً اس نے ابو جان سے پوچھا ہوگا کہ امی جان کی دیکھ ریکھ کس طرح ہوگی۔

''ابو جان اس لیے ایسا کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس اور کوئی قابلِ عمل حل نہیں ہے۔ جانتے ہیں کہ میں شادی شدہ ہوں اور اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتی امی جان کی دیکھ بھال کے لیے......''

''تو پھر جب تم جانتی ہو کہ شادی شدہ عورت کے لیے گھر اہم ہوتا ہے تو......؟''

''اگر میرے ساتھ کچھ ایسا برا ہوتا مہتاب تو تمہیں نہیں لگتا کہ امی جان اپنا سب کچھ تج کر، گھر بار اور ابو کو بھی چھوڑ کر میری دیکھ بھال کے لیے میرے پاس آجاتیں؟'' میں نے اس کی طرف ایسی نظر سے دیکھا کہ وہ لاجواب ہو گیا۔

''کہاں رہنا چاہو گی تم؟'' اس نے ہتھیار ڈال کر سوال کیا۔

''فی الحال تو ابو جان کے پاس ہی جاؤں گی۔ بعد میں اسپتال کے نزدیک ہی کہیں کوئی اپارٹمنٹ دیکھ لوں گی۔ ابو جان کے گھر سے تو رش کے اوقات میں ڈیڑھ گھنٹا وہاں پہنچنے تک لگ جاتا ہے۔ اپنے کام کے شروع ہونے سے پہلے ایک گھنٹا امی جان کے پاس گزار لیا کروں گی اور اسی اسپتال میں ہوں گی تو دن میں بھی انہیں دیکھ لیا کروں گی۔'' میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

''اکیلی رہ لو گی تم؟'' اس نے سوال کیا۔

''اسی لیے اپارٹمنٹ کہا ہے، دن بھر تو مصروف گزرا کرے گا، رات کو سونا ہی ہوگا۔''

''میں کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کرتا ہوں، کوئی ملازم بھی اس سے کہوں کہ ڈھونڈ دے؟''

''نہیں، میں خود دیکھ لوں گی اگر ملازم یا ملازمہ کی ضرورت ہوئی تو...... ہاں بے شک کوئی ایک کمرے کا چھوٹا سا اپارٹمنٹ مل جائے، میرے لیے کافی ہوگا، کوئی اسٹوڈیو ٹائپ۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ میری گنجائش نہیں ہو گی تمہارے اپارٹمنٹ میں؟'' اس نے ناراضی کی نظر سے دیکھا۔

''تم تو میرے دل میں رہتے ہو جانی۔'' میں نے اس سے لپٹ کر کہا تو وہ ہنس دیا۔

''اگرچہ تمہارا دل بہت بڑا ہے مگر پھر بھی مجھے تمہارے گھر میں اپنے لیے تھوڑی سی جگہ چاہیے ہوگی۔''

''سارا گھر ہی تمہارا ہوگا مہتاب۔'' میں نے پیار سے کہا۔

''یوں بھی، فلمسٹار چوہدری مہتاب...... سی ایم صاحب کی بیگم، مایا میم صاحب، مایا مہتاب...... کسی چھوٹے موٹے فلیٹ میں کیوں رہیں گی، اچھا سا کوئی فلیٹ دیکھتا ہوں میری جان، تم جہاں رہو، سہولت اور آرام سے رہو۔''

''شکر ہے کہ تم نے مجھے مایا پیراں جو گا نہیں کہہ دیا......'' ایک پرانی چھیڑ پر ہم دونوں ہنس دیے۔ اس وقت مجھے اپنی امی جان یاد آئیں نہ ان کی تکلیف۔

☆☆☆

چند دنوں میں ہی سب کچھ ہو گیا، میں اپنے سامان سمیت لاہور پہنچی، ابو جان نے میرے کمرے کو تیار کروا رکھا تھا مگر میرا فیصلہ سن کر انگشت بدنداں رہ گئے کہ میں اُن کے ساتھ رہنے کے بجائے اس اسپتال کے قریب فلیٹ لے کر رہ رہی ہوں جہاں نہ صرف امی جان داخل تھیں بلکہ میری ملازمت بھی وہاں تھی۔

''لیکن بیٹا...... اتنا بڑا گھر، خالی کمرے۔''

''پلیز ابو جان۔''

''تمہاری امی جان ٹھیک ہوتیں تو کیا تب بھی تم یوں اس گھر میں نہ رہتیں؟''

''امی جان ٹھیک ہوتیں ناں تو میں کراچی سے آتی ہی کیوں۔'' میں نے اپنے بازو ان کے شانوں کے گرد پھیلائے۔ کتنے کمزور ہو گئے تھے، وہ شانے جنہوں نے مجھے اپنے اوپر لاد کر کبھی جھولا جھلایا ہوگا۔ ''میں اپنا گھر چھوڑ کر لاہور ہی نہ آتی ناں۔''

''پھر بھی بیٹا، ایک ہی شہر میں رہ کر، تم ایک جگہ اور میں دوسری جگہ۔''

''تو پھر آپ چلیں، وہاں میرے ساتھ رہیں، اسپتال سے بھی قریب ہوں گے اور جب چاہیں گے امی جان کو دیکھنے جا سکیں گے۔'' میں نے ان کے شانے پر سر رکھ کر کہا۔

''اسے اس حال میں دیکھنے کی ہی تو ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ جب بھی جاتا ہوں، میرا بلڈ پریشر اور شوگر ہائی ہو جاتی ہے۔''

''چلیں پھر ان کی طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ آپ کی بیٹی آ گئی ہے ناں انہیں سنبھالنے کے لیے.... ان شاءاللہ وہ جلد ٹھیک ہو کر گھر واپس آ جائیں گی اور میں واپس کراچی چلی جاؤں گی اگر تب تک مہتاب اپنا پراجیکٹ ختم کر کے واپس لاہور نہ آ گیا تو۔''

''مہتاب کیسے تنہا رہے گا...... اس کے کھانے پکانے کا کیا ہوگا؟''

''اس کی فکر نہ کریں ابو جان، جب میں وہاں تھی تو تب بھی ہمارا کھانا گھر پر نہیں بنتا تھا......'' میں نے انہیں تفصیل سے کوبتا کے بارے میں بتایا۔ ''کراچی میں تو یہ عام سی بات ہے ابو جان۔''

''بڑے شہروں کی بڑی باتیں ہیں بیٹا۔'' انہوں نے کہا۔ ''ویسے اس سے سہولت کتنی ہو جاتی ہوگی۔ میرے جیسا تنہا بندہ جسے تھوڑا سا کھانا کھانا ہوتا ہے اسے گھر میں چھ بندوں کا راشن لانا پڑتا ہے کہ جنہوں نے پکا کر دینا ہے انہیں بھی کھانا ہوتا ہے، پکاتے ہوئے کئی طرح کا زیاں بھی ہوتا ہے اور راشن میں سے چوری بھی کی جاتی ہے، لالچ بھرا ہوا ہوتا ہے ان کے اندر، جتنا مرضی ان کا خیال رکھیں مگر ان کی نیتیں صاف نہیں ہوتیں۔''

''چلیں ابو جان نظر انداز کر دیا کریں، محتاجی جو

ہوئی ان لوگوں کی، شاید ان لوگوں کے نصیب میں اسی طرح چوری چکاری اور دھوکے سے کمایا ہوا رزق ہی ہوتا ہے۔"

"میں کل اپنے نئے فلیٹ میں منتقل ہو جاؤں گی ابو جان۔"

"کیسا ہے فلیٹ بیٹا...... کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاتے ہوئے جھجکنا نہیں۔" انہوں نے میرے سر پر بوسہ دیا۔

☆☆☆

میرے ساتھ ہی ابو جان گئے تھے اور ہم نئے فلیٹ میں جا کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔ واقعی مہتاب نے اس فلیٹ کو ویسا ہی بنوا دیا تھا جو کہ سی۔ ایم کی بیوی کے شایانِ شان تھا۔ فلیٹ اچھی لوکیشن پر واقع تھا، نیا بنا ہوا تھا اور ارد گرد کا علاقہ بھی خوب صورت تھا۔ اسپتال سے دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ میری گاڑی کراچی سے بھجوانے کے بجائے مہتاب نے ایک چھوٹی مگر بالکل نئی گاڑی بھی لے کر اس کی چابی میری سائڈ ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ نیا نکور فلیٹ اور اس سے بھی بڑھ کر بالکل نئے فرنیچر سے اور جدید انداز سے سجا ہوا، تین کمروں کا روشن اور ہوادار فلیٹ۔ دل خوش ہو گیا اور ابو جان کو بھی سکون ملا کہ اس پراجیکٹ کے سارے فلیٹ ایک چار دیواری کے اندر تھے اور دونوں اطراف سے داخلی راستوں پر گیٹ تھے جن پر چوبیسوں گھنٹے پہرہ ہوتا تھا اور کوئی اس علاقے میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ کالونی کے اندر رہنے والوں سے اس بات کی تصدیق نہیں کر لی جاتی تھی کہ آنے والے شخص کو وہ جانتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی باہر سے کھانا آرڈر کرتا تھا تو اس کے حصول کے لیے بھی انہیں خود گیٹ پر جانا پڑتا تھا، ڈلیوری والوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی، ایسا وہاں رہنے والوں کے تحفظ کی خاطر تھا اس لیے اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

جدید مغربی انداز کا بنا ہوا باورچی خانہ...... جو کوئی علیٰحدہ کمرا نہیں تھا بلکہ ایک بڑے سے ہال میں ہی لاؤنج، ڈائننگ اور کچن کی تقسیم کر دی گئی تھی، اس طرح کہ وہ ایک ساتھ بھی دکھتے تھے اور علیٰحدہ بھی۔" اتنے پیارے کچن میں کھانا پکا کر اسے گندا کیا کرنا، اچھا ہے، کھانا باہر ہی کھا لیا کروں گی۔" میں نے خود ہی حل نکالا اور اپنی بات پر خود ہی ہنسنے لگی۔

زندگی ایک نئی ڈگر پر چل نکلی تھی، اسپتال اور گھر کے بیچ میں، میں گھن چکر بن گئی تھی۔ رات بستر پر پڑتی تو دل چاہتا کہ کوئی اپنی انگلیوں کی پوروں سے میری تھکاوٹ کو چن لے۔ امی جان کی حالت پر بھی جمود تھا۔ رات کو سونے سے پہلے مہتاب سے طویل کال پر بات ہوتی، کیا کھایا...... کیا، کیا جیسے معمول کے سوالات۔ مہتاب نے بتایا تھا کہ اب وہ زیادہ تر وقت اپنی لوکیشن پر رہتا تھا۔ کئی، کئی دن کے لیے وہ گھر ہی نہیں جاتا تھا۔ جس دن اسے گھر نہیں جانا ہوتا تھا اس دن وہ کال کر کے کوبتا کو بتا دیتا تھا کہ اسے اس روز کھانا نہیں چاہیے۔ میں نے بھی کوبتا سے رابطہ مسلسل رکھا ہوا تھا اور اسے مہتاب کی پسند اور ناپسند کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ وہ مجھے بہت مس کرتی تھی۔ میں بھی کسی حد تک اس کے ہاتھ کے کھانوں کی عادی ہو گئی تھی اور بسا اوقات کوئی باسی یا ٹھنڈا کھانا کھاتے ہوئے (تھکاوٹ اور سستی کے باعث اسے گرم کرنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی) کوبتا کے ہاتھوں کے تازہ گرما گرم کھانے یاد آتے۔ اب مجھے بھی تھوڑا سا اندازہ ہونا شروع ہو گیا تھا کہ کس چیز کے ذائقے میں کیا کمی اور کیا زیادتی ہے۔

☆☆☆

کسی بچے کے رونے کی آواز آئی تھی۔ میں اسپتال سے لوٹی ہی تھی، آواز اتنے قریب سے آئی جیسے کہ میرے فلیٹ کے اندر سے ہو۔ میں لاؤنج سے اٹھ کر بیڈ روم میں گئی تو آواز اونچی ہو گئی، یقیناً ساتھ والے فلیٹ کا ماسٹر بیڈ روم اس کے ساتھ تھا، درمیانی دیوار ایک ہونے کے باعث وہاں کی آواز آ رہی تھی۔ ایک فلور پر دو فلیٹ تھے، ابھی تک میرا کسی سے سامنا نہیں ہوا تھا اس لیے اندازہ نہیں تھا کہ آٹھ فلیٹوں کی اس چار

منزلہ عمارت میں اوپر کون کون رہتا ہے اور سامنے کون۔
آواز بہت دیر سے آ رہی تھی اور بند ہی نہیں ہو پا رہی تھی، میں بے چین سی ہونے لگی تا ہم اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں اسپتال جانے کی تیاری کرنے لگی، اس وقت میں امی جان کو دیکھنے جاتی تھی اور واپسی پر کھانے کے لیے کچھ لیتی آتی تھی۔
اپنا دروازہ لاک کر کے مڑی ہی تھی کہ ساتھ والے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی غالباً اسی بچے کو اٹھائے ہوئے باہر نکلا جو مسلسل رو رہا تھا کیونکہ رونے کی آواز تھوڑی دیر پہلے سے بند ہو چکی تھی۔ میں بے خیالی سے دیکھنے لگی۔
''السلام علیکم۔'' کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔
''وعلیکم السلام......'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا بچے کو؟''
''شاید اسے بخار ہے، ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے لے جا رہا ہوں۔'' اس نے شائستگی سے جواب دیا۔
''اوہو...... میں دیکھ لوں اسے؟'' میرے اندر کے ڈاکٹر سے رہا نہیں گیا۔
''آپ ڈاکٹر ہیں کیا؟'' اس نے سوال کیا۔
''ہاں، چلیں میں اسے دیکھ لیتی ہوں۔'' میں اس کے فلیٹ کی طرف بڑھی۔
''وہ...... یہیں دیکھ لیں اسے آپ۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''میرا گھر اصل میں......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ''کوئی عورت نہیں ہے ناں گھر میں تو۔''
''مگر میں نے تو آپ کے گھر میں ایک دو بار کسی عورت کی آوازیں سنی ہیں۔'' میں نے اپنی حیرت کو زبان دی۔
''وہ اس کی آیا ہے......'' اس نے بتایا۔ ''صبح آٹھ بجے سے سہ پہر تین بجے تک رہتی ہے...... جاتے ہوئے اسے سلا جاتی ہے عموماً لیکن آج اس کی طبیعت خراب تھی اس لیے یہ سویا نہیں۔''
''آپ اپنے گھر کا دروازہ کھولیں، میں اسے دیکھ لیتی ہوں۔'' میں نے کہا تو اس نے جھجک کر دروازہ کھولا، واقعی اس کا فلیٹ میرے فلیٹ کی نسبت کوڑا دان لگ رہا تھا۔ ہر طرف سامان بکھرا ہوا تھا، آڑے ترچھے پڑے ہوئے فرنیچر اور اس پر جمی گرد کی تہیں، سارے میں پھیلے ہوئے بچے کے کھلونے اور کپڑے...... میری طبع کو یہ سب ناگوار گزرا مگر دل ہی دل میں تصور کیا کہ میں کسی سرکاری اسپتال میں ہوں اور مجھے صرف ایک مریض کو دیکھنا ہے۔ ''اسے بخار تو ہے مگر اتنا تیز نہیں، سینے میں بلغم ہے، اس کے لیے کچھ دوائیں لکھ دیتی ہوں، بخار کا زور ٹوٹ جائے گا، اگر نہیں ہوا تو مجھ سے دوبارہ رابطہ کر لیں۔'' میں نے بچے کو اچھی طرح چیک کر کے بچے کا نام اور عمر پوچھ کر نسخہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور چل دی۔
''نام پوچھ سکتا ہوں آپ کا میڈم؟'' اس نے ہولے سے کہا۔
''جی، ڈاکٹر ماہا مہتاب......'' میں نے اسے بتایا۔
''میں فیصل یزدانی ہوں اور یہ میرا بیٹا بلال فیصل ہے......''
''جی بتایا تھا آپ نے بیٹے کا نام۔'' میں نے اپنا میڈیکل کٹ اٹھایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
''سوری، کوئی جوس لیں گی آپ؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں شکریہ، میں نے ابھی چائے لی ہے۔'' میں نے اس کی گھر کی حالت دیکھی تھی، جانتی تھی کہ اگر جوس پینے کو ملے گا تو وہ کیسا ہوگا اور کس قسم کے گلاس میں ہوگا۔

☆☆☆

جمعے کے دن عموماً جلدی فارغ ہو جاتی تھی تو سوچا کہ پہلے گھر جا کر نماز وغیرہ پڑھ لوں، کچھ دیر آرام کر لوں، شام کو امی جان سے ملنے کے لیے جاؤں گی۔ گھر پہنچی تو دروازے سے مجھے ایک سفید لفافہ جھانکتا دکھائی دیا، دروازہ کھول کر جھک کر لفافہ اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، بھیجنے والے کا کوئی نام پتا نہ تھا۔ اندر سے برآمد ہونے والی جہاز کی شام سات بجے کی پرواز کے ٹکٹ نے میرے دل کی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔
''ٹکٹ مل گیا جان؟'' ساتھ ہی کال آئی تھی۔
''ٹکٹ تو مل گیا ہے مگر تم سے کس نے کہا میں کراچی آنا چاہتی ہوں؟'' میں نے شوخی سے کہا۔

''ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں تمہیں ہو کر گئے ہوئے۔''
''کم آن مایا...... سات دن ہو گئے ہیں۔'' اس نے کہا تو میری ہنسی نکل گئی۔
''زیادہ مجنوں، مجنوں نہیں کھیل رہے تم، تین دن تک امی جان کو کون دیکھے گا، اتوار کی رات کو جب واپس پہنچوں گی اس وقت تک اسپتال جانے کا وقت ختم ہو چکا ہوگا، گویا پیر تک میں انہیں نہیں دیکھ سکوں گی۔''
''سوری مایا، اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے یہ سوچا ہی نہیں۔'' اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ''مجھے تم سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔''
''اچھا کوبتا سے کہنا کہ مسالے دار حیدرآبادی بریانی کھانے کو من کر رہا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا تو اس کا مسکراہٹ والا ای موجی اگلے ہی لمحے موصول ہوا تھا۔ میں نے جلدی، جلدی پیکنگ شروع کی۔ اسپتال میں امی جان کی آیا کو کال کر کے بتایا کہ میں تین دن کے لیے نہیں آسکوں گی۔ ابو جان کو بتایا تو وہ ایک دم مہتاب کی طرف سے فکر مند ہو گئے۔
''سب ٹھیک ہے ابو جان۔'' سن کر اُن کی تسلی ہوئی تھی۔
''ٹکٹ کس طرح بھیجی تم نے مہتاب؟'' میں نے پیغام میں پوچھا۔
''کوریئر سے...... کیوں، تم نے خود موصول نہیں کی نمائندے سے؟''
''نہیں......''
''ملازمہ نے وصول کی ہوگی۔'' اس نے کہا۔
''وہ تو جمعے کو چھٹی کرتی ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں دیوار کو گھورا۔ ''ہوسکتا ہے کہ کوریئر والے خود ہی دروازے کے نیچے سے اندر کر کے چھوڑ گئے ہوں۔''
''ایسا نہیں ہوسکتا، انہیں دستخط ضرور لینا ہوتے ہیں۔'' مہتاب نے بتایا۔ ''لگتا ہے کہ اردگرد سے کسی ہمسائے نے وصول کر کے تمہارے دروازے سے اندر کر دیا ہوگا۔''
''ممکن ہے......'' میری نظر کے سامنے فیصل یزدانی کا چہرہ آ گیا۔
''کون رہتا ہے ہمسائے میں؟'' اس نے سوال کیا۔
''مجھے زیادہ تفصیل کا علم نہیں......'' میں نے اسے مختصراً بتایا۔
''تب تو ہوسکتا ہے کہ اسی نے وصول کیا ہوگا، اس مالے پر صرف دو ہی تو فلیٹ ہیں۔'' اس نے جواب دیا تھا۔ ''چلو تم تیاری کرو، اگلی دفعہ ملے تو اس کا شکریہ ادا کر دینا۔''

☆☆☆

تھوڑی دیر پہلے ہی کوبتا مجھے مل کر واپس گئی تھی۔ کھانا اس نے حسب معمول بہت اچھا بنا رکھا تھا، کھانے کے دوران وہ نہیں آئی کہ وہ ہم دونوں کو ساتھ وقت گزارنے کا موقع دے رہی تھی۔ ''ہاں جیسے ہم نو بیاہتا میاں بیوی ہیں ناں۔'' میں نے ہنس کر کہا تھا۔
''یوں میاں بیوی ایک دوسرے سے دور رہنا شروع کر دیں تو ان میں آپس میں کشش بڑھ جاتی ہے مایا، انہیں ایک دوسرے کی کمی اور تڑپ محسوس ہوتی ہے۔''
''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میاں بیوی کو ہمیشہ ایک دوسرے سے دور ہی رہنا چاہیے......''
''نہیں، اب ایسا بھی نہیں میری بہنا...... مستقل ایک دوسرے سے دور رہنے کی عادت ہو جائے تو دوریاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔'' اس نے بڑی اپنائیت سے کہا تھا۔
''دونوں فلسفے ایک دوسرے کے کتنے متضاد ہیں تمہارے۔''
''یہ میرے نہیں، زندگی کے فلسفے ہیں مایا۔'' اس نے پُرخیال نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''اتنا بھی دور نہ رہیں کہ ایک دوسرے کے بنا رہنا عادت بن جائے۔'' وہ اٹھی۔ ''چلتی ہوں، دل اداس تھا تو ملنے کو آ گئی، اب تم دونوں کے بیچ سماج کی ظالم دیوار بنی رہی تو جیجا جی میرا قتل ہی نہ کر دیں کہیں۔''
''اتنے خوفناک لگتے ہیں تمہیں مہتاب؟'' ایک بھرپور قہقہہ لگا کر وہ اٹھی اور چل دی۔

☆☆☆

''اتنا گندا اس کا گھر تھا مہتاب ......'' میں مہتاب کو اپنے ہمسائے کی بابت بتا رہی تھی۔'' اس کا بچہ...... پتا نہیں اس کی آیا بچے کے ساتھ کیا کرتی ہے، نہلایا تک نہیں تھا اس نے بچے کو۔''

''بیمار بچے کو نہلاتی تو کیا وہ مزید بیمار نہ ہو جاتا۔'' بات تو مہتاب نے پتے کی تھی۔ ''اس کی ماں کہاں ہے ویسے؟''

''ہاں ...... یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔'' میں حیران رہ گئی، اتنی بڑی بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی۔ ''بتا رہی ہوں ناں کہ ایک ہی وہ سرسری سی ملاقات تھی۔''

''پھر بھی ہمسائے کو ہمسائے کے بارے میں جاننا تو چاہیے ناں...... ایک وہ ہے کہ جس نے تمہارا خط موصول کر کے تمہارے گھر رکھ دیا اور ایک تم ہو۔'' مہتاب جان بوجھ کر مجھے چھیڑ رہا تھا۔ ''نام کیا ہے تمہارے ہمسائے کا؟ وہ بھی نہیں پوچھا ہوگا۔''

''پوچھا تو نہیں تھا مگر اس نے خود ہی بتا دیا...... فیصل یزدانی۔'' میں نے حافظے پر ذرا سا زور دیا تھا کہ کہیں مہتاب کے سامنے پھر سبکی نہ ہو جائے۔

''کیا...... فیصل یزدانی؟ واقعی؟'' خوشی اور حیرت مل کر مہتاب کے چہرے پر پھیل گئی تھیں۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''ارے وہ تو اتنا بڑا لکھاری ہے......'' اس نے خوشی سے کہا۔

''میں سمجھی کہ تمہارا بچپن میں میلے میں کھو جانے والا کوئی بھائی ہے......'' میں نے جان بوجھ کر اسے چڑایا۔ جانتی تھی کہ اس کے نزدیک کسی لکھاری کی کیا اہمیت ہے۔

''ایک نام کے کئی بندے ہو سکتے ہیں ویسے۔''

''لیکن تم جو حالات بتا رہی ہو، وہ اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ یہ وہی فیصل یزدانی ہے...... اس کی بیوی اسے چھوڑ کر کسی پرانے آشنا کے ساتھ چلی گئی ہے، بچہ اس کے پاس ہے اور ماں کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ فیصل میڈیا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا اس لیے وہ چھپتا پھر رہا ہے، کئی مہینوں سے روپوش ہے اور کسی کو علم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔''

''اوہ، واقعی مہتاب! اتنا اہم ہے اس وقت فیصل اور اس کا ذکر کہ تمہیں یاد بھی نہیں رہا کہ ہم سات دن کے بعد مل رہے ہیں......'' مجھے فیصل سے حسد سا محسوس ہوا تھا۔ ''اگر اس کا ذکر اتنا اہم تھا تو میں یہاں آنے کے بجائے تمہیں فون پر ہی بتا دیتی۔'' اس نے مجھے اپنے قریب کر لیا اور میں کھلکھلا کر ہنس دی۔

☆☆☆

''رک جاؤ ناں مایا کچھ دن اور۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''میری نوکری کا معاملہ ہے مہتاب...... تمہارا تو اپنا کام ہے نا تمہیں نوکری کی پابندیوں کا کیا علم اور پھر امی جان......'' میرے ادھورے جملے نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

''میں یہی تو کہتا ہوں کہ نوکری کی ضرورت کیا ہے، چھوڑ دو، اس دن دوبارہ نوکری شروع کر لینا جس دن تمہیں لگے کہ چوہدری مہتاب تمہاری کوئی ضرورت یا خواہش پوری نہیں کر سکتا۔'' اس کا لہجہ التجائیہ تھا۔

''بات صرف میری خواہشات یا ضروریات کی نہیں ہے مہتاب۔'' میں نے ہچکچا کر کہا۔

''باقی سب بھی میں دیکھ لوں گا۔'' اسے علم تھا کہ میں یہ نوکری بنیادی طور پر اپنے ماں، باپ کی ضرورتوں کا بوجھ بٹانے کے لیے کرتی تھی۔ ابو جان کی پنشن بہت کم تھی، گھر کا دال دلیہ بھی نہیں چلتا تھا۔ اچھے وقتوں میں سر چھپانے کو ٹھکانا تو بنا لیا تھا مگر اس کی دیکھ ریکھ کا خرچہ تھا، ملازمین کی تنخواہیں، ماہانہ بل اور خاندان میں کئی اور طرح کے اخراجات۔ بیٹے تو اپنی، اپنی گرہستی کے چکروں میں پڑ کر والدین کو بھول ہی گئے تھے کہ وہ بھی جیتے جاگتے نفوس ہیں اور ان کی بھی ضروریات ہیں۔

''میں تم پر ایسا کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی

مہتاب، جو میرا ہے۔''
''تم خود کو مجھ سے الگ سمجھتی ہو؟'' اس نے مجھے کندھوں سے تھاما، میں نے اپنا سر اس کے سینے سے ٹکا دیا۔
''سوری...... دروازہ کھلا دیکھا تھا تو......'' آواز پر میں جھٹکا کھا کر ہٹی۔ مہتاب گاڑی سے کچھ نکالنے گیا تھا تو وہ واپسی پر دروازہ یونہی بھیڑ آیا تھا۔ کو یتا کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ ''تم جا رہی تھیں بہنا تو میں نے سوچا کہ تمہیں جاتے، جاتے اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب ہی کھلا دوں۔''
''اب تو وقت نہیں رہا...... ہم نکل ہی رہے ہیں، میں اپنے ساتھ لے جاتی ہوں، راستے میں کھا لوں گی۔'' میں نے خفت مٹانے کو اس کے ہاتھ سے ٹرے پکڑتے ہوئے نظر چرائی۔
''یوں کیسے کھاؤ گی...... رکو، میں اچھی طرح پیک کر دیتی ہوں تمہیں... ساتھ لے جانا، بے شک لاہور پہنچ کر کھا لینا۔'' اس نے ٹرے مجھے تھما کر باہر کی راہ لی۔ مہتاب کو دوبارہ مجھے الوداع کہنے کے لیے اتنا ہی وقت چاہیے تھا۔ وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک لنچ باکس کبابوں کے لیے اور ایک چھوٹا سا چٹنی کے لیے تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔
''مہتاب بھائی، واپسی پر مجھ سے اپنے مکالمے لے لیجیے گا۔'' کہہ کر وہ چلی گئی۔
''کون سے مکالمے کی بات کر رہی تھی کو یتا؟'' میں نے حیرت سے مہتاب سے پوچھا۔ ''مکالمے کیا کسی ڈش کا نام ہے؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا تو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مہتاب کے منہ سے ایک فلک شگاف قہقہہ نکلا۔
''مایا، تمہیں علم ہے کہ مکالمے کس کو کہتے ہیں۔'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ''ایک سین تھا، اس کے مکالمے نہیں درست ہو رہے تھے، دو عورتوں کے بیچ کی گفتگو تھی، میں نے تجرباتی طور پر کو یتا سے کہا کہ وہ مجھے اس سچویشن کے مکالمے لکھ کر دے سکتی ہے تو اس نے کہا کہ وہ کوشش کر لیتی ہے...... یاد ہے

ایک بار تم نے خود ہی اسے کہا تھا کہ اگر مہتاب تم سے کچھ لکھوائے گا تو اس کا معاوضہ تو دے گا ناں، بس یونہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ غریب اور ضرورت مند عورت ہے، کیوں نہ کھانے پکوانے کے علاوہ اس طریقے سے اس کی مدد کر دی جائے۔"

"اوہ اچھا...... مجھے یاد تو نہیں کہ میں نے کب اور کس صورتِ حال میں ایسا کہا تھا لیکن یہ یاد ہے کہ کچھ ایسا کہا تھا میں نے۔"

"اب میں تمہیں وہ وقت اور صورتِ حال بھی بتاتا ہوں......"

"اس کی ضرورت نہیں مہتاب، جانتی ہوں، ہاتھی جیسا حافظہ ہے تمہارا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"کباب تو کھولو یار...... ائرپورٹ پہنچنے تک گرما گرم کباب ہی کھالیے جائیں۔"

"میں نے سوچا کہ میرا ڈنر ہو جائے گا۔" میں نے ڈبا چھپانے کی کوشش کی۔

"ڈنر تمہیں دوران پرواز مل جائے گا مایا...... چلو شاباش، کنجوسی نہ کرو، میرے نتھنوں کو ان کبابوں کی سوندھی، سوندھی خوشبو چڑھ رہی ہے جان۔" میں نے اس کے لالچی انداز پر ڈبا کھولا اور چار میں سے دو کباب اسے کھلائے اور دو خود کھالیے۔

"پہنچ کر اطلاع کرنا۔" اس نے مجھے اپنے ساتھ لگایا تو میں اردگرد کے ہجوم کو دیکھ کر سمٹ سی گئی۔

☆☆☆

"آپ نے میرا خط وصول کیا تھا؟" میں نے اس کے دروازے کی گھنٹی بجائی تھی۔

"کون سا خط؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اوہ اچھا، وہ جمعے کے دن کے کوریئر کی بات کر رہی ہیں آپ؟" اسے فوراً یاد آ گیا تھا۔

"جی۔" میں نے کہا۔

"وہ اصل میں آپ کا پوچھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں تو میں آپ کو بتا دوں کہ آپ وہ رجسٹری جا کر اُن کے دفتر سے وصول کر لیں وہ آپ کا فون بھی شاید بند تھا میں نے سوچا کہ آپ کو خواہ مخواہ میں اتنی زحمت ہو گی، کیوں ناں میں ایک چھوٹا سا جھوٹ بول کر آپ کا لفافہ وصول کر لوں۔ اس روز آپ نے بلال کے معائنے کی فیس جو نہیں لی تھی۔"

"اچھا...... وہ چھوٹا سا جھوٹ کیا تھا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا، ہمسائیگی کا حق ادا کرنے کی کوشش جو کر رہی تھی۔

"وہ یونہی...... کچھ خاص نہیں، میں نے ان سے کہا تھا کہ میں آپ کا رشتے دار ہوں اور یہ کہ آپ پہنچنے ہی والی ہیں تو میں وہ لفافہ آپ کو دے دوں گا۔" اس کے خواہ مخواہ میں رشتے دار بننے پر غصہ تو بہت آیا مگر اس کی نیت اور میری سہولت کا سوچنے پر میں نے اپنے غصے کو دبا لیا۔

"شکریہ۔" میں نے مختصراً کہا۔ "وہ واقعی بہت ضروری رجسٹری تھی۔"

"مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کے کام آسکا۔"

"بلال کا کیا حال ہے اب؟" میں نے اخلاقی طور پر پوچھا۔

"بہت بہتر ہے جی اب، اللہ کا شکر ہے۔ سوچتا ہوں کہ اللہ نے آپ کو غیب سے میرے لیے مدد بنا کر بھیجا، خواہ مخواہ میں اسپتال جاتا اور کتنا وقت ضائع ہو جاتا۔"

"جانتی ہوں...... کام کرنے والوں کے لیے وقت ہی تو اہم ہوتا ہے۔" میں نے رسان سے کہا۔

"ویسے پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

"کچھ خاص نہیں، کبھی کوئی کام کر لیتا ہوں کبھی کوئی۔" اس نے گول مول سا جواب دیا۔ "اس بچے کی وجہ سے ٹک کر کوئی کام کر ہی نہیں سکتا، بس کچھ کام ہیں جو کہ کمپیوٹر پر آن لائن سہولت سے کر لیتا ہوں۔"

"بلال کی امی......؟" میں سوال مکمل ہی نہ کر سکی۔

"اس کی والدہ بہت بیمار ہیں، وہ چند ہفتوں سے میکے گئی ہوئی ہے......"

"بچے کو ساتھ لے جاتیں؟" میں نے خواہ مخواہ میں مشورہ دیا۔

''ان کو ٹی بی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا اتنی مہلک بیماری کے مریض کے گھر میں......''

''لیکن آپ کی بیوی بھی تو وہیں ہے۔'' میرے منہ سے ایک اور سوال پھسل گیا۔

''اصل میں......'' وہ رکا۔ ''اسے بھی ٹی بی ہے، اس لیے اس کا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر تھا، ان دونوں کا مرض آخری اسٹیج پر ہے۔'' کہتے، کہتے اس کی آواز بھرّا گئی۔ ''میں نہیں چاہتا کہ بلال یوں اپنی ماں کو خون تھوکتے ہوئے دیکھے، زندگی کے آخری دن پورے کرتے ہوئے...... چلتا ہوں۔'' وہ چلا گیا اور میں سوچتی رہ گئی کہ میں اسے کس حد تک خودغرض سمجھوں، کیا اسے اس وقت اپنی بیوی کی دل جوئی نہیں کرنی چاہیے جو کہ لحمہ بہ لحمہ موت کے منہ میں جارہی ہے یا وہ اپنے بچے کو اور خود کو بچا کر درست کررہا تھا؟

☆☆☆

اتوار کا دن تھا، تھکی ہوئی تھی سوچا تھا دیر تک سوؤں گی مگر اس بچے، بلال کے چیخ، چیخ کر رونے کی آواز نے مجھے سونے نہ دیا۔ جھنجلا کر اٹھی اور غسل خانے میں چلی گئی۔ اس کے گھر کا غسل خانہ بھی میرے ماسٹر بیڈ روم کے غسل خانے سے ملحق تھا سو کھڑکی بھی نزدیک تھی۔ اس لیے وہاں آواز اور بھی زیادہ تھی، غالباً بچے کو نہلایا جارہا تھا اور وہ چیخ رہا تھا۔ میں نے باہر نکل کر اپنے لیے کافی بنائی اور وہ آواز تب تک بھی آرہی تھی، مجھ سے رہا نہیں گیا۔ آیا کیا کررہی تھی اس بچے کے ساتھ، اتنی دیر تک تو بچے کو نہلایا نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے اپنے سلیپنگ سوٹ کے اوپر ہی شال لپیٹی اور باہر نکلی کہ گھنٹی بجا کر ان سے پوچھوں کہ معاملہ کیا ہے۔ ان کے دروازے کے باہر لگا ہوا تالا اور باہر کھڑی ہوئی فیصل یزدانی کی گاڑی کی غیر موجودگی، میں سوچ میں پڑگئی۔

پھر بھی میں نے گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا کہ اگر فیصل خود گھر پر نہیں ہے تو بھی باہر سے تالا لگا کر کیوں گیا۔ اگر آیا کو باہر جانا پڑے تو...کافی دیر تک میں گھنٹی بجاتی رہی مگر کوئی جواب نہ آیا، سوچا کہ پولیس کو اطلاع کرتی ہوں کہ کہیں آیا کو کچھ ہوا نہ گیا ہو۔ مڑی ہی تھی کہ وہ تیز بھاگتا ہوا واپس آتا نظر آیا، جلدی سے سلام کرتے ہوئے اس نے جلدی سے تالا کھولا اور اپنے پیچھے دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر کو بھاگا۔ غسل خانے سے وہ بچے کو اٹھا کر باہر نکلا، بچہ پورے لباس میں تھا، گویا وہ نہلایا نہیں جارہا تھا۔ ''آئی ایم سوری، آپ کو تکلیف ہوئی، ڈاکٹر مایا۔''

''کیا بات ہے، آیا کہاں ہے، بلال کیوں رورہا تھا؟''

''اتوار کو اس کی آیا چھٹی کرتی ہے اور میں چند گھنٹوں کے لیے کوئی کام کرتا ہوں...... جب جاتا ہوں تو اسے سلا کر جاتا ہوں، میرے لوٹ کر آنے تک یہ سو ہی رہا ہوتا ہے، آج جانے کیسے جاگ گیا اور نہ صرف جاگا بلکہ غسل خانے میں چلا گیا اور پھر اسے دروازہ کھولنا نہیں آرہا تھا، اسی پریشانی میں یہ رو پڑا، آپ کو اس کے رونے کی آواز سے زحمت ہوئی، میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔'' بچہ اب باپ کے کندھے سے لگ کر خاموش ہوگیا تھا۔

''اوہو...... آپ کی آیا اگر اتوار کو چھٹی کرتی ہے تو آپ میری آیا کو ان چند گھنٹوں کے لیے اپنے بیٹے کے پاس چھوڑ دیا کریں جب آپ کو کام پر جانا ہوتا ہے، اس کے لیے میں اسے کچھ اضافی رقم ادا کردوں گی۔ آپ کو کچھ دینے کی ضرورت نہیں مگر خدارا آئندہ بچے کو یوں گھر پر تنہا چھوڑ کر نہ جایا کریں۔ بچہ کسی حادثے کا شکار ہوسکتا ہے، آپ کی غیر موجودگی میں کسی چیز سے خود کو نقصان پہنچا سکتا ہے، بجلی یا گیس کی کسی چیز کو چھیڑ کر اپنے لیے مصیبت کھڑی کرسکتا ہے، گھر میں آگ لگ سکتی ہے، گر کر زخمی ہوسکتا ہے، چھری یا قینچی سے خود کو زخمی کرسکتا ہے، بچہ اپنے گلے میں کوئی چیز پھنسا سکتا ہے۔'' میں نے اچھا خاصا لیکچر اور خاصے غصے کے انداز میں جھاڑا۔ ''آئی ایم سوری، میں کچھ زیادہ بول گئی۔ آپ کو برا لگا ہوگا مگر میں رہ نہیں سکی، بچے کتنی قیمتی دولت ہوتے ہیں، اس کا شاید آپ کو

اندازہ نہیں ہے۔"
"نہیں، نہیں..... سوری کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے بیٹے کے بارے میں آپ کی تشویش، جذبۂ ہمدردی اور آپ کے نقطۂ نگاہ سے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔" اس نے احسان مندی سے کہا۔ "اس کے لیے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں اور میں آئندہ کوشش کروں گا کہ اسے تنہا نہ چھوڑوں۔ ہاں، اگر آپ اپنی ملازمہ سے بات کرلیں کہ وہ اسے چند گھنٹوں کے لیے اتوار کو دیکھ لیا کرے۔ لیکن آپ کی ملازمہ کیا اتوار کو چھٹی نہیں کرتی؟"
"نہیں، میری ملازمہ جمعے کو چھٹی کرتی ہے۔"
میں نے اسے کہا اور واپس اپنے گھر لوٹ آئی۔ اس کے یوں منافقانہ انداز پر مجھے غصہ بھی آیا تھا۔ بیوی کو بھی چھوڑ دیا تھا یا اس نے اسے چھوڑ دیا تھا اور بیٹا، جسے ماں بھی چھوڑ گئی تھی اور باپ کا کام اتنا اہم تھا کہ بیٹے کی دیکھ بھال سے بھی غفلت برت رہا تھا۔ میرے ذہن میں اچانک سوچ در آئی کہ اگر مہتاب بھی اس جیسی تنگ سوچ کا مالک ہوتا تو؟

☆☆☆

رات نصف سے زائد بیت چکی تھی، مہتاب اسی رات واپس کراچی گیا تھا اور جانے سے پہلے ہم نے باہر رات کا کھانا کھایا تھا، اسے وداع کر کے گھر لوٹتے مجھے دو بج گئے تھے..... اپنی ایک کولیگ کو پیغام بھیجا کہ سویرے ذرا دیر سے آؤں گی، طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی دیر سے سوتی تو جاگتی کب۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ ایمرجنسی کے انداز میں بجائے جانے والی اطلاعی گھنٹی نے جگا دیا، اس وقت کون ہوگا، فون اٹھا کر وقت دیکھا، ساڑھے تین بج رہے تھے..... ڈر گئی کہ کہیں کوئی چور اچکا نہ ہو۔ بہرحال اٹھی اور دروازے میں بنے سوراخ سے باہر دیکھا، فیصل یزدانی نظر آیا..... چہرے پر بارہ بجے ہوئے میں نے دروازہ کھولا اور اوٹ میں رہ کر ہی پوچھا کہ کیا ہوا، اسے اس وقت میرے دروازے کی گھنٹی بجانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔
"بلال..... اسے سانس نہیں آرہی۔" وہ بدحواسی سے بولا۔
"اوہ، اچھا، آپ چلیں، میں آتی ہوں۔" مجھے اپنی فرسٹ ایڈ کٹ بھی اٹھانا تھی اور دوسرے اپنا حلیہ بھی درست کرنا تھا۔
"پلیز دیر نہ کریں۔" وہ گھگیایا۔
"میں چینج کر کے....."
"دیکھیں، ایک ایک لمحہ اہم ہے، میں باہر کھڑا رہتا ہوں، منہ دوسری طرف کر لیتا ہوں، آپ جس حلیے میں بھی ہیں، ایک بار اسے دیکھ لیں۔"
"ٹھیک ہے....." میں نے دروازے کے قریب ہی کنسول ٹیبل پر رکھی ہوئی اپنی فرسٹ ایڈ کٹ اٹھائی اور باہر نکلی، وہ منہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے گھر کے اندر جا کر دروازہ اندر سے بند کرلیا، ایمرجنسی حالات میں بھی میں اس بات کو فراموش نہیں کرسکتی تھی کہ میں اس وقت تنہا ایک مرد کے ساتھ اس کے گھر پر نہیں ہو سکتی تھی اور یہ کہ میرا لباس ایسا نہیں تھا کہ جس میں میں اپنے گھر سے باہر نکلتی۔ نہ مجھے اپنی طاقت پر کوئی شبہ تھا، نہ فیصل کی طرف سے مجھے کوئی ایسا شک مگر پھر بھی احتیاط لازم تھی۔
بلال کو دمے کا شدید دورہ پڑا تھا اور وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ اتنا چھوٹا بچہ تھا کہ اسے انہیلر بھی نہیں دیا جا سکتا تھا۔ میں نے بیرونی دروازے کا رخ کیا۔
"اسے فوری طور پر اسپتال لے کر جانے کی ضرورت ہے، دمے کا شدید حملہ ہے، اسے سانس لینے میں مدد کرنے والی مشین (نیبولائزر) لگانا پڑے گی اور اس کے سینے سے بلغم نکالنا پڑے گا۔" میں نے اس کے دروازے سے نکل کر اپنے دروازے سے اندر داخل ہو کر اس کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کہا۔ وہ ابھی تک دوسری طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ "میں اپنے اسپتال کی ایمرجنسی میں کال کر دیتی ہوں، آپ میرا حوالہ دے دیں، فوراً اٹینڈ کر لیں گے....." میں رکی۔ "فکر نہ

کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تھینک یو۔'' کہہ کر وہ اندر بھاگا اور تھوڑی دیر کے بعد اس کی گاڑی کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

☆☆☆

''کیسی طبیعت ہے اب بلال کی؟'' اسپتال سے واپسی پر میں نے اس کے گھر کی بیل بجائی، آپا نکل رہی تھی، فیصل غالباً اسی وقت گھر آیا تھا۔

''کافی بہتر ہے ماشاء اللہ...... سوری ڈاکٹر مایا، آپ کو بہت بے وقت زحمت دی۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں نے آپ کو رات دو بجے کے بعد گھر لوٹتے سنا تھا تو سمجھا کہ شاید آپ اس وقت تک بھی جاگ رہی ہوں گی۔''

''میں رات کو دیر سے ائرپورٹ سے لوٹی تھی تو......'' خواہ مخواہ میں' میں نے اس کو جواب دے دیا۔

''اوہ، اچھا، کس کو لینے کے لیے گئی تھیں آپ ائرپورٹ؟'' اس نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔

''لینے نہیں...... اپنے شوہر کو چھوڑنے کے لیے گئی تھی۔'' میں نے جواباً کہا۔

''اوہ...... آپ شادی شدہ ہیں؟'' اس نے ہولے سے کہا۔ ''وہ جو چند دن سے یہاں پر تھے وہ آپ کے شوہر ہیں، فلمساز سی ایم؟''

''ہاں...... آپ انہیں کیسے جانتے ہیں اور آپ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں کہ میں کیسی عورت ہوں کہ میرے گھر میں کوئی فلمساز بغیر کسی تعلق کے رہ رہا ہوگا؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''ارے نہیں...... میں نے آپ کو قطعی غلط نہیں سمجھا، نہ ہی میں نے سی ایم صاحب کو دیکھا ہے...... وہ تو بلال کی آپا نے بتایا کہ آپ کے گھر میں ان کا کبھی کبھار آنا جانا ہوتا ہے اور اسی نے بتایا کہ سی ایم صاحب کی اپنی بیوی انہیں چھوڑ کر چلی گئی ہے...... وہ کراچی میں تنہا رہتے ہیں، اس سے پہلے وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ اصل میں وہ بہت زیادہ فلمیں، ڈرامے دیکھتی ہے ناں تو اس کی دلچسپی فلمی دنیا کے لوگوں کے ذاتی حالات سے بہت زیادہ ہے۔'' وہ صفائی پیش کر رہا تھا اور میرا تو دماغ بھک سے اڑ گیا۔

فلمی دنیا میں میاں بیوی کا مجبوری کے باعث علیحدہ رہنا بھی کیا اس طرح کی افواہوں کو جنم دیتا ہے۔ فیصل کے ساتھ خود یہ ہوا تھا اور میں جان کر بھی خاموش تھی کیونکہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی بیوی اور اس کی ساس کو ٹی بی تھی اور وہ دونوں اسپتال میں داخل تھیں۔ اب اسی نوعیت کی نئی کہانی اور وہ بھی میرے بارے میں، وہ بتا رہا تھا۔ میرا خون میرے اندر ابال کھانے لگا، کئی گھروں میں پھر، پھر کر کن سوئیوں لینے کی عادی ایسی عورتیں افواہوں کو جانے کہاں، کہاں پھیلا دیتی ہیں۔ غصہ تو مجھے فیصل پر آرہا تھا جواب تک یہ سمجھ رہا تھا کہ میں کوئی بدکردار کنواری لڑکی ہوں جو...... اُف غضب خدا کا۔ اسے تو منہ توڑ جواب دیا جانا چاہیے۔

''تمہاری اپنی بیوی تمہیں چھوڑ کر بھاگ گئی ہے ناں اپنے کسی ہوتے سوتے کے ساتھ فیصل یزدانی، تو تمہیں لگتا ہے کہ دنیا میں ساری عورتیں ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ میں شادی شدہ ہوں اور الحمدللہ مہتاب کی بیوی ہوں۔ اسے چھوڑ کر اس لیے آئی ہوں کہ میری ماں اسپتال میں موت اور زندگی کی کشمکش میں پڑی ہے، میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔'' میرے منہ سے غصے سے کف نکل رہی تھی۔ ''اب تم بتاؤ کہ تمہاری بیوی کو کب سے ٹی بی ہے اور اس کی ماں کو کب سے...... اگر انہیں ٹی بی ہے تو تم ان کا علاج کروانے کے بجائے یہاں چھپ کر کیا کر رہے ہو، جہاں کسی کو یہ علم ہی نہیں ہے کہ تم ہی مشہور لکھاری فیصل یزدانی ہو۔'' میں بولے جارہی تھی اور وہ منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا، شاید سوچ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''یہ سب آپ سے کس نے کہا؟'' اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ، ٹوٹ کر نکلے تھے۔

''اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ ایسا کس نے کہا ہے، ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا ہی ہے اور تم بدنامی

کے خوف سے منہ چھپاتے پھر رہے ہو، میڈیا کا سامنا نہیں کر پا رہے ہو، بچے کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہو رہے ہو، تمہارا سارا کیریئر داؤ پر لگ گیا ہے۔ اس جیسے لکھاریوں کی تحریریں بھی کون خریدے گا جس کی اپنی زندگی میں ہی طوفان آئے ہوئے ہوں۔'' میں نے اپنے ترکش کے سارے تیر چلائے اور پیر پٹختی ہوئی اپنے فلیٹ میں داخل ہوگئی اور پیچھے دھاڑ سے دروازہ بند کیا۔ اسی دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی اور آنکھوں میں جمع شدہ ان آنسوؤں کو بہنے دیا جو میں نے اس کے سامنے روک کر رکھے تھے۔ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی ایک غیر کے سامنے اپنے آنسو بہانے کی۔

''کیا کروں میں امی جان، ابو جان تو مر گئے اور نجات پا گئے اس ذمے داری سے...... آپ کیا کر رہی ہیں، بولتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، سنتی ہیں، نہ کھاتی ہیں اور نہ پیتی ہیں۔ آپ کا دماغ مر رہا ہے تو آپ بھی مر جائیں، مجھے کیوں اتنے مہینوں سے آپ نے سولی پر لٹکا رکھا ہے، نہ میں اِدھر جوگی ہوں نہ اُدھر جوگی۔ دیکھ لیں لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں، ایک وقت آئے گا جب مہتاب کو بھی یقین ہو جائے گا کہ لوگ سچ ہی کہتے ہیں کہ اس کی بیوی کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے...... فیصل یزدانی جیسے لوگ بھی مجھے بدکردار سمجھ سکتے ہیں جن کے اپنے کردار کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' جب سے ابو جان کا اچانک ہی انتقال ہوا تھا۔ میں خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی اور جلد کمزور پڑ جاتی تھی۔ اس وقت عجیب، عجیب باتیں میرے دماغ میں آ رہی تھیں ورنہ کون اولاد ایسی دعا کرے گی۔ میں سسک رہی تھی، اور اب ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''یا اللہ...... میری اس آزمائش کو اب ختم کر دے، بلا لے امی جان کو اپنے پاس، وہ زندوں میں ہیں نہ مردوں میں، انہیں ایک ہی بار مار دے تاکہ میں روز، روز مرنے سے بچ جاؤں۔'' معلوم نہیں میری دعا کس کے حق میں تھی امی کے یا میرے۔ بس میں روتے، روتے نڈھال ہوگئی تھی۔ فون پرس سے نکال کر مہتاب کو کال کی۔ ''مہتاب میں بہت اداس ہو رہی ہوں، میں آ رہی ہوں کراچی۔''

''کیا ہوگیا ہے میری جان؟ ابھی کل ہی تو لوٹا ہوں میں، اب تو میں موہنجوداڑو میں ہوں لوکیشن پر، سات آٹھ دن یہیں ہوں، واپس پہنچ کر ملنے کے لیے آتا ہوں۔''

''نہیں تم نہ آنا، میں آؤں گی جب تم لوٹو گے تو، مجھے پہنچ کر بتانا۔''

''ٹھیک ہے میری زندگی۔ میں واپس پہنچ کر تمہیں ٹکٹ بھجواتا ہوں۔''

''نہیں، میں ٹکٹ خود آن لائن خرید لوں گی......''

''جیسی تمہاری مرضی میری جان۔''

☆☆☆

''آپ کی والدہ بیمار ہیں؟'' اگلی صبح میں اپنے فلیٹ سے نکلی تو وہ باہر ہی کھڑا تھا جیسے میرا ہی انتظار کر رہا ہو۔

''جی......'' میں نے ابرو اچکا کر کہا۔ ''آپ سے کوئی مطلب؟''

''ڈاکٹر مایا، میں آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں...... میں نے آپ کو بتایا کہ وہ سب میری سوچ نہیں تھی بلکہ بلال کی آیا کی تھی، لوگ انجانے میں اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔ میرے بارے میں ہی دیکھ لیں، جو کچھ آپ نے کہا، اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ، آپ نہیں جانتیں...... لیکن آپ نے کتنے وثوق سے وہ سب کہا جیسے آپ ان سب واقعات کی چشم دید گواہ ہوں۔ میڈیا کی دنیا ایسی ہی ہے، اسی لیے میں نے آپ کی کسی بات کی تصدیق کی نہ تکذیب، جانتا ہوں کہ آپ نے بھی سب کچھ کسی چٹ پٹے فلمی رسالے میں پڑھا ہوگا یا کسی سے سنا ہوگا......''

''مجھے سچ جاننے کا شوق ہے نہ ضرورت......'' میں آگے بڑھی۔ ''آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر مایا، ایک انسان ہونے کی حیثیت سے ہی کم از کم اتنا سچ جاننے کی ضرورت تو ہوتی ہے کہ آپ کے ایسے غیر تصدیق شدہ جھوٹ سے کسی کو کتنی تکلیف پہنچ

سکتی ہے...... اگر آپ کو میرے اس بات کے کہنے سے اتنی تکلیف ہوئی ہے جو میں نے آپ کو اپنی ملازمہ کے حوالے سے بتائی ہے، جو کہ ایک ان پڑھ اور جاہل خاتون ہے تو...... آپ جیسی پڑھی لکھی اور باشعور عورت کے منہ سے نکلی ہوئی غیر مصدقہ تلخ بات کسی کو کس طرح مجروح کر سکتی ہے، اس کا اندازہ بخوبی کر سکتی ہیں آپ؟''

وہ میرے پیچھے تیز، تیز قدموں سے چل رہا تھا۔

اس کی بات ختم ہونے تک میں گاڑی میں بیٹھ چکی تھی، پہلے ہی اس کے روک لینے سے میرے چند منٹ ضائع ہو چکے تھے۔ اپنے وارڈ میں جانے سے پہلے میں لگ بھگ ایک گھنٹا امی جان کے پاس جاتی تھی، ان کے ڈاکٹرز سے ان کے بارے میں بات چیت کرتی تھی۔ اس روز بھی وہی معمول تھا مگر دماغ حاضر نہ تھا، امی جان کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا، مجھے سنائی تو دے رہا تھا مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کچھ مختلف بتانا بھی کیا تھا، وہی باتیں، وہی حکایتیں اور وہی ٹوٹتی ہوئی امیدیں۔ امی جان کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے میری آنکھوں سے کئی آنسو اُن کے ماتھے پر ٹپکے...... وہ کتنی بے بسی سے پڑی تھیں اور میں ان کی اکلوتی بیٹی ان کی زندگی کے بجائے ان کے مر جانے کی دعائیں کر رہی تھی۔ دل کی گہرائیوں سے فوری دعا نکلی کہ صحت یاب ہو جائیں اور جلد از جلد۔

اپنے کام میں بھی میرا دھیان کہاں تھا۔ ایک وفد آنا تھا جن سے ملاقات طے تھی۔ ان کا ایجنڈا تھا کہ ان لڑکیوں کا مفت علاج حکومتی خرچے پر کیا جانا چاہیے جن کے چہرے اپنے شوہروں اور بھائیوں اور ناکام عاشقوں کے ہاتھوں تیزاب سے جھلسا کر انہیں ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے بدنما کر دیا جاتا ہے۔ اس میٹنگ کے دوران بھی میں غائب دماغ سی رہی، لوگ بول رہے تھے، تقریریں کر رہے تھے، اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کر رہے تھے۔

''المیہ یہ ہے کہ جن ہاتھوں میں تیزاب کی بوتل ہوتی ہے، اس وجود کے سر کے اندر دماغ کا خانہ خالی ہوتا ہے۔ اپنی ہی بہن، بیوی یا محبوبہ کو ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے مسخ کر دینے والے عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جو غیرت اور انتقام کی آگ میں خود جھلس رہے ہوتے ہیں، وہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتے ہیں، وہی رخ جو انہیں دکھایا جاتا ہے...... وہ ایک فریق کی بات سن کر تیزاب کی بوتل ہاتھ میں لے کر نکل پڑتے ہیں مگر کیا کسی نے تیزاب پھینکنے سے پہلے اپنی بیوی، بہن یا محبوبہ سے یہ سوال کیا کہ جس آگ میں وہ جھلس رہے ہیں، اسے لگانے میں اس کا کتنا ہاتھ ہے؟ ساری عدالت خود ہی لگا کر...... سارے فتوے خود ہی سنا کر، سارے فیصلے خود کر کے ان پر عمل درآمد بھی کر دیتے ہیں اور جانے کتنی ہی بنت حوا اس اذیت کی زندگی گزار رہی ہیں۔ حکومت کو چاہیے......'' اور جانے کیا، کیا بولا جا رہا تھا مگر میں اس تقریر کے الفاظ کی گھمن گھیریوں میں گم تھی۔ میں غائب دماغی کے باوجود یہ سوچ رہی تھی کہ فلم بنانے کے لیے یہ کتنا اچھا معاشرتی مسئلہ ہے...... اب کے کراچی جاؤں گی تو مہتاب کو بتاؤں گی۔

مہتاب کو بتانے کے لیے میرے پاس اور بھی بہت کچھ تھا، فیصل یزدانی کے بارے میں، یہ بھی کہ لوگ ہمارے علیحدہ، علیحدہ رہنے کی وجہ سے کس، کس طرح کی افواہیں پھیلا رہے تھے...... فیصل کی ملازمہ نے اسے میرے اور مہتاب کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس نے مجھے بتایا تو میرا پارہ آسمان تک جا پہنچا تھا اور جب ویسی ہی باتیں جو کہ مجھے مہتاب نے بتائی تھیں، وہ میں نے اسے کہیں تو کیا اس کا دل نہیں دکھا ہو گا...... درست ہی تو کہہ رہا تھا وہ کہ اس کی آیا تو ایک جاہل عورت تھی، اس سے ایسی توقع کی جا سکتی تھی۔ لیکن اگر ایسی ہی بات مجھ جیسی پڑھی لکھی، ڈاکٹر...... بغیر تصدیق کے یقین بھی کر لے اور وہ بات اگلے کے منہ پر کہہ بھی دے تو مجھ میں اور اس جاہل عورت میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

ہم سب تصویر کا ایک ہی رخ تو دیکھتے ہیں، وہی رخ جو ہمیں دکھایا جاتا ہے...... میرے دماغ پر بوجھ کتنا ہی بڑھ گیا تھا۔

اس خوب صورت اور تجسس سے پُر ناولٹ کا اگلا رخ کیا ہوتا ہے یہ دیکھیے، پڑھیے اور جانیے فروری 21ء کے شمارے میں۔

سلسلے وار ناول

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت... اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حسین جذبے... کہیں یہ پھول برساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں... غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی مرہونِ منت ہے... لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے... اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل پزیر تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے ۔۔۔ کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے
ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں ۔۔۔ بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے
ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر ۔۔۔ محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے
وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا ۔۔۔ اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے
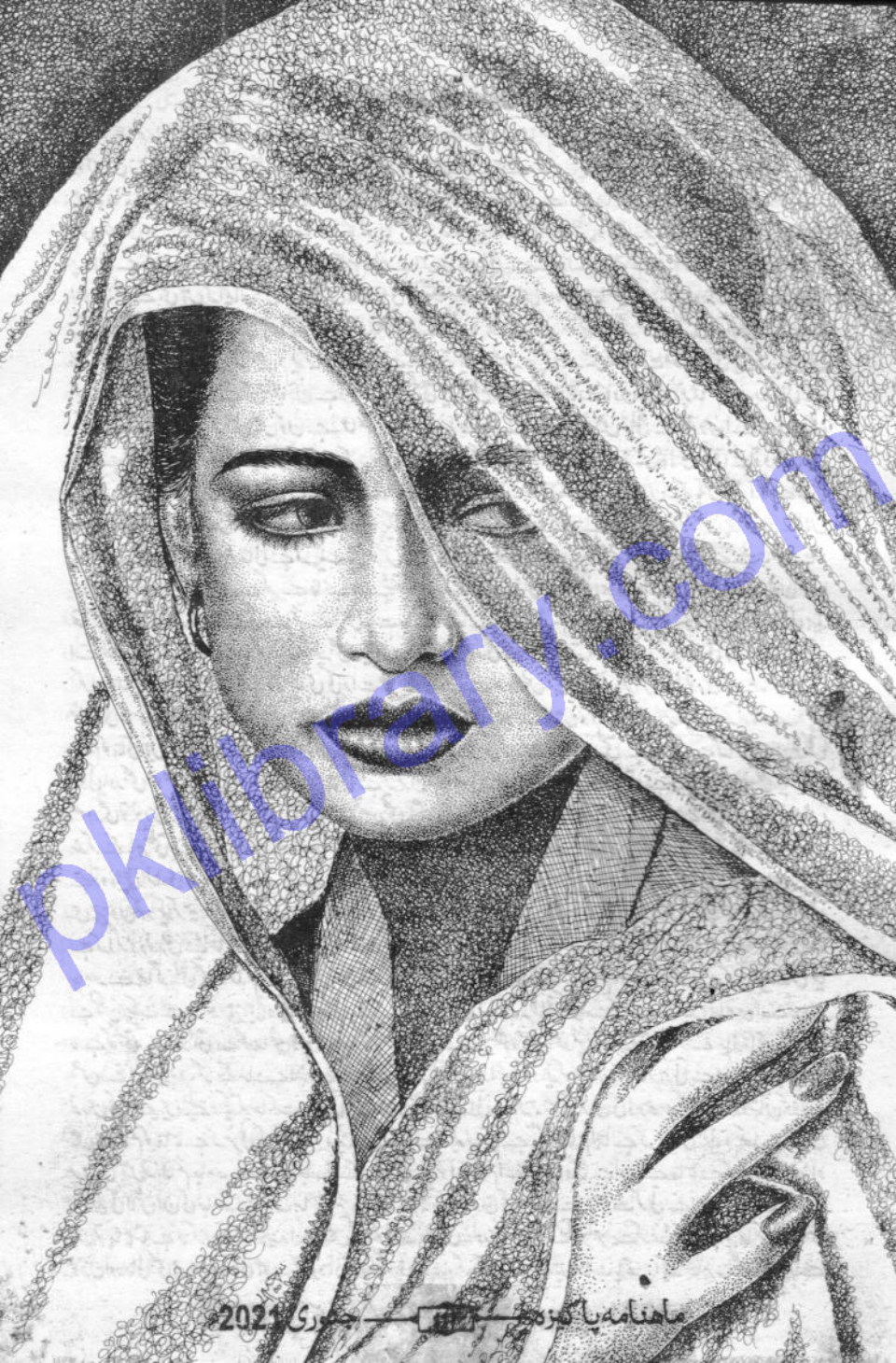
گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمائم عالمہ بن رہی تھی، وہ اور عالی جامعہ میں ایک ساتھ پڑھتی تھیں۔ عمائم کو آج کل کچھ کال اور ایس ایم ایس آرہے تھے جو اس کی زندگی میں آنے والے ہر حادثے کی پیشگی اطلاع دے دیتے تھے، عمائم بچپن سے دیکھتی آئی تھی اُسے دو لوگوں سے چھپایا جاتا تھا۔ بابا صاحب اور امو جان اور تیسری شخصیت دادی پھپھو۔ وہ بچپن سے اپنے ساتھ ایسا سلوک ہوتے دیکھ رہی تھی مگر اس بات کی وجہ سے ناواقف تھی۔ بابا صاحب کا گھرانا مشترکہ خاندانی نظام کے تحت چل رہا تھا۔ ثریم، عمائم کو اپنی بہن کی شادی پر بلاتی ہے، نورس، عمائم کے ذمے نمائش کا کام کرتی ہے اس کی کامیابی سے ملنے والے پیسے سے یتیم لڑکیوں کی شادی ہوگی۔ امو، عمائم سے کہتی ہیں کہ ایمان کبھی اس کا نہیں ہوگا۔ امی، احتشام اور اذان میں دوریاں چاہتی تھیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ماہم کا رشتہ احتشام کے لیے مانگ لیں لیکن وہ کہتا ہے کہ ضرور مانگیں مگر اذان کے لیے۔ بسمہ چاچی، عمائم کو کہتی ہیں کہ تمہیں دیکھ کر اپنے خسارے یاد آتے ہیں۔ بسمہ چاچی بعد میں عمائم سے معافی مانگتی ہیں کہ یہ دن ہی ایسا ہے شاید تو وہ پوچھتی ہے آج کیا دن ہے تو بسمہ چاچی کہتی ہیں جیل والوں کی ملاقات کا دن۔ جس پر عمائم دنگ رہ جاتی ہے کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ جیل میں کون ہے۔ عمائم، نورس کے ساتھ ثریم کے گھر تقریب میں جاتی ہے تو نورس اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے ایک لڑکی عمائم کو ایک پارسل دیتی ہے کہ یہ نوٹس ہیں تم نورس کو دے دینا۔ پولیس راستے میں گاڑی روکتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں ایس پی اذان کی کزن ہوں تو آفیسر اس سے معذرت کر لیتے ہیں۔ گھر واپس آتی ہے تو اس کے پاس میسج آتا ہے کہ منع کیا تھا ناں جانے سے۔ صبح عمائم کے کمرے سے وہ پیکٹ غائب تھا۔ صبح وہ امی کو بتاتی ہے کہ میرے ڈاکومنٹس چوری ہوئے ہیں جو امانت تھے۔ ثریم، عمائم کو بتاتی ہے کہ پیکٹ میں نوٹس نہیں تھے کچھ اور تھا اور اگر وہ نہ ملا تو تمہارے اور میرے لیے تباہی ہے۔ نورس کہتی ہے وہ پیکٹ تمہارے گھر سے غائب ہوا ہے تم کو وہ پیکٹ گم ہونے کی سزا بھگتنی ہوگی۔ اس نے عمائم کے گھر فون کر دیا تھا کہ وہ آج جامعہ میں رہے گی۔ عمائم سے اصلی بات جاننے کے لیے نورس، ثریم کو عمائم کے پاس بھیجتی ہے۔ انتظامیہ کی ہیڈ اسے کھانے کی ٹرے میں چھپا کر ایک پرچہ بھی دیتی ہے۔ جس پر محمد غوری کا تاریخی واقعہ لکھا تھا۔ عمائم کو اس کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ کرن، عمائم کو بتاتی ہے کہ جب وہ مہندی کی رات عمائم کو پیکٹ دے کر واپس آئی تو ٹیرس پر اس نے نورس کو دیکھا تھا وہ کسی ضروری کام سے نہیں گئی تھی۔ اذان کی کسی غلطی سے ان کے کوڈ ڈی کوڈ ہو جاتے ہیں تو احتشام اس پر بہت غصہ کرتا ہے۔ امو، حریم کو بتاتی ہیں کہ عمائم کی وجہ سے ایمان ان سے بات نہیں کر رہا، ان کی یہ بات ماہم سن لیتی ہے اور کہتی ہے کہ آج ایمان تو کل کوئی اور بھی عمائم کے لیے کھڑا ہوگا۔ ثریم بتاتی ہے کہ کرن اغوا ہوگئی ہے، عمائم، نورس سے کہتی ہے کہ کرن اغوا ہوگئی ...... وہ بے قصور تھی تو نورس کہتی ہے کہ تمہیں کیا پتا کہ وہ بے قصور تھی یا گناہ گار...... عمائم، اُم ردمان کو جو اسے کھانا دینے آتی ہے باتھ روم میں بند کر کے باہر نکلتی ہے اور ایک لڑکی سے بات کر کے اپنا گاؤن اور کارڈ چینج کر کے جامعہ سے باہر نکل آتی ہے۔ عمائم کے پاس میسج آتا ہے تو وہ اپنی الماری میں دیکھتی ہے تو کپڑوں کے نیچے سے وہ پیکٹ مل جاتا ہے۔ عمائم اس پیکٹ کو کھول کر دیکھتی ہے لیکن ان عجیب سی چیزوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ عمائم، نورس سے ملنے جاتی ہے تو نورس اس کی بہت تعریف کرتی ہے اور اسے آفر کرتی ہے کہ اگر وہ نورس کے ساتھ کام کرے گی تو وہ اسے جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر بنا دے گی اور اس کو وہ کلپ دکھاتی ہے کہ کس طرح وہ جامعہ سے بھاگ نکلی تھی۔ عمائم کہتی ہے میں اتنی بھاری ذمے داری نہیں اٹھا سکتی...... عمائم، نورس کو بتاتی ہے کہ وہ پیکٹ مل گیا ہے لیکن پیکٹ سے برآمد چیزیں دیکھ کر وہ کہتی ہے کہ یہ سامان بدل گیا ہے۔ عمائم کہتی ہے کہ میں نے نہیں کیا تو وہ اسے خبردار رہنے کو کہتی ہے اور کہتی ہے کہ راشن ڈپو میں جا کر راشن اتروائے۔ اسٹور کا ہیڈ عمائم کو کہتا ہے کہ ڈیلر نے نیا ڈرائیور بھیجا تھا جس نے ایکسیڈنٹ کر کے سارے انڈے توڑ دیے ہیں۔ عمائم، ڈرائیور کو دیکھ کر الجھن کا شکار ہوتی ہے اور اسے چھپ کر نورس کی تصویریں لیتے دیکھ کر ساکت رہ جاتی ہے۔ عالی، عمائم کو بتاتی ہے کہ حریم کی کزن کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ روشان کوڈ ورڈ میں احتشام کو بتاتا ہے کہ مرغی کی تصویریں لیتے ہوئے اسے دیکھ لیا گیا ہے۔ احتشام کہتا ہے کہ چوزی نے دیکھا ہے تو کوئی پریشانی نہیں۔ عمائم جامعہ سے واپس جانے کے لیے نکلتی ہے تو احتشام اسے لفٹ دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ برطانوی نژاد کرن کی لاش ان کی جامعہ کے بیک سائڈ گٹر سے ملی ہے۔ عالی، کرن کی والدہ سے سوالات کرتی ہے اس رات کے بارے میں تو پتا چلتا ہے کہ کرن نے شاید راستے میں کسی کو لفٹ دی تھی۔ نورس، کرن کے گھر تعزیت کرنے آتی ہے تو عمائم کے ساتھ نورس اور عالی بھی حیران رہ جاتی ہیں۔ پھر وہ تائی امی کو گھر ڈراپ... کر کے جامعہ آتی ہیں تو فٹ پاتھ پر ایک بظاہر بزرگ بیٹھا تھا جسے

عالی کوئی رقعہ دیتی ہے تو وہ اپنی وگ اتار کر سامنے کی بلڈنگ میں چلا جاتا ہے، عمائم جب عالی سے پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اسے اس نے دس روپے کا نوٹ دیا تھا۔ عمائم واپس وہاں جاتی ہے تو اسے وہ نوٹ ملتا ہے جس پر لکھا تھا کہ میدان خالی ہے۔ جامعہ میں الیکٹریشن آتا ہے تو عمائم اس کے پیچھے جاتی ہے اور اس کو ایک آلہ دیوار میں نصب کرتے دیکھ کر سوچتی ہے کہ نورس کی جان کو خطرہ ہے۔ عمائم، احتشام کو کہتی ہے کہ اس کے دوست نے جامعہ میں گھس کر تصویریں لی ہیں تو وہ عمائم کی توجہ ہٹانے کے لیے کہتا ہے کہ روشان، عالی میں انٹرسٹڈ ہے، عمائم اور شام کو دیکھ کر دادی کچھ سوچنے لگتی ہیں۔ روشان کے گھر میں اذان اور احتشام تھے وہاں عالی آتی ہے تو احتشام انہیں بتاتا ہے کہ عمائم ان کی باتوں پر چونک رہی ہے۔ آج جامعہ میں دولڑکیوں کا نکاح تھا اور یہ دن عمائم کے لیے بہت روح پرور ہوتا تھا۔ تائی امی بتاتی ہیں کہ... ایمان نے کہا کہ میں اموجان کی نفرت کی وجہ جانے بغیر پیچھے نہیں ہٹوں گا اور بابا صاحب نے کہا ہے کہ ہمیں عمائم کی خوشی مقدم ہے۔ صوفی صالح کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی جس میں سے دو بیٹے اور ایک بیٹی حافظ قرآن تھی۔ عمامہ، شام سے ملنے آتی ہے تو وہ اسے واپس جانے کو کہتا ہے صوفی صاحب اسے دیکھ کر سوچتے ہیں کہ کہیں جانے کے لیے شام کو کہنے گئی ہوگی۔ طاہرہ، ساس کے پوچھنے پر کہتی ہیں کہ وہ چاہتی ہیں کہ عمامہ ان کی نظروں کے سامنے رہے جس پر وہ کہتی ہیں کہ شام کا رشتہ ان کی بہن نے فیقہ کے لیے دیا تھا۔ لیکن عمامہ اپنی پسند سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ شام کی غیر موجودگی میں اس کا رشتہ فیقہ سے طے پا کر کارڈ بھی چھپوا کر بانٹ دیے اس پر عمامہ، شام کو طیش دلانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ کہتا ہے کہ مجھے تمہارے باپ کے سر پر رکھے عمامے اور اپنی عزت پیاری ہے۔ تم واپس لوٹ جاؤ۔ فیقہ اور عمامہ کی رخصتی ایک ساتھ طے کردی گئی۔ طابہ (بھاوج) عمامہ کو کہتی ہے کہ شام بھی تمہیں بہت چاہتا ہے، وہ اسے مجبور کرے گی تو وہ ضرور بولے گا۔ عمامہ، طابہ کے ذریعے شام کو بلاتی ہے اور اس کو سول میرج کے لیے راضی کرتی ہے ساری بات فیقہ سن لیتی ہے۔ عمامہ آنے والے فون پر کہتی ہے صوفی صالح کی بیٹی عمامہ حادثاتی موت کا شکار ہوگئی ہے۔ آپ بارات مت لائیے گا۔ عمامہ کو یہ بات کرتے طاہرہ سن لیتی ہیں، وہ اس پر غصہ کرتی ہیں، وہ صوفی صالح سے کہتی ہیں ہم نے جلد بازی کرلی۔ فرخ (منگیتر عمامہ) اور اس کے بہنوئی کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے جس میں بہنوئی کی ڈیتھ ہوجاتی ہے، دونوں شادیاں نامعلوم مدت کے لیے کینسل ہوگئیں۔ شمسہ بھابی، عمامہ کو کہتی ہیں کہ طابہ سے دور رہو وہ تمہیں نقصان پہنچائے گی۔ عمامہ کا کالج میں ایڈمیشن ہوتا ہے تو دادی کہتی ہیں کہ وہ کوئی چاند چڑھائے گی۔ طابہ اپنے شوہر تقی سے کہتی ہے کہ فیقہ کو شام اور عمامہ کے حوالے سے کچھ شبہات ہیں تو تقی کہتا ہے کہ شام جس سے بھی بات کرے وہ اسے شک کی نگاہ سے دیکھیں گی۔ عمامہ کو کالج چھوڑنے شام جاتا ہے تو گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوجاتا ہے اور ایک آدمی ملتا ہے جو عمامہ کے لیے گھٹیا الفاظ استعمال کرتا ہے اور شام کے پوچھنے پر خود کو اس کا باپ بتاتا ہے۔ منصور سیال پھر فیکٹری جاتا ہے اور منیجر سے شام کی تنخواہ مانگتا ہے تو وہ اسے منع کردیتا ہے۔ لیکن وہ شام سے دس ہزار لے کر ہی جاتا ہے۔ کالج میں جانے سے عمامہ گھبراتی ہے تو وہاں اسے سونیا ملتی ہے۔ سونیا کے ساتھ عمامہ کالج میں جلد ایڈجسٹ ہوجاتی ہے۔ سونیا جب عمامہ کے ساتھ گھر آتی ہے تو دادی کو وہ بالکل پسند نہیں آتی۔ عمامہ، سونیا کو بتاتی ہے کہ فیقہ کا یہ حشر کیسے ہوا وہ پہلے ایسی نہیں تھی۔ دادی، شام کو عمامہ کی ذمے داری اٹھانے سے منع کرتی ہیں تو وہ کہتا ہے مجھے صالح بھیا نے کہا تھا وہ منع کریں گے تو میں اسے لے کر نہیں جاؤں گا۔ عمامہ، سونیا کو بتاتی ہے کہ فیقہ پھپو بہت پیاری تھی ان کی دوست نے ان کے منہ پر کوئی کریم لگادی جس سے ری ایکشن ہوا اور گھر والوں نے اس کا صحیح علاج نہیں کرایا جس کی وجہ سے ان کی یہ حالت تھی کہ چہرہ عجیب سیاہی مائل ہوگیا تھا......سونیا، عمامہ سے کہتی ہے کہ وہ فیقہ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے کہ وہ نارمل ہوجائے۔ منصور سیال کا فون آتا ہے تو عمامہ، شام کو بلانے جاتی ہے تو وہ اسے ڈانٹتا ہے کہ تم نے یہ کال کیوں سنی۔ تقی، شام کو بتاتے ہیں کہ فیکٹری کے سامنے پلاٹ کا جو کیس تھا وہ ہار گئے ہیں اور وہ پلاٹ منصور سیال نے لیا ہے اور اب وہ ان کے مقابل آکر بدلہ لینا چاہتا ہے کیونکہ صوفی صالح نے رابعہ (شام کی ماں) کے ساتھ منصور سیال کے سلوک کی وجہ سے اسے جیل کی شکل دکھائی تھی۔ اور شام کو خود لے آئے تھے۔ تاج بیگم (دادی) شام سے کہتی ہیں کہ وہ تین مہینے کے بعد فیقہ سے اس کی شادی کردیں گی وہ تیار رہے۔ طاہر وکیل کے پاس جاکر پوچھتا ہے کہ اس نے یہ کیس کیوں ہارا تو وہ بتاتی ہے کہ آج تک وہ کوئی کیس جیتی ہی نہیں۔ فیقہ سوچتی ہے کہ اماں اور بھیا نے اس کے لیے شام کا انتخاب کیا ہے تو عمامہ اس کے رستے سے ہٹ کیوں نہیں جاتی۔ سونیا، عمامہ کو فون کرکے کہتی ہے وہ فیقہ کی برین واشنگ کرکے اس کو صحیح اور غلط فیصلے کی پہچان کروا کر اس کی دوسری جگہ شادی کروادے گی۔ عمامہ ابھی بات کررہی ہوتی ہے کہ فون کٹ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد فون پھر بجتا ہے تو فون پر سونیا کے دھوکے میں شام کے باپ منصور سے کہہ بیٹھتی ہے کہ وہ شام کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں

کر سکتی۔ سونیا، عمامہ کو کہتی ہے کہ وہ فیقہ کو بدلنے کے لیے کچھ بھی کرے گی۔ طابہ، عمامہ کو بتاتی ہے کہ اس نے منصور اور اس کی باتیں سن لی تھیں۔ سونیا، عمامہ کے گھر ایک جوکر کے روپ میں آتی ہے اور پھر کچھ کرتب دکھا کر سب کو خوش کرتی ہے اور پھر اپنا آپ ظاہر کر کے فیقہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے۔ اماں، فیقہ سے سونیا کی دی ہوئی گڑیا یہ کہہ کر لیتی ہیں کہ اس پر کوئی جادو ٹونا بھی ہوسکتا ہے تاکہ اس کی شادی نہ ہو اور طابہ ان کی باتیں سن کر فیقہ کے خدشات کو اور بھی ہوا دیتی ہے اور کہتی ہے کہ تم ان دونوں پر ظاہر کر دو کہ تم ان کی سازش سے واقف ہو۔ طاہر اور بسمہ ہمدانی کو منصور ہوٹل میں چائے پیتے دیکھ لیتا ہے۔ عمامہ، سونیا سے کہتی ہے کہ فیقہ نے اسے بلایا ہے، فرخ فون کر کے عمامہ سے بات کرتا ہے اور اسے شرمندہ کرتا ہے کہ اس کو فرخ کی عیادت تو کرنی چاہیے تھی۔ سونیا کے آنے پر جب فیقہ اس کی بے عزتی کرتی ہے کہ اس نے فیقہ پر عمامہ کے ساتھ مل کر جادو کیا ہے تو سونیا اسے کہتی ہے کہ وہ بدگمانی ہٹا کر دیکھے گی تو اسے خلوص کی پہچان ہوگی۔ منصور سیال، شام سے دوبارہ بیس ہزار روپے لیتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ صالح کی بہن سے شادی کر کے اپنے جذبات اور زندگی کے ساتھ کیوں کھیل رہے ہو پھر وہ صوفی صالح کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ عمامہ اور شام کی شادی کر دیں۔ طاہر اپنی پسند کو لے کر پھر سکتا ہے تو میرا بیٹا کیا گناہ کر رہا ہے۔

..........اب آگے پڑھیے

قسط نمبر 13

اس ساری گفتگو میں عمائم کے دل کو صرف وہی باتیں..... لگی تھیں جن میں بابا صاحب کا ذکر تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''عمائم کی رائے جانو۔'' گویا ان کی نگاہ میں عمائم کی اہمیت تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''عمائم کی خوشی مقدم ہے۔'' گویا کوئی زور زبردستی نہیں۔ وہ آزادانہ ہر فیصلے کا اختیار رکھتی تھی لیکن وہ کیوں ہر فیصلہ آزادانہ کر لیتی؟ اس کی زندگی کچھ لوگوں کے ساتھ منسوب تھی۔ ایک تائی امی جو اس کی حقیقی ماں نہیں تھیں لیکن ماؤں سے بڑھ کر اس کی پرورش کرتی رہی تھیں۔ اس کے لیے وبال ہوتی زندگی میں ہمیشہ کے لیے ڈھال تھیں۔ دوسرے بابا صاحب، اس گھر کا مضبوط کردار، جنہیں چپکے، چپکے دیکھنا اور حفظ کرنا اس کا بچپن سے بہترین مشغلہ تھا۔ جن سے پوشیدہ محبت کا کوئی شمار تھا اور نہ کوئی حد تھی۔ اگر وہ عمائم کی ذات کو اتنا مان بخش کر اس کی رائے جان رہے تھے تو یہ عمائم کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔ امو اور ایمان سے ہٹ کر بابا صاحب اور تائی امی کی محبتوں اور اہمیت کی زیر بارگی نے عمائم کی سوچوں کے کئی در وا کر دیے تھے۔ سو جب وہ بولی تو فیصلہ نسبتاً پہلے سے آسان تھا۔

''میری زندگی کا ہر فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے امی! وہ ایمان ہو یا کوئی بھی۔ جسے آپ اور بابا صاحب پسند کریں گے، مجھے وہ قبول ہوگا۔'' اس کی فرمانبرداری نے تائی امی کو رُلا دیا تھا۔ وہ اسے سینے میں بھینچ کر سسک پڑیں۔

''عمائم! تم نے تو مجھے سرخرو کر دیا ہے میری جان، میری تربیت کو اعزاز بخش دیا۔ مجھے پھر سے زندہ کر دیا۔'' وہ اسے سینے میں بھینچے شدتِ ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ عمائم ان کے جذبات کو سمجھتی تھی۔

''بیٹیوں کو تمہارے جیسا ہونا چاہیے۔ موم کی طرح، بڑوں کے ہر فیصلے میں ڈھلنے والی۔ ہر سانچے میں اپنی ماہیت بدلنے والی، عمائم! بیٹیوں کو فرمانبردار ہونا چاہیے، خودسر نہیں۔ آج میں بابا صاحب کے سامنے سر اٹھا کر کہہ سکوں گی۔ گندے خون کا اثر نسلاً بعد نسلاً، پیڑھی در پیڑھی، پشت در پشت منتقل نہیں ہوتا۔ ان کے کہے الفاظ غلط ثابت ہو گئے۔'' ان کی بڑبڑاہٹ ایسی تھی کہ عمائم قریب بیٹھ کر بھی سمجھ نہیں سکی تھی۔ تاہم وہ ان کے جذبات خوب سمجھ رہی تھی۔ حالانکہ فیصلے کے سارے اختیار تائی امی کی طرف منتقل کرتے ہوئے دل کے اندر دور کہیں ''سناٹا'' سا اتر رہا تھا۔ ایسی خاموشی جس پر شام ہجراں رو رہی تھی۔ دل کے اندر اک قیامت کا درد پگھل رہا تھا۔ دور کہیں، کسی دریچے میں ایک چہرہ ابھر رہا تھا۔ بادلوں کے رتھ پر سوار ایک جگنو مٹھی سے پھسل رہا تھا۔ دل کے نہاں خانوں میں چھپا ایک ''راز'' سسک رہا تھا۔ عمائم کو خبر ہو گئی تھی۔ وہ ایک خواب، وہ ایک راز، وہ دل میں چھپا ایک احساس آج ہی احتشام کے ساتھ بچھڑ رہا تھا۔ کسی آنے والے ایسے ہی دن وہ سوچوں تک میں پرائی ہونے والی تھی۔ پھر وہ خود

سے بھی نگاہ چرا، چرا کر احتشام کو کبھی نہیں سوچے گی۔ وہ اس کے خوابوں سے بہت دور چلا جائے گا۔ وہ اس کے خیالوں کی سرحدوں سے بھی بہت دور نکل جائے گا۔
کیونکہ عمائم کو وفاداری اور فرمانبرداری کے ایسے ہی نصاب پڑھائے گئے تھے۔ وہ خودسر نہیں تھی جو بغاوت کا علم اٹھاتی، وہ سرکش نہیں تھی جو نسلوں کو داغ دار کرتی۔ وہ منافق نہیں تھی جو غداری کرتی اور ''غدار'' کہلاتی۔

☆☆☆

وہ کچن میں کھڑی اپنے لیے برنچ تیار کر رہی تھی۔ آج کرنچ کیک کا موڈ ہو رہا تھا۔ حالانکہ اس نے اپنے لیے کبھی بھی ایسا کوئی اہتمام نہیں کیا تھا۔ اوون میں ڈرم اسٹکس بھی بیک ہو رہی تھیں۔ ایک چکن پارسل بھی تیاری کے آخری مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔ حریم کوئی چوتھی مرتبہ ہاتھ ملتی کچن میں جھانک کر گئی تھی۔
''برنچ کب ریڈی ہوگا؟ میں نے تو آج لانچ میں کچھ کھایا ہی نہیں۔'' حریم کے چہرے پر مایوسی سی پھیل رہی تھی۔
''لالچ گندی بلا ہے۔ تم نے کہیں پڑھا نہیں؟'' اس کا انداز ناصحانہ تھا۔ حریم کا موڈ بگڑ گیا۔
''ایک سو ایک مرتبہ پڑھ چکی ہوں۔ عملی تجربے سے آج گزری ہوں۔'' وہ چڑ کر پلٹ گئی تھی۔ کچن کے ایک کونے سے ''کھی، کھی'' کی آواز آئی۔ عمائم بغیر دیکھے بھی جانتی تھی۔ کچن کے کونے میں کون کھڑا ہے؟
تائی امی کی ہدایت پر ایمان پانے کی مدد سے لکڑی کے کیبنٹ کی دراز کھول رہا تھا۔ ایک چپٹی لکڑی سے بڑی مہارت کے ساتھ وہ کام لے رہا تھا۔ ساتھ گاہے بگاہے عمائم پر بھی نگاہ ڈال لیتا۔ جب عمائم نے کوئی توجہ نہیں دی تو وہ چڑ کر بولا۔
''میں پیدائشی ترکھان نہیں ہوں۔'' اس کا انداز جلا کٹا سا تھا۔ ''تم تو مجھے ''دیہاڑی'' والوں کی طرح نظرانداز کر رہی ہو۔''
''تو کیا کروں؟'' عمائم کو نہ چاہتے ہوئے بھی کہنا پڑا۔
''میں ایک کمرشل پائلٹ ہوں۔'' اس کا انداز جتانے والا تھا۔ جس پر وہ منہ بنا کر رہ گئی تھی۔
پورے کچن میں اشتہا انگیز خوشبوئیں چکرا رہی تھیں۔ ایمان نے ناک سکیڑ، سکیڑ کر خوشبو اندر اتاری۔ اس کی بھوک بھی خاصی چمک گئی تھی۔
''ویسے ''مزدوری'' میں تم مجھے برنچ کی آفر کر دینا۔ میں اسی پر ''صبر'' کرلوں گا۔'' ایمان نے بے صبرے پن سے کہا تھا۔
''تم تائی امی کا کام کر رہے ہو، مزدوری بھی انہی سے لو۔'' اس نے صاف جھنڈی دکھائی تھی۔
''ایسی کٹھور تو نہیں ہو تم عمائم۔'' ایمان نے دکھی صورت بنائی۔ ''ویسے تم نے کب مجھے بطور کاریگر کبھی ہائر کیا ہے؟''
''مجھے ایسا نکما کاریگر نہیں چاہیے۔ جسے باتیں بنانے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔'' وہ املی کی چٹنی کو تختہ مشق بناتی آرام سے بولی۔
''باتوں کے علاوہ بھی بہت کچھ آتا ہے۔ تم موقع تو دو۔ پھر میرے کمال دیکھنا۔'' ایمان ٹھونک بجا کر چہکا تھا۔
''کمال تو میں تمہارے دیکھ ہی چکی ہوں۔'' اس کا اشارہ سمجھ کر ایمان بھی قدرے سنجیدہ ہوا۔
''میں ایسا ہی ارادوں کا پکا ہوں۔'' وہ جھک کر جذب سے بولا تھا۔
''اتنے عظیم دعوے نہیں کرتے۔'' اس کی معنی خیزیت کو نظرانداز کر کے عمائم نے کہا۔
''نبھا کر دکھاؤں گا۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔ کیونکہ عمائم مزید جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔
''کیا میں تمہاری رائے جان سکتا ہوں؟'' اس کے لہجے میں عجیب سی بے چینی تھی۔ جیسے عمائم کی رائے اس

کے لیے خاصی اہمیت رکھتی تھی اور وہ اس کے خیالات سے مستفید ہونا چاہتا تھا۔

''میری رائے تائی امی کے پاس محفوظ ہے۔'' عمائم نے ٹھوس انداز میں وضاحت کی تھی۔ ''وہ میرے بارے میں فیصلہ کرنے کے تمام اختیار محفوظ رکھتی ہیں۔''

''تو اب میں تائی امی سے پوچھوں؟'' وہ چڑ کر گویا ہوا۔ ''کہ عمائم کے دل کا حال تو بتائیں؟ کیا وہ مجھے اپنی زندگی اور دل میں جگہ دے گی، حد ہے یار! کیا اظہارِ محبت بھی ان ڈائریکٹ کروں گا؟''

''محبت پھر درمیان میں اٹھا لائے ہو؟ ابھی تو بڑوں کے درمیان فیصلہ ہوگا۔ باہمی رضامندی سے، اموکی خوشی اور مرضی کے بعد۔'' عمائم جتا کر بولی تھی تاکہ وہ اپنی ماں کے واضح انکار اور ناپسندیدگی کو نظر انداز نہ کرے۔

''محبت ایک حقیقت ہے جو پسندیدگی سے شروع ہو کر چاہت کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔'' ایمان نے ملائمت سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''اب محبت کا فلسفہ مت بگھارو۔'' وہ بھی چڑ کر رہ گئی۔

''تو منگنی کا فلسفہ کیا مناسب رہے گا؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ اچانک چونک گئی تھی۔

''منگنی؟'' عمائم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''جی ہاں، عنقریب ہونے والی منگنی۔'' ایمان نے جیسے انکشاف کیا تھا۔

''لیکن امو؟'' وہ حواس باختہ ہو گئی۔

''بابا صاحب نے امو سے بات کی ہے۔ سو وہ خاموش ہو گئیں اور جناب خاموشی، نیم رضامندی ہوتی ہے۔'' ایمان چہک کر بتا رہا تھا۔ عمائم کا ذہن گول، گول چکرانے لگا۔ باقی سب تو ٹھیک تھا لیکن اتنی جلد بازی کے بارے میں اس نے سوچا نہیں تھا۔ تو کیا اس کی زندگی کا فیصلہ بابا صاحب اور تائی امی کی مرضی کے مطابق ہو چکا تھا؟ اس کا دل جیسے اتھاہ میں ڈوبنے لگا۔ ذہنی اور قلبی پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ تائی امی کو سونپ کر بھی دل کے اندر ایک ''احساسِ زیاں'' چٹکیاں بھر رہا تھا۔

☆☆☆

ایمان نے جو کہا تھا ٹھیک کہا تھا۔ باقی کے معاملات تیزی سے طے ہوئے تھے۔ عمائم دل میں ابھرتی کسی منفی سوچ کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ گھر کے سربراہ بہت خوش تھے۔ تایا ابا، بڑے ابا، بابا صاحب، تائی امی، بڑی امی، بسمہ چاچی...... خاص طور پر بسمہ نے عمائم کو مبارک باد دی تھی۔ اس نے کہا۔ ''گھر پر جما سالوں کا جمود ٹوٹنے کی مبارک ہو۔'' اس گھر میں یہ پہلی کزنز میرج، مطلب کزنز انگیجمنٹ تھی۔ حریم اور حرم گو کہ بہت خوش تھیں تاہم عمائم کو بھی، بھی حریم کی آنکھیں شکوہ کناں لگتی تھیں۔ اس کا کوئی بھی تاثر عمائم سمجھنے سے معذور تھی۔

سب سے حیران کن رویہ امو کا تھا۔ جانے بابا صاحب نے کس طرح انہیں سمجھایا تھا۔ وہ نہ صرف خاموش تھیں بلکہ انہیں کوئی دورہ بھی نہیں پڑا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ عمائم کو دیکھ کر بھیانک تکلیف سے نہیں گزری تھیں۔ ان کی خاموشی بلاشبہ خوش آئند تھی۔

گھر میں منگنی کی دھڑا دھڑ تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ تائی امی جیسے اپنے سارے ارمان نکال لینا چاہتی تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک لباس بن کر آ رہا تھا۔ ماما کی فیملی کے علاوہ سب مسرور تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی۔ ماما تمام تر نفرت اور ناپسندیدگی کے باوجود اس رشتے کو توڑنے کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکی تھیں۔ جانے وہ اتنی بے بس کیوں تھیں؟

ماہم البتہ کٹ کھنی بلی بنی غراتی پھر رہی تھی۔ اس کا غصہ بجا تھا۔ ایک دم کھیل کا پانسہ الٹ گیا تھا۔ منگنی سے دو دن پہلے حریم دھپ، دھپ کرتی عمائم کے کمرے میں آئی۔ اس کا منہ پھول کر کپا ہو رہا تھا۔ وہ اس پھولے غبارے کی خفگی سمجھ نہیں سکی تھی۔

''مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی عمائم کرؤ'' اس نے چھوٹتے ہی اپنی خفگی جتا کر کہا۔
''کون سی؟'' وہ بھونچکی ہوئی۔
''منگنی والی۔'' حریم نے خفگی جتائی۔ تاثرات برہم سے تھے۔
''کیا مطلب؟ میں کچھ نہیں۔'' وہ واقعی سمجھنے سے قاصر تھی۔ کافی دنوں سے حریم کا موڈ تو دیکھ رہی تھی تاہم وہ آج پھٹ پڑے گی، یہ عمائم نے سوچا نہیں تھا۔
''تم کیوں سمجھوگی، چپ چاپ ایمان بھائی سے منگنی کروا کے بھی نہ سمجھنا۔ میری آنکھوں میں تو ریت بھر گئی۔ آخر کون سا منظر صاف دیکھوں؟ پہلے والا جو شام بھائی کے ساتھ تمہیں دیکھ کر پرفیکٹ لگا تھا؟ یا اب والا؟ جو سرے سے ''ہیرو'' ہی بدل گیا۔'' حریم چڑ کر بولتی چلی گئی۔
''ہیرو تو شروع سے ایمان ہی تھا۔ یاد کرو، اس کے پروپوزل کی اطلاع بھی تمہی نے مجھے پہنچائی تھی۔ اس وقت جب تم کچن میں کھڑی غٹاغٹ جوس چڑھا رہی تھیں۔'' عمائم نے اسے کسی پچھلی بات کا حوالہ دیا تھا۔ حریم تپ کر بول پڑی۔
''وہ محض اطلاع تھی...... یہ تو نہیں کہا تھا، ایمان کا پروپوزل ایکسیپٹ کرلو۔'' اس نے غرا کر کہا۔ تب عمائم کچھ پریشان ہوگئی تھی۔ اسے حریم خاصی ڈپریسڈ سی لگی۔ عمائم ہونٹ کاٹتی رہ گئی تھی۔
''تو پھر ایمان کے علاوہ کوئی آپشن بھی نہیں تھا ایمان میں کمی تو کوئی نہیں......'' اس نے مری، مری آواز میں بات مکمل کی تھی۔ حریم نے اسے گھور کر دیکھا۔
''آپشن کیوں نہیں تھا۔'' وہ دکھی سی ہوگئی۔
''حریم! تم جذباتیت سے نکلو...... جو تم سوچ رہی ہو، وہ کیسے ممکن تھا؟'' عمائم اس کی بات سمجھ کر مضطرب انداز میں بولی۔ گمان غالب تھا کہ حریم کے غصے کا سرا احتشام سے ملتا تھا۔ وہ عمائم کے لیے شام کو پسند کرتی تھی۔
''تم دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگتے۔'' اس کا لہجہ حسرت آمیز تھا۔
''اچھا لگنے سے کیا ہوتا ہے...... احتشام کا پروپوزل تو نہیں آیا تھا ناں......'' روانی میں عمائم بول ہی گئی تھی بعد میں الفاظ کی پیچیدگی کا احساس ہوا۔ لیکن کمان سے نکلا تیر تو واپس نہیں ہوسکتا تھا۔
''آ تو سکتا تھا۔'' حریم اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔
''میں ریت پر تاج محل نہیں بناتی۔'' وہ چڑ کر گویا ہوئی۔ حریم چپ سی کر گئی تھی پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہوگی...... کچھ دیر بعد وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی، عمائم اس کے پل میں تولہ پل میں ماشہ والے مزاج پر سر تھام کر رہ گئی۔ معا بسمہ بھی دروازے پر دستک دے کر آ گئی۔ اس کے چہرے پر کافی عرصے کے بعد خوشی نظر آ رہی تھی۔ وہ عمائم کے قریب آ گئی اور اس نے عمائم کا ہاتھ تھام لیا۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ عمائم چونک سی گئی۔ اسے بسمہ کی آمد کا مقصد معلوم نہیں تھا۔ اسی لیے تھوڑا مضطرب ہوگئی تھی۔ کیونکہ عام روٹین میں بسمہ بہت کم عمائم کے روم میں آتی تھی۔ پھر اس نے ہلکی پھلکی گفتگو کے بعد اس سلسلے کی بات سے آغاز کیا تھا۔ جس کی رونق آج کل لاؤنج پر چھائی تھی۔
''عمائم! تم خوش ہو......؟'' اس نے ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔ آج کل ہر کوئی اس سے یہی سوال پوچھ رہا تھا۔ اب عمائم بھلا کیا جواب دیتی...... خوشی نہ جانے کیا تھی؟ اسے خوشی کے احساس کی خبر نہیں تھی تاہم وہ مطمئن ضرور تھی۔ اب بھی محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔
''امو کا رویہ خاصا حیران کن ہے، مجھے ان کی خاموشی کسی طوفان کی پیش قدمی لگتی ہے۔'' عمائم نے الجھے انداز میں کہا۔
''ایسا کچھ نہیں عمائم......! وہم میں نہ پڑو......'' بسمہ نے نرمی سے سمجھایا۔
''وہم نہیں...... آپ سمجھیں تو، کہاں وہ مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھیں۔ اور کہاں اتنی خاموشی......؟'' اس نے

متفکر انداز میں اپنی الجھن شیئر کی تھی۔
''یہ تمہارا واہمہ ہے.....اموکیوں مانی ہیں؟ اس کے پیچھے کہانی کچھ اور ہے۔'' بسمہ کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا۔
''مطلب.....؟'' اس نے الجھے انداز میں پوچھا۔
''بات سنو عمائم! میں کچھ جانتی تو نہیں.....بس اتنا ضرور پتا ہے، جیل والوں میں سے کسی نے اموکو فون کیا ہے تاکہ ایمان اور تمہارے رشتے میں دراڑ نہ ڈالیں۔'' بسمہ نے سنجیدگی سے اسے بتایا تھا۔ وہ چونک اٹھی۔
''جیل والوں میں کون.....؟'' اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔
''کیا تمہیں نہیں پتا.....؟'' بسمہ نے بڑی حیرانی سے کہا تھا۔ اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا حالانکہ دل کی رفتار بہت تیز ہو رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کوئی بات ایسی ضرور ہے جو اس کا ذہن قبول کسی بھی کیفیت میں نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک پژمردہ سا دن تھا۔ بجھا، بجھا سا، اداس اور زرد دھوپ میں لپٹا ہوا۔ طبیعت خاصی بے چین تھی۔ آج اس نے جامعہ سے ناغہ کیا تھا۔ اب گھر میں رہ کر بھی پچھتا رہی تھی۔ کیونکہ سب لوگ کہیں نہ کہیں مصروف تھے۔ کچھ بازاروں میں اور کچھ کالجوں میں.....حریم بھی نہیں تھی سو دن گزارنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ وہ پچھلے صحن میں چلی آئی۔ وہاں دادی بھی موجود تھیں۔ اس منگنی پر دادی کے تاثرات محفوظ تھے۔ وہ ان کا خیال جاننے سے قاصر تھی۔
اس وقت وہ کونڈی میں کچھ کوٹ رہی تھیں۔ شاید جڑی بوٹیوں کا جوشاندہ تھا۔ عمائم دیکھ نہیں سکی۔ وہ وہیں چار پائی پر کسلمندی سے پڑی رہی.....طبیعت کا بوجھل پن کم نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے دھوپ سے بچنے کے لیے آنکھوں پر دوپٹا رکھ لیا تھا۔ کہیں امرود کے درختوں پر ننھی چڑیا ایک دوسرے کے ساتھ لڑ رہی تھیں۔ فضا میں ناگوار سا شور بکھر رہا تھا۔ جو طبیعت کے بوجھل پن پر گراں گزر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے ایک بھاری مردانہ آواز مدہم انداز میں سنائی دی تھی۔ عمائم نے چونک کر منہ سے دوپٹا پیچھے کھسکایا۔ وہ احتشام ہی تھا۔ جو دادی کے پاس دوزانو بیٹھا کچھ راز و نیاز کر رہا تھا۔ کافی دیر تک بھنبھناہٹ کی آواز آتی رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر واپس جانے لگا۔ معاً اس کی نگاہ عمائم پر پڑی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے رک سا گیا۔ پھر نپے تلے قدم اٹھاتا قریب آ گیا۔ عمائم اسے آتا دیکھ کر سنبھل کر اٹھ بیٹھی تھی۔ دوپٹا بھی ڈھنگ سے اوڑھ لیا تھا۔ اسے احتشام کے آنے کی وجہ معلوم نہیں تھی۔ نہ جانے اس نے کیا بات کرنا تھی؟ عمائم سوچ میں پڑ گئی۔ معاً احتشام نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ نہ جانے کب سے وہ کن انکھیوں سے اس کا تاثر نوٹ کر رہا تھا۔
''منگنی کی مبارک ہو.....'' اس کا انداز خاصا دوستانہ تھا۔ عمائم کو غش سا آ گیا۔ احتشام اور مبارک دے۔ کافی حیران کن سی بات تھی۔ عمائم کو امید نہیں تھی۔ وہ بات کا آغاز ہی ''مبارک باد'' دے کر کرے گا۔ ویسے بھی اس کا انداز ناقابلِ فہم تھا۔
''ابھی منگنی ہوئی کہاں ہے؟'' عمائم نے بے ساختگی سے کہا۔ اسے اچانک احتشام کی بہت پرانی وہ گفتگو یاد آئی تھی۔ جب اس نے ایمان سے کہا تھا۔ ''اس خون آشام بلا کا خیال ترک کر دو.....'' عمائم کو وہ سب باتیں بھولی نہیں تھیں۔
''ہونے تو والی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ عمائم قدرے جز بز سی ہو گئی۔ اسے احتشام کا لہجہ طنزیہ لگا تھا۔
''بڑی جلدی رپورٹ مل گئی.....'' اس نے کلس کر کہا۔ کم از کم وہ احتشام کے منہ سے اپنی منگنی کا ذکر نہیں سننا چاہتی تھی۔

''فارغ اور نکما جو ہوں...... گھر میں ویلا رپورٹنگ کرتا ہوں۔ ایسی خبریں جلدی نگاہ سے گزرتی ہیں۔''
احتشام نے نچلا لب دانتوں تلے دبالیا تھا۔ عمائم اس کا طنز سمجھ گئی تھی۔ کیونکہ حریم ہاتھ دکھانے سے باز نہیں آئی تھی۔ اس کا ہلکا پیٹ کوئی بھی راز اندر نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسے حریم پر بلا کا غصہ آیا۔ احتشام کی چچی تھی پوری۔
''میری جاب کے لیے تم بہت کانشس تھی ناں...... میں نے سوچا، خود ہی بتا کر آؤں۔ اس طرح تو بے خبری میں مارا جاؤں گا۔ تم نے ''ویلا'' نکما سمجھ کر گھاس تک نہیں ڈالی۔'' آخر میں وہ کچھ شکوہ کناں ہوا تھا۔ عمائم کے تیور بگڑ گئے۔ وہ احتشام کے لہجے میں ہلکے سے چبھن دیتے احساسِ زیاں کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس کو احتشام کا لہجہ طنزیہ ہی لگتا۔
''میں گھاس کا کاروبار نہیں کرتی۔'' اپنے تئیں عمائم نے اسے لاجواب کرنا چاہا تھا۔ لیکن مقابل بھی احتشام تھا۔ ہوتا نہیں، لاجواب کر دیتا تھا۔
''جذبوں کا بیوپار تو کرتی ہو...... اور جذبوں کی پہیلیاں نہیں سمجھتی؟ بڑے افسوس کا مقام ہے۔'' اس نے خاصی آہ بھر کر کہا۔ وہ لمحوں میں گم صم رہ گئی تھی۔ احتشام اسے کیا سمجھانا چاہتا تھا؟
''اس بات کا مطلب......؟'' اس نے ناگواری سے پوچھا۔ ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ کیا خبر، اسے عمائم کے جذبوں کی بھنک پڑ گئی ہو...... اور اب احتشام باتوں، باتوں میں اسے جتا کر بے عزت کرنا چاہتا ہو......؟ عمائم کو بے انتہا خفت نے آگھیرا تھا۔ وہ بات کو بدل دینا چاہتی تھی۔
''بھئی مطلب تو مطلبیوں سے پوچھو......'' اس نے صاف جھنڈی دکھائی۔ عمائم کو اچانک خیال گزرا تھا۔ بحث میں کشیدگی کے باعث وہ عالی کے متعلق کچھ اور پوچھ نہیں سکتی تھی۔ سو اسے لہجے میں ملائمت بھرنی پڑی تھی۔ حالانکہ عالی کے بارے میں سطحی انداز میں سوچنا بڑا تکلیف دہ امر تھا۔ پھر بھی احتشام کو اس الزام کی وضاحت دینی تھی۔
''عالی کے افیئر کی بابت وہ خبر درست تھی؟'' اس نے تنک کر خفگی سے پوچھا۔ عمائم کے تاثر برہم تھے۔
''میں لوگوں کی جاسوسی نہیں کرتا۔'' احتشام نے کندھے اچکا کر جتایا۔ وہ اس کے طنز کو سمجھ گیا تھا۔ اور بات بدلنے کو بھی سمجھ گیا تھا۔
''تو پھر کیا کرتے ہو؟'' عمائم نے تلخی سے کہا۔ اسے احتشام کا صاف مکرنا ناگوار گزرا تھا۔ لیکن اس سے ہر توقع رکھی جا سکتی تھی۔
''سرکار کی نوکری......'' اس کی بزجستگی قابلِ دید تھی۔ عمائم کو غصہ آ گیا۔ وہ جان گئی تھی۔ احتشام نے خود ہی بات گھما کر ٹال دی ہے۔ وہ عالی اور روشان کے متعلق بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا غصہ ملاحظہ کر کے وہ جاتے، جاتے ذرا دیر کو رکا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں معنی خیزیت بھر گئی تھی جیسے کوئی اچانک بات یاد آ گئی تھی۔
''ویسے یہ منگنی......'' احتشام نے بولتے، بولتے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ پھر عمائم کے چہرے کا تاثر پڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے ادھورا فقرہ مکمل کر دیا تھا کیونکہ عمائم تنک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''زیادہ دیر چلتی دکھائی نہیں دیتی۔'' اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر شرارتاً کہا۔ عمائم بھک سے اڑ گئی تھی۔
''بجا فرمایا آپ نے۔'' وہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔ ''عنقریب منگنی شادی میں بدل جائے گی۔''
اس نے احتشام کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ جلدی سے اپنا راستہ ناپ گیا تھا حالانکہ اس کے چہرے پر بڑے محظوظ کن تاثرات تھے جو عمائم دیکھ نہیں سکی تھی تاہم غصے میں بڑبڑاتی ضرور رہ گئی تھی۔ چونکی تو تب جب دادی نے ''اونہوں'' کے ساتھ اسے تنبیہہ کی تھی۔ گویا غصہ کرنے سے روکا تھا۔ وہ الجھ سی گئی۔ پھر دادی نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ عمائم کو غش سا آ گیا۔ دادی اسے منہ لگالیں؟ بڑی حیران کن بات تھی۔ وہ تیزی سے ان کے قریب آئی۔ انہوں نے پھر اشارے سے غصہ کرنے کی وجہ پوچھی تھی۔ عمائم نے جلے کٹے انداز میں بتایا۔

ابھی تک دماغ سلگ رہا تھا۔ تیور برہم تھے۔
''آپ نے سنا نہیں دادی......! احتشام ابھی سے بدشگونی کی بات کر رہا تھا۔ کہتا ہے منگنی چلے گی نہیں۔'' وہ غصے سے بولی۔
''تو کیا غلط کہتا ہے؟'' ان کا انداز مبہم تھا۔ عمائم کے خاک بھی پلے نہیں پڑا۔ پھر وہ خود ہی دوبارہ سے بول پڑیں۔ ویسے ان کا انداز بھی عجیب تھا۔ ان کے جملے میں سوال تھا یا یقین......؟ عمائم ہونق سی ہو گی۔ دادی کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں۔
''اور مجھے دادی نہ کہا کرو......'' ان کی اگلی بات نے عمائم کا دل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ٹوٹ کر بکھر سی گئی۔ دادی نے اس کا بازو دبوچ کر قریب بٹھایا۔ ''میں تمہاری نانی ہوں، مجھے نانی کہا کرو......'' ان کی سرگوشی نے عمائم کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ سنجیدہ تھیں اور بڑی محبت سے کہہ رہی تھیں۔ ایسی محبت جو آج سے پہلے عمائم نے نہیں دیکھی تھی۔
''نانی......!'' اس لفظ میں ایسی مٹھاس تھی کہ عمائم کو اپنی زندگی کی ساری تلخیاں گھلتی، پگھلتی اور ختم ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کے اندر ٹھنڈک سی اتر آئی تھی۔ جلتے دل کو قرار سا مل گیا۔ یوں لگا، آبلہ پائی کا ایک سفر کسی انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔
صرف ایک لفظ کی مٹھاس نے عمائم کو سرتا پا بدل دیا تھا۔ اسے لگا، رشتے کے ایک حوالے نے سارے جہان کے سامنے عمائم کو معتبر کر دیا ہے۔ اسے اپنا آپ پہاڑ کی طرح لگا۔ جو سنگلاخ زمین پر جما ہوا تھا۔ اپنی جگہ پر کھڑا تھا اور اسے کوئی ہلا نہیں سکتا تھا۔ کوئی اپنی جگہ سے کھسکا نہیں سکتا تھا۔ کوئی ٹھوکر سے اڑا نہیں سکتا تھا۔ لفظ ''نانی'' نے اس کے لیے بہت سے رشتوں میں آسانیاں... کر دی تھیں۔ آج سے پہلے عمائم کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔ وہ رشتوں کو اسی حوالے سے دیکھتی تھی، انہی ناموں سے پکارتی تھی جو زبان زدعام تھے۔ اس کے لیے کوئی خاص رشتہ سرے سے نہیں تھا۔ نہ اس کی ماں تھی نہ باپ، نہ کوئی بہن، بھائی، نانی، دادی کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اسے بتایا گیا تھا کہ وہ لاوارث ہے۔ لے پالک ہے، تائی امی نے اسے کسی سے گود لیا تھا۔ یوں وہ اسی گھر میں پلی بڑھی تاہم اس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ عمائم اسی احساس کے ساتھ جوان ہوئی تھی۔ اسی کرب کو اندر بسائے بڑی ہوئی تھی۔ اسی اذیت کے ساتھ عمر رواں کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ لیکن آج کے دن کچھ اچھوتا ہوا تھا۔ اس کے لیے رشتوں کی وضاحت کر دی گئی تھی۔
یہ سفید براق بالوں والی بوڑھی عورت جو دنیاداری کے جھمیلوں سے الگ خود کو مصروفیت کی آڑ میں چھپائے پچھلے صحن میں بسیرا کیے رکھتی تھی۔ دراصل ایک سربستہ راز کی گانٹھ اندر اتارے خود کو زمانے کی نگاہ سے پوشیدہ کیے ہوئے تھی۔ عمائم جان گئی تھی۔ اس بوڑھی عورت کی بڑی، بڑی بادامی آنکھوں میں کوئی کرب انگیز کہانی تیر رہی ہے۔ وقت دبے قدموں زرد دھوپ کی طرح پھسلنے لگا۔ سے گزرنے لگا۔ عمائم کسی موم کی طرح پگھلتی ہوئی اس بوڑھی عورت کے قدموں میں دوزانو بیٹھ گئی۔ اس کے تھرتھراتے ہاتھ ان کے پیروں پر جمے تھے۔ انہوں نے چونک کر عمائم کو سنہری فریم والی عینک کے عدسوں سے دیکھا۔ وہ نہ بھی دیکھتیں تو انہیں عمائم کے دل پر گزرتی قیامت کا علم تھا۔ ان کے انکشاف نے عمائم کو بھربھری ریت کی طرح بکھرا دیا تھا۔ وہ جانتی تھیں یہ انکشاف ایسا معمولی نہیں کہ عمائم صبر سے سن کر خاموش رہتی، وہ بہت سے سوال بھی اٹھا سکتی تھی۔
ان کے قبل از وقت انکشاف نے عمائم کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس کے دل پر گزرنے والی ہر قیامت سے باخبر تھیں۔ وہ اس کے زرد چہرے پر بکھرے سوالوں سے ڈر رہی تھیں۔ وہ خود بھی ایک قیامت کے اثر سے گزر رہی تھیں۔

''آپ میری حقیقی نانی ہیں کیا؟'' اس کے کپکپاتے لہجے میں کچھ ایسے کانچ ٹوٹ رہے تھے جو ایک، ایک کر کے ان کی بھنبوڑی روح میں پیوست ہو گئے۔ عمائم کے سوال نے انہیں تھرتھرا ڈالا تھا۔ لیکن وہ عمائم کو کچھ بتا کر پچھتا ہرگز نہیں رہی تھیں۔ انہوں نے جو کہا تھا، ٹھیک کہا تھا۔ بقائمی ہوش و حواس..... کہا تھا۔ وہ مکرنے کا اور نظر انداز کر کے عمائم کی آنکھوں میں کرب پگھلانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔

''ہاں۔'' ان کے کپکپاتے ہاتھ آگ کے ڈوڈے چھیل رہے تھے۔

وہ اس انکشاف پر سجدہ ریز ہو رہی تھی۔ خدا کتنا رحیم تھا۔ جو لاوارثوں کے وارث بنا ڈالتا تھا۔ جو یتیموں، مسکینوں کو رشتوں کی لڑیوں میں پُرو کر معتبر کر دیتا تھا۔

''تیرے لیے عمائم! تیری روح کے سکون، خوشی اور تیرے اندر کے اضطراب کے خاتمے کی وجہ سے بتا رہی ہوں..... میں تیری بدنصیب ماں کی ماں ہوں..... اسی کی طرح بدنصیب، یہ انکشاف خود تک محدود رکھنا کسی کو بتانا مت کہ میں نے تمہیں کچھ بتا دیا ہے۔ ورنہ یہ لوگ تلواریں اٹھالیں گے، کمانیں سیدھی کر لیں گے، چین و سکون تباہ کر دیں گے۔ تمہارا جینا حرام کر دیں گے کیونکہ تمہارے نانا نے ان سب کو قسم دے رکھی ہے۔ سب نے پچھلے حوالے کو دفن کر کے تمہیں لے پالک سمجھ... کر اس گھر میں جگہ دی تھی۔ تمہارے نانا کی قسم تھی کہ کوئی عمائم کو یہ نہیں بتائے گا۔ اس کا کیا تعلق ہے ہمارے ساتھ..... یا اس گھر کے ساتھ..... بائیس سال پہلے جو کچھ ہوا، وہ دفن کر دیا گیا۔ کوئی گڑے مردے نہیں اکھاڑے گا۔ عمائم کی پرورش نازوں سے ہوگی اور اسے شہزادیوں کی طرح ہی رخصت کیا جائیگا۔ پچھلے باب بند ہیں تو بند ہی رہیں گے۔ عمائم میری بچی اس بوڑھی کے حال پر رحم کھا کر مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ بس اتنا سمجھ لو، پرانے حوالے ایسی غلیظ کتاب کا باب تھے جنہیں کھولیں تو گندگی سے لتھڑ جائیں۔ میں تیری روشن پیشانی داغدار نہیں کرنا چاہتی۔ تو میرے قلب کا سکون ہے، کیا یہ کافی نہیں..... تو میری نگاہ کے سامنے ہے، اپنے نانا اور تائی کا سر بلند کر دیا..... وہ عورت جس... کی گود میں تو نے پرورش پائی..... وہ ہی تمہاری ماں ہے، اس کا سر کبھی نہیں جھکنے دیا..... بیٹیوں کو تو عمائم جیسا ہونا چاہیے۔ دشمن بھی مثالیں دیں..... پاکیزہ، مقدس، فرمانبردار، دیکھیں تو آنکھ ٹھنڈی ہو جائے، سوئیں تو دل سکون کے احساس سے لبالب بھرا ہو، اس گھر میں کوئی تم سے محبت نہیں کرتا، مجھے سب خبر ہے، نہیں کرتے تو نہ کریں۔ ہم تو ہیں ناں..... تمہیں ہمیشہ چاہنے والے، تم میری دعاؤں کے حصار میں ہو عمائم..... ! تجھے آنچ بھی نہیں آئے گی۔'' نانی کی آواز میں کرب چھلکے کھا رہا تھا۔ ان کی گدلی آنکھوں سے موتی سیلِ رواں کی طرح بہہ رہے تھے۔ عمائم جانتی تھی وہ درد کے ڈونگے سمندر سے گزر رہی ہیں..... جہاں پل، پل ڈوبنے کا خطرہ تھا۔ جہاں پل، پل غرق ہونے کا دھڑکا تھا۔

''مجھ سے وعدہ کر عمائم! کبھی پچھلے نصاب کھولنے کی ضد نہیں کرو گی؟ کبھی اس کہانی کو پڑھنے کی کوشش نہیں کرو گی؟ جسے صدیوں سے دریا برد کر دیا گیا۔'' نانی نے اس کا زرد، بے روح چہرہ دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں بھر کر چوم لیا تھا۔ پھر اسے دونوں بازوؤں میں بھر کر خود میں سمیٹ لیا۔ وہ ان کی محبت بھری خوشگوار ممتا سے لبریز گود میں تڑپ، تڑپ کر ایسے روئی کہ سالوں کا درد، کرب، اذیت کثافت کی صورت میں آنکھوں اور دل سے اتر کر بہہ گیا۔ اس کی بلکتی روح سکون میں ڈھلنے لگی۔ پیاسا دل سیراب ہوتا رہا۔ ممتا کی ایسی ہمک تائی امی کے بعد نانی کی آغوش سے سمیٹ کر وہ عمر بھر کے لیے شانت ہو گئی تھی۔

صرف ایک محبت بھرے معتبر حوالے نے اسے عمر بھر کے لیے پُرسکون کر دیا تھا۔ اگر اس کی پیاری نانی عمائم سے وعدہ لے رہی تھیں تو عمائم کیسے دو قدم پیچھے ہٹ جاتی۔ ان کا دل توڑ دیتی۔ انہیں شرمندہ کر دیتی؟ کیا یہ کم تھا انہوں نے اسے عمر بھر کے لیے معتبر کر دیا تھا۔ اب وہ ماہم کے سامنے سر جھکا کر نہیں سر اٹھا کر چل سکتی تھی۔ امو اور

ماما کی نظروں کا سامنا کر سکتی تھی۔ اس کے اندر آن کی آن میں اعتماد کی دیوار اٹھ کھڑی ہوئی۔
''میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں...... جب تک خود بخود حقیقت آشکار نہ ہوئی، میں کوئی سوال نہیں اٹھاؤں گی۔ ماضی کی دھول سے اپنی ماں کے گم شدہ نقش تلاش نہیں کروں گی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں، یہ بات یہیں دفن کرتی ہوں......'' عمائم نے نانی کے دونوں ہاتھ باری، باری چوم لیے۔ انہیں آنکھوں سے لگالیا۔ اس کے اندر سکون کی لہریں اترنے لگی تھیں۔
''تجھے زندگی میں کوئی دکھ، کوئی اذیت، کوئی تکلیف چھو کر بھی نہ گزرے۔ تجھے زمانے بھر کی خوشیاں ملیں...... ابھی تیرے لیے آزمائش کے دن ہیں، چپکے سے گزر ہی جائیں گے۔ آنے والا موسم بڑا دلفریب ہوگا، دیکھنا عمائم......!'' ان... کی محبت بھری آواز میں تجربوں کا اسم بول رہا تھا۔ عمائم ان کی بات کے اندر تک اتر گئی تھی۔ وہ مستقبل قریب کی کسی آزمائش کا ذکر کر رہی تھیں۔ عمائم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔
''نانی امی! آپ ایمان کی بات تو نہیں کر رہیں؟'' اس نے اضطراب بھرے لہجے میں جلدی سے پوچھا تھا۔ وہ اس کی بے قراری کو سمجھ کر سر ہلا گئی تھیں۔
''ایمان میں کوئی کمی نہیں...... لیکن وہ اپنی ماں کی محبت میں بندھا ہے۔ کچھ ایسی مجبوریاں ہیں، جن سے کبھی وہ نکل نہیں سکتا۔ تمہارے نانا نے اس کی ضد پر منگنی کا اعلان تو کر دیا ہے لیکن یہ ایمان کے لیے ایک آزمائشی دور ہوگا۔ تمہارے نانا دیکھنا چاہیں گے کہ وہ کس قدر مستقل مزاج ہے، ایسے تو اپنی عمائم کو کسی حوالے نہیں کر سکتے...... جو ماضی میں غلطیاں ہوئیں اب کے دُہرانے کی سکت نہیں......'' انہوں نے عمائم کو اتنے اچھے طریقے سے سمجھایا کہ وہ سمجھ کر نانا کی دوراندیشی اس کے لیے چاہت اور محبت کی قائل ہوگی۔ جن دو لوگوں کو عمر بھر سے چپکے، چپکے دیکھنا عمائم کا مشغلہ رہا تھا۔ وہ دونوں بھی عمائم کے وجود سے غافل نہیں تھے۔
''کیا سمجھتی ہو؟ آک کے ڈوڈوں سے روئی کھینچتے، السی چھنتے، مربے بناتے، اچار ڈالتے، کشن اُدھیڑتے، سویٹر بُنتے، تکیے سلائی کرتے کوئی روشن دان سے دیکھے، کھڑکیوں میں جھانکے، درزوں میں آنکھیں گھسائے اور میں ایسی نادان کہ سمجھوں ہی نہیں...... یا تمہارے نانا مسجد جاتے، نماز کے لیے نکلتے، اندر، باہر آتے جاتے چپکے، چپکے دیکھنے والی گرم محبت بھری نگاہوں سے غافل رہ سکتے تھے؟ یہ محبت کی گرمی بڑی تپش رکھتی ہے عمائم! دلوں کو پگھلا کر موم بنا ڈالتی ہے۔ میں بھی موم بن گئی اور تمہارے نانا موم کی بتی...... جو جلتی بھی ہے اور روشنی بھی دیتی ہے۔'' انہوں نے عمائم کی پھیلی ہوئی حیران آنکھوں میں جھانک کر محبت سے کہا تو وہ بے ساختہ چوری پکڑے جانے پر جھینپ گئی تھی۔
''تو آپ جانتی تھیں کیا؟ پھر بھی مجھے کبھی نہیں جتایا؟ میں آپ سے کبھی شکوہ نہیں کروں گی۔ آپ نے میرے بیکار وجود کو مالا مال کر دیا ہے۔ میں اس مہربانی پر پچھلی ساری تکلیفیں بھول سکتی ہوں۔'' عمائم پھر سے نانی کے وجود سے لپٹ گئی تھی۔ ابھی بہت وقت درکار تھا۔ ماضی کے بادباں کھلنے کا، پرانے قصے گرد دھول سے جھاڑنے کا۔ پھر بھی ایک اطمینان تو تھا ہی...... زیادہ دیر نہیں تھی جو ایک، ایک کہانی سامنے آجاتی۔ کچھ بھی پس پردہ نہ رہتا۔
''ہم تم سے کبھی غافل نہیں رہے عمائم......! یہ بدگمانی کبھی ذہن میں آنے نہ دینا۔'' انہوں نے محبت سے کہا تھا۔
''میں آپ سے بدگمان نہیں ہوں نانی امی!'' عمائم نے دوبارہ سے اُن کے کپکپاتے ہاتھ چوم لیے تھے پھر کچھ سوچ کر بات بدلتے ہوئے بولی۔ دراصل وہ اپنی کشمکش کو ایمان کے حوالے سے ختم کرنا چاہتی تھی۔
''آپ ایمان کے ساتھ میری منگنی پر خوش ہیں؟'' عمائم نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ اجنبیت کا پردہ ہٹا تو اپنائیت سارے حجاب گرا گئی تھی۔ وہ ایسے ان کی رائے معلوم کر رہی تھی جیسے قرنوں سے دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو بانٹ رہی تھیں۔ وہ عمائم کی بات سن کر لمحہ بھر کے لیے چپ کر گئیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک عکس لہرایا تھا۔ جو ایمان

کا نہیں تھا...... بعض خواہشیں ادھوری بھی تو رہ جاتی ہیں ......انہوں نے گہری سانس کھینچ کر کہا۔
''تمہارے نانا کے کسی فیصلے کے سامنے میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ لیکن اتنا گمان ہے مجھے۔ وہ تمہارے لیے کچھ غلط نہیں سوچیں گے۔'' ان کی آنکھوں میں ماضی کی کوئی پرچھائی بکھر رہی تھی۔ انہوں نے سر جھٹک کر ماضی کی کسی یاد سے پلو چھڑوایا۔ پھر عمائم کے چہرے کو پیار سے دیکھنے لگیں۔
''تم پریشان نہ ہو...... اللہ بہتر فیصلہ کرے گا...... جو بھی ہوا بہتری کے لیے ہوگا......'' ان کی ڈھارس نے عمائم کو مطمئن کر دیا تھا۔ ایمان اور امو کے حوالے سے سارے وسوسے گرا کر وہ چین کی بانسری بجاتی، دل میں نئے، نئے احساس کے ساتھ اٹھ گئی تھی۔ یہ احساس نانی کی محبت اور ان کی نسبت کے سبب دل کو ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔
وہ کسی کے گندے خون کا نتیجہ نہیں تھی۔ وہ کسی کے گناہ کا ثمر نہیں تھی۔ وہ لاوارث نہیں تھی۔ یہ گھر اس کے وارثوں کا تھا۔ اس گھر کے افراد اس کا ''حوالہ'' تھے۔ چاہے دل سے تسلیم کرتے یا نہ کرتے؟ وہ عمائم کے وجود کی نفی بھی نہیں کر سکتے تھے۔
اسے نہیں پتا تھا کہ اس کی ماں کون سے ''گناہ'' کی پکڑ میں اپنے قبیلے سے دھتکاری گئی تھی۔ وہ کس جرم کی پاداش میں راندی گئی تھی۔
وہ کس عظیم زیادتی کی بدولت اپنے خاندان سے منہ چھپا کر ماضی کی دھول کا حصہ بن گئی تھی۔ یہ باب ماضی کے کتابچوں میں ''بند'' تھا۔

☆☆☆

نانی نے کہا تھا، میں نے جو کچھ بتایا ہے اسے خود تک محدود رکھنا...... عمائم کو راز کی حفاظت کرنی آتی تھی۔ سو یہ راز اس کے دل کی تہوں میں اتر گیا تھا۔ لیکن ایک عجیب بات ضرور ہوگئی تھی۔ اس کی خوشی رانگ کالر تک ضرور پہنچ گئی ...... جانے اس کے پاس ایسا کون سا حساس سسٹم تھا جو اسے عمائم کے دل کی خبر سے آگاہ کر دیتا۔ جانے وہ کس قسم کا میٹرولوجسٹ تھا جسے عمائم کے دل کی ہر کیفیت اور موسم کی خبر ہوتی تھی۔
وہ اس وقت حیران رہ گئی...... جب رانگ کالر کے میسج چلے آئے۔ عمائم کو کافی عرصے بعد اس کا میسج ملا تھا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کھول کر دیکھا۔ جیسے، جیسے میسج کھول کر پڑھتی گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑتے گئے۔ یہ ایک عجیب پہیلی تھی۔ لگتا تھا اخباری میگزین سے کاٹ کر اسے لکھ بھیجی تھی۔ عجیب بد دماغ آدمی تھا، حیران کن قصے لکھ کر بھیج دیتا۔ محض دماغ کو الجھانے کے لیے تاکہ عمائم کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دے۔ اس کا سارا خوشگوار موڈ کثیف ہوتا چلا گیا تھا۔ پیشانی پر ناگواری کی سلوٹ ابھر آئی۔ اس نے اسکرین روشن کر کے میسج دوبارہ پڑھا۔
''ایک اطالوی موسیقار کے لیے دو باتیں مشہور تھیں۔ ایک اس کی بدصورتی اور دوسرے خواتین کے لیے اس کا محترم رویہ...... ایک مرتبہ وہ اوپیرا کے لیے ریہرسل کروا رہا تھا جس میں اطالوی جوان ساز بجا رہا تھا اور ایک امریکی لڑکی گا رہی تھی۔ وہ بار بار بے سُری ہو جاتی تھی۔ موسیقار کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ مگر وہ اپنی عادت سے مجبور صنفِ نازک کے لیے سخت کلمہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ زیرلب بڑبڑایا۔ ''کرسٹوفر کولمبس پر لعنت ہو، جس نے امریکا دریافت کیا۔'' میسج کو سہ بار پڑھ کر اس نے غصے میں جھنجلا کر پھر سے اگلا میسج کھول لیا تھا۔ مزید طنزیہ لکھا تھا۔
''کیا سمجھیں......؟'' عمائم کو واضح طنز محسوس ہو گیا۔ اس نے غصے میں زیرلب بڑبڑا کر کہا۔
''کچھ بھی نہیں......'' اسے میسج بھیجنے والے پر بے طرح غصہ آ گیا تھا۔ حالانکہ یہ آدمی کبھی نازیبا کلام نہیں بھیجتا تھا۔ نہ کبھی فحش گفتگو کرتا...... بس پہیلیاں لکھ، لکھ کر بھیجتا۔ اور ان پہیلیوں میں عمائم کے لیے رہنمائی کا کوئی نہ پہلو ضرور ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک اور میسج آیا۔

''تم کہاں سمجھو گی......؟ ایک، ایک بات کھول کر سمجھانا پڑتی ہے۔'' مسکراتے سمبل کے ساتھ جیسے عمائم کو چڑایا گیا تھا۔

''کرسٹوفر کولمبس پر لعنت ہو جس نے امریکا دریافت کیا۔ امریکا ہوتا نہ امریکی گلوکارہ کے بے سُرے پن کو اطالوی موسیقار برداشت کرتا...... ٹھیک اسی طرح فساد کی جڑ ہوتی نہ فساد ہوتا۔ بانس ہوتا نہ بانسری بجتی۔ نہ تمہاری اچھائی ہوتی نہ ایمان تمہاری طرف متوجہ ہوتا...... ایمان کو تم سے محبت نہیں...... وہ تمہاری پرسنالٹی کا اسیر ہے۔ تمہاری اچھائی اور نیک دلی سے متاثر ہے۔ سو اس کی نگاہِ انتخاب تم پر ٹھہر گئی۔ اس نگاہ کو تم ہٹا سکتی ہو......'' میسج کیا تھا ایک لپکتا شعلہ تھا، عمائم تو سرتاپا ہل کر رہ گئی تھی۔ آخر یہ کیا بکواس تھی؟ اس کا دماغ جھنجنا گیا۔ یہ کون تھا جو دوربین سے اس کا مطالعہ کر رہا تھا؟ اس کی زندگی پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اسے بڑے دھیان سے سرچ کر رہا تھا۔ وہ بھونچکی رہ گئی پھر اس نے جلبلا کر ریپلائی لکھا۔

''لیکن میں کیوں اس کی نگاہ کو ہٹاؤں......؟'' اس نے بڑے برہم انداز میں میسج ٹائپ کیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی ریپلائی آ گیا۔ اس نے بے چینی سے کھول کر دیکھا تھا۔

''ہٹانا تو پڑے گا...... کیونکہ ایمان خوب صورت، برسرِ روزگار اور فنانشلی اسٹرانگ تو ہے لیکن معاملہ فہم، سمجھدار اور دور اندیش ہرگز نہیں...... وہ جذباتی طور پر اور اعصابی طور پر اتنا مضبوط بھی نہیں...... جبکہ تمہیں کسی ایسے شخص کا ہاتھ تھامنا چاہیے جو بہت ''دوررس'' ہو۔ معاملے کی تہوں میں اترنے والا۔ بلا کا حاضر جواب، عقل مند، دانش ور جو دلیل دے کر فیصلے اپنے حق میں کرنے کا فن رکھتا ہو...... جسے دوسرے کو قائل کرنا آتا ہو...... جو خطروں سے لڑنا جانتا ہو......'' پورا میسج پڑھ کر وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ بظاہر تسلیم نہ بھی کرتی پھر بھی یہ باتیں دل کو لگتی تھیں۔ اس نے ایمان کی شخصیت کا تجزیہ بھی بہت خوب کیا تھا۔ عمائم نہ چاہتے ہوئے بھی قائل ہو گئی تھی لیکن اس کے سامنے بھلا کیوں مانتی۔

''میں منگنی کروانے جا رہی ہوں...... کسی محاذ پر جنگ کرنے نہیں......'' اس نے بھنّا کر ٹائپ کیا تھا، کچھ دیر میں ہی جواب آ گیا۔ آج وہ خاصا فرصت میں تھا، تبھی جواب جلدی، جلدی لکھ رہا تھا۔

''یہ منگنی بھی کسی محاذ سے کم نہیں...... مجھ سے لکھوا لو طبلِ جنگ بس بجنے ہی والا ہے۔'' بڑے مزے کے ساتھ عمائم کو باور کروا دیا گیا تھا۔ وہ لمحوں میں سُن ہو کر رہ گئی تھی۔ اس سے جواب لکھا ہی نہیں گیا۔ جو وسوسے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر پنپ رہے تھے وہ وہم اور خدشے اس اجنبی تک رسائی کیسے کر گئے تھے؟ وہ سر تھام کر بیٹھی رہ گئی تھی۔ کافی دیر تو وہ گہری سوچ میں بیٹھی رہی مگر پھر نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ آنکھ کھلی تو اذان کی آواز سے اس نے سرعت سے اٹھ کر وضو کیا نماز ادا کی اور پھر قرآن پاک کھول کر خوش الحانی کے ساتھ ترجمہ پڑھنے لگی۔ اس کی اضطرابی کیفیت ہٹتی رہی۔

اب وہ مطمئن ہو چکی تھی۔ کیونکہ قرآن کی ایک آیت ابھی تک اس کے ذہن میں روشن تھی۔

''جو کچھ ہماری تقدیر میں لکھا جا چکا ہے وہ مٹ نہیں سکتا۔ اور انسان تقدیر بدلنے پر قادر نہیں...... ہر اچھائی اور برائی اللہ کی طرف سے ہے، پس تو پہنچنے والی تکلیف پر صبر کر۔ کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' عمائم اندر تک ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مسئلے کا حل ملا تھا یا نہیں...... لیکن وہ پُرسکون ضرور ہو گئی تھی۔ اس سکون میں کنکر تب گرا تھا۔ جب ثریم کی کال آئی۔ اتنی سویرے ثریم کی کال آتی نہیں تھی۔ وہ قدرے پریشان ہو گئی۔ ویسے بھی کرن کے گھر سے آنے کے بعد ثریم سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ کیونکہ وہ کرن کے گھر ہی موجود تھی۔ ابھی تک جامعہ نہیں آ رہی تھی۔ ان کے گھر تعزیت کے لیے مہمانوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔

عمائم نے کال پک کی تو ثریم کو بڑا پریشان پایا...... وہ گھٹ، گھٹ کر رو رہی تھی۔ اور شدید گھبراہٹ کا شکار تھی۔ پھر اس نے عمائم کے بار، بار پوچھنے پر بالآخر بتایا۔ عمائم نے بمشکل اسے چپ کروایا تھا۔ کیونکہ اس کی سسکیوں میں کچھ بھی سمجھنا آسان نہیں تھا۔ ''میں بڑی اذیت میں ہوں، ایسی شدید تکلیف ہے جس کی اذیت کم نہیں ہو رہی عمائم......'' اس کی سسکیاں اب بھی مسلسل گونج رہی تھیں۔ عمائم نے اسے ٹوک کر بے ساختہ کہا۔

''پہلے پانی پی کر آؤ، منہ دھوؤ، تھوڑا خود کو پُرسکون کرو۔ میں تمہاری ساری بات ضرور سنوں گی۔ مگر پہلے ریلیکس تو کرو......'' عمائم کے ملائم انداز پر ثریم اسے ہولڈ پر رکھ کر منہ دھونے چلی گئی تھی۔ پھر شاید اس نے پانی بھی پیا تھا۔ اور قدرے سنبھل کر اکھڑی سانسوں کو رواں بھی کیا۔ کافی دیر بعد ثریم کی پہلے سے نسبتاً ہلکی مگر رواں آواز سنائی دی تھی۔ اب وہ قدرے حوصلے میں تھی۔

''عمائم! ہمارے اندر ایک برقی سرکٹ موجود ہوتا ہے، ایسا برقی سرکٹ جس میں عام روٹین کے دوران کرنٹ نہیں ہوتا۔ یہ تکلیف نہیں دیتا، نہ اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ یہ عموماً خاموش رہتا ہے۔ اس میں کرنٹ تب دوڑتا ہے جب ہم معمول کی سیدھی زندگی سے کچھ ہٹ کر غیر معمولی، منفی کام کرتے ہیں۔ جیسے کسی کو دھوکا دینا۔ جیسے کسی کا دل دکھانا۔ کوئی چوری کرنا، کسی کو دکھ میں مبتلا کرنا...... جھوٹ بولنا، کچھ ایسا چھپانا جسے بتا دینا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ جب ہم ان الجھنوں میں پڑتے ہیں تو اندر موجود برقی سرکٹ اپنا کام دکھانے لگتا ہے۔ وہ ہمیں کرنٹ مارتا ہے، شاک دیتا ہے، جھٹکے مارتا ہے، وہ رات، دن ہمیں بے چین رکھتا ہے۔ تم جانتی ہو عمائم...... اس برقی سرکٹ کا نام کیا ہے؟'' ثریم بھیگی آواز میں نان اسٹاپ بول رہی تھی۔ اس کی سانسیں دھونکنی کے مانند چل رہی تھیں۔ عمائم کو وہ قطعاً حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

''عمائم اس برقی سرکٹ کو ضمیر کہتے ہیں۔'' عمائم کے بولنے سے بھی پہلے وہ کپکپاتی آواز میں شروع ہوگئی تھی۔

''میں اب اسی ضمیر کے کچوکوں کا شکار ہوں۔'' وہ تڑپ، تڑپ کر رو دینے کو تھی۔ عمائم جیسے بھونچکی رہ گئی تھی۔ ابھی وہ کچھ بولنے کے لیے زبان کھولنا چاہتی ہی تھی جب ثریم پھر سے بول اٹھی۔

''تم میری بات کیسے سمجھ سکتی ہو...... میں تمہیں تفصیل بتاتی ہوں۔ میں اس رات بڑی پریشان تھی۔'' اس نے بے قراری میں کہنا شروع کیا۔ نہ جانے وہ کس رات بڑی پریشان تھی؟ عمائم کے پلے کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔ تاہم وہ ثریم کی بات بڑے دھیان سے سن رہی تھی۔ کیونکہ اس کی باتوں میں بڑا غیر معمولی پن تھا۔

''میرا دل بڑا گھبرا رہا تھا تو میں ممی کو بتا کر کرن کے گھر چلی آئی تھی۔ ہم دونوں کا گھر ایک ہی اسٹریٹ پر ہے ناں کرن جب سے واپس آئی تھی۔ میرے ساتھ اس کی کافی انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی تھی۔ وہ بھی اکیلی تھی میں بھی۔ سو ہم دونوں کی بڑی اچھی دوستی ہوگئی۔ یوں کرن میرے ساتھ ایڈجسٹ کر گئی تھی۔ وہ اکثر جامعہ بھی چلی جاتی۔ نورس سے بھی ملتی۔ کرن، نورس کو آئیڈیلائز کرنے لگی تھی۔ نورس بھی کرن کو بہت پسند کرتی تھی۔ ارے میں بھی کیا بولنے لگی۔ ہاں بات تو اس رات کی ہو رہی ہے، جب میرا دل بڑا پریشان تھا۔'' ثریم کئی دفعہ بے ربط ہوئی۔ بہت دفعہ گفتگو کے دوران اس کی زبان لڑکھڑائی تھی۔ پھر بھی وہ بے چینی سے بولتی رہی۔ اس کے اندر نہ جانے کیا تھا؟

''میں کرن کے گھر پہنچی تو اس کی مما بڑی پریشان تھیں۔ وہ میری رشتے کی پھپو ہیں ناں۔ اور کرن کے حوالے سے بھی ہم دونوں فیملیز ایک دوسرے کے قریب ہیں سو پھپو کی پریشانی نے مجھے بھی بے چین کر دیا کیونکہ میں جانتی تھی کہ کرن اپنی کچھ فرینڈز کے ساتھ کانسرٹ میں گئی تھی۔ اس وقت تک واپس نہیں آئی تھی، رات کا دوسرا پہر اسٹارٹ تھا۔ پھپو بہت پریشان تھیں۔ وہ جگہ، جگہ فون کالز کر رہی تھیں لیکن کہیں سے کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔ ہم تین گھنٹے خوار ہوتے رہے، جگہ، جگہ فون کرنا بھی بدنامی تھی۔ لوگ کیسے، کیسے سوال کر رہے تھے۔ پھر اللہ، اللہ کر کے

کرن کے نمبر پر کال لگ ہی گئی تھی۔ میں تب ٹیرس پر تھی اور بار، بار مختلف فرینڈز کو میسجز کر رہی تھی۔ ہاں تب ہی میری نگاہ سامنے اسٹریٹ پر چمکتی ہیڈ لائٹس پر پڑی۔ گھر سے کچھ ہی فرلانگ کے فاصلے پر کرن کی گاڑی کھڑی تھی۔ مزید پانچ منٹ لگتے تو وہ گھر میں موجود ہوتی۔ لیکن وہ پانچ منٹ آئے نہیں۔ اس کی رکی گاڑی میں کوئی سوار ہوا تھا۔ وہ کوئی کون تھا بھلا...... میں آنکھ بند کر کے بھی پہچان سکتی ہوں۔ وہ سفید گاؤن والی کوئی خاتون تھی۔ جس کا چہرہ اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ وہ ونڈو میں جھک کر کرن سے کچھ بولی تھی۔ شاید لفٹ کی بات کر رہی تھی یا پھر کرن کو ڈرتے، ڈرتے جامعہ ڈراپ کرنے کے لیے اصرار کر رہی تھی۔ میں اب بھی پورے وثوق سے کہتی ہوں عمائم...... کرن نے اس رات جس عورت کو لفٹ دی تھی۔ وہ کوئی اور نہیں، نورس ہی تھی۔'' ثریم نے جیسے دھماکا کیا تھا۔ عمائم کے ہاتھ سے موبائل گرتے، گرتے بچا تھا۔ وہ چکر کھا کر رہ گئی۔ اسے امید ہی نہیں تھی کہ ثریم کی اتنی لمبی بات کا اختتام ''نورس'' پر ہوگا۔ اسے اچانک کرن کے گھر اس کی مما سے عالی کے سوال یاد آ گئے تھے۔ عالی نے جو کہا تھا اور اس کی مما نے جیسے جواب دیے تھے ان میں اتنی مماثلت تھی کہ عمائم دنگ رہ گئی تھی۔ عالی کے ان سوالوں کے پیچھے کیا لاجک تھی؟ عمائم کچھ نہیں جانتی تھی تاہم اس وقت وہ عجیب سے ایک خوف کا شکار ہوگئی تھی۔

''میں تب ڈر گئی تھی عمائم! مجھے خوف آ رہا تھا، میں نے کسی کو یہ بات نہیں بتائی۔ اور پھر کرن مر گئی، وہ واپس نہیں آسکی۔ اور میں مرنا بالکل نہیں چاہتی۔'' ثریم نے بکھرے لہجے میں آزردگی سے بتایا تھا۔ وہ بمشکل سنبھل سکی تھی۔ ''میں نے بڑا سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے تمہیں سب بتانے کا کیونکہ میں ضمیر کی چبھن سے عاجز آ چکی تھی عمائم......'' اس نے سسکتے ہوئے بتایا تھا۔

''کرن جب نورس کو ڈراپ کرنے گئی اور واپس نہیں آسکی۔ میں یہ بات پھپھو کو بتا نہیں سکی تھی۔ میں بہت ڈر گئی تھی عمائم! لیکن اس دن عالی کے سوالوں نے میرے خوف کو بڑھا دیا۔ پھر پھپھو بھی اتنا جانتی تھیں کہ کرن نے اس رات کسی کو لفٹ دی تھی۔'' ثریم نے گہری سانس کھینچ کر اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ وہ خود اپنے ضمیر کے بوجھ سے آزاد ہو کر اس کے ضمیر کو بوجھل کر چکی تھی۔ عمائم نے اسے تسلی دی تو وہ اور بھی مطمئن ہوگئی۔ پھر ثریم نے فون بند کر دیا۔ لیکن عمائم کی سوچوں کے در بند نہیں ہوئے تھے۔ وہ سوچتی رہی کہ کرن کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کرن کنسرٹ سے جامعہ تک کیسے گئی؟ یہ تو سوچنے کا سوال تھا۔ لیکن اب گرہ کوئی نہیں رہی تھی۔ وہ نورس کو ڈراپ کرنے گئی۔ وہیں کسی حادثے کا شکار ہوگی۔ بعد میں جامعہ کے پیچھے گٹر... میں اس کی لاش پھینک دی گئی تھی۔ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ عمائم کا دماغ سلگ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ نورس سے باز پرس ضرور کرے گی۔ اور احتشام کو بھی ان انہونیوں کے بارے میں باخبر کرے گی۔ کیونکہ احتشام نے اسے بتایا تھا کہ کرن کا کیس خفیہ ڈپارٹمنٹ کے پاس ہے اور کرن کا خون رائگاں چلا جائے یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ ضمیر کے جس بوجھ کو ثریم اتار چکی تھی اب وہ بوجھ عمائم کی جان پر بطور قرض دھرا تھا۔ جسے اتارنا اس پر واجب تھا۔ اور وہ فرض چھوڑتی تھی نہ واجب۔

☆☆☆

زندگی میں بعض دفعہ سراب بھی حقیقت ہوتا ہے، نظر آئے یا نہ آئے۔ دیکھنے میں سراب کچھ بھی نہیں...... لیکن ساری زندگی انسان اسی سراب کے پیچھے بھاگتا ہے، یہ جانے بغیر کہ قریب پہنچنے پر کچھ ہاتھ آئے گا یا نہیں؟ اور بعض دفعہ تاریکی سے باہر آ کر انسان کو لگتا ہے وہ بھلے وقت میں تاریکی سے نکل آیا ہے، حالانکہ روشنی بھی ایک سراب ہے، انسان کی نگاہ کو فریب دے کر لبھاتی ہے جب وہ اس تاریکی میں بے دھڑک داخل ہو جائے تو روشنی نما سراب اسے دبوچ لیتا ہے۔ دراصل وہ تاریکی روشنی ہوتی ہے نہ سراب...... وہ نظر کا ایک فریب ہوتا ہے اور کچھ نہیں...... جس میں داخل ہو کر بھی انسان پچھتاتا ہے اور باہر نکل کر بھی پچھتاتا ہے، اسے زندگی کی بند گلی کا نام دیتے ہیں،

جہاں روشنی ہوتی ہے نہ آکسیجن...... انسان سانس لینا چاہے تو لے نہیں سکتا، مرنا چاہے تو مر نہیں سکتا۔ پھر جان حلق میں ''پھنس'' جاتی ہے، نکلتی ہے نہ رواں ہوتی ہے اور انسان کی زندگی کا سب سے بھیانک لمحہ یہی ہے۔ جب پھنسی ہوئی جان صرف آنکھ کو روشنی خیرات کرتی ہے، باطن کی ایسی آنکھ جو ''نامۂ اعمال'' دیکھتی ہے، اس اسکرین میں صرف اپنا بھیانک عمل دکھائی دیتا ہے اور انسان تب اس پل صراط سے گزرتے ہوئے سوچتا ہے کہ وہ اپنا عمل نہ دیکھتا تو اچھا تھا۔ کاش اس کی بینائی چلی جاتی یا وہ نابینا ہو جاتا اگر عمل کی اسکرین منظر بدل کر کچھ اور دکھاتی تو چلتی پھرتی اس لاش میں زندگی کی رمق باقی نہ رہتی۔ وہ خود کو زندہ لاش کہتے ہوئے کبھی نہیں ہچکچاتی تھیں۔ حالانکہ اس لاش کے پاس جینے کے ہزار بہانے تھے۔ وہ احتشام اور اذان کی ماں تھیں۔ ان دونوں کی موجودگی میں کون بدنصیب عورت ہوگی جو زندگی کو جینا نہ چاہے، سانس لیتے، دلوں کو گرما دینے والے وہ دو وجود جب چلتے تو سینے میں حرارت بڑھ جاتی۔ اس عورت کے بیٹے جو اس کا غرور تھے، مان تھے، فخر تھے، جن کے دم سے چراغ دانوں میں شمعیں روشن تھیں۔ انہیں دیکھ کر بھی اس کے اندر زندگی نہیں دھڑکتی تھی کیونکہ سانس جب وبال ہو جائے تو زندگی کا بوجھ اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے، سو وہ بھی زندگی کے پاٹ اٹھائے عمر رواں کی آتی جاتی سانسیں نبھا رہی تھی۔ کبھی کبھار باطن کی آنکھ کھلتی تو بڑے بھیانک منظر دکھائی دیتے۔ اتنے بھیانک کے وہ چیخ، چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی۔

وہ بھی ایسی بے رنگ سہ پہر تھی۔ حسبِ معمول ماضی کی چوکھٹ پر کھڑا ایک وجود بھیگی آواز میں آہیں بھر رہا تھا۔ اس کی سسکیوں نے اسے نیند سے جگا ڈالا۔ وہ چیختی ہوئی اٹھ گئی تھی۔ اس کا پورا وجود پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ وہ خوف کے مارے کمبل میں گٹھڑی بنی کراہ رہی تھی جب کوئی دروازہ کھول کر تیزی سے اندر آیا۔ آنے والا ابھی اس سے نفرت کی انتہا پر تھا کیونکہ وہ ماں ہو کر بھی اس کے لیے محبت کا سائبان نہیں بن سکی تھی پھر بدلے میں محبت اور صلہ رحمی کی توقع کیسے کرتی؟ لیکن وہ بیٹا ہو کر کٹھور نہیں بن سکا تھا۔ حالانکہ ماں کے دیے گھاؤ وہ آج تک بھول نہیں پایا تھا۔ بچپن کا ایک، ایک زخم زندہ تھا، رس رہا تھا۔ درد دیتا تھا۔ پھر بھی وہ سب کچھ بھلا کر ماں کے لیے محبت کا سائبان بن گیا۔ وہ جانتا تھا اس کی ماں بہت سالوں سے کسی ذہنی کشمکش کا شکار ہے۔ وہ کسی شدید ذہنی اذیت میں مبتلا ہے۔

احتشام انہیں اٹھا کر زبردستی اسپتال لے گیا تھا۔ وہ تین گھنٹے اسپتال میں رہیں وہ ان کے ساتھ ہی رہا تھا۔ ڈسچارج ہونے کے بعد گھر آ کر بھی کئی گھنٹے وہ ان کے پاس موجود رہا تھا۔ حالانکہ احتشام کی موجودگی میں انہیں مسلسل الجھن ہو رہی تھی۔ گو کہ وہ ماں کی دوائیوں اور آرام کے متعلق بات کر رہا تھا۔ پھر بھی وہ خفیف ہو رہی تھیں۔ بعد میں اس کیفیت سے نکل کر نظر چرا کر بولیں۔

''تم نے شادی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا...... انسان کو فیصلے میں تبدیلی کی گنجائش رکھنی چاہیے۔'' انہوں نے تھکے، تھکے انداز میں کہا تھا۔ احتشام لب بھینچ کر رہ گیا۔ ابھی ماں کی طبیعت خراب تھی۔ وہ لہجے میں تلخی نہیں بھرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اپنی شادی کے موضوع سے اسے بہت چڑ تھی۔

''شادی سے کسے سکھ ملے ہیں جو میں یہ ڈھول بجاؤں۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''ضروری نہیں...... تمہارا تجربہ بھی برا ثابت ہو۔'' انہوں نے اصرار کیا تھا...... جانے اچانک انہیں اس کی شادی کا جنون کیسے چڑھ گیا تھا۔ حالانکہ کچھ عرصے پہلے تک وہ اس کی ہر اچھائی، برائی سے مبرا تھیں۔

''اب میں محض خوش گمانی میں تو زندگی کو ڈبو نہیں سکتا۔'' احتشام کا جواب وہی تھا۔ دو ٹوک انکار میں لپٹا۔ وہ اداسی سے بیٹے کو دیکھنے لگیں۔

''کیا تم بھول نہیں سکتے؟''

''بھولنا آسان نہیں...... پھر بھی کوشش ضرور کروں گا۔'' احتشام کو ماں کا دل توڑنا مناسب نہیں لگا...... وہ بھی

اس کنڈیشن میں کہ جب وہ بیمار تھیں...... اس کی صلہ رحمی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ماں کا دل کسی بھی حال میں برا نہ کرے۔
''احتشام......! زندگی بہت وبال ہے......'' نہ جانے کس رو میں وہ بے قراری سے بول اٹھی تھیں۔ حالانکہ انہیں اپنے دل کی بات شیئر کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ اپنی جان پر ہر اذیت برداشت کر لیتی تھیں لیکن کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دیتی تھیں۔ احتشام ان کی بات سن کر ''تھرا'' اٹھا۔ اسے ماں کے لہجے میں بکھری اذیت نے..... بے قرار کر دیا تھا۔
''زندگی وبال کیوں ہے؟ احتشام اور اذان کے ہوتے ہوئے بھی وبال کیوں ہے؟'' وہ جیسے تڑپ کر رہ گیا تھا۔ ہر بات بھلا کر محض اپنی ماں کی اذیت پر مضطرب ہو گیا تھا۔
''اس لیے کہ جو اندر ''کنڈل'' مار کے بیٹھا ہے وہ چین نہیں لینے دیتا۔'' انہوں نے سہمے انداز میں احتشام کا بازو دبوچ لیا تھا۔ پھر وہ خوف کے عالم میں رونے لگی تھیں۔ اتنے دردناک انداز میں رو رہی تھیں کہ احتشام کا دل پھٹنے لگا۔
''کون......؟'' اس نے سہمی ہوئی تڑپتی ماں کو بمشکل اپنے بازوؤں میں سمیٹا...... وہ کسی طور بھی احتشام کے قابو میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس انداز میں ماں کو تڑپتے دیکھنے کا اس میں حوصلہ تھا نہ ہمت تھی اور نہ طاقت تھی۔
''وہ دھات جس پر تیزاب اثر نہیں کرتا۔'' وہ سابقہ انداز میں مچل، مچل کر کہہ رہی تھیں۔ احتشام لب بھینچ کر سوچتا رہا۔ جیسے ماں کے کرب کی گہرائی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ ان کی اذیت کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔
''پلاٹینیم......؟'' احتشام کا انداز پُرسوچ قسم کا تھا۔ انہوں نے بے ساختہ نفی میں زور، زور سے سر ہلایا۔
''نہیں...... کیا اسی دھات پر تیزاب اثر نہیں کرتا؟''
''ایک اور بھی ہے......'' احتشام جیسے ان کی تڑپ کے ہر کنویں میں اتر گیا۔ ''اور وہ ہے ضمیر......'' وہ ماں کے چہرے پر لحوں میں جمتی سرسوں کو دیکھ کر نڈھال ہو گیا۔ اس کی ماں تڑپتے ہوئے احتشام کی بانہوں میں لہرا گئی تھی۔ اور وہ بے قراری سے ماں کے رخسار تھپکتا سمجھ گیا۔ احتشام کی ماں ''ضمیر کے بھونچال کی'' زد میں تھی۔ اور ضمیر پر اترا زلزلہ بڑا...... بھیانک ہوتا ہے، جب یہ دھرتی ہلائے تو لحوں میں بڑی، بڑی عمارتوں کو زمین بوس کر دیتا ہے۔ اس کی چبھن، اس کی اذیت، اس کا درد سارا کروفر بہا دیتا ہے۔ بڑے، بڑے فرعون اس ضمیر کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں، بڑے، بڑے قارون تباہ ہو جاتے ہیں، یہ ضمیر اگر موڈ میں آ جائے تو زندوں میں چھوڑتا ہے نہ مردوں میں...... اور احتشام کے سامنے بھی ایک زندہ لاش موجود تھی۔

☆☆☆

گیلری میں ''انکھولے'' (گلگلے) کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا سو پکوان بنا کر چھٹی انجوائے کی جا رہی تھی۔ ہال میں اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔
عمائم تے گزرتے ہوئے باورچی خانے میں جھانکا تو بڑے سے پیتل کے کونڈے میں آٹے اور گڑ سے بنا شکوفے کا تھال رکھا ہوا نظر آیا تھا جو کچے دیسی گھی میں مل کر ناریل کے پاؤڈر میں گوندھ کر بناتے ہیں، بڑی مزیدار سی ڈش تھی۔ برابر والے گھر سے احتشام، اذان بُو سونگھتے چلے آتے تھے۔ عمائم کو ہال کے قریب سے گزرتے ہوئے احتشام کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ وہ لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایمان بھی ہمیشہ کی طرح چہک رہا تھا۔ آج کل اس کی ترنگ ہی کچھ اور تھی۔
دروازے کی درز تھوڑی کھلی تھی۔ سبز چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے عمائم کی گلابی شال کا پلو نظر آیا تھا۔ وہ قدرے چونک کر اٹھ گیا۔ پھر اس نے ناریل اور گڑ سے گندھی شکوفوں کی میٹھی بھری ہوئی پلیٹ اٹھالی۔ ایک ہاتھ میں چائے کا کپ لیے وہ ''ایکسکیوز می'' کہتا باہر نکل آیا تھا۔

اس کی توقع کے عین مطابق پچھلے صحن میں املی کے سوکھے پیڑ کے پاس کھڑی تھی۔ ٹنڈ منڈ سا درخت دیکھتے ہوئے وہ احتشام کو خاصی ڈسٹرب لگی تھی۔ وہ پنے تلے قدم اٹھاتا عمائم کے قریب آ گیا۔ پھر اس نے گلا کھنکھارتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ جو سر جھکائے بیٹھی تھی، زمین پر جمے دو مضبوط پیروں کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔

''لوگ منگنی سے پہلے خوشی سے ''پھدکتے'' دکھائی دیتے ہیں، یہاں الگ ہی حال ہے، ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اداس، مسافر، دکھی اور نڈھال بلبل، املی کی سوکھی ٹہنی کے نیچے سر نیہوڑائے پڑا ہو۔'' احتشام کے اپنے ہی منفرد انداز تھے، اپنی ہی مختلف منطق تھی۔ گفتگو کے طریقے بھی دل پسند تھے۔ عمائم اچھی بھلی سنجیدہ تھی۔ اس کی بات سن کر ساری سنجیدگی ہوا ہو گئی تھی۔ اس نے پہلی حیران آنکھوں میں خفگی سمو کر احتشام کو دیکھا تھا۔

''میں مینڈک تو نہیں، جو پھدکتی پھروں......'' اس نے ناراضی بھرے لہجے میں کہا۔ احتشام نے بڑی ہی سنجیدگی سے اس کی بات سنی تھی جیسے اس نے بڑا دلکش جواب دیا ہو۔

''بات تو درست ہے......'' اس نے سابقہ سنجیدگی بھرے لہجے میں عمائم کو دیکھا تھا۔ وہ گھور کر اسے رہ گئی، عمائم یہی کام کر سکتی تھی۔

''تم کیا مجھے بیوقوف سمجھتے ہو؟'' عمائم نے بھناتے ہوئے کہا تھا۔ احتشام جلدی سے بول پڑا۔

''میری ایسی مجال کیا؟'' اس کا انداز بڑا برجستہ تھا۔ عمائم اسے گھور کر رہ گئی تھی۔ لیکن یہ گھوریاں بھی بیکار تھیں۔ اس ڈھیٹ پر کیا اثر ہونا تھا۔ اپنی ہی آنکھیں الٹا دکھنے لگی تھیں۔

''اچھا ایک بات بتاؤ......'' احتشام مسکرا کر بولا۔ ''ایک ذہین آفیسر چالاک ہوتا ہے یا کوئی ان پڑھ ڈکیت مجرم......'' اس نے عمائم کی ذہانت اور عقل مندی پرکھنے کا ثبوت مانگ لیا تھا۔ عمائم نے خفگی سمو کر آنکھوں میں احتشام کو گھورا اور تڑخ کر بولی۔ وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔

''ظاہر سی بات ہے، ایک ذہین آفیسر چالاک ہوگا۔ کوئی ان پڑھ مجرم داؤ پیچ سمجھنے سے رہا...... ایک ٹرینڈ آفیسر کا مجرم کی ہوشیاری سے کیا مقابلہ......؟'' اپنے تئیں احتشام کو بڑا ٹھوس جواب دے کر وہ دونوں بازو سینے پر لپیٹ کر کھڑی تھی۔ احتشام قائل ہونے والے انداز میں بے ساختہ سر ہلاتا رہا۔ تو گویا عمائم نے اس جیسے ذہین، حاضر دماغ، چالاک اور مکار بندے کو قائل کر لیا تھا۔ احتشام نے مسکراہٹ چھپالی تھی۔ پھر بڑی معصومیت سے بولا۔

''تم نے مجھے لاجواب کر دیا ہے۔ عمائم! تم بڑی ذہین ہو، یقین کرو...... میں تم سے بہت متاثر ہوں۔'' اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس کی تعریف میں کچھ کہا تھا۔ عمائم کو بہت ہی اچھا لگا۔ وہ اندر ہی اندر بے حد خوش ہوئی، احتشام مزید بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے کان لگا کر سنا۔

''ایگزیکٹلی! تمہارا جواب درست ہے لیکن گیا کہوں...... ایک اذان اور روشان جیسا ذہین آفیسر تھا۔ ایک دن وہ ناکے پر کھڑا ہوا...... ٹرک آ جا رہے تھے، وہ ہر ایک کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس نے ایک ٹرک کو روکا، تلاشی لی اور اسے خالی پا کر بولا۔ ''میں متعجب ہوں، تم روزانہ گزرتے ہو...... اور ٹرک میں کچھ نہیں ہوتا، تم کام دھام کیا کرتے ہو؟''

''اسمگلنگ......'' ٹرک ڈرائیور نے جواب دیا۔

''لیکن مجھے کوئی چیز کیوں نہیں ملتی۔'' ذہین آفیسر زچ ہوا۔ ٹرک ڈرائیور نے آفیسر کو ایک چٹ دی۔ اور کہا...... ''اسے میرے جانے کے بعد کھولنا۔'' آفیسر نے اس کے چلے جانے کے بعد چٹ کھولی تو اس میں لکھا تھا۔ ''میں ٹرک اسمگل کرتا ہوں......'' ''اب تم بتاؤ گی...... آفیسر الو کا پٹھا ہوا یا ٹرک ڈرائیور......؟'' احتشام نچلا لب دانتوں تلے دبا کر مسکرا رہا تھا۔ عمائم کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا۔ اسے بھگو، بھگو کر مارنے میں بڑا کمال حاصل تھا۔ عمائم کا دل چاہا، املی کی سوکھی ٹہنی اتار کر اسے زور سے دے مارے......'' بدتمیز نہ ہو تو......'' وہ خفیف سی رہ گئی۔

احتشام اس کی خفت سے حظ اٹھاتا، دوبارہ بولا۔ آج اس نے عمائم کے حواس ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ یا شرمندہ کروانے کا وہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔

''ایک شام روشان ''ناکے'' پر کھڑا تھا۔ ایک مشکوک گاڑی کو اسے روکنا پڑا۔ گاڑی میں ایک بو کے اور ایسا پیکٹ رکھا تھا جس میں ایک ننھا سا کھلونا تھا...... اس کھلونے کے اندر کیا تھا؟ یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ تاہم وہ پیکٹ اور بُو کے بڑا مشکوک تھا۔ گاڑی کے ڈرائیور نے ناکے پر آفیسر ز کو دیکھا تو گھبرا گیا۔ پھر اس کے ذہین دماغ نے اپنی ذہانت کی لگامیں دور تلک کھلی چھوڑ دی تھیں۔ معاً اسے خیال آیا۔ اس نے اذان کے نام پر ''فیور'' لی، روشان چونک گیا تھا۔ اس نے فوراً مجھے کال دی۔ وہ مجھے ''موقع'' پر بلانا چاہتا تھا تا کہ میں اپنی ڈرائیور رشتے دار کو پہچان سکوں...... اس نے حلیہ بتایا تو میں نے مشکوک گاڑی کو جانے کے لیے کہا...... حالانکہ یہ ڈیسیزن (فیصلہ) بڑا خطرناک تھا۔ پھر بھی میں نے یہ خطرہ مول لیا۔ میری ڈرائیور کزن نے ایک ''شکریہ'' تک ادا نہیں کیا۔ بہر حال میں نے شکریہ وصول کرنے کے لیے نہیں...... مشکوک گاڑی کے ڈرائیور کی ذہانت کو سیلوٹ کرنے کے لیے یہ قصہ دُہرایا ہے، سو آج ثابت ہوا۔ ذہین آفیسر ز کو ''مجرم'' چکما دینے کا بڑا کمال فن رکھتے ہیں، مجرم چاہے معمولی کیوں نہ ہو...... ان ٹرینڈ کیوں نہ ہو، اناڑی کیوں نہ ہو......'' وہ تول، تول کر بول رہا تھا۔ عمائم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ اُمڈ آیا تھا۔ وہ احتشام کی ایک، ایک بات کو سمجھ گئی تھی۔ وہ اس کے ہر اشارے کو سمجھ گئی تھی۔ اس نے ماضی قریب کے قصے پر لگی ہلکی سی گرد کو پھونک مار کر اڑا دیا تھا۔ عمائم کو دھچکا لگا۔ وہ اسے ''مجرم'' کے نام سے پکار رہا تھا۔ وہ اسے اناڑی مجرم کہہ رہا تھا۔ اس نے کون سا جرم کیا تھا! آخر احتشام کو اس الزام کے لگانے کی جرأت کیسے ہوئی......؟ وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن اپنی ذات پر اٹھی انگلی اسے گوارا نہیں تھی۔ وہ سنبھل کر چیخ پڑی۔ بھاڑ میں گئی تھی فیور، آگ میں جھونکا شکریہ...... آخر احتشام نے اسے مجرم کہا تو کیوں کہا......؟ وہ لمحوں میں آگ بگولا ہو گئی تھی۔ اپنی ذات اور وقار پر آنے والی آنچ کے رخ موڑنے اسے خوب آتے تھے۔ وہ احتشام پر الٹ پڑی۔

''میں نے کون سا جرم کیا ہے؟ اس گاڑی میں کوئی چیز مشکوک نہیں تھی۔ وہاں ایک ٹیپ ریکارڈ پیکٹ سے نکالا گیا تھا۔ جسے لمحوں میں توڑ مروڑ دیا گیا۔ کوئی قابلِ گرفت چیز نہیں تھی۔'' عمائم نے پھٹ کر کہا۔ غصے میں اس کے ماتھے کی رگ پھول گئی تھی۔ آخر الزام بھی چھوٹا تو نہیں تھا۔ اس کی جان پر بن آئی تھی۔ وہ اب بھی اپنی صفائی میں نہ بولتی تو کب بولتی...... حالانکہ دل تو چاہ رہا تھا جو انکھولے سے بھری پلیٹ اس نے پکڑ رکھی تھی وہ عمائم اس کے منہ پر الٹ دیتی۔

''وہ پیکٹ بدل دیا گیا تھا۔ ورنہ بڑی تباہی لاتا...... بہر حال تم غلط سمجھ رہی ہو...... میں نے تمہیں مجرم نہیں کہا۔ بس ایک مثال دی ہے...... پھر بھی تمہارا دل دکھا ہو تو میں معذرت کرتا ہوں۔'' احتشام نے بڑی شائستگی سے سوری کا سہارا لیا کہ عمائم کا چڑھتا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ بھلا کیا کہتی، احتشام نے معذرت کا بند باندھ دیا تھا۔ وہ لمحوں میں جز بز ہو کر رہ گئی۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوئی بلڈوزر احتشام کے اوپر سے گزار دیتی۔ اس کا کچومر نکال دیتی۔ یا پھر سبز چائے کا مگ اس کے سر پر دے مارتی۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا تھا عمائم......'' اس کی غصہ نما خاموشی کو محسوس کر کے احتشام نے نرمی سے کہا۔ اس نے کٹیلی سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو بکو...... وہ عمائم کے برہم تاثرات کے باوجود بھی بولا۔

''تمہاری جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر کو ''خطرہ'' لاحق ہے۔ اسے سکیورٹی کے لیے آفر کی جسے وہ ٹھکرا چکی ہے گو کہ جامعہ کی اپنی سکیورٹی بھی سخت ہے۔ تاہم نورس کو غیر معمولی سکیورٹی چاہیے تھی۔ اگر تم اسے قائل کر سکو تو ہماری آفر برقرار ہے۔'' احتشام کی سنجیدگی کو محسوس کر کے وہ چونک اٹھی تھی۔ ''تو کیا اس کے وسوسے بے بنیاد نہیں تھے۔ نورس کی جان کو خطرہ تھا؟'' عمائم کانپ کر رہ گئی تھی۔

غزل

شگفتہ شفیق

محبت کا کوئی نغمہ سنا لو
سنو تم آج کھل کے مسکرا لو
ذرا سا بوجھ کاندھوں سے ہٹا لو
اٹھا لو آج تم کچھ تو اٹھا لو
جو دنیا خواب سی لگتی ہے مجھ کو
اسی میں ایک گھر اپنا بنا لو
مجھے جانا ہے ایک لمبے سفر پر
دل میں جو چھپی ہو وہ سنا لو
بلا لو آج سارے دوست اپنے
کبھی تو میزبانی خود سنبھالو
شبِ تاریک بھی ہے مجھ کو پیاری
چلو تم اپنی صورت بھی چھپا لو
میں شاداب و شگفتہ ہی ملوں گی
جہاں بھی جب بھی چاہے آزما لو

''میں خفیہ سروسز کا ذمے دار آفیسر ہوں۔ وطن کے ہر شہری کی جان و مال کا محافظ ہوں۔ میں نہیں چاہوں گا کسی انسانی جان کو نقصان ہو۔ پے در پے ایسے واقعات ہوئے ہیں جو بہت ساری چیزوں کو مشکوک کر گئے ہیں۔ بہر حال انوسٹی گیشن جاری ہے۔ اس سے پہلے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' احتشام کے اگلے انکشاف نے اسے حیران نہیں کیا تھا۔ جس طرح وہ ہر ایک کی جاسوسی میں لگا رہتا تھا۔ عمائم کو اندازہ ہو چکا تھا وہ کسی جاسوسی ڈپارٹمنٹ سے ہی تعلق رکھتا تھا۔

''کرن کے قاتلوں کا کچھ پتا چلا؟'' اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔ احتشام سے ایسی بے تکلفی تو نہیں تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے اس کے ساتھ بدکلامی بھی ہوتے، ہوتے رہ گئی تھی سو اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ احتیاط ہی برتے۔

''جلد پتا چل جائے گا۔ یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں...... خیر تم کچھ ڈسٹرب لگی تھیں مجھے......'' وہ بات گھما کر واپس اسی جگہ لے آیا تھا۔ وہیں جہاں عمائم املی کے ٹنڈ پیڑ کے نیچے اداس بیٹھی تھی۔ اب وہ اس کی پریشانی کا احوال جاننا چاہتا تھا۔

''ایسا تو کچھ نہیں......'' وہ اسے ثریم کی فون کال بتانے کا سوچنے لگی۔ بتائے یا نہ بتائے......؟ یہ ادھیڑ بن خاصی غور طلب تھی اور مقابل جو کہ بہت ذہین تھا اس کے تاثرات خوب حفظ کر رہا تھا۔ عمائم جھنجلا گئی۔

''وہ کہو، جو کہنا چاہتی ہو......؟'' احتشام نے بلا کی نرمی سے کہا۔ وہ لمحے بھر کے لیے چپ سی کر گئی تھی پھر گویا فیصلہ ہو گیا۔ اسے نورس کی خاطر احتشام کو کچھ باخبر تو رکھنا تھا۔ وہ غیر محسوس طریقے سے دھیرے، دھیرے احتشام کے لیے مخبر بن گئی تھی۔ ایسی جاسوس جو اسے ہر خبر سے باخبر رکھتی...... اس مخبری کی آج سے ابتدا تھی۔

''تذبذب اس کیفیت کو کہتے ہیں جہاں آگے جانے کی ہمت نہ ہو اور واپس جانا ممکن نہ ہو۔ سو تم اس تذبذب کے فیز سے نکل آؤ۔'' اسے خاموش دیکھ کر احتشام نے نرمی سے اس کے لیے کچھ بھی بولنے کی آسانی کر دی تھی۔

عمائم نے لمحے بھر کے لیے آنے والے نتائج پر غور کیا اور دھیمی آواز میں بتانے لگی۔
''کرن کی موت سے پہلے نورس اس کے ہمراہ تھی۔'' عمائم کے انکشاف پر احتشام کی ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔
وہ اب بھی املی کے پیڑ کی ٹنڈ شاخوں کے نیچے بیٹھی تھی۔ دھوپ میں ہلکی، ہلکی حدت آرہی تھی۔ درختوں کی اونچی شاخوں سے سورج بلند ہوتا واضح کرنیں دھرتی کے سینے پر پھینک رہا تھا۔ صبح والی ٹھنڈک میں گرمائش کی تاثیر بڑھ رہی تھی۔ اس نے آسمان پر تیرتے پرندوں کو دیکھا...... وہ بھی دھوپ کو انجوائے کر رہے تھے۔ پھر اس نے برآمدے کے قدمچے پر بیٹھے احتشام کی طرف دیکھا تھا۔ انکھولے کی پلیٹ اس کے قریب ہی رکھی تھی۔ اور سبز چائے کا مگ بھی وہیں پڑا تھا۔
''آج کل حریم تم سے ناراض ہے۔'' وہ بڑے سرسری انداز میں پوچھ رہا تھا۔ جیسے بر سبیلِ تذکرہ ذکر نکل آیا ہو... دانستہ کوشش نہ کی گئی ہو۔ حالانکہ عمائم سب سمجھتی تھی۔ احتشام کوئی بھی بات سرسری نہیں کرتا تھا۔ اس کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی معنی ضرور ہوتے تھے۔
''مجھے کیا پتا......'' عمائم جز بزسی ہو گئی۔
''اوں ہوں...... تمہیں کیوں نہیں پتا...... وجہ تو اس نے تمہیں ضرور بتائی ہو گی۔ اس کے ہلکے پیٹ میں کچھ نہیں ٹکتا......'' احتشام نے معنی خیزی جتلا کر کہا تھا۔ وہ بے ساختہ نظر چرا گئی۔ یہ حریم کی بچی بھی ناں...... ڈھنڈورا پیٹے بغیر اسے چین نہیں پڑتا۔ کیا ضروری تھا اپنی ناراضی کا اعلان کرتی پھرتی۔ ناراضی بھی خود ساختہ قسم کی۔
''مجھے تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔'' عمائم نے بیزاری سے کہا...... اب وہ یہاں سے کھسک جانا چاہتی تھی کیونکہ احتشام کے تیور اسے بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔ اس نے اپنی چالاکی سے حریم کی ناراضی سے اس کا پس منظر اگلوا لیا تھا۔
''لیکن مجھے تو اس نے بتایا ہے۔'' احتشام نے نچلا لب دبا کر مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ جس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ عمائم دھک سے رہ گئی۔ تو کیا حریم نے اگل دیا۔ اسے من وعن حریم کی ساری گفتگو یاد آگئی۔ بے دھیانی میں اپنے کہے الفاظ بھی...... وہ سخت خفت محسوس کر رہی تھی۔ پھر بھی ذرا ڈھیٹ بن کر بولی۔
''کیا......؟'' اس کا انداز بلا کا سرسری تھا۔ احتشام اس کی کامیاب اداکاری پر سراہے بغیر نہ رہ سکا۔
''یہی کہ ایمان کے علاوہ کوئی اور آپشن نہیں تھا اگر آپشن ہوتا تو تم کیا فیصلہ کرتیں؟'' احتشام نے بڑی معصومیت کے ساتھ اس کا ہر طبق روشن کر دیا تھا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ احتشام نے بات کو گھما پھرا لیا تھا۔ پھر بھی وہ سمجھ گئی تھی کہ احتشام من وعن سارے قصے سے باخبر ہے۔
''اچھا لگنے سے کیا ہوتا ہے...... پھر احتشام کا پرپوزل تو نہیں آیا تھا۔'' اپنی ہی بازگشت پر اس کا دل چاہ رہا تھا خودکشی کر لے...... اتنی خفت اس نے زندگی میں کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ حریم نے ساری بکواس احتشام کے سامنے دُہرادی تھی۔ غلطی عمائم کی اپنی تھی۔ اس نے زبان کو کیوں پھسلایا تھا؟ حریم کی تو عادت تھی۔ وہ بدل نہیں سکتی تھی۔ مارے شرمندگی کے اس کا سر جھک گیا تھا۔ حالانکہ احتشام نے اسے بالکل بھی نہیں جتایا تھا۔ پھر بھی عمائم کو لگا تھا کہ اس کی سینت، سینت کر رکھی عزتِ نفس اور انا کا قتلِ عام ہو گیا۔ یہ انا جو اسے اتنی عزیز تھی۔ کیسے ریزہ، ریزہ ہو رہی تھی۔ اس کے پاس آخر بچا کیا تھا؟ ایک انا کی سربلندی تھی کچھ سمیٹا ہوا وقار تھا۔ عزت نفس تھی جیسے سب کچھ ریت کی طرح بکھر گیا تھا۔ احتشام اس کا ایک، ایک تاثر پڑھ رہا تھا۔ وہ اس کی خجالت اور خفت کو سمجھ رہا تھا۔ کم از کم عمائم کو شرمندہ کرنا اس کے مقاصد میں کبھی شامل نہیں رہا تھا۔ اس نے بڑے سلیقے سے بات بدل دی تھی۔ گفتگو کا رخ موڑ دیا تھا۔
''سنو، سنو عمائم! رشتے اور سودے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ رشتے قائم کیے جاتے ہیں جبکہ سودے طے کیے

جاتے ہیں۔ زندگی تمہاری ہے، اس کا بیوپار نہ کرنے دو...... جو آج تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے، وہ کل تمہارے ہاتھ میں ضرور ہوگا۔ واپسی کے لیے کوئی ایک راہ بچالینا...... عمرِ رواں کے کسی بھی موڑ پر خفیہ خبر رساں ڈپارٹمنٹ کا کوئی محبِ الوطن کمانڈو تمہاری ''مخبری'' کے لیے الرٹ رہے گا۔ اسے وطن کی مٹی اور مٹی سے بنے ایک پتلے سے شدید محبت ہے۔'' اس نے جھک کر شگوفوں کی پلیٹ عمائم کے ہاتھ میں تھمائی تھی۔ پھر سبز چائے کا مگ اٹھا کر چلا گیا۔ جبکہ عمائم دم بخود رہ گئی تھی۔ وہ کیا بول کے گیا تھا؟ اس کے مضبوط لہجے میں کیسی سچائی اور جذبوں کا رسیلہ پن قطرہ، قطرہ بہہ رہا تھا۔ وہ اپنے انداز اور طرز کا باکمال انسان تھا۔ اظہارِ محبت بھی اپنے ہی طریقے سے کرتا...... تو کیا وہ عمائم سے اظہارِ محبت کر گیا تھا؟ اس سوچ نے عمائم کو لمحوں میں فریز کر دیا۔ وہ حواس باختہ سی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے اندر باہر بھونچال آ گیا تھا۔ ایک زلزلہ اتر آیا تھا۔ آخر کس موڑ پر آ کر احتشام اسے پابند کرنا چاہ رہا تھا؟ جب وہ خود کسی کی پابند ہونے جا رہی تھی۔

یہ احتشام اسے کس دوراہے پر لے آیا تھا۔ وہ اٹھی اور لڑکھڑا گئی۔ کیا خواب ایسے تکمیل پاتے ہیں؟ کیا خواہشیں اتنی آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں۔ جو دل میں چپکے، چپکے بس رہے ہوتے ہیں اتنی اچانک مجسم آ کھڑے ہوتے ہیں۔

ہر رشتے میں ناپائیداری ہے، جب تک اظہار کے دھاگے سے گرہ نہ لگائی جائے۔ محبت کا اظہار ضروری ہوتا ہے، رشتوں کو مضبوط کرنے، بنانے کے لیے انہیں مطمئن کرنے کے لیے چاہے وہ اظہار لفظوں میں ادا ہو یا عمل سے...... محبت اظہار نہ ہے تو محبوب کی امانت بن جاتا ہے۔ اور وہ اپنی محبت کے اظہار کی امانت عمائم کے پاس گروی رکھ گیا تھا۔ وہ خیانت کرتی تو خائن کہلاتی پھر وہ خیانت کرتی بھی کیوں......؟ اس کا اولین خواب ستاروں کی طرح آنکھوں میں سجنے کے لیے آ رہا تھا۔ اس نے آنکھوں اور دل کے دریچوں کو بند کرنا چاہا...... روکنا چاہا...... لیکن بوئے گل رکتی نہیں ہے...... درزوں میں بھی گھس، گھس کر نہال کرتی، بے حال کرتی اڈتی چلی آتی ہے۔

☆☆☆

''ایک تیر سے کتنے شکار کرنا چاہتی ہو......؟'' عمائم کو تیکھی آواز نے بے ساختہ چونکا دیا تھا۔ اس نے جھکا سر اٹھا کر دیکھا...... سرخ چہرے پر خونخوار تاثر لیے ماہم کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھ لہرا کر وہ بڑے جارحانہ تیور لیے عمائم کو گھور رہی تھی۔ منگنی کے اعلان اور ڈیٹ فکس کے بعد وہ آج عمائم کو دکھائی دی تھی۔ شاید اس نے احتشام کو یہاں سے گزرتے دیکھ لیا تھا۔ اب ایمان کے بعد احتشام کو اس کے گرد دیکھنے کا ماہم میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ چیل کی طرح سے اڑتی ہوئی دوسری منزل سے نیچے آئی تھی۔ جانے کب سے وہ ان دونوں کو گفتگو کرتے برداشت کر رہی تھی۔ احتشام کے جاتے ہی وہ نیچے اتر کر الٹ پڑی۔ عمائم جو بڑے انوکھے جذبات کا شکار تھی اور اپنے ہی گیان میں گم تھی۔ اس افتاد پر گھبرا اٹھی تھی۔

''ایمان کو ورغلا کر اپنا مقصد تو حاصل کر چکی ہو، اب مزید کیا چاہتی ہو......؟ کتنوں کو پھانسنا چاہتی ہو......'' ماہم وحشت زدہ سی چیخ پڑی تھی۔ سرخ آنکھیں، تپتے گال، سنہری رنگت میں گھلتی زردیاں...... وہ تو بڑی... بدحال... لگ رہی تھی...... عمائم کے دل کو کچھ ہوا...... اس نے ماہم کو اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ بڑی اپ ٹو ڈیٹ رہا کرتی تھی پر اس وقت بہت نڈھال لگ رہی تھی۔ عمائم پریشان ہو گی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے ماہم......؟'' اس نے نرمی سے گھبرا کر پوچھا تھا۔ جواباً اس نے خونی آنکھوں سے عمائم کو گھورا۔ وہ مزید گھبرا اٹھی تھی۔

''سب کچھ کر کرا کے اب معصوم بن رہی ہو...... بڑی مکار ہو تم...... ایمان کو اپنے دام میں کر لیا...... وہ کچھ سنتا نہیں...... اسے کسی کی قدر رہی نہیں......'' ماہم بدحواس ہو کر چیخ پڑی تھی۔ اس کا انداز بڑا بے ربط قسم کا تھا۔ بدحالی کی

ایک ہی جھلک اس کے اندر کا حال بتا رہی تھی۔ تو کیا وہ ایمان سے محبت کرتی تھی۔ اسے دھچکا سا لگا۔

''ماہم! تم مجھ پر الزام تراشی مت کرو......'' وہ دھیمی آواز میں بے ساختہ بولی۔

''یہ حقیقت ہے کوئی الزام تراشی نہیں...... تمہیں ایمان کے علاوہ کوئی اور نہیں ملا......؟ یہ احتشام بھی تو تھا ناں...... تمہارے گرد ہی پروانے کی طرح نظر آتا ہے۔'' ماہم نے آگ بگولا ہو کر کہا...... وہ لب بھینچ کر رہ گئی تھی۔

''ایمان کو میرے لیے تائی امی نے پسند کیا ہے...... بابا صاحب کا فیصلہ ہے۔ میں نے ایمان تو کیا کسی کو پھانسنے کا کوئی تردد نہیں کیا۔'' وہ بہت چاہ کر بھی ماہم کو منہ توڑ جواب نہیں دے سکی تھی۔ کیونکہ اسے ماہم کی ذہنی حالت کچھ مناسب نہیں لگ رہی تھی۔ یقیناً وہ بڑی تکلیف میں تھی۔

''بابا صاحب کو میرا خیال کیوں نہیں آیا؟ تمہارا خیال کیسے آ گیا؟ آج تک تمہیں منہ تو لگایا نہیں...... اور چن کر ایمان کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں پکڑا دیا۔'' اس نے تلخی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے جتایا۔

''ماہم! یہ نصیب کی بات ہے۔'' عمائم کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ کن لفظوں سے اسے ٹھنڈا کرتی ...... اس کے اندر تو بھانبھڑ جل رہے تھے۔

''یہ نصیب کی نہیں، اداؤں کی بات ہے، تمہاری اس صورت نے ایمان کو سدھ بدھ بھلا دی۔ ورنہ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔'' ماہم نے اپنی بات پر زور دے کر بگڑتے ہوئے کہا۔ وہ لمحے بھر کے لیے لفظ ''محبت'' پر گم صم ہو گی۔ اب بھلا اس بات کا کیا جواب دیتی۔

''اگر وہ تم سے محبت کرتا تھا تو اس نے میرا نام کیوں لیا؟'' عمائم نے بھیگی آواز میں پوچھا۔ وہ تو خود ایک ان دیکھے شکنجے میں پھنس گئی تھی۔ ایک طرف ایمان تھا، تائی امی کا انتخاب اور دوسری طرف احتشام تھا۔ وہ عجیب عذاب کا شکار تھی۔ وہ عجیب دوراہے پر کھڑی تھی، آگے بڑھ سکتی تھی نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی۔

''بتاؤ ماہم! میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں۔'' وہ بے بس سی بول اٹھی۔ ماہم نے خونی نگاہوں سے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کی زخمی آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کے کانچ بکھر رہے تھے۔ وہ محبت کا عذاب جھیل رہی تھی۔ وہ محبت کے پل صراط سے گزر رہی تھی۔

''اس منگنی سے انکار کر دو......'' ماہم نے پھٹی، پھٹی آواز میں کہا۔ پھر وہ روتے ہوئے اندر کی طرف بھاگ گئی۔ عمائم کے دل پر منوں بوجھ آ پڑا۔ اس کے اعصاب لمحوں میں کشیدہ ہو گئے تھے۔ کوئی بھی کام ٹھیک طریقے سے نہیں ہو پا رہا تھا۔ ہر طرف الجھنیں، دکھ اور پریشانیاں بکھر رہی تھیں۔ کوئی بھی خوشی مکمل صورت میں نہیں ملتی تھی۔ ہر چیز میں ادھورا پن تھا۔ خوشیوں میں بھی زندگی میں بھی، رشتوں میں بھی، رویوں میں بھی۔

جیسے ہی وہ صحن سے نکل کر گیلری تک آئی تو اچانک سیڑھیوں سے اترتی امو کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ ''یا اللہ! ایک اور امتحان......'' اس کا دل گھبرا اٹھا تھا۔ ابھی تو وہ احتشام کی طرف سے ملنے والی ''بوئے گل'' کے بارے سنبھلی نہیں تھی جب اچانک ماہم سے تلخ کلامی ہو گئی اور اب امو کو جھیلنا بھی کسی عذاب سے کم نہیں تھا...... نہ جانے جب مستقل طور پر ان کے ساتھ رہنا پڑتا تو عمائم کا بھلا کیا حال ہوتا......؟ اس کی تو خوف کے مارے جان پر بن آئی تھی۔ امو اسے بڑے دن بعد ذرا نارمل دکھائی دی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک مخصوص برف کی طرح جمی وحشت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آج ان کے تاثرات بھی بھیانک خوف میں مبتلا کر دینے والے نہیں تھے۔ ان کی ذہنی حالت نسبتاً بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ وہ عمائم کو دیکھ کر وحشت سے الٹ نہیں پڑی تھیں۔ نہ انہوں نے کوئی حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ البتہ وہ عمائم کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اس کے ایک، ایک نقش کو کھوجنا چاہ رہی تھیں۔ کچھ تلاش کرنا چاہ رہی تھیں۔ اس کے خدوخال میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ عمائم کو ان کی نگاہوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ جلد از جلد ان

کی نظروں سے اوجھل ہونا چاہتی تھی اسی لیے مروتاً سلام کر کے الٹے قدموں بھاگنے لگی۔ معاً امو نے اسے آواز دے کر روک لیا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا...... عمائم کو رکنا ہی پڑا...... اب وہ زینہ اتر کر عمائم کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے دو انگلیوں سے عمائم کے رخسار چھو لیے تھے۔

''ہو بہو...... ویسی ہی......'' ان کی نرم ملائم آواز عمائم کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ اسے غش آتے، آتے رہ گیا۔ امو اور عمائم سے اتنی ملائمت کے ساتھ بات کریں۔ اسے غشی تو آنی ہی تھی۔ پھر امو نے دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں اس کا ملائی سا چہرہ پکڑ لیا۔ عمائم تب حیرت سے مرنے کے قریب ہو گئی تھی جب امو نے اس کی پیشانی بھی چوم لی۔ عمائم کو لگا...... ابھی کے ابھی اسے ہارٹ اٹیک تو ضرور ہو جائے گا اور امو بڑی دھیمی آواز میں خود کلامی کر رہی تھیں۔

''ہو بہو...... ویسی ہی، اسی ''قاتلہ'' کی اولاد ہو، کیا تم جانتی ہو عمائم......! تمہاری ماں نے کسے قتل کیا تھا؟''

☆☆☆

''اگر زمانے نے ہمیں ستایا اور اس کی سختیاں ہم پر پڑی ہیں تو کوئی تعجب نہیں۔ آسمان میں بے شمار ستارے موجود ہیں مگر گہن صرف چاند اور سورج ہی کو لگتا ہے......'' درختوں کی دو رویہ قطار کے درمیان چلتے ہوئے اسے کسی کی نرم آواز سنائی دی تھی۔ یہ آواز اتنی اپنائیت بھری تھی کہ اس نے بے ساختہ گردن موڑی۔ گو کہ وہ گردن نہ بھی موڑتی تب بھی دل گواہ تھا کہ آنے والا کون ہے؟ پھر بھی تصدیق ضروری تھی۔ کیونکہ ان دنوں وہ الوژن کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے ہر چہرے پر ایک ہی چہرے کا گمان ہوتا تھا۔ ہر آواز پر ایک ہی آواز کا گمان ہوتا۔

درختوں کی دو رویہ قطار کے سائے تلے وہ اس کے ہم قدم تھا...... گو کہ سفر مختصر تھا۔ جلدی اختتام پزیر ہو جاتا۔ لیکن یہ کیا کم تھا کہ وہ ہم قدم تو تھا...... برابر تو چل رہا تھا، تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی...... عمامہ قناعت پر آتی تو اتنی سی بات پر زندگی اور عمریں چپ چاپ گزار دیتی۔ آنکھیں موندتی تو شام کی ہمراہی کے احساس میں گم زندگی کی کئی شامیں تمام کر دیتی۔ لیکن محبت کرنے والے کو صبر اور قناعت کی سوغات اتنی آسانی سے نہیں ملتی...... اس کے لیے ریاضتیں کرنا پڑتی تھیں۔ کشٹ کاٹنے پڑتے تھے۔ آبلہ پائی کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ وہ سست قدموں سے چلتی رہی...... شام اس کے برابر ہی تھا۔

''کیا تم مجھے ''چاند'' اور خود کو سورج سے تشبیہہ دے رہے ہو۔'' عمامہ نے بالآخر اس گمبھیر خاموشی کو توڑ دیا تھا۔ وہ ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا اور چلتا رہا۔

''نہیں...... تم سورج اور میں چاند ہوں۔'' اس نے ایک تعجب میں ڈالنے والی بات کی تھی۔ عمامہ کچھ حیران ہوئی...... یہ تشبیہہ الٹ سی ہو رہی تھی۔

''تم سورج کی طرح ہو...... گرم اور پُر حدت آگ اگلنے پر آتی ہو تو اونچائیوں پر چڑھتی ہو۔ سورج جتنی بلندی پر ہو کر جھکے اتنا پُر تپش ہوتا ہے جبکہ چاند تو بس چاند ہے۔ اداس، غمگین، اکیلا، تنہا اور اپنے دکھوں پر بھی خاموش، خوشیوں پر بھی مہر بہ لب...... جبکہ سورج اپنے ہر ''احساس'' کو چلا، چلا کر ظاہر کر دیتا ہے۔ یوں دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود بھی ایک چیز میں ذرا بھی الگ نہیں...... یعنی کہ نصیب، دونوں کے نصیب میں ''گرہن'' لکھا ہے۔ جب دل چاہے، گرہن لگ جائے۔'' وہ اتنی دھیمی آواز میں بول رہا تھا کہ عمامہ بمشکل سن سکی تھی۔

''بہترین نہ سہی مگر فلسفہ برا بھی نہیں......'' عمامہ نے سر ہلا کر تائید کی تھی۔

''تم جو بھی کہو، تمہیں سب خون معاف ہیں......'' شام نے بوجھل لہجے میں کہا...... عمامہ تھوڑی مضطرب سی ہو گئی تھی۔

''کچھ ہوا ہے شام......!'' وہ اس کی مزاج شناس تھی اور ٹھیک دعویٰ کرتی تھی۔ لمحوں میں سمجھ گئی۔ شام....

بے مقصد کچھ نہیں کہتا۔ اس کے قدم اور بھی سست پڑے تو شام بھی رک گیا۔

''اگر کہوں ''ہاں'' تو؟'' اس نے عمامہ کی خوف بھری آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہاں تفکر اور ہراس کی لکیر پھیل رہی تھی۔

''مطلب......؟'' وہ ہونق بن گئی تھی۔ لیکن اسے اندازہ ضرور تھا۔ شام کسی بات پر خفا ہے۔

''مطلب تب بتاؤں گا جب یقین ہو تم مکرو گی نہیں......'' اس کا انداز بلا کا سنجیدہ تھا۔ اب کے عمامہ ٹھٹک گئی تھی۔ یعنی معاملہ گمبھیر تھا۔

''نہیں، تم کہو تو......'' عمامہ گھبرا گئی تھی ---- کیا شام کو کچھ پتا تو نہیں چل گیا۔ منصور کی اس ''آفر'' کا......؟ اور کالج کے گیٹ پر ہونے والی زبردستی کی ملاقات کا...... جب وہ سونیا کو منانے کی خاطر پہلی مرتبہ باہر لگے ٹھیلوں سے گول گپے لینے اکیلی چلی گئی تھی۔ آخر سونیا کو منانا بھی تھا۔ جو فیقہ اور دادی کی کلاس لینے کے بعد دوبارہ اس کے گھر نہیں گئی تھی۔ ان دنوں سونیا کچھ الجھ رہی تھی۔ نہ جانے کیا پرابلم تھا؟ اس کے گھر میں پریشانی تھی یا سونیا کی زندگی میں؟ عمامہ کو کچھ پتا نہیں تھا یا پھر فیقہ اور دادی کے روڈ بی ہیویئر کی وجہ سے سونیا، عمامہ سے کھنچی کھنچی، کچھی لگ رہی تھی۔ کیا خبر، کوئی اور بھی مسئلہ ہو...... جیسے سونیا کا دل کسی پر آ جانا...... اور کسی بھی کیوں؟ اس کا اپنا بھائی طاہر بھی تو موجود تھا۔ اگر ایسا کوئی ''پیچ اپ'' ہو جائے تو کتنا مزہ آئے؟

وہ درختوں کی دورویہ قطار تلے چلتی، چلتی سوچوں میں بہت دور تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی سوچوں کو شام کی آواز نے بریک لگائے تھے۔ وہ ایک مختلف بات کر رہا تھا۔ عمامہ ٹھٹک گئی تھی۔

''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ عمامہ کی سانسیں رک سی گئی تھیں۔

''کیا......؟''

''تم سچ بتاؤ گی......؟'' شام کے انداز میں غصہ نہیں تھا۔ لیکن ملائمت بھی نہیں تھی۔ عمامہ کی جان پر بن آئی۔

''بالکل سچ......'' اس نے وعدہ کیا۔ حالانکہ اندر سے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ شام کیا پوچھنے والا تھا؟

''میرے باپ منصور نے اس فون کال کے علاوہ تم سے کب بات کی......؟ میرے منع کرنے کے باوجود بھی......؟'' وہ پینٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے تن کر کھڑا تھا۔ عمامہ کی جیسے ساری راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ لیکن وہ گھبرائی نہیں...... اس کے اندر چور ہوتا تو وہ گھبراتی ناں۔

''کالج کے گیٹ پر......'' عمامہ نے بتا دیا۔ وہ چھپاتی بھی کیوں...... شام نہ بھی پوچھتا، وہ تب بھی بتاتی۔

''اس نے تمہیں کیا کہا؟'' وہ بلا کا سنجیدہ تھا۔ عمامہ نے سر جھکا کر سوچا۔ پھر تمہید باندھی تھی۔ پھر دھیمی آواز میں کہا تھا۔

''وہ چاہتے تھے ہم دونوں...... مطلب ہم لوگ سول میرج کر لیں...... وہ ہمیں سپورٹ کریں گے۔ انہوں نے بس یہی کہا۔'' عمامہ نے رک، رک کر کچھ جھجکتے ہوئے بالآخر بتا دیا تھا۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کی زبان کئی مرتبہ لڑکھڑائی تھی۔ اس میں بے پناہ ''حیا'' تھی۔ ہر بات شام سے منہ پھٹ انداز میں کہہ لینے کے باوجود کچھ چیزوں میں وہ بہت جھجکتی تھی۔

''اور تم نے کیا جواب دیا؟'' شام کے لیے ''ان'' کی آفر کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اصل چیز عمامہ کا جواب تھا جو اس کے لیے اہمیت رکھتا تھا۔

''میں نے انکار کر دیا...... یہی بولا کہ ایسی سپورٹ نہیں چاہیے۔'' عمامہ نے سچ بتایا۔

''واقعی......؟'' شام کچھ مطمئن ہوا۔

''کیا مجھ پر یقین نہیں......؟'' وہ کچھ خفا ہوئی تھی۔

''یقین ہے تبھی تو......'' شام ایک اعصابی کھنچاؤ سے باہر آ کر مسکرا دیا۔

''تم سمجھتے ہو، عمامہ کوئی بڑی نادانی کر لے گی۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا...... میں سوچوں بھی تو...... کچھ ایسے رشتے

میرے لیے اتنے اہم ہیں کہ ان سب کے بغیر رہنا ممکن نہیں......'' وہ ''بے بس'' سی ''بے بس'' تھی۔ ایسی ''بے بسی'' شام نے عمر بھر کسی کی آنکھوں میں پھیلتی ہوئی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

''اس کا مطلب ہے......تم نے میری لاتعلقی کے باوجود منصور کی آفر کو سوچا ضرور تھا۔'' شام نے اندازہ لگایا۔

''سوچتی تو میں نہ جانے کیا کچھ ہوں......کیا میری سوچوں کے عین مطابق سب کچھ ہو رہا ہے۔'' وہ پھیکی سی ہو گئی تھی۔

''تو کیا نہیں ہو رہا......؟'' شام بلاوجہ مسکرا دیا تھا۔

''رہنے دو تم......'' وہ برا مان گئی تھی۔

''اچھا......ایک بات تو بتاؤ......'' شام نے موضوع ہی بدل دیا تھا۔ چلتی ہوئی عمامہ رک گئی تھی۔

''کیا؟''

''یہ آج کل طاہر کن چکروں میں ہے۔'' اس کا انداز معنی خیز سا ہو گیا تھا۔ عمامہ چونکی۔

''کن چکروں میں؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''اتنی انجان نہ ہی بنو......'' شام مسکراتا رہا تھا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو......؟'' عمامہ الجھی سی گئی تھی۔

''کیا تمہیں نہیں پتا......'' اب کے شام بھی چونکا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا طاہر، عمامہ کو کچھ نہ بتائے......اس کے اندر تو کوئی بات ٹکتی نہیں تھی......جب تک عمامہ کو کچھ بتا نہ دیتا۔

''نہیں......'' عمامہ حیران ہوئی۔ ''اب بتا بھی چکو......ایویں ہی تجسس کری ایٹ کر رہے ہو۔'' وہ بے چین ہوئی تھی۔

''آں......ہاں، کچھ نہیں......'' شام بات بدلنا چاہ رہا تھا۔

''اب بتانا پڑے گا۔'' عمامہ کا تجسس اُمڈ آیا تھا۔ اب وہ آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔

''ارے، کچھ نہیں۔ تم سناؤ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟'' شام نے حتی المقدور لہجے کو سرسری بنا لیا تھا۔

''پڑھائی کو چھوڑو......مجھے طاہر بھائی کا بتاؤ......وہ کن چکروں میں ہے؟'' عمامہ نے بے تابی سے پوچھا۔ کیونکہ اسے لگ رہا تھا، دال میں کچھ کالا ضرور ہے؟ ایسے ہی ایک نامعلوم خیال اسے چونکا گیا۔

''باہر جانے کے۔'' شام کو بات سوجھ ہی گئی تھی۔ ورنہ آج تو برا پھنسا تھا۔ اگر طاہر نے عمامہ کو بھی ہوا لگنے نہیں دی تھی تو اس کا مطلب تھا ابھی وہ کسی پر کچھ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''ہیں......کیا واقعی......؟'' عمامہ مزید کھوج میں نہیں پڑی تھی۔ گو کہ اپنا خیال غلط ہونے پر برا تو لگا تھا لیکن زیادہ غصہ طاہر کے باہر چلے جانے پر آیا......تو طاہر بھائی یہ کھچڑی پکا رہا تھا؟

''لگ تو یہی رہا ہے......پر کنفرم نہیں۔'' شام نے پہلو بچایا۔

''تم نے غلط ہوائی سنی ہے۔ بابا تو ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ بات کچھ الگ ہو گی......کم از کم یہ نہیں ہو سکتی۔'' عمامہ ایسی دور رس تو نہیں تھی......لیکن اس وقت لگ رہی تھی۔ شام نے پھر پہلو بچایا۔

''جب جائے گا تو پتا چل جائے گا۔'' اب وہ جان چھڑا رہا تھا۔ اگر طاہر نے نہیں بتایا تو اس نے بھی عمامہ کو نہیں بتانا۔

''ہونہہ......دیکھوں گی کیسے جاتا ہے؟ وہ بھی شادی کیے بغیر......'' اس نے خفگی سے کہا......شام اچانک چونکا تھا۔

''طاہر کی شادی؟ کس کے ساتھ؟''

''میری پسند کی لڑکی کے ساتھ۔'' اس نے ناک چڑھا کر بتایا......گویا وہ لڑکی پسند کر چکی تھی۔

''کون سی......؟'' وہ پوری طرح گھوم گیا۔

''کیوں بتاؤں......؟'' اس نے مزے سے کہا۔

''اچھا..... بتادوناں.....'' شام اصرار کرنے لگا..... وہ خاصا بے چین ہوگیا تھا۔ عمامہ سمجھ نہیں سکی تھی۔
''کیوں بتاؤں.....تم سیدھی بات بتاتے ہو.....'' عمامہ کو بھی بدلہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔ شام جھنجلایا۔
''پلیز عمامہ.....!'' اس کے انداز میں لجاجت تھی۔ عمامہ کو ترس آ گیا۔
''کیا یاد کرو گے..... بتا دیتی ہوں.....'' عمامہ نے شاہانہ انداز میں اس کی سات نسلوں پر احسان کرتے ہوئے بتایا۔
''میری لاڈلی فرینڈ.....''
''کون سی.....؟'' شام بری طرح سے ٹھٹک گیا۔
''خود پوچھو.....'' وہ اترائی تھی۔ شام نے اسلام پورہ کالونی کی ساری قریبی سہیلیوں کی طرف ذہن کی لگا میں چھوڑ دی تھیں۔ وہ ساری عمامہ کے بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ محلے کی لڑکیاں، جن میں نازی، فہمی، پومی، کنول، آسیہ وغیرہ شامل تھیں۔ جن کے گھروں میں جانے کے لیے عمامہ ہمہ وقت بے تاب رہا کرتی تھی۔ لیکن یہ کالج میں آنے سے پہلے کی باتیں تھیں۔ کالج میں آنے کے بعد عمامہ کی صرف ایک ہی سہیلی رہ گئی تھی۔ اور اس کا نام شام دماغ میں لانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بار، بار سر کو جھٹکتا رہا۔ جیسے اپنے خیال کو جھٹلا رہا تھا۔
''تم بھی ناں..... بہت ڈفر ہو شام! اتنی ''بچار'' کی کیا ضرورت ہے؟ سامنے کی بات تو ہے.....اپنی سونیا ہمدانی.....'' اس نے اپنے تئیں دھماکا کیا تھا۔ لیکن شام اس انکشاف پر ذرا بھی نہیں چونکا.....عمامہ انتہائی بدمزہ ہو کر درختوں کی دورویہ قطار کے سائے تلے چلنے لگی تھی۔ اور شام انتہائی تعجب سے عمامہ کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

سونیا دو دن سے کالج نہیں آ رہی تھی۔ وہ سارا دن پریشان رہی۔ کالج میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ گھر آ کر اس نے یونیفارم بدلا اور فون کی تار کھینچ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔
سونیا نے بہت دیر بعد فون اٹھایا تھا۔ اس کی آواز بہت پژمردہ لگ رہی تھی۔ عمامہ کھٹک گئی۔ یقیناً وہ ناراض تھی؟ عمامہ کا دل برا ہو گیا۔ لیکن وہ سونیا سے معذرت تو کر سکتی تھی۔
''سونیا آئم سوری.....'' اس نے بغیر تمہید کے دکھی لہجے میں کہا۔ لاتعلق اور پژمردہ سی سونیا ذرا دیر کے لیے چونکی۔
''کس بات پر سوری.....؟''
''جو تمہارے ساتھ ہوا.....'' عمامہ اور بھی دکھی ہو گئی تھی۔
''تمہیں بھی پتا چل گیا؟'' سونیا ٹھٹک کر رہ گئی۔ ''کس نے بتایا؟''
''میرے سامنے ہی تو ہوا تھا'' عمامہ نے اسے یاد دلایا۔ یہ سونیا بھی کیسی بہکی بہکی ہو رہی تھی۔
''کیا؟'' سونیا حیران ہوئی۔
''جو کچھ دادی اور فیقہ نے کیا۔'' اس نے چبا، چبا کر کہا تھا۔ سونیا نے گہری سانس کھینچی اور عمامہ بھی ناں ابھی تک اسی لکیر کو پیٹ رہی تھی جسے سونیا کب کا بھلا چکی تھی۔
''ارے، بھاڑ میں جھونکو دادی اور پھوپی کو.....'' سونیا نے ناک چڑھالی تھی۔
''چلو جھونک دو.....'' عمامہ نے جلدی سے کہا۔ ''میری جان تو چھوٹے.....''
''اتنی آسانی سے نہیں چھوٹنے والی.....'' سونیا نے لمبی سی جمائی لی۔
''تم دعا کرو ناں.....'' عمامہ نے اصرار کیا۔
''اور تم ''دوا'' کرو.....دعا کے ساتھ دوا بہت ضروری ہوتی ہے۔'' سونیا نے ہمیشہ کی طرح اسے اکسایا تھا گو کہ اس کے اکسانے میں کوئی منفی پہلو نہیں تھا۔ یہ بات برائے بات تھی۔
''میں دوا اور دعا دونوں کے درمیان معلق ہوں۔ سمجھ نہیں آتا کیا کروں.....'' وہ رنجیدہ ہو گئی تھی۔

''کچھ بھی نہ کرو، کرنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔'' سونیا نے ایک اور جمائی لی۔
''یہ تم کہہ رہی ہو؟'' عمامہ کو یقین نہیں آیا۔
''بلاشبہ، میں کہہ رہی ہوں......دیکھو، عمامہ! پریکٹیکل لائف میں خیالی چیزیں نہیں ہوتیں۔ تمہیں حقیقت کو فیس کرنا ہوگا......فیقہ جتنی ٹیکو سہی، جو کچھ اس نے ''بے عزتی'' کے ذریعے میرا حال کیا...... یہ سب باتیں ایک طرف، میں اب بھی کہوں گی۔ ایثار کرنے والوں کا ایثار کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ تمہارے سامنے ایک جہاں اور ہے جبکہ فیقہ کی دنیا بڑی محدود ہے۔ وہ دو شخصیتوں میں بٹتی جارہی ہے۔ وہ تم سب کے لیے عنقریب ایک خطرناک مریضہ بن جائے گی۔'' سونیا نے اپنے محدود علم کے مطابق اسے سمجھانا چاہا تھا۔
''تو بن جائے......کیا میں بنارہی ہوں؟'' عمامہ نے جذباتیت میں کہہ دیا۔ ''تم اب بھی اسی کے گیت گانا۔ وہی ہے تمہاری ہوتی سوتی......''
''بس اب منہ بسور کے بیٹھ جاؤ......'' سونیا خفا ہوئی۔ اس وقت عمامہ بھول گئی تھی۔ اس نے سونیا کو کس مقصد کے لیے فون کیا تھا۔ اور وہ کالج کیوں نہیں آرہی......گھر میں آخر کیا پریشانی چل رہی تھی؟ اور سونیا اتنی پژمردہ کیوں تھی؟
''اچھا......بتاؤ فون کیوں کیا تھا؟'' اس کی خاموشی محسوس کر کے سونیا کو خود پوچھنا پڑا۔ عمامہ بھی چونک پڑی تھی۔
''یہ پوچھنے کے لیے کہ تم کالج کیوں نہیں آرہیں۔'' عمامہ کو بھی اچانک خیال آ گیا۔
''طبیعت ٹھیک نہیں......'' سونیا پھر بیزار ہوگئی تھی۔
''کیا ہوا؟'' اس نے پریشانی سے پوچھا۔
''کچھ خاص نہیں......تم کون سا عیادت کے لیے آؤ گی۔'' لگے ہاتھوں سونیا نے شکوہ بھی پھسلا دیا تھا۔ کیونکہ عمامہ اس کے گھر جانے سے کتراتی تھی۔
''میں آؤں گی۔'' اس نے فٹافٹ حامی بھرلی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ کبھی نہ جاتی۔ لیکن اب سونیا کی خرابی طبیعت کا سن کر پریشان ہوگئی تھی۔ سونیا ہوتی تو ابھی کے ابھی پہنچ جاتی۔ اسے عمامہ سے ایسا ہی پیار تھا۔
''تم آؤ گی تو ایک بات بتاؤں گی۔'' سونیا نے اس کے اندر تجسس جگایا اور فون بند کردیا۔ عمامہ ہیلو، ہیلو کرتی رہ گئی تھی۔ فون سیٹ گیلری کے دیوار گیر اسٹینڈ پر رکھا پھر کچن میں عادتاً جھانکا......وہاں طابہ کھڑی تھی۔ چائے بناتی ہوئی......عمامہ کو دیکھ کر مسکرائی۔
''کیا تمہارے لیے بھی بناؤں......؟'' وہ خاصی مہربان نظر آرہی تھی۔ عمامہ نے چونک کر سر ہلایا۔
''کس کے لیے بنارہی ہو؟''
''تقی کے لیے......'' طابہ کے منہ میں شیرینی گھل گئی تھی۔ تقی کا ذکر اور گھر میں اس کی موجودگی طابہ کے اندر ایسی مٹھاس بھر دیتی تھی۔
''تقی بھائی گھر میں ہیں......؟'' عمامہ حیران ہوئی۔ کیونکہ اس وقت وہ فیکٹری میں ہوتا تھا۔ پھر شام کو اپنی بنائی ہوئی کسرت گاہ میں......جس میں حال ہی میں شام کے ہاتھ کراچی سے اس نے مشین منگوائی تھی۔
''طبیعت کچھ ٹھیک نہیں......'' طابہ نے متفکر انداز میں بتایا۔ ''ویسے وہ آرام کررہے ہیں۔''
''کیا ہوا؟'' وہ گھبرا گئی تھی۔
''موسمی اثر ہے......شاید فلو......'' طابہ سنجیدگی سے بولی تھی۔ عمامہ الٹے قدموں پلٹ گئی۔ طابہ کا موڈ آف ہوگیا تھا۔ ابھی وہ اسے روکنا چاہتی ہی تھی کہ لیکن عمامہ نے اس کی بات سنی نہیں......طابہ زیرِلب بڑبڑا کر رہ گئی۔

''اُف...... یہ محبتوں کے ہتھیار......'' اس کا موڈ بدل گیا۔
عمامہ پیچھے مڑے بغیر سیدھی گیلری میں گم ہوگئی تھی۔ یہ بھی طویل کاریڈور تھا۔ جس کے دائیں، بائیں کمرے ہی کمرے تھے۔ وہ ماسٹر بیڈروم میں داخل ہوگئی۔ یہ اس کے طاہر سے پہلے اور طاہر کے بعد بھی نفیس ترین بھائی کے روم کا منظر تھا۔ یہ دونوں کمال کے نفیس اور صفائی پسند تھے۔ خاص طور پر اپنے، اپنے کمروں کی نفاست کے بارے میں بلا کے بچی تھے۔ طاہر تو چلو چھڑا چھانٹ تھا۔ تقی کا کمرا بچوں کی موجودگی کے باعث بھی کبھی بے ترتیب نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ بچے بھی بہت سلجھے ہوئے نفیس تھے۔ اپنے باپ کے مزاج کو سمجھتے تھے اور پھیلاوا ڈالنے سے پرہیز کرتے تھے۔
عمامہ نیم اندھیرے کمرے میں داخل ہوگئی تھی۔ پھر اس نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ پھیرا۔ ہلکی زرد روشنی چہار سو پھیل گئی تھی۔ تقی نے بے ساختہ آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔
''لائٹ تو بند کرو...... تمہاری اپنی روشنی بہت ہے۔'' فلو سے بھاری ہوتی آواز میں ہلکی شرارت موجود تھی۔
عمامہ کو گلا کھنکھارنا ہی پڑا۔
''تقی بھائی! میں ہوں عمامہ...... طابہ بھابی نہیں ہوں......'' اس نے مسکرا کر جتلایا تھا۔ تقی نے آنکھوں پر بازو رکھے رکھے کہا۔
''تمہاری روشنی بھی کم نہیں......''
''چلیں، مان لیتی ہوں۔'' وہ مسکرا کر قریب آئی تھی۔ ''طبیعت کا احوال سنا دیں بھائی......!''
''طبیعت بستر پر محو استراحت ہے۔'' تقی نے آواز میں خاصی نقاہت بھر لی تھی۔
''کیا ہوا؟'' عمامہ نے بھائی کا ماتھا چھوا۔ ٹمپریچر تو نہیں تھا۔ البتہ فلو کا اثر ضرور تھا۔
''تمہاری بھابی نے دیکھ، دیکھ کر نظر لگا دی ہے۔'' اندر آتی طابہ کو دیکھ کر تقی نے شرارتاً کہا۔
''میں نے کون سا پہلی مرتبہ دیدار کیا ہے۔ اتنے سالوں سے تو دیکھ رہی ہوں......'' طابہ ٹرے اٹھائے قریب آئی تھی۔
''حسد کی نگاہ کا کیا ہے...... لمبی مدت تک اس کا اثر قائم و دائم رہتا ہے۔ بندہ برسوں بدنظر کے حصار سے نہیں نکلتا۔'' تقی بھائی آج بہت موڈ میں لگ رہے تھے۔ عمامہ ہنسنے لگی۔ طابہ نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ تقی کی نگاہ پڑ گئی۔
''ایں...... یہ خطرناک گھوریاں مجھ تک محدود رکھو...... میری بہن کو مت گھورو......'' اس نے بے ساختہ طابہ کو ٹوکا تھا۔ وہ روہانسی ہوگئی تھی۔
''میں یہاں بیٹھتی ہی نہیں......'' طابہ ہمیشہ کی طرح برا مان گئی۔
''شیور......'' تقی نے مسکرا کر کہا۔ ''تم ہم دونوں بہن، بھائی کے بیچ ''ہڈی'' نہ ہی بنو......'' تقی کا مذاق بھی طابہ کو چبھا تھا۔ شاید اس میں حسِ مزاح...... سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ بار، بار عادتاً ناراض ہو جاتی تھی۔ پھر چھوٹی، چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا لیتی تھی۔
''میرا وجود تو ہمیشہ سے کھٹکتا ہے۔'' طابہ نے غصے سے کہا۔ چائے دونوں کو تھمائی اور ٹرے کو اٹھا لیا تھا۔ ''کبھی کسی کو اچھی نہیں لگی۔''
''تقی بھائی کو تو لگتی ہیں ناں......'' عمامہ نے ازراہِ مذاق کہا اور کہہ کر بری طرح سے پچھتائی تھی۔
''لوگ تو چاہتے ہیں...... نہ ہی لگوں......'' طابہ تڑخ سی گئی۔ تقی نے اس کا پھولا منہ ملاحظہ کیا اور مسکراہٹ سمیٹ کر پوچھا۔ ابھی وہ مذاق کے موڈ میں تھا اسی لیے طابہ کا ''نخرہ'' بھی برداشت کر رہا تھا۔ ورنہ وہ اتنی ''ڈھیل'' دیتا نہیں تھا۔
''ہائی داوے، کون سے لوگ اتنا برا چاہتے ہیں؟'' تقی نے بڑی حیرت سے دریافت کیا۔ خاص مصنوعی حیرت تھی۔
''اردگرد نگاہ ڈال لیں۔'' وہ طنز کر رہی تھی عمامہ اس کا طنز سمجھ رہی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کی ہنسی نہیں رکی۔
''مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے جنوب تک، تمہارا سراپا پھیلا ہوا ہے۔ نگاہ بیچاری اور کہاں، کہاں

تک جائے؟'' تقی نے پھیلتی ہوئی طابہ کے پھیلاؤ پر چوٹ کی تھی۔ وہ کلس کر رہ گئی تھی۔

''میں اب موٹی بھینس تو لگوں گی۔''

''اچھا ہوا...... تم نے خود کے لیے نفیس سا لقب تخلیق کر لیا...... میں کچھ کہتا تو تمہیں برا ہی لگتا......'' تقی نے اسے مزید چڑایا تھا۔ طابہ چڑ کر اٹھ گئی تھی۔ عمامہ کے سامنے اور بے عزتی گوارا نہیں تھی۔

''چلتی ہوں...... بہن کے ساتھ مل کر میری غیبتیں کر لیں...... یا بہن کے ساتھ مشاورت کے بعد کوئی سلم اسمارٹ بیوی ڈھونڈ لائیں...... میں تو موٹی بھینس ہوں جس کا سراپا شمال، جنوب تک پھیل چکا ہے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی غصے میں باہر نکل گئی تھی۔ تقی نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر ہنستی ہوئی عمامہ کو دیکھ کر خود بھی ہنس پڑا تھا۔

''ان کو کیا ہوا......؟'' وہ ہنسی روکتی بمشکل بولی تھی۔ تقی نے اپنی کنپٹی کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کا ایک پُرزہ یہاں سے ڈھیلا ہے۔''

عمامہ ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی...... آنکھوں میں آنسو بھر گئے، چہرہ لال ہو گیا تھا۔

''تقی بھائی! اُف...... بڑے مزے کی باتیں کرتے ہو مگر کبھی، کبھی......'' اس نے سراہنے کے ساتھ ساتھ آخر میں جتا بھی دیا تھا۔ تقی نے تسلیم کر لیا...... اور ہنس پڑا...... ان دونوں کی ہنسی نے طابہ کو سلگا ڈالا تھا...... وہ باہر کھڑی اس وقت تک پیچتی رہی تھی۔ جب تک اندر سے ہنسی کی آواز آتی رہی...... پھر وہ دانت پیس کر بڑبڑائی۔

''ہنس لو، مجھ پر ہنس لو...... تمہارے ہنسنے کے دن تھوڑے ہیں۔''

☆☆☆

عمامہ نے صبح سے طاہرہ کا پلو تھام رکھا تھا۔ اور وہ ہر دفعہ پلو چھڑواتی اور اپنے کام میں لگ جاتی تھیں۔ عمامہ بھی کسی ننھے میمنے کی طرح ان کے پیچھے، پیچھے تھی۔

دادی تخت پر بیٹھی ان کی کھسر پھسر ملاحظہ تو کر رہی تھیں تاہم ان دنوں ''مداخلت'' سے پرہیز چل رہا تھا۔ فیقہ سامنے کہیں نہیں تھی۔ بچے سب اسکول میں تھے اور کچھ اتنے چھوٹے تھے کہ پالنے میں آرام فرما رہے تھے۔ رافعہ ان دنوں بچے کی ولادت کے سلسلے میں میکے میں مقیم تھی۔ اماں دل سے دعا گو تھیں اس دفعہ رافعہ کے ہاں لڑکا پیدا ہو۔ اس ضمن میں اماں نے بہت سی نذریں مان رکھی تھیں کیونکہ طابہ بیٹوں کی وجہ سے بہت اتراتی تھی۔ عمامہ نے کالج سے بلاوجہ چھٹی کر لی تھی۔ اور اب طاہرہ کے کان میں گھسی تھی۔ وہ اسے بار، بار بادامی آنکھوں سے گھور کر دیکھتیں۔

''اماں! پلیز......'' وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کر رہی تھی۔

''عمامہ......! تنگ کرتی ہو، بہت ماروں گی۔'' انہوں نے خفگی سے کہا۔ اور بھیگے چاولوں کو سوکھا کر کونڈے میں پیستی رہیں۔ شاید فیرنی بنانے کا ارادہ تھا۔ وہ اپنے پوتے پوتیوں کے لیے کچھ نہ کچھ مزیدار سا بناتی رہتی تھیں۔

''اس میں حرج کیا ہے؟ میں نازی، فہمی، اور کنول کے گھر بھی تو جاتی رہی ہوں۔'' وہ بسور کر بولی تھی۔

''یہ محلے کی بات تھی۔ اُدھر دور ڈیفنس تک تمہاری دادی نہیں مانیں گی۔'' طاہرہ نے صاف انکار کر دیا۔

''ان کو نہ بتائیں۔'' عمامہ نے ایک حل پیش کیا۔

''تو ان کی آنکھیں بند نہیں......'' طاہرہ نے گھر کا۔

''سونیا بیمار ہے اماں......'' اس نے بے قراری سے کہا۔ ''کیا میں بیمار ہوتی تو سونیا کبھی نہ آتی؟ وہ تو رات ایک بجے بھی پہنچ جاتی۔''

''ان کے اور ہمارے ماحول میں فرق ہے بیٹا......'' وہ کچھ دھیمی پڑ گئی تھیں...... عمامہ کی یہ سہیلی انہیں بھی پسند تھی۔

''ماحول کیا کہتا ہے؟ کسی کی عیادت نہ کرو......'' عمامہ نے جتانے والے انداز میں کہا۔

''عمامہ......!'' ان کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

''نہیں جاتی......'' وہ دھپ، دھپ کرتی اٹھ گئی تھی۔ ''اگر میں بھی بیمار ہوئی تو سونیا سے شکوہ مت کیجیے گا۔'' اس کا انداز بچگانہ سا تھا۔ طاہرہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑیں۔ پھر دہل گئیں۔

''اللہ نہ کرے تم بیمار ہو......'' انہوں نے خفگی سے اسے گھورا تھا۔ پھر اندر جاتی عمامہ کو آواز دی۔

''اچھا سنو تو......'' ان کی پکار میں نرمی تھی۔ عمامہ جاتے، جاتے پلٹ آئی۔ ان کی نرمی میں ڈھیلا پن نمایاں تھا۔ عمامہ کو امید نظر آئی۔

''جاؤ گی کس کے ساتھ ؟'' اس کے قریب آتے ہی طاہرہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ عمامہ کا دل بلیوں اچھل پڑا۔

''شام کے ساتھ۔'' وہ بے تابی سے چہکی۔

''وہ فارغ نہیں بیٹا...... فیکٹری میں ہوگا......'' طاہرہ نے خفگی سے جتایا تھا۔

''آپ اسے کال کریں گی تو ضرور آ جائے گا۔'' عمامہ نے راہ دکھائی تھی۔ طاہرہ نے اسے گھورا۔

''نوکر نہیں تمہارا...... دس کام چھوڑ کر مہارانی کی ڈرائیوری کرے...... اسے گھر میں بے وقت دیکھ کر تمہاری دادی طوفان اٹھالیں گی...... آخر وہ ان کا داماد بننے والا ہے۔ اس پر زیادہ حق وہ اپنا سمجھتی ہیں۔'' طاہرہ دبی آواز میں کہتی چلی گئی تھیں...... دل اندر سے بہت برا ہو رہا تھا...... جو بھی تھا...... شام بس پرایا ہونے والا تھا۔

''اماں......'' عمامہ روہانسی ہوگئی تھی۔

''دیکھتی ہوں...... کچھ کرتی ہوں...... سنو، طاہر سے کہو...... وہ گھر میں ہی تھا۔'' انہیں اچانک یاد آیا۔

''طاہر بھائی ؟'' وہ کچھ چونک گئی تھی۔ ''کیا وہ مان جائے گا۔''

''ایک دفعہ کہو تو سہی......'' انہوں نے عمامہ کو گھُرکا...... وہ جلدی سے سلیپر اڑس کر اندر بھاگی تھی۔ گرل کے ساتھ لگے تخت پر بیٹھی دادی چوکنا ہوگئیں...... اندر بڑھتی عمامہ کو آواز دے کر روکا تھا...... وہ بادلِ ناخواستہ رک گئی تھی۔

''کہاں...... ''اڑتی'' جارہی ہو......؟'' آج کل دادی کے اندازِ تخاطب بھی بدل گئے تھے۔ خاص طور پر عمامہ کو بلاتے ہوئے وہ بہت غیر محتاط ہو جاتی تھیں۔

''اِدھر ہی ہوں......'' عمامہ جز بز سی ہوگئی۔

''کیا کھسر پھسر چل رہی تھی ؟'' انہوں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ اشارہ ان دونوں ماں، بیٹی کی میٹنگ اور باتوں کی طرف تھا۔ جو وہ سن نہیں سکی تھیں۔

''کچھ نہیں......'' وہ گڑبڑائی۔

''مجھ سے ہر بات چھپاتی ہو...... طاہرہ نے اپنے سارے گُر تمہیں سکھا دیے ہیں۔'' دادی کو اماں کے خلاف بولنے کا موقع مل گیا تھا۔ عمامہ سخت بدمزہ ہوئی۔

''میں پوچھ رہی ہوں کہاں کی تیاریاں ہیں؟ آج تم پڑھنے بھی نہیں گئیں......'' ان کی ایکسرے جیسی آنکھوں سے بچ جانا بھی محال تھا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں......'' وہ منہ ہی منہ میں بدبدائی۔

''چنگی بھلی تو ہو......'' انہوں نے عینکوں کے پار دوبارہ گھورا تھا۔

''طاہر بھائی کے ساتھ دوائی لینے جارہی ہوں......'' عمامہ کو بالآخر مناسب بہانہ مل گیا تھا۔ دادی کے بھلی چنگی کہنے کو وہ پی گئی تھی۔ بہت لمبی بحث میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

''طاہر گھر ہے کیا......؟'' اِک نئی تفتیش شروع تھی۔

''صبح تو گھر تھا......'' عمامہ نے کمزور آواز میں کہا۔

''اب تو نکل گیا......'' دادی کی اطلاع پر عمامہ کو غش آ گیا تھا۔ اب وہ سونیا کے گھر کس طرح سے جائے

گی؟ دادی نے اس کے تذبذب کو ملاحظہ کیا۔ پھر عینک اتار کر جتلاتے ہوئے بولیں۔
''شام کو فون مت کھڑکانے بیٹھ جانا...... نوکر نہیں تمہارا...... چھٹی کرو تب بھی تمہیں ہی ڈھوتا رہے......'' ان کا لہجہ بلا کا کاٹ دار طنزیہ تھا۔ عمامہ ہونٹ کاٹتی کھڑی رہ گئی۔
''تو پھر کیسے جاؤں......؟'' وہ روہانسی ہوگئی تھی۔
''چھ بھائی ہیں تمہارے ماشاء اللہ سے ......کوئی بھی ڈیوٹی دینے حاضر ہو جائے گا...... شام کا پلو چھوڑ دو اب...... اس کی تمہارے علاوہ بھی ذمے داریاں ہیں۔'' انہوں نے تلخی سے کہا تھا۔ عمامہ سن سی ہوگئی تھی۔ دادی کے کاٹ دار اشاروں کو سمجھتی تھی۔
''وہ سب تو فیکٹری ہیں......'' وہ زیرلب بڑبڑائی۔
''تمہارے بھائی مصروف ہیں تو شام بھی ویلا نہیں...... اپنی ماں سے کہو، ساتھ چلی جائے۔ مجھے تو بیمار نہیں لگتی۔'' دادی نے ناک بھوں چڑھالی تھی۔ یہی دادی تھیں عمامہ کو چھینک بھی آتی تو تڑپ اٹھتیں۔ اور اب کیا حالات تھے؟ کیسا سنگین وقت تھا؟ سب کچھ بدل گیا۔ نہ رویے وہ رہے تھے، نہ رشتے وہ رہے تھے۔ عمامہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔
معاً اندھیری گیلری سے تقی نکلتا دکھائی دیا تھا۔ تقی گھر میں تھا؟ دادی اور عمامہ تک ناواقف تھیں۔ وہ دونوں ہی چونک گئیں...... اور چونک تو تقی بھی گیا تھا۔ اس کی کھڑی ناک کا بانسا کھنچ سا گیا۔ سفید سرخ رنگت میں حدت دوڑ گئی تھی۔ کیا اس نے دادی کی کوئی بات سن لی تھی؟
''کیا ہوا؟'' وہ دادی کے بجائے عمامہ سے پوچھ رہا تھا۔ عمامہ لمحوں میں ہونق ہوگئی تھی۔ دادی کو ہی بات سنبھالنا پڑی۔
''یہ عمامہ کی طبیعت خراب ہے، ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ......'' انہوں نے جان چھڑوانا چاہی...... تقی، عمامہ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ عمامہ بری پھنس گئی تھی۔
''میں لے چلتا ہوں...... کیا ہوا؟'' تقی نے تفکر سے پوچھا...... عمامہ جز بز ہوگئی تھی۔
''پوچھ لو، کیا ہوا...... مجھے تو کچھ ہوا...... دکھائی نہیں دیتا۔'' دادی نے تیور بگاڑ کر پوچھا...... ان کے انداز بڑے کٹیلے تھے...... تقی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
''آپ ڈاکٹر نہیں ہیں...... جو آپ کو کچھ ہوتا دکھائی دے۔ نہ آپ کی ''حکمت'' بہت اعلیٰ پائے کی ہے۔ جو نبض دیکھے بِنا مرض کو جان سکیں......'' تقی کا انداز ذرا برہم تھا۔ تو گویا وہ دادی کی کچھ باتیں سن چکا تھا۔ طابہ بھی بچے کو کندھے سے لگائے باہر آگئی تھی۔
''اور عمامہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے محتاط رہا کریں...... وہ اس گھر میں مہمان ہے۔ عنقریب وداع ہو جائے گی۔ کم از کم اچھی یادوں کے حوالے سے کنگال نہیں بھیجے گا۔'' وہ بہت کچھ یاد کرواتا طابہ اور دادی کو سلگتی نگاہوں سے دیکھتا عمامہ کے قریب آیا تھا۔ پھر اس کا ماتھا چھو کر بولا۔
''بخار نہیں ہے...... پھر بھی ڈاکٹر کو دکھا آتے ہیں۔'' بھائی کے تفکر اور محبت پر عمامہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔
''میں ٹھیک ہوں...... ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں......''
''پکا......؟'' وہ ملائمت سے پوچھ رہا تھا۔ طابہ سے محبت کا یہ مظاہرہ دیکھا نہیں گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ناگواری در آئی تھی۔
''پکا......'' عمامہ نے جیسے یقین دہانی کروائی...... تقی اس کا سر تھپتھپا کر باہر نکل گیا تھا۔ عمامہ نے گہری سانس کھینچی۔

دادی کٹیلی نظروں سے جز بز ہوتی اس کو گھور رہی تھیں۔ طابہ بھی پاؤں پٹختے باہر نکل گئی تھی۔
''بڑی بخت آور ہے......'' اس نے تلخی سے سوچا تھا۔
''اب جاؤ بھی......'' دادی نے اسے گھر کا۔''میرے سر پر سوار کیوں ہو۔'' تقی کے الفاظ پر انہیں تپ چڑھی ہوئی تھی۔ یہ تپ اتنی جلدی اترنے والی نہیں تھی۔
معاً شام لاؤنج میں داخل ہوا۔ طاہرہ بھی تھال اٹھائے فون والے کمرے سے برآمد ہو گئی تھیں۔ ان کے پہنچتے تک معاملہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔
''آپا! آپ کا فون آیا تھا تاخیر کے لیے معذرت چاہتا ہوں...... کچھ ڈیلر پہنچ گئے تھے بغیر اطلاع کے...... انہیں نپٹا کر آیا ہوں...... اب حکم کریں......'' وہ عجلت میں بولتا طاہرہ سے مخاطب تھا۔ فیقہ بھی شام کی آواز سن کر دروازے کے فریم میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ طاہرہ نے سنبھل کر ساس کی طرف دیکھا اور کہا۔
''عمامہ کو ذرا لے جاؤ......'' انہوں نے کوئی وضاحت نہیں کی تھی۔ عمامہ کو کہاں جانا تھا۔ شام نے بھی پوچھا نہیں...... عمامہ کو باہر آنے کا اشارہ کر کے وہ خود واپس چلا گیا تھا۔ دادی اور فیقہ کی طرف دیکھے بغیر جبکہ دادی کے سینے پر جیسے سانپ لوٹ گئے تھے۔ طاہرہ اور عمامہ کے نکلتے ہی وہ جیسے پھٹ پڑیں۔
''جب تک یہ ''بلا'' رہی تمہیں آباد ہونے نہیں دے گی۔'' وہ ہاتھ ملتے ہوئے صدمے سے نڈھال تھیں۔ اگلے تین گھنٹے دادی کے تبصروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے طابہ بھی موقعِ واردات پر پہنچ چکی تھی۔ کم از کم ایک دن تو ''انجوائے منٹ'' میں گزر سکتا تھا۔

☆☆☆

سونیا کو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔ وہ عمامہ سے ایسے بھینچ بھینچ کر ملی تھی جیسے صدیوں سے جدا ہوں...... دراصل یہ خوشی عمامہ کو اپنے گھر میں دیکھ کر ہو رہی تھی۔ سونیا کے بے حد اصرار پر بھی شام رکا نہیں تھا...... اسے کام تھا سو چلا گیا...... جبکہ عمامہ سہ پہر تک یہیں تھی۔
سونیا کے ڈیڈی اور آپی گھر نہیں تھے۔ ان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ تاہم اس کی آپی کے فوٹو دیکھ کر عمامہ بہت متاثر ہوئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کامنی سی لڑکی وکیل تھی۔
سونیا کے ساتھ پورا دن آزادانہ ماحول میں گزارنا...... ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ انہوں نے وی سی آر پر فلم بھی دیکھی تھی۔ کارٹون اور اسٹیج ڈراموں سے بھی لطف اندوز ہوئی تھیں۔ پھر سونیا کے ہاتھ کا مزیدار اٹالین لنچ انجوائے کیا تھا۔ بعد میں عمامہ کو اس ضروری بات کا خیال آیا۔ جس کے سبب نہ تو سونیا کالج آ رہی تھی اور نہ ہی تندرست لگ رہی تھی۔
''اب بتا بھی چکو...... تم مریضہ مریضہ کیوں لگ رہی ہو؟ سب خیر تو ہے؟'' عمامہ نے بے تابی سے سوال کیے۔
''خیر کہاں ہے......؟'' سونیا نے ٹھنڈی آہ بھری۔
''کیا ہوا؟'' عمامہ بے تابی سے بولی تھی۔ کیونکہ اسے بھی خیر نہیں لگ رہی تھی۔
''ایک پرابلم ہو گئی ہے عمامہ......!'' سونیا سے صبر نہیں ہو سکا تو خود ہی بتا دیا۔ عمامہ پریشان ہو گئی۔
''کیا ہوا ہے؟''
''اصل میں میری بہن کو محبت ہو گئی ہے......'' سونیا نے اپنے تئیں بڑا پریشان کن دھماکا کیا تھا۔ عمامہ حیران رہ گئی۔
''تو اس میں پرابلم کیا ہے؟'' اس نے ہونق پن سے پوچھا۔
''ایگزیکٹلی! یہ پرابلم میرے ساتھ بھی ہو چکی ہے۔ پرابلم یہی تھی۔ جو فون پر بتا نہیں سکی۔'' سونیا نے بے بسی سے کہا۔
''مطلب؟ کیا دونوں کو ایک ہی بندے سے محبت ہو گئی؟'' عمامہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

(جاری ہے)

ناولٹ

بوجھ

روحیلہ خان

تیسرا اور آخری حصہ

دروازے کی گھنٹی بج رہی تھی شرجیل احمد کو ابھی گئے پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے تھے۔ ''یقیناً پھر اپنا سیل فون یا کوئی ضروری کاغذ بھول گئے ہوں گے صاحب......'' وہ سوچتی ہوئی بیرونی دروازے کی جانب بڑھی اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا لیکن دروازے پر ایک بزرگ شخص کو دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکی۔ شکل صورت سے تو پاکستانی ہی دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ شرجیل احمد کا گھر ہی ہے ناں......'' ان کا لہجہ خاصا شریفانہ تھا۔

''جی...... آپ کون...... میں پہچانی نہیں؟''

''بیٹا...... آپ کون ہیں، شکل سے تو مسلمان لگتی ہو...... ہندو تو نہیں ہو ناں؟'' ان کا سوال چونکا دینے والا تھا گویا سوال کے جواب میں سوال وہ بھی ٹیڑھا۔

''نہیں بزرگوار...... الحمدللہ میں مسلمان ہوں......''

وہ پٹ سے بولی اور ان بزرگ کے چہرے پر خوشی کھل اٹھی۔

''میں پاکستان سے آیا ہوں بیٹا......'' اپنائیت و خلوص ان کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

''آپ...... آپ کہیں ان کے پاکستان والے ماما تو نہیں ہیں۔'' اسے فوراً یاد آیا تو وہ بھرپور مسکرا دیے۔

''ہاں بیٹا......! میں ہی اس کا ماما ہوں...... ویسے جب وہ چھوٹا سا تھا ناں تو مجھے بابا کہتا تھا۔'' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے شرجیل کے بچپن کی وضاحت کی۔

''ارے آیئے ناں ماما جی......! میں تو کب سے آپ سے ملنا چاہتی تھی......'' اس نے جھٹ دروازہ کھولا

اور انہیں اندر بلایا وہ بہت خوش تھی دل میں آیا کہ فوراً فون کر کے شرجیل کو مطلع کرے معاً بعد میں وہ ناراض نہ ہو...... ڈرائنگ روم ہی انہیں بٹھانے کے بعد بولی۔

''میں ابھی شرجیل کو فون کر کے بتاتی ہوں۔''

''نہ بیٹا! اسے کچھ نہ بتانا...... میں دراصل تم سے ہی ملنے آیا ہوں......'' وہ ان ماما، بھانجے کے رشتے سے خاصی کنفیوز ہو رہی تھی۔

''مجھ سے ملنے...... آپ مجھ سے ملنے پاکستان سے آئے ہیں؟'' وہ حیرت واستعجاب سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''تم سے ملنے نہیں...... بلکہ اطمینان کر لینے کے لیے...... اور خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی بیٹا......''

''سوری ماما جی! آپ کی باتیں مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہیں...... خیر آپ آرام سے بیٹھیں...... میں آپ کے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتی ہوں......'' وہ جانے کو اٹھی تو انہوں نے پھر اسے روک دیا۔

''نہیں بیٹا! مجھے کچھ نہیں کھانا...... کیا نام ہے تمہارا...... مجھے اپنے بارے میں بتاؤ...... اپنے خاندان کے بارے میں بتاؤ...... میں نے یہ سب جاننے کے لیے بہت انتظار کیا ہے......'' وہ بے چینی سے بولے ان کی باتیں پُراسراریت کی حد تک عجیب تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا کرے ایک شخص جس کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا، نہ ہی بات چیت کی یہاں تک کہ ان کے نام سے بھی ناواقف ہے کیسے اپنی پرسنل معلومات ان سے شیئر کرے، اسے متفکر دیکھ کر وہ مسکرانے لگے۔

''تم یقیناً مجھ بڈھے کی باتوں سے پریشان ہو گی، غلطی میری ہی ہے...... چلو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں اور شرجیل کا کیا لگتا ہوں۔''

''نہیں ماما جی...... دراصل۔'' اسے کچھ خفت سی ہوئی۔ اس نے عذر پیش کرنا چاہا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا......! میرا نام کرم الٰہی ہے میرا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ ریٹائرڈ سرکاری ملازم ہوں تھوڑی بہت باپ کی طرف سے زمینداری بھی ہے۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے، بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم دونوں میاں، بیوی کو اولاد کی بڑی خواہش تھی پر جو اوپر والے کی رضا۔ میری گھر والی بڑی جنتی عورت تھی وہ چاہتی تھی کہ میں دوسری شادی کر لوں...... پر بیٹا، شاید میرے نصیب میں سگی اولاد نہیں تھی۔ کسی نے کہا کے کوئی بچہ گود لے لو اور ہم دونوں اولاد کے ترسے فوراً مان گئے۔''

اتنا کہہ کر وہ ذرا رکے اور ایک سرد آہ بھری۔

''رشتے دار، عزیز سب کے آگے جھولی پھیلائی پر اولاد بھیک میں کب ملتی ہے۔ تب میری بیوی کے کسی جاننے والے کے ذریعے ایک خاتون سے ملاقات ہوئی جو کہ اسپتال میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی تھی اس نے کہا کہ وہ ہمیں بچہ دلوا سکتی ہے لیکن اس کے لیے اسے رقم دینی ہو گی ... ہم فوراً مان گئے اور پھر ایک دن اس نے ہمیں ایک نومولود بچہ لا کر دیا...... وہ بچہ ہم نے خوشی، خوشی گود لے لیا۔ پوچھا نہ ہی کوئی معلومات حاصل کیں...... اوپر والے کی نعمت سمجھ کر اپنا لیا۔ اس کی نازوں سے پرورش کی...... میری گھر والی نے بڑے چاؤ سے اس کا نام اکرم الٰہی رکھا تھا۔ اکرم ہمارے گھر کا سکون تھا۔ چین تھا، تم جانتی ہو بیٹا وہ بچہ کون تھا؟'' انہوں نے اپنی آنکھوں سے چشمہ اتارا اور ابھرتی نمی کو خشک کرنے لگے۔

''کون؟'' اسے یوں محسوس ہوا جیسے دن کا اجالا کسی سحر انگیز دھندلکوں میں گم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ تو سب کچھ پہلے سے ہی جانتی تھی۔ اونچے میناروں پر سے مٹی آہستہ، آہستہ جھڑ رہی تھی۔

''وہ بچہ شرجیل ہے، تمہارا شوہر......''

وہ خواب کی سی کیفیت میں صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اس کی نظریں جیسے سامنے دیوار پر گڑی تھیں۔

''شرجیل...... کیا آپ واقعی سچ کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں، بیٹا...... یہ سچ ہے، کاش میں اپنے بچے کو ساری عمر اپنے پاس رکھ سکتا...... پر شاید یہ میری آزمائش ہے۔ اور اب تو یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ اکرم الٰہی کی بھی آزمائش ہے۔''

''میں آپ کے لیے پانی لے کر آتی ہوں......'' وہ ان سے بہانہ بنا کر چلی گئی دراصل خود اسے پانی پینے کی

ضرورت تھی، اس نے غٹاغٹ دو گلاس پی ڈالے پر آنکھوں سے نکلنے والے پانی کو نہ روک سکی۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی اور پانی لے کر ڈرائنگ روم میں لوٹی۔

''شکریہ بیٹا......'' ماما جی نے پانی پی لیا اور پھر کہنے لگے۔ ''جب اکرم ڈھائی سال کا ہوا تو اس کے ماں، باپ اسے واپس لینے آ گئے۔ میں کیسے اپنے دل کے ٹکڑے کو ان کے حوالے کرتا پر مجبور تھا، دراصل اسپتال میں کام کرنے والی رشیداں بی بی نے خود اپنی بھانجی کے جگر گوشے کو چند ہزار روپوں کی لالچ میں ہمارے حوالے کر دیا تھا اور جب اس کا آخری وقت نزدیک آیا تو اس نے ساری سچائی اسے بتا دی...... ہم کیا کرتے بیٹا......! بات پولیس تھانے تک پہنچ گئی تھی۔ عزت پر بن آئی تھی پھر سچ بھی یہی تھا کہ اکرم کی اصل ماں جس نے اسے جنم دیا تھا اچھو مسیح کی بیوی رشیداں کی بھانجی ثریا ہی تھی۔''

''اچھو مسیح......'' اونچے مینارے دھڑام سے زمین بوس ہو رہے تھے، کانوں میں اب بلند گڑگڑاہٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

''میرا اکرم الٰہی، ولیم مسیح بن گیا اور میں کچھ نہ کر سکا۔ وہ میرے گھر کی رونق تھا، جان تھا، جسے قدرت نے مجھ سے چھین لیا۔ ثریا اور اچھو برے لوگ نہیں تھے وہ جانتے تھے کہ میرے گھر کے لیے ان کے بیٹے کی کیا اہمیت ہے۔ کتنا پیار ہے ہمارے دلوں میں اس کے لیے، شاید اسی لیے انہوں نے ہمیں ملنے سے نہ روکا۔ پہلے پہل تو اکرم الٰہی بہت مچلتا تھا پھر ماں تو ماں ہوتی ہے چاہے وہ صفیہ بی بی ہو یا ثریا...... وہ ہم سے دور ہوتا گیا۔''

''اور یہاں تک آ گیا...... لیکن ماما! وہ اصل میں کون ہے اکرم الٰہی......؟ ولیم مسیح یا شرجیل احمد......؟''

اس نے ان کی ادھوری بات، بیچ سے اچک لی۔ وہ اپنے اندر کے اضطراب سے بوکھلا رہی تھی۔

''میں صفیہ کے انتقال کے بعد بھی اپنے بچے سے ملتا رہا لیکن مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ شرجیل احمد کب بنا...... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا...... لیکن تمہیں دیکھ کر تم سے ملنے کے بعد لگتا ہے کہ میرا بچہ تو شرجیل احمد ہی ہے...... تم میری بات سن رہی ہو ناں بیٹا...... مجھے خوشی ہے کہ اس نے میرا تعارف تم سے کروا دیا......''

''لیکن اپنے گھر والوں کے متعلق تو کچھ بھی نہیں بتایا......'' وہ تو پوری کی پوری ٹوٹ چکی تھی۔ شکستہ کسی پرانی آسیب زدہ حویلی کے مانند جس کے اطراف بھیگے، نم خوردہ بھیانک سائے ہوں۔

''اچھو تو مر چکا ہے، اس کی دو بڑی بہنیں اور ایک بھائی شادی شدہ ہیں...... ایک چھوٹی بہن ہے اس کی بھی بات طے کر دی ہے۔'' انہوں نے اس کی فیملی کے بارے میں بتایا۔

''آپ اس کی فیملی کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں؟'' اسے حیرت ہو رہی تھی۔

''ہاں بیٹا...... غریب لوگ ہیں، میرا اب ہے ہی کون تھوڑی بہت ان کی مالی امداد کرتا رہتا ہوں لیکن یہ کوئی احسان نہیں ہے...... اب بھی مجھے اپنے اکرم سے اسی طرح محبت ہے جیسے اس وقت تھی۔ جب وہ ننھا منا سا تھا۔'' وہ بڑی اپنائیت سے اس کا ذکر کر رہے تھے۔

''اور انہیں آپ سے محبت ہے کیا؟'' اس نے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔

''شاید ہاں...... اسی لیے اس نے تم سے بھی میرا ذکر کیا...... اور شاید نہیں اس لیے کہ اب وہ مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتا...... پتا نہیں کیوں...... میں اتنا تو جانتا تھا کہ وہ ملائشیا آیا ہے پر... کہاں رہتا ہے کیا کرتا ہے یہ کچھ خبر نہ تھی۔ اس نے شاید سب کو منع کر رکھا تھا۔ تب ہی کسی نے بھی مجھے اس کا پتا نہیں دیا تھا...... یہ دیکھ لو بیٹی......! میں آ گیا ناں اسے ڈھونڈتے، ڈھونڈتے......''

وہ اس کے یوں مل جانے پر بہت مسرور تھے کچھ توقف بعد وہ بولی۔

''وہ اکرم سے ولیم بن گیا تھا۔ پھر شرجیل کیسے بنا......؟'' اس کے استفسار پر وہ سوچ میں پڑ گئے۔

''اس کے بارے میں تو شاید ثریا بھی نہیں جانتی...... یا شاید بچے کی طرح اس بات کو بھی چھپا رہی ہو......'' وہ بے چینی سے اپنی انگلیاں چٹخانے لگی تھی، اتنی بڑی حقیقت سے وہ ناواقف رہی...... وہ کون ہے

جس نے اس سے محبت کی وعدے کیے، نکاح جیسا مقدس رشتہ قائم کیا اور اب جبکہ ان کی محبت کی نشانی اس دنیا میں آنے والی ہے یہ کیا ہو گیا تھا۔ ایسے جیسے کسی نے اسے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا ہو۔ وہ زمین پر ہی تھی یا خلاؤں میں کہیں معلق...... اس کی سانس گھٹنے لگی تھی اور وجود میں چونٹیاں سی رینگتی محسوس ہو رہی تھیں۔ شرجیل احمد کا نماز پڑھنے پر اعتراض، سورۂ یٰسین کا پانی پر ناراضی اور اس طرح کے عجیب و غریب رویے ساتھ نہ چھوڑنے کے وعدے وعید...... بس ایک کے بعد ایک نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

''میں اب چلتا ہوں بیٹا! یہ میرا نمبر ہے رکھ لو...... وہ آئے تو کہنا کہ دل چاہے تو اپنے ماما کو فون کر لینا، ابھی میں ایک دو دن تو یہیں ہوں......'' انہوں نے سفید چٹ پر لکھا ایک نمبر اس کی جانب بڑھایا۔

''آپ کھانا تو کھا کر جاتے...... کھانے کا ٹائم ہونے والا ہے ماما جی......'' اس نے نمبر تھاما اور انہیں کھانے کی دعوت دی پر وہ نہ رکے اور اسے دعائیں دیتے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ مٹی کے مادھو کے مانند صوفے میں دھنس گئی۔ زندگی اس کے ساتھ کیا کھیل رہی تھی، کتنے ارمانوں سے یہ گھر سجایا تھا۔ بننا سنورنا، سجنا کس قدر مسحور کن تھا کہ وہ سب کچھ اپنے مجازی خدا کے لیے جی جان سے کرتی تھی ایسے گھر کا تو اس نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا اپنا آپ سب کچھ شرجیل احمد پر صدقے واری کر دیا تھا۔ اس کی خدمت کرنا، پیار محبت کرنا جیسے اپنا فرض ہی سمجھ لیا تھا پر اب اسے اس رشتے سے وحشت سی ہو رہی تھی۔ شرجیل احمد کے ساتھ گزارہ ایک، ایک پل اس کے وجود میں کچوکے مار رہا تھا۔ آج صبح جب وہ آفس گیا تھا تب بھی اس کا منہ کچھ بنا ہوا تھا اس نے سوچ رکھا تھا کہ اس کے آنے سے پہلے خوب تیار ہو کر اس کے آگے پیار سے ہاتھ جوڑ دے گی۔ اور......

''دروازہ کھلا ہوا تھا......'' وہ نہ جانے کب اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی اتری صورت دیکھ کر پھر خود ہی بولا...... ''کیا بات ہے عینی...... تم ایسے کیوں بیٹھی ہو یہاں......؟''

''ہوں......'' وہ تصور ہرگز نہ تھا بلکہ اس کے سامنے ہی تھا...... اکرم الٰہی، ولیم مسیح یا شرجیل احمد......؟

''کیا ہوا...... کچھ پوچھ رہا ہوں...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟'' وہ اپنے کاغذات بھول گیا تھا جب لینے گھر لوٹا تو کھلا دروازہ دیکھ کر کچھ پریشان ہو گیا تھا۔

''کون ہو تم......؟'' اس کی آنکھوں میں وحشت تیر رہی تھی۔

''کیا ہوا...... کیسی بہکی، بہکی باتیں کر رہی ہو عینی......؟'' وہ اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

''کون ہو تم، اکرم...... ولیم...... یا شرجیل......؟''

وہ ہکا بکا رہ گیا اس کا تو خیال تھا کہ لڑکیاں بڑی بدھو ہوتی ہیں اپنی تمام تر عقلمندی اور سمجھداری کے باوجود ان کے ساتھ باؤلے کا ٹیگ لگا ہوتا ہے۔ قرۃ العین بھی ایسی ہی ایک لڑکی ہے۔

''کیا بکواس کر رہی ہو...... کس نے تمہارے کان بھرے ہیں......''

''سچائی تو کھل کر رہتی ہے ناں مسٹر اکرم الٰہی...... نہیں ولیم مسیح یا شرجیل احمد......'' اس کی آنکھیں مستقل رونے سے سوج بھی رہی تھیں۔ اب اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے عینی...... تمہیں کسی نے بہکایا ہے......'' اس نے اپنے تئیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

''یہ ہے فون نمبر آپ کے ماما جی کا...... چاہیں تو کال کر لیں...... ویسے انسان کو اتنا بھی احسان فراموش نہیں ہونا چاہیے......'' اس نے بڑی تیزی چٹ اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

''اوہ...... ماما جی...... تو وہ یہاں بھی پہنچ گئے......''

وہ غصے سے پھنکارا ساری کہانی تو اب کھل ہی چکی تھی جسے چھپاتے، چھپاتے وہ تھکنے لگا تھا۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا میرے ساتھ۔ بولیے کیوں کیا؟'' اس نے اس کا شانہ پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا پر اس کے اندر تو ہولناک سناٹا سیٹیاں بجا رہا تھا۔

''میں نے کتنا پیار کیا آپ سے...... آپ کو اپنا آپ سونپ دیا پر آپ...... آپ تو پتا نہیں کون ہیں۔''
وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپے رونے لگی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھاما لیکن اس نے سختی سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

''مجھے ہاتھ بھی نہ لگانا مجھے سچ، سچ بتاؤ کہ تم کون ہو...... کون ہے شرجیل احمد جس کے ساتھ میں نے نکاح کے بول پڑھے، کون ہو تم......؟''

نفرت کی آگ اس کے وجود سے دہکتی اس کے دل تک پہنچ رہی تھی۔ وہ قرۃ العین تھی یا ایک دھوکا کھائی عورت ایک بولڈ عورت اور پھر اس نے ہار مان لی۔ اس نے اس کی جانب سے اپنے چہرے کا رخ موڑ لیا کیونکہ اب وہ اس کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

''تم جان ہی چکی ہو سب کچھ اور یہ سچ ہے کہ میں شرجیل احمد نہیں ہوں۔'' یہ الفاظ تھے یا دہکتا سیسہ جو کسی نے اس کے کانوں میں انڈیل دیا تھا۔

''تو پھر...... یہ شرجیل احمد کون ہے؟'' اسے اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔ آنکھیں حیرت و خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔

''میں جانتا تھا کہ پاکستان میں کچھ نہیں کر پاؤں گا تو میں نے باہر جانے کی سوچی لیکن میرے پاس ایسا کچھ بھی نہیں تھا کہ باہر جا کر کوئی اچھی جاب کر سکوں ایک ایجنٹ میرا دوست تھا اس نے کسی کے کاغذات مجھے دکھائے جن کی بنیاد پر میں کچھ کر سکتا تھا اور میں نے ان کاغذات کو......''

''اوہ...... اب سمجھی کہ شرجیل احمد ایک مظلوم، غریب، مجبور اور بے روزگار شخص ہے، جس کی ڈگریاں اس کے لیے سوائے ردی کے اور کچھ نہیں...... سنا تھا کہ ایسا ہوتا ہے لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ یہ...... میرے ساتھ ہی ہونا تھا۔'' اسے اب اس کی فضول کہانی سننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ سمجھ چکی تھی کہ کرم الٰہی ماما نے کس طرح اس کے باپ کے فرائض نبھائے وہ صوفے پر گر کر پھر سے رونے لگی۔ اسے یوں بکھرتا دیکھ کر اس کا دل کٹنے سا لگا تھا، وہ گھٹنوں کے بل صوفے پر بیٹھ گیا۔

''میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا عینی...... میں، میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، بہت محبت......''

''ایک اور جھوٹ، جھوٹ پہ جھوٹ...... تم اکرم الٰہی نہیں ہو...... میرے لیے یہی کافی ہے...... اب اور کیا جھوٹ بولو گے...... جس شرجیل احمد کے نام پر تم نے مجھ سے نکاح کیا...... تم وہ ہو ہی نہیں...... تم نے جان بوجھ کر میرے ساتھ ظلم کیا...... تمہیں اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا......'' وہ بچوں کے مانند سسکیاں لیتی بول رہی تھی اس نے ایک بار پھر اسے چھونا چاہا لیکن وہ جنگلی بلی کے مانند غرائی...... ''ہاتھ نہیں لگانا مجھے...... میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''عینی...... یہ ظلم نہ کرو مجھ پر...... میں تمہارے بنا جی نہ پاؤں گا......'' وہ رو دینے کو تھا۔

''اور اگر میں تمہارے ساتھ رہی تو میں مر جاؤں گی......'' اس کا انداز حتمی تھا وہ دنگ رہ گیا۔

''میں نے تم سے شادی کی ہے...... نکاح کیا ہے......'' اس نے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''جھوٹ پر رکھے ہر رشتے کی بنیاد کھوکھلی ہوتی ہے مسٹر ولیم...... میں نے شرجیل احمد کے نام سے نکاح کیا تھا...... اور تم تو اس کا بہروپ ہو...... تم نے تو مجھے ناپاک کر دیا...... مجھے آلودہ کر دیا...... میرے خدایا...... میرے خدایا مجھے معاف کر دے......'' وہ بری طرح روتے روتے توبہ تلا کر رہی تھی۔ روتے، روتے اسے غشی سی آ گئی۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی شہناز بیگم نے سبزی بناتے بناتے عمرانہ کو آواز دی لیکن شاید وہ کسی کام میں مصروف تھی۔ اب کی بار دستک زوردار تھی۔

''آتی ہوں...... آتی ہوں...... کیا دروازہ توڑنے کا ارادہ ہے۔'' وہ اپنی چپلیں گھسڑ پھسڑ کرتی آئیں اور دروازہ کھولا پھر دنگ رہ گئیں ان کے سامنے ان کی اپنی جان کھڑی تھی اس کے چہرے پر وہ چمک نہ تھی جسے دیکھنے کے لیے وہ اتنے مہینوں سے ترس رہی تھیں اجڑی، اجڑی مضمحل سی قرۃ العین...... ان کا ہاتھ بے ساختہ اپنے کلیجے کی جانب بڑھا۔

''ہائے میرے ربا...... قرۃ العین میری بچی......''
وہ منہ سے کچھ نہ بولی اوران کے گلے سے لپٹ گئی اس کا بری طرح سے رونا خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔
''عینی، کیا ہوا میری جان......؟'' وہ اسے لے کر اندر آئیں اتنے میں کمرے سے نکل کر عمرانہ آئی تو بہن کو یوں اچانک بلکتا دیکھ کر ہراساں ہوگئی۔
''عینی...... کیا ہوا......؟''
''عمرانہ جاکر بہن کا بیگ اندر لاؤ......'' شہناز بیگم نے عمرانہ کو حکم دیا اور اسے بیڈ پر بٹھایا۔
''تم اچانک اس طرح پاکستان میں...... بغیر کسی اطلاع کے اور...... شرجیل کہاں ہے...... وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا......'' انہوں نے اپنے دل کو سنبھالتے پوچھا۔
''امی...... بہت برا ہوا...... بہت برا ہوا میرے ساتھ......'' وہ بری طرح رو رہی تھی۔
''میرا دل ہول رہا ہے عینی......! پہیلیاں نہ بجھواؤ بیٹا......'' ان کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔
''امی......! شرجیل، شرجیل بہروپیا ہے...... جھوٹا ہے...... فریبی ہے...... اس نے دھوکا دیا ہے مجھے......''
''عینی...... کیا ہوا...... شرجیل بھائی کہاں ہیں......'' عمرانہ گھبرائی سی کمرے میں داخل ہوئی۔
''وہ اب کبھی نہیں آئے گا...... امی میں اب اس کے پاس نہیں جاسکتی...... ورنہ بہت گناہ ملے گا مجھے......''
''پر کیوں بیٹا! خدانخواستہ...... تم دونوں کے درمیان جھگڑا تو نہیں ہوگیا...... کچھ تو بولو......''
''امی......! وہ شرجیل احمد نہیں ہے بلکہ ولیم ہے، ولیم مسیح......''
''کیا، کیا ولیم مسیح......'' شہناز بیگم بیڈ پر تیورا کر گر پڑی تھیں ان کا ایک ہاتھ اپنے دل پر تھا۔
''امی، امی، عمرانہ، امی کو کیا ہوا......؟'' وہ بری طرح چلّا رہی تھی۔
ایمبولینس کا سائرن گلی میں شور مچا رہا تھا۔ محلے والے اپنے گھروں سے نکل، نکل کر جھانک رہے تھے۔
''خدا خیر کرے کیا ہوا...... طفیل صاحب کے گھر ایمبولینس آئی ہے۔''
''شہناز خالہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے......''
''کیسے......؟''
''کب......؟''
''کیوں؟''
سوال ابھر رہے تھے، لوگ متجسس تھے ایک نیا تماشا نیا لائیو ڈراما شروع ہو چکا تھا۔
''ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب! پلیز میری امی ٹھیک تو ہیں ناں...... پلیز انہیں بچالیں۔'' وہ اسپتال کے کاریڈور میں ڈاکٹر کی منتیں کر رہی تھی۔
''دیکھیے اٹیک شدید تھا، ہمیں فوری طور پر انجیو پلاسٹی کرنا ہوگی...... آپ فوری طور پر پیمنٹ جمع کرادیں تاکہ ہم پروسس کرسکیں۔''
''کہاں سے آئے گی اتنی لمبی چوڑی رقم......'' عشنہ بھابی، ساجد بھائی کے کان میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔
''پلیز ساجد بھائی......! کچھ کریں...... کچھ کریں ناں......'' اس نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
''ارے یہ کیا کرسکتے ہیں، کہاں سے لائیں گے اتنے پیسے...... ٹکسال کھلی ہے ناں ان کی......'' عشنہ بھابی نے اپنے شوہر کو آنکھیں دکھائیں۔
''عینی...... بہت بڑی رقم ہے...... کیسے بندوبست کروں...... تم ہی بتاؤ......'' ساجد بھائی بیچارگی سے بولے۔
''ارے یہ کیا بولے گی...... اسی کی وجہ سے تو انہیں دل کا دورہ پڑا ہے، اپنی مرضی سے گل کھلانے چلی تھی ناں، کرلو اب اپنی مرضی...... ماں بسترِ مرگ پر پڑی ہے تمہاری وجہ سے۔'' عشنہ بھابی اب براہ راست اسے سنانے لگیں اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔
''ایسا نہ کہیں عشنہ بھابی...... خدا ہماری ماں کو لمبی عمر دے...... دشمنوں کے منہ میں خاک......'' عمرانہ کو ان کا جملہ اپنے دل پر محسوس ہوا اور وہ چپ نہ رہ سکی۔
''دیکھ لیا اپنی بہنوں کو...... میرے منہ میں خاک ڈال رہی ہیں......''
''میں نے دشمنوں کو کہا ہے بھابی...... کون کیا ہے، آپ خود ہی فیصلہ کرلیں۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

"ہم...... ہم اپنا پورشن بیچ دیں گے ساجد بھائی...... ہاں آپ بس پیسوں کا بندوبست کریں۔"

"کمال کرتی ہو عینی! گھر بیچ دو گی تو...... رہو گی کہاں......" ساجد بھائی نے ذرا برا سا منہ بنایا۔

"کرائے کے گھر بہت ہیں جی...... عقلمند ہے...... سمجھدار ہے...... جب کہہ رہی ہے تو کر لیں ناں......" عشنہ بھابی نے اپنے شوہر کو ٹہوکا دیا۔ اتنے میں نرس دوڑتی ہوئی آئی اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا...... کیا ہوا نرس، بولیے؟"

"میں ڈاکٹر صاحب کو بلانے جا رہی ہوں...... پیشنٹ کی حالت بہت خراب ہے۔"

اتنے میں ڈاکٹر تیزی سے آتا دکھائی دیا۔ نرس دوڑ کر اس کے پاس گئی اور کچھ کہا پھر دونوں لپک کر چلے گئے۔

"عمرانہ...... یہ کیا ہو رہا ہے......" اس کا رنگ فق پڑا تھا چکر سا آ گیا تو عمرانہ نے اسے تھام لیا۔

"تم پریشان نہ ہو......" عمرانہ نے اسے دلاسا دیا۔

"میں...... میں جاتا ہوں پیسوں کا بندوبست کرنے...... تم ڈاکٹر سے کہو کہ آپریشن شروع کریں۔"

ساجد بھائی ابھی جانے کو مڑے ہی تھے کہ آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر برآمد ہوا۔

"سوری...... ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ کا پیشنٹ ایکسپائر ہو گیا۔"

"امی، امی، امی......" وہ بڑی زور سے چیخی تھی اس نے آنکھیں کھول کر بڑے غور سے اپنے ارد گرد دیکھا یہ کون سی جگہ ہے، وہ سوچنے لگی اور پھر اسے رفتہ، رفتہ یاد آنے لگا کہ روتے، روتے وہ بے ہوش ہو گئی تھی پھر کمرے میں اپنے بیڈ تک کیسے پہنچی...... شرجیل...... نہیں...... ولیم...... ولیم ہی مجھے ڈائننگ روم سے یہاں لے کر آیا ہے۔" اسے اپنے وجود سے کراہیت سی آنے گی اور محسوس ہوا کہ جیسے سب کچھ [illegible] وہ باتھ روم کی جانب دوڑی۔

"میں آپ کی بات کبھی نہیں مان سکتا...... آپ جھوٹ بول رہے ہیں، آپ نے ہی اسے میرے خلاف بھڑکایا ہے...... آپ نے کان بھرے ہیں میری بیوی کے...... آپ نے ہی اسے بتائی ہے میری اصلیت...... نہیں مانتا میں آپ کی محبت آپ کے پیار کو...... آپ کے پیار نے میری ہنستی، بستی زندگی میں آگ لگا دی، آپ جانتے ہیں کہ آپ کی وجہ سے میری بیوی بے ہوش پڑی ہے اور اگر آپ کی وجہ سے میرے بچے کو کچھ بھی ہوا تو میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا...... میرے ماں، باپ غریب تھے، جنہوں نے بچپن میں مجھے آپ کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن میں غریب نہیں ہوں...... میں اپنے بچے کو کسی کے حوالے نہیں کروں گا...... کسی کے بھی حوالے انہیں کروں گا...... سنا آپ نے اور ہاں پولیس کو انفارم کرنے کی غلطی نہ کیجیے گا......" وہ ٹیرس میں کھڑا غالباً ماما جی سے ہی بات کر رہا تھا۔ اس کا انداز دھمکی آمیز تھا۔ جو کچھ اس کے کانوں نے سنا اس نے اس کا دل ہلا دیا۔

"اُف خدایا...... یہ شخص، کس حد تک گر سکتا ہے...... اس پر اب کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے...... بجلی کی سی تیزی سے خیال اس کے ذہن ہی کوندا اور وہ جلدی سے دوبارہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور پھر سے اسی طرح لیٹ گئی...... تاکہ اسے پتا نہ چل سکے کہ اس نے اس کی کوئی بات بھی چھپ کر سنی ہے۔

ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ کمرے کے دروازہ کھلا...... وہ اس کے نزدیک آیا اور اس کی نبض ٹٹولی۔ ماتھا چیک کیا۔ اور پھر کمرے سے نکل گیا اسے بیرونی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ غالباً وہ ڈاکٹر کو لینے گیا تھا یا شاید وہ اندازہ نہ کر سکی لیکن یہ وقت اس کے لیے اہم تھا وہ تیزی سے اٹھی۔

☆☆☆

اس نوجوان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے راستہ سمجھایا اور وہ تیزی سے اپنا بیگ سنبھالتی چلی گئی۔

بیرونی مرمریں رنگ کا دروازہ دیکھ کر اسے کچھ سکون آیا، دروازے کے ساتھ منی پلانٹ کی خوب صورت بیل منڈھی تھی۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ انہوں نے یہ ہی پتا اور نشانی بتائی تھی۔ ڈور بیل پر انگلی رکھی لیکن

دروازے پر کوئی نہ آیا دوسری بار...... پھر لگاتار، وہ بیل بجاتی رہی۔ لیکن جواب ندارد، اس کی ہمت ٹوٹنے لگی اس نے نزدیک سے گزرتی ایک خاتون سے پوچھا لیکن وہ ناواقف تھیں آخر اس نے ہمسائے کے دروازے پر دستک دی۔

''وہ تو آج صبح ہی اپنے بیٹے کے ساتھ چھٹیوں پر گئی ہیں۔''

''چلی گئی...... کب...... کب تک واپس آئیں گی......؟'' بمشکل تھوک نگلتے پوچھا۔

''کہہ رہی تھیں کہ ویک اینڈ گزار کر آئیں گی۔''

''یعنی پورا ہفتہ......'' اسے چکر سا آ گیا...... اس نے جلدی سے دیوار کا سہارا لیا۔'' بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی میڈم روبانہ سے اگر پہلے بات کر لیتی تو...... پر کب بات کرتی...... بم تو آج ہی پھٹا ہے۔ میرے مالک کیا کروں اب......'' کچھ نہ سوجھا...... اس پر سوختگی سوار ہو گئی تھی۔'' کاش ماماجی کا نمبر ہی رکھ لیتی تو کوئی تو بات بنتی پر...... ماماجی کا نمبر بھی جذباتی پنے میں اسے ہی تھما دیا۔ اوپر سے میڈم روبانہ کا فون بھی نہیں لگ رہا...... کوئی تو بات ہوتی......'' اسے احساس تھا کہ اپنے احمقانہ پنے میں اس نے خود سارے راستے مسدود کر دیے سوائے اندھیروں کے اب کچھ بھی نہیں تھا۔ پہلے خود کھائی کا انتخاب کر کے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری اور اب ایک اور ناکامی۔'' کیا کروں کدھر جاؤں......'' اس کا ذہن چل رہا تھا تب ہی پولیس سے مدد لینے کا خیال ذہن میں کوندا......'' کہیں ولیم کا تعلق کسی خطرناک گینگ سے تو نہیں اور اسے بھی اس کا ساتھی سمجھ کر الٹا دھر لیا جائے تو......'' وہ پسینے میں نہا گئی۔'' یہ کیا کر لیا عینی تو نے اپنے ساتھ......'' ولیم کا دھمکی آمیز لہجہ ذہن میں محفوظ تھا جو شخص اپنے محسن کے ساتھ اس قدر تلخی سے پیش آ سکتا ہے وہ اس کے ساتھ کیا کر سکتا ہے...... ذہن میں کھچڑی سی پکنے لگی تھی......

''پاکستان چلتے ہیں...... لیکن کیسے...... مجھے تو یہاں کچھ سمجھ نہیں آ رہا......'' شام کے اندھیرے اب پھیلتے ہوئے رات کی تاریکی میں قدم رکھ رہے تھے...... پتا نہیں کتنی دیر سے وہ چلے جا رہی تھی۔ اپنے ہی اندر اپنے ہی آپ سے لڑتی جھگڑتی، بکتی، جھکتی...... پر اب نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک پوری طرح اپنا زور لگا رہی تھی۔ چلتے، چلتے پیر شل ہو رہے تھے رکنا نہیں تھا بس چلتے چلے جانا تھا...... کہاں، کدھر، کس سمت کچھ خبر نہیں تھی۔ اور جب قدموں نے جواب دے دیا تو تھک کر فٹ پاتھ کے نزدیک بینچ پر ذرا ستانے کو رکی...... اپنے بیگ سے سیل فون نکالا۔ شرجیل نے اسے کئی بار کال کی تھی اور کئی پیغامات بھی چھوڑے تھے لیکن اب اسے اس کے کسی فون یا پیغام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بادل گھر، گھر آ رہے تھے۔ ماحول کچھ اور بھی ڈراؤنا ہو گیا۔

''اے میرے رب......! میری خطاؤں کو معاف کر دے۔ مجھے معاف کر دے۔ میرے مالک...... اپنی بندی کو معاف کر دے۔ اپنے پیارے رسولؐ کے واسطے...... میں شیطان کی چمک دمک میں الجھ گئی تھی بہک گئی تھی۔ مجھ سے انجانے میں یہ گناہ سرزد ہوا ہے، میرے رب...... آپ ہی میرے اپنے ہیں، آپ ہی تو ہیں بس میرے اپنے جو سب کچھ جانتے ہیں...... میں کس سے کہوں کس سے کہوں...... مجھے بہت ڈر لگتا ہے، بدنامی سے...... بہت ڈر لگتا ہے...... سوائے آپ کے کوئی میری عزت نہیں بچا سکتا...... کوئی نہیں بچا سکتا......'' اور پھر اچانک ہی آسمان سے چھم، چھم پانی برسنے لگا۔

اس کی چیخیں بلند تھیں پر آواز کوئی نہیں تھی اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی آنسو خود بخود بہے جا رہے تھے پورا جسم جیسے لرز رہا تھا یہ کون سی منزل تھی جس پر وہ چل پڑی تھی اسے کچھ سمجھ نہیں پڑ رہا تھا۔ زندگی میں آج پہلی بار اپنے رب کو اس قدر نزدیک پایا تو سارے خوف چھوٹ گئے تھے بس وہ ہمکلام تھی تو اپنے بنانے والے سے اپنے تخلیق کار سے جو کبھی اپنے بندے کو اس کا پکارنے پر اکیلا نہیں چھوڑتا اور پھر مدد کے لیے کسی نہ کسی کو بھیج دیتا ہے۔

''کیا آپ کو کسی مدد کی ضرورت ہے

ایک مہربان نسوانی آواز ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس سے مخاطب تھی۔ اس کی آنکھیں پانی کے تیز چھپاکوں سے مندی جارہی تھیں۔ کوئی خاتون برساتی چھتری لیے اس سے ہی مخاطب تھیں۔ وضع قطع سے وہ مقامی دکھائی دیں۔ خود بخود اس کی گردن اثبات میں ہی ہل گئی۔ ان خاتون نے اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا۔

”توبہ کرو عینی......! رمضانوں میں تو یوں چپڑ چپڑ کھلے عام نہ کھایا کرو......“ عمرانہ نے اسے ٹوکا۔

”کیوں نہ کھاؤں بھئی...... جب میں زیادہ دیر تک بھوکی نہیں رہ سکتی تو کیا کروں بتاؤ...... اللہ تعالیٰ کو سب پتا ہے کہ اس کی بندی فوراً فاقوں مرنے لگتی ہے......“ وہ مزے لے، لے کر سینڈوچ اڑا رہی تھی۔

”ذرا ڈر نہیں لگتا تمہیں کہ مرنے کے بعد کیا حشر ہوگا......“ عمرانہ نے اسے ڈرانے کی ناکام کوشش کی۔

”مرنے کے بعد دیکھا جائے گا ناں سسٹر...... ابھی تو کھاپی لو...... موج اڑالو......“ گرم گرم چائے اور سینڈوچ کی مہک اسے ماضی سے کھینچ لائی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔

”نہیں، نہیں کھانے کے سامنے کوئی آنسو نہیں......“ انہوں نے ذرا مسکراتے ہوئے اس کی پیٹھ شفقت سے سہلائی۔ اسے احساس تھا کہ وہ صبح کی بھوکی ہے اور اس حالت میں جبکہ اس کے وجود سے ایک اور جان بھی منسلک ہے اسے کھانے پینے پر کس قدر توجہ دینے کی ضرورت ہے شاید بھوک تو لگی تھی پھر خود ہی گزرتے وقت نے اس احساس کو بھی مار دیا تھا۔ پہلے روزہ رکھنے کے تصور سے ہی اس کی جان جاتی تھی پورے مہینے میں چند روزے ہی رکھ پاتی اور باقی کا ٹلا...... کہ بھوک پیاس برداشت نہیں کرسکتی تھی اور آج سارا دن کس طرح گزرا...... کیسی بھوک...... کیسی پیاس۔

”کھاؤ پلیز......“ خاتون نے اسے پھر احساس دلایا کہ اس کے سامنے رزق رکھا ہے اور خود اس کے نزدیک بیٹھ گئیں ان کا نام امینہ تھا گزشتہ دس، بارہ برسوں سے وہ اس بڑے سے گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں جو ان کی نوکری میں شامل تھا خود ان کی ایک بیٹی شادی شدہ تھی جو اپنے شوہر کے ہمراہ یہیں جارج ٹاؤن میں رہتی تھی شوہر کو گزرے پانچ برس ہوچکے تھے اور اب وہ اپنی اس ملازمت کے ساتھ بہت خوش رہتی تھیں۔ ماحول میں سردی سی بڑھ گئی تھی امینہ نے بجلی کا آتش دان جلایا تھا۔ وہ خوش تھی کہ اس کی مہمان پاکستانی ہے لیکن اس کے کپڑے پہن کر وہ ملائین دکھائی دیتی ہے۔ اسے امینہ کی آنکھوں سے ممتا چھلکتی نظر آرہی تھی اور وہ پُرسکون وہیں سوگئی۔

ہلکی، ہلکی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی بارش کے بعد موسم سہانا ہوگیا تھا، آسمان شفاف نیلی چھتری کے مانند چمک رہا تھا۔ رنگ برنگے پھولوں کی خوشبوئیں مل کر ماحول کو معطر بنا رہی تھیں۔ آسمان پر پرندے اڑتے چلے جارہے تھے ندی کے کنارے ڈھیروں کشتیاں کھڑی تھیں اپنے مسافروں کی منتظر...... اس نے ذرا نظر دوڑائی تو شفاف پانی کی سطح پر کتابیں تیرتی دیکھ کر اس کی تو چیخ ہی نکل گئی۔

”یہ...... یہ کیسی کتابیں پانی پر تیر رہی ہیں۔“ اس نے چلاتے ہوئے پوچھا تھا پر کسی سے کوئی نظر ہی نہیں آیا اسے کتابوں کو یوں تیرتا دیکھ کر سخت حیرت ہو رہی تھی۔

”یہ مقدس کتابیں ہیں......“ کسی نے جواب دیا اس نے اس چہرے کو کھوجنے کی کوشش بھی کی پر ناکام رہی۔

”مقدس کتابیں؟“ وہ بڑبڑائی اور خود گویائی کے سے انداز میں بولی۔ ”یہ کون سی مقدس کتابیں ہیں مجھے تو ان کی سمجھ ہی نہیں آرہی...... ان کا نام نظر ہی نہیں آرہا۔“

”تم کس کتاب کو ڈھونڈ رہی ہو......؟“ سوال پوچھا گیا۔

”میں...... میں کس کتاب کو ڈھونڈ رہی ہوں......“ اس نے اپنے ذہن پر ذرا زور ڈالتے سوچا۔

”تم بتاؤ...... مجھے کیا معلوم......؟“ پھر سوال پوچھا گیا۔

”میں، میں کیوں ڈھونڈوں......؟“ اس نے اپنے سینے سے لگی کتاب کو ٹٹولتے کہا۔ ”میرے پاس تو یہ ہے...... یہ...... دیکھو...... یہ میرا قرآن پاک ہے...... مجھے کسی اور کتاب کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں

ہے...... ہاں ...... یہ ہے میرے پاس ......'' اسے محسوس ہوا تھا جیسے ایک لمحہ پہلے ہی وہ کہیں کھو گئی تھی لیکن قرآن پاک کی موجودگی نے اسے اس کی شناخت لوٹا دی تھی وہ جیسے پھر سے جی اٹھی تھی۔ اس نے پانی میں شفاف عکس دیکھا اور مطمئن ہو گئی۔

☆☆☆

صبح نہ جانے کتنی دیر میں اس کی آنکھ کھلی، وہ کاؤچ پر ہی سو گئی تھی کسی نے اس کے اوپر پتلا سا کمبل ڈال دیا تھا اس نے دیکھا آتش دان بجھ چکا تھا۔ دن کی روشنیاں کمرے میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں ... تو گویا اس نے خواب دیکھا تھا۔ وہ حیرت زدہ تھی۔

امینہ اس کی کمپنی کو بہت انجوائے کر رہی تھی، وہ اسے کھانا پکانے کی ترکیبیں سکھاتی باغبانی کے طریقے سمجھاتی، کپڑوں کو استری کرتے کن باتوں کے خیال رکھا جاتا ہے اسے حیرت ہو رہی تھی کہ جن امور پر کبھی اس نے توجہ ہی نہیں دی لوگ کتنی باریکی سے انہیں پرکھتے ہیں۔ اسے ایک ہی دن میں یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ یہاں برسوں سے رہ رہی ہو...... اس دوران شرجیل نے اسے کئی فون کیے لیکن اس نے فون کی آواز ہی بند کر دی تا کہ پھر سے ماضی کی تلخیاں اس کے وجود میں خراشیں نہ ڈالیں لیکن کب تک اور آخر ایک دن وہ ڈھونڈتا ہوا اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم، تم یہاں بھی پہنچ گئے......؟'' حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے وہ چیخ اٹھی۔

''میں، میں تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتا۔''

آج سے چند دنوں پہلے اگر وہ اس طرح شدتِ محبت سے کہتا تو اس کا دل موم ہو جاتا لیکن اب اسے اس کا ڈراما صاف نظر آ رہا تھا جواب بے اثر تھا۔

''تمہیں مجھے کہیں بھی ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر ولیم مسیح کیونکہ اب ہمارے راستے الگ ہو چکے ہیں اور تم اب جا سکتے ہو۔'' اس نے دیو قامت آبنوسی دروازے کو دھکیل کر بند کرنے کی کوشش کی لیکن وہ لپک کر درمیان میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا اس کے چہرے پر مایوسی و غم کے مہیب سائے پھیلے تھے وہ بیمار و مضمحل نظر آ رہا تھا۔

''ایسے کیسے ہمارے راستے الگ ہو جائیں...... ایسے کیسے تم مجھے چھوڑ سکتی ہو عینی...... میری بیوی ہو تم، شادی کی ہے ہم دونوں نے......'' اس کا لہجہ ٹوٹے دل کی عکاسی کر رہا تھا۔

''راستے پہلے ہی الگ تھے بس مجھے ہی نظر دیر سے آئے۔ پلیز چلے جاؤ یہاں سے...... نفرت ہے مجھے تمہارا وجود سے...... گھن آتی ہے تمہاری وجہ سے مجھے اپنے آپ سے۔'' اس نے اپنا پورا زور دروازے کو بند کرنے پر لگایا۔

''نہیں چھوڑ سکتا میں تمہیں، تم میری زندگی ہو...... پلیز...... پلیز عینی لوٹ آؤ...... ہم پھر سے اس طرح ہنسی خوشی زندگی گزاریں گے...... ہم اپنے بچے کو ایک خوب صورت دنیا دیں گے۔''

''نام نہ لو بچے کا...... تم اس نعمت کے اہل ہی نہیں...... تمہاری سازشوں کا پردہ کھل چکا ہے، تم ایک دھوکے باز انسان ہو، دفع ہو جاؤ ورنہ میں۔''

''پولیس کو کال کرو گی...... بلوا لو پولیس کو، لگوا دو مجھے ہتھکڑیاں، یار نہیں رہنا مجھے تمہارے بغیر...... یہ زندگی بوجھ ہے تمہارے بغیر...... تم جیسا کہو گی میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔''

''جس کے دل پر مہر لگی ہو...... اس کا کیا ہو سکتا ہے۔ اور تمہارے دل پر مہر لگی ہے۔''

''عینی...... خدارا......'' اس نے التجا کی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے......؟'' ایک گونج دار آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا...... ''کون ہیں آپ لوگ میرے گھر میں کیا کر رہے ہو......'' طویل قامت سوٹڈ بوٹڈ بارعب شخصیت کنپٹی پر کچھ سفیدی سی تھی نوارد نے اپنے سن گلاسز اتارے...... اور غصیلی نظروں سے ان دونوں کو گھورنے لگے۔

''وہ میں......'' وہ اس کے رعب سے متاثر ذرا منمنائی۔

''یہ، یہ میری بیوی ہے جناب......! مجھ سے روٹھ کر یہاں آ گئی...... آپ اسے میرے حوالے کر دیں پلیز......''

اس نے فوری موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو وہ ششدر رہ گئی۔ وہ شخص اب اسے تنقیدی

نظروں سے کھوجنے لگا۔

''کون ہو تم...... اندر کیسے داخل ہوئیں...... یہ میرا گھر ہے کوئی دھرم شالہ نہیں...... کہاں ہے امینہ...... امینہ......'' انہوں نے ذرا زور سے پکارا تو امینہ کہیں سے تقریباً دوڑتی ہوئی برآمد ہوئی۔

''یس سر......!'' بیرونی دروازے پر اس عجب ڈرامے کی منطق انہیں اچانک سمجھ نہ آئی۔ وہ ہونقوں کی طرح دیکھنے لگی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے یہاں، کون لوگ ہیں یہ......؟'' وہ زور سے دہاڑے۔

''دیکھیے آپ اس طرح میری بیوی کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے...... میں، میں پولیس کو کال کروں گا۔''

خوف سے اس کا وجود سن سا ہو گیا تھا۔ شرجیل، ولیم کس قدر عیار و چالاک تھا اس نے تو جیسے اپنے سارے چولے اتار پھینکے تھے۔

''واٹ ربش، تم پولیس کو کال کرو گے...... میں پولیس کو کال کرتا ہوں اور تم دونوں کو گرفتار کرواتا ہوں۔'' انہوں نے غصے سے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ڈائل کرنے لگے۔

''سر، سر...... یہ لڑکی بہت مظلوم اور معصوم ہے...... ایسا نہ کریں پلیز......'' امینہ نے التجا کی تو ان کی انگلیاں رکیں۔

''اے مسٹر...... نکلو یہاں سے...... فوراً نکلو......'' وہ پوری قوت سے دہاڑے، امینہ کی گواہی نے اثر دکھایا۔

''یہ میری بیوی ہے، آپ کسی کی بیوی کو اپنے گھر میں قید نہیں رکھ سکتے......'' وہ جذباتی انداز میں اچھل، اچھل کر بولنے لگا۔

''یہ، یہ جھوٹ ہے سر...... میں اس کی بیوی نہیں ہوں...... یہ جھوٹا ہے، دھوکے باز ہے، فراڈ ہے۔'' اسے اپنے دفاع کے لیے جتنے الفاظ آتے تھے سب کہہ ڈالے۔ اس وقت وہ شخص اسے اپنے لیے سیسہ پلائی دیوار محسوس ہوا۔

''تم جیسے نمبر ٹو لوگوں سے نبٹنا مجھے خوب آتا ہے...... نکلو، نکلو ادھر سے ورنہ ابھی اپنے گارڈز کو بلواتا ہوں۔'' وہ انگلی کے اشارے سے ذرا سختی سے بولے جس کا اس پر اثر ہوا۔

''ابھی تو میں جا رہا ہوں...... لیکن پھر آؤں گا...... پولیس لے کر آؤں گا اور اپنی بیوی کو لے کر جاؤں گا۔'' وہ دھمکیاں دیتا جلتا بھنتا لوٹ گیا اس کے جانے کے بعد اس کی جان میں جان آئی۔

کمرے میں اب خاموشی کی دیوار سی تنی تھی وہ صوفے سے ٹیک لگائے چھت کی جانب دیکھ رہے تھے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ وہ ان کے عین سامنے والے صوفے پر مجرموں کے مانند سہمی دبکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اتنے میں امینہ کافی لے کر آئی اس نے کافی کا مگ ان کے سامنے کیا۔

''کافی پلیز......'' انہوں نے عینی سے پوچھا۔

''نو تھینکس سر......'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''دیکھیے بی بی! آپ کی کہانی سن کر مجھے واقعی بہت دکھ ہوا...... آپ کے ساتھ ظلم ہوا......'' وہ کافی سے ابھرتے دھوئیں کے مرغولوں کو تکتے ہوئے بولے۔ ''جو ہو چکا ہے، اب لوٹایا نہیں جا سکتا لیکن......'' انہوں نے ذرا رک کر اس کی جانب دیکھا...... ''آگے کے لیے تو سوچا جا سکتا ہے ناں...... آپ ہی بتایئے کہ آپ نے کیا سوچا ہے اپنے بارے میں۔''

''کچھ بھی نہیں......'' اس کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی تو اسے اپنے رویے پر کچھ ندامت سی ہوئی۔

''آئی ایم سوری...... آپ کو ہرٹ کرنا میرا مقصد نہیں ہے لیکن...... ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو ہوتا ہے ناں...... ظاہر ہے اس مسئلے کا بھی کوئی حل تو ہوگا ہی......'' اتنا کہہ کر انہوں نے کافی کا سپ لیا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا سر......'' آنسوؤں پر کب اختیار تھا وہ تو خود بخود بہے چلے آئے۔

''ہوں، ایک بات تو کلیئر ہے کہ وہ شخص شرجیل احمد یا ولیم مسیح جو بھی ہے انسان برا ہے...... اور میرا یہ ماننا ہے کہ آپ کے پورے کیس میں مذہب سے زیادہ اس شخص کی جعل سازی انوالو ہے......''

''لیکن وہ......'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن انہوں

نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔
''میرا عقیدہ ہے بی بی کہ رب العزت اس دنیا میں جس بچے کو بھی پیدا کرتا ہے وہ مذہباً مسلمان ہی ہوتا ہے...... بعد میں اسے کوئی سلیم بنائے یا شرجیل...... شنکر بنائے یا ولیم مسیح...... اور پھر جس پر اللہ کی رحمت ہو اسے کوئی کچھ بھی بنا لے اس کے لیے سچائی کا راستہ خود بخود کھلتا چلا جاتا ہے۔ ہاں البتہ ولیم نے اپنے ساتھ اور آپ کے ساتھ ظلم کیا۔ ورنہ راستہ تو اس کے لیے کب سے کھلا تھا......'' وہ شاید کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔
''وہ اب اعتبار کے قابل ہی نہیں...... اس نے مجھے بار، بار احساس دلایا ہے کہ وہ کسی کے ساتھ مخلص نہیں......''
''یہ تو ہے...... پھر آپ کیا چاہتی ہیں...... آپ بتائیں...... آپ فیصلہ کریں ...... اچھا ایسا کریں...... آپ اپنے آپ کو کچھ وقت دیں پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہو سکتا ہے۔'' انہیں فی الحال یہ ہی سوجھا۔
''کچھ بھی ہو...... اس کے پاس دوبارہ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ اپنے اس فیصلے پر ڈٹی تھی کہ وہ غلط نہیں ہے۔
''او کے...... آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف کوئی بھی مجبور نہیں کر سکتا۔ پھر دیکھتے ہیں ان ولیم صاحب کو آپ یہاں آرام سے رہ سکتی ہیں......'' انہوں نے کافی کا کپ ہاتھ میں تھاما اور اتنا کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

''یاسر یزدانی نام ہے ان کا...... آپ کا پاکستانی ہے، بہت سوئیٹ ہے سر...... ان کی ایک بیٹی بھی ہے ابھی آنے والی ہے۔ عائشہ نام ہے بہت سوئیٹ گرل ہے۔'' امینہ سلاد بناتے بہت محبت سے اسے بتا رہی تھی۔
''ایک بات پوچھوں......؟''
''پوچھو ڈیئر......!''
''آپ نے مجھ سے میرے بارے کچھ کیوں نہیں پوچھا تھا؟'' اسے یاسر یزدانی سے ملنے کے بعد امینہ کے رویے پر تشویش سی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اتنا اعتبار اتنا بھروسا ایک اجنبی سڑک پر چلتی لڑکی کا کیسے کر لیا۔
''تمہارا کیا خیال ہے...... کچھ پوچھنا چاہیے تھا...... انسان کے چہرے پر سب لکھا ہوتا ہے ڈیئر......''
''اور اگر پڑھنے میں غلطی ہو جائے تو......'' نجانے اسے اب بھی اپنے ساتھ ہونے والی بیتا پر تاسف تھا۔
''یہ نصیب کی بات ہے ڈیئر...... تم اپنا دل چھوٹا نہ کرو......''
امینہ نے اسے دلاسا دیا اور وہ ان کی سلاد بنانے میں مدد کرنے لگی۔ اس سارے دن پھر اس کا یاسر یزدانی سے سامنا نہ ہوا۔ امینہ نے بتایا تھا کہ ان کی بیگم کا دو سال قبل ایک کار حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بہت امیر خاتون تھی اور یہ گھر بھی اس کا ہی تھا جو اب عائشہ یزدانی کے نام ہے گو ابھی تک کاغذی کارروائیاں مکمل نہیں ہیں لیکن اسے نازش یزدانی کی موت کے بعد سے ہی عائشہ کی ملکیت سمجھا جاتا ہے، امینہ بولتی رہی اور وہ اپنی سوچوں میں گم کہیں اور کھوئی رہی۔
''ماما جی کے بھڑکانے پر تم مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کر سکتی ہو...... میں ساری زندگی صرف تم سے محبت کرتا رہوں گا۔''
''میں تمہیں ایسے نہیں چھوڑ سکتا تم جانتی ہو کیوں؟''
''تمہیں ہمارے بچے کی قسم لوٹ آؤ عینی۔''
''تم تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ میں تمہاری کیسی، کیسی وڈیوز سنبھال کر رکھی ہیں، میں تمہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔''
ایک کے بعد ایک پیغام اس کی گھٹیا سوچ کی ترجمانی کر رہا تھا وہ تھک گئی تھی۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کے مانند سفید ہو رہا تھا۔
''ڈیئر......'' معاً امینہ کی اس پر نظر پڑی......
اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اسے کسی اندھیرے کنویں سے پکار رہا ہو، جب اس کی آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اسپتال کے ماحول میں پایا۔
''اب کیسی ہو تم؟'' امینہ نے شفقت سے اس کے بال سنوارتے ہوئے پوچھا تو اس نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ اس کا بی پی گر گیا تھا اتنے دنوں کی دوڑ بھاگ نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اسے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی یہ تو ان لوگوں کا احسان تھا کہ انہوں نے اسے اپنے گھر میں رہنے دیا اور پھر سے اسپتال کے اخراجات......

''سر بہت پریشان تھے لیکن ڈاکٹرز نے تمہیں اوکے کردیا تو وہ بھی مطمئن ہوگئے......'' امینہ نے بتایا وہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ گھر لوٹیں تو یاسر یزدانی ان کے منتظر تھے۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے بی بی؟''

''شکر ہے اللہ کا...... لیکن میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی...... بلاوجہ میں ہی اتنے پیسے ضائع ہوئے......''

''کمال کرتی ہیں آپ...... پیسے خرچ کرنے کے لیے ہوتے ہیں اور یہاں تو دو انسانی جانوں کی بات تھی آپ کوئی ٹینشن نہ لیں......کل پرسوں میں میرا لائر بھی آنے والا ہے، آپ سے بات کرے گا...... پھر جیسے آپ کا دل چاہے آپ کرلیں...... یہاں رہیں یا پاکستان میں۔'' وہ خوش دلی سے بولتے گئے اور وہ احساسِ کمتری کے سمندر میں ڈوبتی چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ جس اسپتال میں اسے علاج معالجے کے لیے لے جایا گیا تھا وہ خاصا مہنگا تھا۔ نازش یزدانی کی ملکیت کا یہ بڑا سا گھر بھی خاصے پوش علاقے میں تھا یہاں کی ایک، ایک چیز اپنی بلند قیمت کو بیان کرتی تھی۔ روپے پیسے کی ریل پیل سی تھی۔ وہ بہت متاثر تھی اس گھر اور اس کے مکینوں سے......

عمرانہ کا فون آیا تھا وہ پریشان تھی کہ اس نے اتنے دنوں سے بات کیوں نہیں کی اور وہ بہانے بناتی رہی کیسے بتاتی کہ قسمت نے اسے کہاں پہنچا دیا۔ وقت ایک بہت بڑا مرہم ہے لوگوں کو کہتے تو سنا تھا لیکن اب یقین آتا جارہا تھا اس نے گزرے وقت کو اپنی یادداشت سے جھٹکنے کی پوری کوشش کی تھی۔ بارگاہ الٰہی میں پورے خلوص سے جھکنے میں اب مزہ آنے لگا تھا۔ نماز کی پابندی جاری تھی کیونکہ وہی تو اس کا اپنا ہے جس نے ہاتھ پکڑ کر دوزخ سے ایک...... محفوظ مقام پر پہنچا دیا تھا بس آنکھ بند کر کے اب اپنے رب کی جانب دیکھتی اور ساری باتیں ان سے ہی شیئر کرتی ایسا کرنے سے اس کے دل کو سکون ملتا اپنا آپ ہلکا محسوس ہوتا۔ عصر کی نماز پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو شرمندگی و ندامت کے احساس نے گھیر لیا۔ جسے محبت... سمجھا وہ تو پلید جذبہ تھا۔

غلاظت تھی کہ جس نے پورے وجود کو آلودہ کردیا یہ محبت تو نہ تھی یہ تو شہوت تھی۔ درندگی تھی، ہوس تھی۔ ''بہت غلطیاں کیں پر ایسی غلطی، ایسا عذاب کیسے نکل پاؤں گی کیسے...... مجھے آپ ہی سنبھالیے......آپ ہی اس درد کا مداوا کریں کہ مجھے کوئی کنارہ نظر نہیں آتا۔'' وہ بڑے جذب سے اپنے رب سے مخاطب تھی دنیا و مافیہا سب بھربھری مٹی کے مانند ڈھیر ہوچکا تھا اب تو دہکتی جہنم کی آگ اس پار جیسے اس کی منتظر تھی جس سے بچنے کی کوئی ترکیب سمجھ نہیں آرہی تھی۔ پر وہ رب جس نے کن فیکون قرآن پاک میں لکھ کر محفوظ کر کے بندوں کو اپنی محبت کی اتھاہ گہرائیوں سے بھی واقف کرادیا کہ اس کی بادشاہت میں ناممکن، ممکن کے مرتبے پر کھڑا ہوجاتا ہے کہ اسے ذرا بھی علت نہیں کہ وہ اعلیٰ مدبر رب ذوالجلال والاکرام ہے آنسو اس کے آنچل کو نم کررہے تھے اور وہ اسی طرح بیٹھی روئے چلی جارہی تھی۔ کچھ دیر اپنے رب سے اپنا آپ کہہ کر من ہلکا کر کے کچھ سکون ملا تو اس نے اپنا چہرہ دوپٹے کے ہیولے سے صاف کیا اور جانماز تہ کرنے لگی۔

''کیا آپ کو لگتا ہے کہ اللہ آپ کی ساری باتیں سن رہا تھا۔'' سناٹے میں ایک باریک سی نسوانی آواز گونجی تو اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک کھلے گلاب کے مانند پیاری سی صورت صوفے پر بیٹھی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''لگتا نہیں...... بلکہ یقین ہے......'' اس نے مسکراتے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''کیونکہ دعا مانگنے کے بعد اگر بندے کے بے قرار دل کو قرار مل جائے سکون محسوس ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ بندے نے اپنا سارا دکھ، درد ساری تکلیفیں اپنے خالقِ حقیقی سے شیئر کردیں۔''

''یہ تو بڑی اچھی ترکیب ہے ڈپریشن سے بچنے کے لیے۔'' وہ خوشی سے چہکی۔

''بالکل...... اس سے آسان اور سستا اور پیارا سا علاج کوئی ہو ہی نہیں سکتا......'' اس نے جانماز تہ کر کے ایک جانب رکھی۔

''میں عائشہ ہوں...... اور آپ یقیناً قرۃ العین

ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔
''عائشہ...... آپ کب آئیں......؟''
''تھوڑی دیر پہلے لیکن اینہ اور پپا سے آپ کی اتنی باتیں...... اتنی تعریفیں سن رکھی تھیں کہ فوراً آپ سے ملنے چلی آئی۔''
''ریئلی...... کیا میں، میرے جیسی حقیر بندی بھی کسی تعریف کے قابل ہے۔'' ایک خوشگوار حیرت کا انکشاف ہوا۔
''آپ سے ملنے کے بعد محسوس ہوا کہ وہ سب ہنڈرڈ پرسنٹ کریکٹ ہیں۔''
''آپ لوگ خود بہت اچھے ہیں شاید اس لیے بھی......'' پھر اچانک ندامت نے آگھیرا۔
عائشہ چودہ، پندرہ سال کی ایک پیاری سی لڑکی تھی وہ اس سے جلدی گھل مل گئی۔ امریکا میں پڑھتی تھی لیکن اسے ملائشیا میں رہنا اچھا لگتا تھا اور چھٹیوں میں وہ یہاں آیا کرتی تھی۔ امریکا میں اپنے نانا کے ساتھ رہتی تھی۔ یاسر یزدانی کا امریکا میں بزنس تھا اس گھر سے اس خاندان کی پرانی یادیں جڑی تھیں۔
''پپا......! یہ واقعی بہت اچھی ہیں۔'' رات کھانے کی ٹیبل پر عائشہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
''گڈ...... تو پھر آپ دونوں کی دوستی ہوگئی......''
یاسر یزدانی کے کہنے پر وہ جھینپ سی گئی۔
''بالکل پپا! بلکہ ہم کل شاپنگ پر بھی جائیں گے۔''
یاسر یزدانی نے استفسارانہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''بیٹا...... اگر انہیں اعتراض نہ ہو تو کیوں.... بی بی... آئی مین قرۃ العین......'' وہ ذرا گڑبڑا سے گئے بی بی کہنا ان کی عادت میں شامل تھا یا وہ جان بوجھ کر اس کا نام لینے سے احتیاط برتتے تھے۔
''میں عائشہ کے ساتھ ضرور جاؤں گی۔'' اس کی اتنی محبت دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔
''گڈ پپا...... دیکھا ہم دونوں کی کتنی دوستی ہو گئی......'' عائشہ کھل اٹھی تو وہ بھی مسکرا دیے۔
رات کھانے کے بعد وہ اس کے پاس گھسی باتیں کرتی رہی، وہ پاکستان کے بارے میں جاننے کی بڑی خواہش مند تھی۔ بچپن میں کبھی ایک بار گئی تھی اس وقت اسے ہوش کب تھا لیکن اب اس کی زبانی پاکستان کی باتیں سن کر شوق سا ہو گیا تھا۔
''ہم پاکستان چلیں گے، کیوں؟''
''ہاں بالکل چلیں گے لیکن جناب گھومنے پھرنے سے زیادہ آپ کو اپنی پڑھائی پر توجہ دینی چاہیے......''
''مما بھی اسی طرح کہتی تھیں، پڑھنے پر توجہ دو...... ایگزامز سر پر ہیں، اچھے گریڈ لینے ہیں۔''
''ساری مماز ایک ہی جیسی ہوتی ہیں...... میری امی بھی ایسے کہتی تھیں۔'' اس نے اس کے بال اپنی انگلیوں سے سنوارتے ہوئے بتایا۔
''آپ کی، آپ کی ممی بھی ایسی تھیں...... پھر آپ کیا کرتی تھیں......؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔
''ان کی بات مانتی تھی...... لیکن...... جہاں ان کی بات نہ مانی...... وہیں گر پڑی۔'' آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے نمی اتر آئی۔ عائشہ اس کی جانب بغور دیکھ رہی تھی۔
''سمجھ گئی...... لیکن اب تو آپ اللہ تعالیٰ سے اتنی معافیاں مانگتی ہیں پھر بھی آپ کو ٹینشن ہے۔'' اس کی بات پر وہ دھیمے سے مسکرائی۔
''ٹینشن نہیں ہے...... لیکن دکھ تو ہے...... وہ شاید کبھی کم نہ ہو...... جب ان لوگوں کو ساری سچائی کا پتا چلے گا تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا...... کبھی یہ سوچتی ہوں تو آنکھوں سے نیند اڑ جاتی ہے۔''
''ایک بات کہوں...... اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو......''
''مجھے پیاری سی دوست عائشہ کی کوئی بات بھی بری نہیں لگتی......'' اس نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔
''آپ پپا سے شادی کرلیں......'' اس نے یہ نہ جانے کیا سوچ کر کہا تھا، وہ دنگ رہ گئی۔
''آپ پریشان ہیں ناں کہ لوگوں کو اچھا نہیں لگے گا کہ کسی نے آپ کو چیٹ کیا ہے لیکن میرے پپا بہت نائس ہیں...... انہوں نے کبھی کسی کو چیٹ نہیں

کیا...... مما کو بھی نہیں......"

"عائشہ بچے......! اتنی بڑی بات آپ نے...... آپ نے کیسے کردی......؟" وہ ہونقوں کی طرح اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھ رہی تھی جو اس کے پہلو میں لیٹی تھی۔

"یہ بڑی بات نہیں ہے...... بلکہ آپ کے لیے ایک فنٹاسٹک سلوشن ہے...... اس سے دو فائدے ہوں گے۔ آپ کو لوگوں سے کوئی پرابلم نہیں ہوگی اور پپا...... انہیں بھی ایک اچھا لائف پارٹنر مل جائے گا۔ میں نے اپنی ساری لائف میں انہیں خوش نہیں دیکھا...... لیکن جب میں یہاں آئی اور ان کو دیکھا تو فیل کیا کہ وہ خوش ہیں، فرسٹ ٹائم انہیں اس طرح دیکھا......" وہ جذباتی ہو کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"عائشہ! ابھی آپ بہت چھوٹی ہو...... بچے اس طرح کی باتیں نہیں کرتے......" اس کا دل سہم گیا تھا عائشہ ابھی بچی ہی تو ہے اگر یاسر یزدانی کے کانوں تک اس کی باتوں کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ کیا خیال کریں گے اس کے بارے میں۔

"میں اتنی بھی بچی نہیں ہوں...... سب سمجھتی ہوں لیکن اگر آپ کو آپشن دیا جائے تو پلیز انہیں ضرور cansider کیجیے گا۔" وہ اسے کیا بتاتی کہ اب اس کی زندگی میں اس طرح کے سارے آپشنز ختم ہو چکے ہیں، ایک ہی وار میں وہ تو ڈھیر ہو گئی سب کچھ تو لٹا دیا۔ اب لٹنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اس نے مچلتے آنسوؤں کو اندر ہی اندر تھپک کر سلانے کی ناکام کوشش کی۔

بظاہر وہ ایزی چیئر پر آنکھیں موندے پڑے تھے لیکن ان کے ذہن پر بہت سی تصویریں شور مچا رہی تھیں۔ نازش ان سے پورے آٹھ برس بڑی تھی اس کی پہلی شادی ناکام ثابت ہوئی تھی۔ ایک امیر باپ کی بگڑی ہوئی اولاد نے پہلے شادی کو انجوائے منٹ سمجھ کر گزارنا چاہا لیکن اس کا مدِمقابل ایک اور بگڑا ہوا امیر شخص تھا، طاقتوں کے ٹکراؤ نے نازش کو بہت کچھ سکھا دیا تھا تب اچانک اس کی زندگی میں یاسر یزدانی داخل ہوئے۔ چوبیس برس کا اسمارٹ ہینڈسم نوجوان جو

یکم جنوری

ہر طرف دھند ہے
دھند ہی دھند ہے
ایسے لگتا ہے زمیں و آسمان
دھند کی گود میں ہیں
یہ سرد ہوائیں سرد لمحات کی دھند ہے
ہر چیز منجمد ہے
محبت کی یاد کا کتبہ ڈھک گیا
دھند کی تاریکی میں
شاید یکم جنوری ہے
آنکھ دیکھتی ہے باہر بہت دھند ہے
دل کہتا ہے اندر بھی کچھ کم نہیں
شاید کہ یکم جنوری ہے

شاعر: احمد آزاد

مرسلہ: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

میرے بابا نہیں ہیں ناں

میں تپتی دوپہر میں
شہر کی سڑکوں پر اپنے جسم کا
ایندھن جلاتا ہوں
تو گھر میں چولھا جلتا ہے
میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں
پاؤں سے چپکی ہوئی یہ تارکول ریت
میرے ساتھ روزانہ میرے بستر میں جاتی ہے
میرے اپنے بدن سے
شہر کی روندی ہوئی سڑکوں کی
باس یہ کہتی......
میرے بابا نہیں ہیں ناں

از: زونیہ علی، کھاریاں

کراچی سے ملائشیا اچھے مستقبل کی تلاش میں آیا تھا۔ تب کمپنی کے مالک نے اپنی طلاق یافتہ بیٹی کے رشتے کے لیے اسے آفر دی، ایک اچھی جاب حاصل کرنے کے بعد مالک کی بیٹی سے شادی کا پیغام ایک بہترین آفر ہی تھی جو اس نے بڑی پلاننگ سے سوچ سمجھ کر قبول کرلی۔

شادی کے بعد تلخ حقیقت نے تو جیسے سانس لینا بھی محال کر دیا...... کہنے کو تو وہ دونوں گاڑی کے پہیے کے مانند تھے لیکن ان کی قدرو قیمت اور برتاؤ میں زمین آسمان جیسا فرق تھا، نازش نے ساری زندگی اسے شوہر کے بجائے ایک معمولی آفس کے ورکر کی سی حیثیت دی، یہاں تک کہ عائشہ کی آمد بھی ان کے درمیان اس تفریق کو ختم نہ کر سکی، آنکھیں بند کر کے تیز رفتاری سے آگے بڑھنے کا جذبہ، مسابقت، حسد اور لالچ کی ہوس نے یاسر یزدانی کی شخصیت ان کی انا اور روح کو اتنے کچوکے لگائے کہ زندگی پھیکی، بے لطف سی لگنے لگی۔ ساری امنگیں، جذبات سرد پڑ گئے اور پھر جلد ہی انہیں احساس ہوگیا کہ وہ ایک شکست خوردہ انسان ہیں، انہوں نے اپنی مجبوریوں اور کم مائیگی سے سمجھوتا کرلیا یہاں تک کہ نازش کے انتقال کے بعد بھی ان کی روز مرہ کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ لیکن آج اپنی ہی بیٹی کے اپنے بارے میں خیالات سن کر ان کی روح تڑپ اٹھی، وہ تو اسے ابھی تک بچی ہی سمجھتے رہے تھے لیکن اس معصوم سی بچی کو بھی اپنے باپ کی بے کیف زندگی کی فکر تھی...... وہ دکھی ہے، اپنے باپ کے لیے...... وہ انہیں کس قدر اعلیٰ مقام پر دیکھتی ہے شاید جس کے وہ حقدار بھی نہیں...... یہ محض اتفاق تھا یا قدرت کی جانب سے ایک خوب صورت موقع جب وہ عائشہ سے کسی ضروری کام کے سلسلے میں بات کرنے گئے تھے لیکن اس کی اپنے بارے میں گفتگو سن کر وہ سب بھول گئے کہ انہیں آخر اس سے کیا کام تھا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو رہے تھے انہوں نے بجلی کے آتشدان میں رکھی سرخ ہوتی راڈ پر نظر ڈالی اور پھر خود ہی مسکرا دیے۔ برف کے طوفان میں پھنسے ہوئے مسافر کو جیسے سائبان مل گیا تھا۔ انہیں محسوس ہوا جیسے ان کے سینے پر سے بہت بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ اس کے پاس سرد موسم کے لیے کپڑے نہیں تھے لیکن اس وقت جلدی، جلدی میں جتنے کپڑے ہاتھ لگے بیگ میں ٹھونس لیے تھے لیکن اس بھاگم دوڑی میں یاد سے اپنے ضروری کاغذات لینا نہیں بھولی تھی ورنہ اپنی شناخت کے بغیر اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ عائشہ نے اپنے لیے کچھ خریداری کی اور ضد کر کے اس کے لیے بھی کچھ گرم کپڑے خریدے۔ اسے تو بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کی محبت سے مجبور ہوگئی۔

''ویسے یہاں کا ونٹر بہت مزے کا ہوتا ہے...... بارشیں بھی بہت ہوتی ہیں لہٰذا ہمیں تیار رہنا چاہیے کب سردی اور بڑھتی ہے......'' عائشہ اسے بتا رہی تھی۔

''اچھی خاصی سردی تو ہے...... ہاں اس سردی پر بارش اُف......'' دونوں مسکرا دیں ان کی شاپنگ کافی حد تک تو ہو چکی تھی دونوں آپس میں باتیں کرتی شاپنگ مال سے باہر نکل رہی تھیں کہ نہ جانے وہ کہاں سے آن ٹپکا...... اسے دیکھتے ہی اس کا چہرہ فق پڑ گیا۔

''عینی......! میں ہر روز تمہیں ڈھونڈتا ہوں...... بس اب لوٹ آؤ یار......'' اس نے آتے ہی اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے سے دور کیا۔

''دفع ہو جاؤ...... میں نے کہا ناں کہ میں تم سے کوئی تعلق، کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی......'' ملگجے سے کپڑے، بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بال وہ کون تھا...... وہی شرجیل احمد جس کے انداز کسی ہیرو کے مانند تھے یا پھر وہ جسے وہ جانتی ہی نہیں تھی لیکن وہی تو تھا ولیم مسیح......

''کون ہو تم...... کون ہو...... بدتمیز...... ایڈیٹ......'' عائشہ گھبرا کر چیخنے لگی تھی تب ہی ارد گرد کے لوگ ان کی جانب متوجہ ہوئے۔

''میں...... میں شرجیل ہوں...... شرجیل احمد...... ان کا ہزبینڈ......'' وہ اب عائشہ کو یقین دلانے لگا......

لیکن اس کا اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا وہ چراغ پا ہوگئی۔
"we should call the police" (ہمیں پولیس کو بلانا چاہیے) اس کا کہنا تھا کہ وہ تیر کی سی تیزی سے کہیں غائب ہوگیا۔ وہ ابھی تک اس اچانک حملے کے باعث ہراساں تھی اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی، ماتھے پر پسینے کی ننھی، ننھی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ وہ بار، بار اس کی زندگی میں مداخلت کر کے اسے ہراساں کر رہا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......" اس نے عینی کا سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

"ہاں، میں ٹھیک ہوں...... چلو...... گھر چلو عائشہ......"

"اوکے......!" عائشہ نے جلدی سے زمین پر گرے شاپنگ بیگز اٹھائے اور اس کا ہاتھ تھامے کار کی جانب چل دی۔

"سوری...... یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ آپ میری ضد کی وجہ سے شاپنگ پر گئی تھیں۔" عائشہ کا منہ اتر گیا تھا اسے اس پر بے ساختہ پیار آیا ان کی کار منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

"ارے نہیں میری جان...... ایسا نہ کہو...... میرا بھی دل چاہ رہا تھا۔"

"وہ شخص تو مجھے بالکل پاگل لگ رہا تھا۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم پہلے وہ ایسا ہرگز نہیں تھا......" شاید اسے دکھ ہو رہا تھا۔ وہ اندازہ نہیں کرسکی۔

"پھر ایسا کیوں ہوگیا...... اس لیے کہ آپ نے اسے چھوڑ دیا۔" عائشہ کے معصوم ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے تھے۔

"نہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ سچائی سے لڑ رہا ہے...... اپنے آپ سے لڑ رہا ہے۔"

"سچائی سے کون لڑتا ہے بھلا...... ہار جائے گا...... آپ کا کیا خیال ہے۔"

"میری زندگی سے اس کا چیپٹر کلوز ہوچکا ہے عائشہ...... اس لیے میں نے اس کے بارے میں اندازے لگانے بھی چھوڑ دیے......" اس نے تھک کر سیٹ کی بیک پر سر ٹکا دیا۔ جب وہ دونوں گھر پہنچیں تو اس وقت ہلکی، ہلکی بارش شروع ہوچکی تھی اور ساتھ ہی سردی بھی کچھ بڑھ گئی تھی۔ آج آمنہ نے ساری ڈشز عائشہ کی پسند کی بنائی تھیں۔ لنچ پر یاسر یزدانی نے بھی انہیں جوائن کیا تھا۔ عائشہ پہلے ہی فون پر شرجیل کی شاپنگ مال کے باہر اس مڈبھیڑ کے بارے میں بتا چکی تھی۔ انہیں خاصی تشویش تھی، انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ دیوانگی کی اس حد تک جا سکتا ہے۔

"پپا...... میرا خیال ہے کہ ہمیں سیریسلی اس (conlict) کر لینا چاہیے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ پاگل ہوچکا ہے، کیا وہ پہلے بھی ایسا ہی پاگل تھا۔" اس نے اچانک قرۃ العین کو مخاطب کیا تو وہ کچھ الجھ سی گئی۔

"بیٹا......! وہ پہلے کیسا تھا، کیوں تھا یہ اتنا امپورٹنٹ نہیں ہے لیکن اب وہ جو کر رہا ہے وہ پہلے کی طرح ہی غلط ہے...... وکیل صاحب سے میری بات ہوئی تھی کل وہ آرہے ہیں۔" وہ جانتے تھے کہ اب شرجیل کے ذکر پر وہ نروس ہوجاتی ہے جو اس کی صحت کے لیے مناسب نہیں تھا۔

"گڈ...... پپا...... یہ اتنی نائس ہیں، ہمیں انہیں اس پرابلم سے ضرور نکالنے میں مدد کرنی چاہیے۔"

"بالکل لیکن ابھی انہیں کھانا تو کھانے دو...... دیکھو تو ان کی پلیٹ خالی پڑی ہے۔"

"ارے نہیں...... میں کھا تو رہی ہوں......" وہ خجل سی ہوگئی۔

"میں آپ کو نکال کر دیتی ہوں...... واقعی آپ کی پلیٹ تو بالکل خالی پڑی ہے۔" عائشہ نے اس کی جانب ڈش بڑھائی اور خود اس کے لیے کھانا نکالنے لگی۔

"آپ کو حیرت تو ہوئی ہوگی کہ ہماری بیٹی کی اردو اتنی اچھی کیسے ہے...... جبکہ یہ تو امریکا میں پلی بڑھی اور وہیں پڑھتی بھی ہے۔" یاسر یزدانی نے موضوع بدلنے کی غرض سے بات کی۔

"جی بالکل...... اتنی اچھی اور صاف اردو تو بچے وہاں بھی نہیں بولتے پاکستان میں۔"

"شکریہ گائز......" عائشہ کے پیارے سے چہرے پر شرم کی لالی ابھری۔

"دراصل عائشہ کے نانا بہت اچھے شاعر بھی ہیں...... مصنف بھی ہیں، اردو ادب سے ان کی دلی وابستگی ہے۔"

"نانا جی کی وجہ سے میری اور پپا کی اردو بھی اچھی ہوگئی ہاں البتہ مما زیادہ تر انگریزی زبان میں بات کرتی تھیں......" عائشہ نے کچھ اس طرح کہا کہ سب مسکرا اٹھے۔

"عائشہ بیٹا......! تم انہیں اپنے نانا جی کا کلام سنانا......"

"بالکل پپا...... ضرور سناؤں گی بلکہ نانا جی کی کچھ کتابیں بھی یہاں پڑی ہیں وہ بھی انہیں دوں گی۔ ویسے آپ کو پڑھنے میں دلچسپی تو ہے ناں......" اس نے پوچھا۔

"ہاں عائشہ...... کیوں نہیں......" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"ایک بات اور بیٹا...... جب تک قرۃ العین کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوتا اس وقت تک آپ ان کو باہر کہیں لے کر نہیں جائیں تو بہتر ہے...... ورنہ بلاوجہ کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو یہ پریشان ہو جائیں گی۔" یاسر یزدانی نے اسے تاکید کی۔

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا پپا...... میں دعا کروں گی کہ جلدی سے ان کا مسئلہ حل ہو، میں اپنی چھٹیاں ان کے ساتھ انجوائے کرنا چاہتی ہوں......"

یاسر یزدانی نے عائشہ کی آنکھوں میں اس سے پہلے اس قدر چمک نہیں دیکھی تھی وہ خوش تھے کہ قرۃ العین کی وجہ سے عائشہ یہاں بہت دلچسپی لے رہی ہے ورنہ پہلے انہیں یوں لگتا تھا جیسے وہ ان کا دل رکھنے کی خاطر وقت گزاری کر رہی ہے۔

کھانے کے بعد وہ ستانے کے لیے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ امینہ...... اس کے لیے سبز چائے لے کر آئی تھی ابھی اس نے چند سپ ہی لیے تھے کہ میڈم روبانہ کا فون آگیا۔ وہ سخت شرمندہ تھیں مشکل وقت میں وہ اس کے گھر آئی اور وہ نہ مل سکیں اس لیے وہ اگلے دن اس سے ملنے خود چلی آئیں...... میڈم روبانہ کو جب اس نے اپنی داستانِ غم سنائی تو اس کے ساتھ، ساتھ وہ بھی رو پڑیں۔

"مجھے بہت افسوس ہوا یہ سب سن کر......"

"میڈم......! کیا میں اتنی گناہ گار ہوں جو میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوا...... پہلے ارسلان نے مجھے چھوڑا پھر ٹینا اور ربیعہ نے میرے خلاف سازشیں کیں...... میں اس شخص کے جال میں پھنسی...... آخر، آخر میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہوا......" آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر ہو رہا تھا۔

"ایسے نہیں کہتے قرۃ العین...... تم تو بہت اچھی لڑکی ہو......" انہوں نے اسے دلاسا دیا لیکن اس کا دل مچل رہا تھا۔

"آپ میرا دل رکھنے کو کہہ رہی ہیں...... میں اچھی نہیں ہوں...... میں اچھی نہیں ہوں ناں......"

"میں سچ کہہ رہی ہوں قرۃ العین...... تم اچھی ہو...... اللہ تم سے محبت کرتا ہے تو اس نے تمہیں آزمائش میں ڈالا ہے ناں......" انہوں نے پیار سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں تو بہت گناہ گار ہوں میڈم......! امی مجھے نماز کی پابندی کے لیے بہت ڈانٹتی تھیں لیکن میں تو بمشکل جمعے کی نماز ہی پڑھتی تھی۔ روزے رکھنے سے مجھے بھوک کا خوف ہی رہتا تھا۔ میں اچھی لڑکی نہیں تھی...... میں بری لڑکی تھی۔" اس پر تو جیسے ہذیان سوار تھا۔

"ایک بری لڑکی اپنی ماں اور بہن کے لیے اپنے گھر کے لیے لڑکوں کی طرح کام تو نہیں کر سکتی...... ایک بری لڑکی کو غیر مرد کا بری نظروں سے دیکھنا یا چھونا برا نہیں لگتا...... کیونکہ وہ تو بری ہے...... ایک بری لڑکی کو یہ برداشت کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کا نکاح جس مسلمان مرد سے ہوا ہے وہ تو دراصل مسلمان ہی نہیں ہے۔" وہ دھیمی آواز میں اسے سمجھاتی رہیں اور وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

''ایک بری لڑکی ٹینا اور ربیعہ کی سازشوں کو... سازش نہیں اچھا منافع بخش بزنس بھی تو سمجھ سکتی تھی...... لیکن کیا تم نے ایسا کیا...... نہیں...... تم بری نہیں ہو...... تم نے ہر برائی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا...... اور جو برائی کے خلاف ڈٹ جائے وہ برا نہیں کہلاتا، تمہیں اللہ کی رحمت نے ہمیشہ اپنے سائے میں رکھا۔''

''کیا، کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں......'' اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسی، کیسی پُر خطر زندگی کی پگڈنڈیوں سے دوڑتی چلی آئی ہے...... اس کا وجود اس جھلسا دینے والی آگ کی گزرگاہ سے گزر چکا ہے۔

''بالکل قرۃ العین، میں نہیں بلکہ تم سچی ہو...... زندگی اسی دھوپ چھاؤں کا نام ہے اور اگر ہم دھوپ سے نہ گزریں تو پھر ہمیں چھاؤں کی اہمیت، اس کی راحت کا کیسے اندازہ ہو...... تم نے سچائی کے راستے کا انتخاب کیا...... اپنے رب سے دوستی کر لی۔ ایک اچھا سچا دوست اتنی آسانی سے تو نہیں ملتا ناں...... وہ دوست جو ہمہ وقت آپ کے ساتھ رہے آپ کا ساتھ دے...... آپ کو کھرے اور کھوٹے کی پہچان کرائے...... آپ کو کبھی اکیلا نہ چھوڑے بس آپ اسے اپنے دل میں محسوس کر کے دیکھیے۔'' وہ ان کے شانے سے لگ کر پھر سے سسکنے لگی۔

''اپنے رب کی ذات پر یقین رکھو...... اس کی ہر بات میں حکمت ہے...... شرجیل احمد یا ولیم سے نکاح کا فیصلہ تو اوپر آسمانوں پر لکھا جا چکا تھا اس فیصلے پر گریہ و زاری کے بجائے شکر ادا کرو کہ تم کو سچائی پتا چل گئی اور تم نے اسے چھوڑ دیا۔ ورنہ سوچو اگر اس کے ماما اسے ڈھونڈتے ہوئے تمہارے پاس نہیں آتے تو کیا ہوتا انجانے میں تم اسی دوزخ کا حصہ بن جاتیں...... لیکن رب العزت کو یہ منظور نہ تھا کیونکہ تم ایک اچھی لڑکی ہو......'' وہ اسے بچوں کی طرح دلاسے دیتی رہیں اور اس کا من ہلکا سا ہو گیا...... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ شہناز بیگم کی آغوش میں ہو لیکن وہ کس منہ سے اپنی ماں سے اپنے دل کا حال کہتی کہ ان کی بیٹی پر یہاں کیا، کیا گزری اسے وہ ڈراؤنا خواب ابھی تک یاد تھا جس کا تصور بھی اس کی برداشت سے باہر تھا۔

☆☆☆

رات سے ہونے والی بارش صبح جا کر تھمی تھی۔ اسے اپنے روٹین کے چیک اپ کے لیے اسپتال جانا تھا لیکن اسے خوف تھا کہ کہیں پھر سے وہ اسے سرِ راہ مل گیا تو تماشا کھڑا کر دے گا۔ امینہ نے اس کی مشکل کے لیے ایک آسان حل ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ ایک سادہ سا اسکارف تھا جس سے وہ اپنا چہرہ بہ آسانی ڈھانپ سکتی تھی اور اس نے ایسا ہی کیا، وہ پُرسکون تھی کہ اب اسے کوئی پہچان نہیں سکے گا۔ گاڑی ابھی گھر سے نکل کر گلی سے مڑتے مین روڈ کی جانب بڑھ رہی تھی تب اسے درخت کے نیچے کوئی بیٹھا نظر آیا تھا، یہ کوئی فقیر تھا ابھی نظریں دوسری جانب رخ کرنے کو تھیں کہ جیسے لمحہ بھر میں ایک جھماکا سا ہوا، وہ چونک اٹھی اور ذرا توجہ سے اس مفلوک الحال شخص کو دیکھنے لگی۔ وہ زمین پر اکڑوں بیٹھا اس جانب سے گزرنے والی گاڑیوں کو تک رہا تھا۔

''شرجیل......'' بے ساختہ اس کے لب ہلے......

بکھرے بال جیسے دنوں سے سنوارے نہ ہوں، شیو بڑھی ہوئی، میلے کپڑے اور اتنی سردی میں بنا کسی گرم کپڑے کے دنیا و مافیہا سے بے خبر...... وہ ہی تو تھا...... اگر کچھ دن پہلے وہ اسے شاپنگ مال کے باہر نہ دیکھتی، وہ اسے جھنجوڑ کر اپنی شناخت نہ کراتا تو آج وہ اسے بالکل بھی پہچان نہیں سکتی تھی...... اس کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ بیک ویو مرر میں اس کی صورت گم ہوتی گئی۔

''یہ اس نے کیا حال بنا لیا تھا اپنا...''

''وہ شخص تو مجھے بالکل پاگل لگ رہا تھا۔'' عائشہ کی آواز سماعت میں گونج رہی تھی۔

''تو کیا یہ واقعی پاگل ہو گیا ہے۔'' وہ زیرِ لب... بڑبڑائی۔ اس کا پہلی بار ائرپورٹ پر ٹکرانا، شادی کے لیے پرو پوز کرنا ایک کے بعد تصویریں یادداشت کے صفحے پر پھیلتی سکڑتی جا رہی تھیں...... ''میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں اس کے لیے...... کیوں...... وہ فراڈ ہے...... دھوکا

دیا ہے اس نے مجھے برباد کیا ہے......'' اس نے ہر بات کی نفی کرنا چاہی۔
''اپنے رب کی ذات پر یقین رکھو...... اس کی ہر بات میں حکمت ہے۔'' میڈم روبانہ کی آواز گونج گہری تھی تب ہی گاڑی رکی...... ڈرائیور نے گاڑی سے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا...... اسپتال آچکا تھا، ڈاکٹر اس کے لیے نسخہ لکھ رہی تھی اور اسے آرام کرنے اور پُرسکون رہنے کی ہدایات دے رہی تھی کیونکہ اس کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا۔ گھر سے نکلتے وقت وہ بالکل پُرسکون تھی لیکن اس شناسا دیوانے کو دیکھ کر اس کی پُرسکون روح میں اضطراب سا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کو یہ سب کیسے بتاتی...... گھر لوٹی تو پتا چلا کہ عائشہ کسی سیمینار میں گئی ہوئی ہے، لنچ تیار تھا لیکن اکیلے کھانے کو اس کا من نہیں کر رہا تھا تب امینہ نے ضد کر کے اسے کھانے کے لیے بلایا اس نے بتایا کہ چار بجے تک وکیل صاحب بھی آجائیں گے اور اس وقت تک اس کے لیے بھوکا رہنا مناسب نہیں...... مجبوراً اسے کھانا پڑا گو اس گھر سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ سب اس کی ذات سے جڑے تھے۔ امینہ کہنے کو تو ایک نوکرانی ہی تھی لیکن وہ ایک ذمّے دار ماں کی طرح اس کا خیال رکھتی، عائشہ عمر میں تو اس سے بہت چھوٹی تھی لیکن اس کے لیے وہ ایک بہت اچھی دوست کے مانند تھی، اور یاسر یزدانی......

''قرۃ العین...... آپ کو سر نیچے ڈرائنگ روم میں بلا رہے ہیں۔'' امینہ نے آکر اطلاع دی تو اس کی سوچیں منتشر سی ہو گئیں۔ بیرسٹر ارباب ایک قابل وکیل تھے جو نہ صرف یاسر یزدانی کے قریبی دوست تھے بلکہ ان کے کاروباری معاملات میں قانونی مدد کی کرتے تھے انہوں نے اس کی ساری باتیں بڑے غور سے سنیں اور پھر بولے۔

''یاسر...... تم بلاوجہ ہی پریشان ہو رہے تھے ان کا کیس تو بہت اسٹرونگ ہے......''

کیا واقعی......؟'' یاسر یزدانی کے چہرے پر ذرا سکون اترا تھا۔

''دیکھو...... محنت تو کرنا ہوتی ہے اور ان کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے...... پھر یہ ہم وطن بھی ہیں تو یوں سمجھو کہ یہ میرے اپنے گھر کا کیس ہے۔''

''سر...... آپ کا بہت شکریہ......'' وہ اس کی بہت ممنون تھی۔

''میرا نام ارباب ہے...... آپ مجھے ارباب بھائی کہہ سکتی ہیں یہ سر آپ...... یاسر یزدانی کے لیے سنبھال کر رکھیے......'' انہوں نے اس اپنائیت سے کہا کہ بے اختیار اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

''میں آپ لوگوں کا احسان کیسے اتاروں گی۔''

''عینی...... پلیز نہ روئیں...... اس طرح آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' یاسر یزدانی نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

''آپ اپنی انرجی جمع کر کے رکھیے...... پھر دیکھیے آپ کے مجرم کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے...... اسے سزا بھی ملے گی اور ڈی پورٹ تو اسے یوں کیا جائے گا......'' بیرسٹر ارباب نے چٹکی بجا کر دکھائی...... اسے یوں لگا جیسے وہ خوش نہیں ہے...... اسے دکھ ہے پر کیوں...... اس دیوانے کی تصویر پھر آنکھوں میں لہرائی۔

''آپ کی مرضی کے خلاف ہم کچھ بھی نہیں کرنا چاہتے۔'' یاسر یزدانی اس کے چہرے کو بغور دیکھتے بولے۔

''ایک مظلوم کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے...... لیکن پھر بھی آپ کی رضا مندی...... جیسا کہ ابھی یاسر نے کہا...... اس کے بغیر ہم کوئی کارروائی نہیں کریں گے...... پھر بھی میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ یہاں قانون پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے...... لہٰذا آپ کو کسی سے بھی ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے...... اوکے......''
بیرسٹر ارباب نے اسے بھرپور حوصلہ دیا۔

''ٹھیک ہے ارباب...... ہم جلد از جلد...... ان کی اجازت سے اس کیس پر کام کرتے ہیں...... میری خدمات بھی حاضر ہیں۔''

یاسر یزدانی نے اجازت طلب نظروں سے اس

کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور وہ خفیف سا مسکرائی۔

''یہ سب کیا ہورہا ہے۔ کیوں ہورہا ہے، میرا دل اسے سزا دلوانے سے انکار کررہا ہے کیا......؟ لیکن کیوں......؟ کیوں......'' اسے گھبراہٹ سی ہورہی تھی۔ رات بھر وہ ٹھیک سے سو نہ سکی...... صبح ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کیا گیا، عائشہ دوبارا سے کمرے میں دیکھ کر جاچکی تھی لیکن اس کی اتری صورت دیکھ کر چلی گئی۔ اس نے جلدی سے عمرانہ کو فون کیا اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی لیکن پھر بھی اس کی بے قراری میں کچھ کمی نہیں آئی۔ ظہر کی نماز کا وقت ہورہا تھا اس نے وضو کرکے نماز پڑھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو کچھ مانگا ہی نہیں گیا...... بس پھوٹ، پھوٹ کررودی...... اس طرح رونے سے کچھ دل کو قرار آیا۔ اس کا سیل فون دہاڑ رہا تھا اس نے لرزتے ہاتھوں سے فون اٹھایا۔

''قرۃ العین......''

''یس......'' اس سے اس شناخت پر انکار نہ ہوسکا اور پھر دوسری طرف سے جو کہا گیا وہ آنکھیں پھاڑے سنتی رہی اور پھر دھپ سے بستر پر گر پڑی۔

☆☆☆

آئی سی یو وارڈ کی جانب بڑھتے اس کے قدم من، من بھر کے ہورہے تھے اس کے اردگرد کیا ہورہا ہے۔ کون دیکھ رہا ہے، کون جارہا ہے وہ بس چلتی چلی جارہی تھی۔ عائشہ نے اسے تھام رکھا تھا، یاسر یزدانی بھی ان دونوں سے کچھ آگے تیزی سے قدم بڑھارہے تھے۔

سفید پٹیوں میں جکڑا نلکیوں سے الجھا وہ ہنستا مسکراتا شرجیل احمد یا...... نہیں بلکہ کوئی اور ہی تھا۔

''یہ...یہ کیا ہوا تمہیں......؟'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلارہی تھیں۔

''مجھے، مجھے معاف کردو......'' اس کی آواز بہت دھیمی تھی ترسی آنکھوں کو جیسے تراوٹ سی مل گئی۔

''میں نے...... میں نے تمہیں معاف کیا......'' وہ اتنی شقی القلب تو نہ تھی۔ شدت جذبات سے اس کے جسم میں لرزہ سا پیدا ہوگیا۔ اتنا کمزور اتنا مجبور اسے

یوں دیکھ کر اس کا دل کٹ سا گیا۔

"میں، میں شرجیل احمد نہیں اکرم الٰہی بن کر مرنا چاہتا ہوں......" وہ اپنے اندر کی کشمکش سے تنگ آ چکا تھا۔

"ایسی باتیں نہ کرو...... ایسے نہ کہو پلیز...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ہاں۔" یاسر یزدانی کے چہرے پر اذیت امڈ آئی تھی وہ جانتے تھے کہ جس کار سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ درخت سے جا ٹکرائی تھی اس کا ڈرائیور موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔

"میں...... میں کلمہ پڑھنا چاہتا ہوں مجھے، مجھے پڑھاؤ...... میں بھول چکا ہوں مجھے یاد کراؤ......" قرۃ العین نے چونک کر یاسر یزدانی کی جانب دیکھا تو انہوں نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

"ہاں، ہاں میں پڑھتی ہوں میرے ساتھ، ساتھ پڑھو...... لا الہ......" آنسو بس بہے جا رہے تھے۔

"لا الہ......" اس کے لب ہلے۔

"الا اللہ......" اذیت، دکھ سے اس کا کلیجا پھٹا جا رہا تھا۔

"الا اللہ......" سفید پٹیوں میں جکڑے وجود میں ذرا جنبش پیدا ہوئی۔

"محمد رسول اللہ......" وہ اس کے نزدیک آ کر سرگوشی کے سے انداز میں پڑھ رہی تھی۔

"محمد رسول...... اللہ......" اور پھر اس کا وجود بے جان ہو گیا تھا۔

"ہاں، اکرم...... پڑھو...... دوبارہ پڑھو...... پڑھو...... تم پڑھ سکتے ہو...... تم تھوڑے دنوں کے لیے ہی تو بھولے تھے، دیکھو...... دیکھو اب تمہیں سب یاد آ گیا ناں...... اکرم...... اکرم......" وہ دیوانگی سے اسے پکار رہی تھی...... لیکن وہ برف سا سرد پڑا تھا اس کی آنکھیں اب بھی ادھ کھلی کہیں خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ یاسر یزدانی نے گھبرا کر ڈاکٹر کی جانب دیکھا تو اس نے مایوسی سے سر نفی میں ہلا دیا۔ تھرکتی ہوئی دل کی دھڑکنیں اب خاموش ہو چکی تھیں۔ نرس نے اس کی آنکھیں بند کیں۔

"قرۃ العین......" یاسر یزدانی نے اسے شانوں سے پکڑ کر سنبھالا ایک سرد منجمد کر دینے والی لہر اس کے وجود میں دوڑی...... موت نے اپنا پیغام سنا دیا تھا تو وہ جان چکا تھا کہ اس کا آخری وقت آ چکا ہے لیکن وہ قرۃ العین کے سامنے اپنے اندر شور مچاتی حق و باطل کے درمیان جنگ کے اختتام کا اعلان کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی دید کا منتظر تھا اور فتح بالآخر حق کی ہوئی۔ اس کی ساری بے سکونی، بے چینی، کشمکش اور دنیا سے بے رغبتی مکمل طور پر اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔

"یہ خاموش ہو گیا ہے...... کیوں، کیوں، بولتا کیوں نہیں...... یہ بولتا کیوں نہیں......" وہ ایک ٹک ایسے دیکھتے ہوئے چلّا رہی تھی۔ یاسر یزدانی نے اسے سہارا دیا اور وہ بے اختیار ان کے شانے سے لگ کر بری طرح رونے لگی۔

"قرۃ العین...... جو اللہ کی رضا...... اس کی رضا کے آگے ہم سب بے بس ہیں۔" ان کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔

رات امینہ نے اسے بڑی مشکل سے دوائی کھلا کر سلا دیا تھا لیکن وہ بے چین ہی رہی۔ بار، بار اس کی تصویریں نگاہوں کے سامنے پھرتی، بے شک موت ایک حقیقت ہے جسے تسلیم کرنے میں...... وقت لگتا ہے جو گزارے نہیں گزرتا...... وہ رات ان سب پر بہت بھاری تھی۔

"میں جانتا تھا کہ کچھ تو ہے جو ایک ماڈرن لاابالی سے نوجوان کو یوں اپنے آپ سے بیگانہ کر رہا ہے...... لیکن میں نے تم سے شیئر نہیں کیا تھا...... تم جانتے ہو پچھلے دس پندرہ دنوں سے وہ اپنے اپارٹمنٹ سے غائب تھا...... قرۃ العین کے رویّے نے اس کے ضمیر کو جگا دیا تھا۔"

"تمہارا خیال ہے کہ وہ...... قرۃ العین سے بہت محبت کرتا تھا اسی لیے......" یاسر یزدانی کو بیرسٹر ارباب کے خیالات جان کر ذرا حیرانی ہوئی تھی۔

"نہیں، نہیں...... یہ میرا مطلب نہیں ہے......"

بیرسٹر ارباب ذرا سوچتے ہوئے بولے۔

''اس نے ایک مسلمان گھرانے کے درمیان اپنی زندگی کی شروعات کی...... پیدا ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی اسے کسی اور کی گود میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ ان تمام باتوں کو اس ماحول کو کبھی بھلا نہیں سکا...... اس کو جنہوں نے ایڈاپٹ کیا انہوں نے مسلمان کی حیثیت سے اس کی پرورش کی تھی۔ وہ، وہ ایک خاص بندہ تھا اللہ کا...... راستے میں الجھا بھی لیکن پھر قرۃ العین اس کی زندگی میں روشنی کی کرن بن کر داخل ہوئی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو ارباب...... جس شخص کو پہلی بار میں نے اپنے گھر کے دروازے پر دیکھا تھا۔ وہ مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا اور مجھے محسوس ہوا تھا کہ جیسے وہ قرۃ العین کو کھودینے کے خوف سے دیوانہ سا ہو گیا ہے لیکن وہ...... وہ محبت نہ تھی۔ وہ کچھ اور تھا...... وہ اپنے اندر کسی اور سے لڑ رہا تھا۔''

''بالکل...... میرے کہنے کا بھی یہی مقصد ہے...... ورنہ جس شخص کی گاڑی نے اسے ہٹ کیا تھا بعد میں وہ ایک درخت سے ٹکرائی گئی تھی اور وہ وہیں ایکسپائر ہو گیا۔ لیکن خدا کی قدرت...... اکرم نے خود اپنے حواسوں میں قرۃ العین کا سیل نمبر اسپتال والوں کو دیا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو...... وہ منتظر تھا کہ اسے......''

یاسر یزدانی کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی وہ قدرت کے اس ماجرے پر حیران تھے۔

''یاسر...... حوصلہ کرو یار...... میں جانتا ہوں کہ نازش بھابی کا انتقال...... مجھے سب یاد ہے...... لیکن اب تم قرۃ العین کو سہارا دو...... اسے تم سب کی ضرورت ہے...... اسے اپنے گھر والوں کی محبت کی ضرورت ہے۔''

''جانتا ہوں......'' یاسر یزدانی نے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اکرم کی میت پاکستان جانے کے انتظامات میں دیر نہیں لگے گی۔ قرۃ العین اگر اس کے ساتھ پاکستان جانا چاہے تو میں ارینج کروا دیتا ہوں...... اور ہاں...... اکرم کی پراپرٹی وغیرہ بھی قرۃ العین کے نام......''

''یہ باتیں بعد میں کی جائیں گی......'' وہ اس تذکرے سے گریز کر رہے تھے۔

''اوکے...... لیکن ایک بات میں تم سے ضرور کرنا چاہتا ہوں......''

کچھ توقف کے بعد بیرسٹر ارباب بولے......

یاسر یزدانی نے ان کی جانب دیکھا۔

''ہوسکتا ہے کہ قرۃ العین...... پاکستان چلی جائے تو بلکہ مجھے یقین ہے کہ پاکستان جانے کے بعد وہ پھر یہاں کبھی نہیں آئے گی۔''

''میں سمجھا نہیں ارباب...... ! تم کیا کہنا چاہتے ہو......'' انہیں تشویش سی ہوئی۔

''یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب تو نہیں لیکن یار...... قرۃ العین ایک اچھی سلجھی ہوئی لڑکی ہے...... وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے بلکہ...... بہت خاص ہے۔ شاید میں تمہیں اچھی طرح سے سمجھا نہ سکوں لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہارے لیے اس سے بہتر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی......''

''تمہارا کیا مطلب ہے ارباب......؟'' ان کے اندر کے سناٹوں میں جیسے کسی نے دور سے پتھر پھینکا تھا۔

''مطلب یہ کہ...... تم قرۃ العین سے شادی کر لو...... اسے سہارا دو......'' اتنا کہہ کر ان کے دل سے بوجھ سا اترا اور وہ ٹھٹک گئے۔

''تم ہمارے درمیان عمروں کا فرق جانتے ہو......''

کیا یہ واقعی عذر تھا بیرسٹر ارباب نے انہیں چونک کر دیکھا۔

''تم...... پینتالیس برس کے ہو اور وہ پچیس، چھبیس سال کی ہوگی...... اور جب تمہاری نازش سے شادی ہوئی تھی تب بھی کچھ اسی طرح کا......''

''یار...... ! پلیز ماضی کو نہ کریدو...... میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں......''

''تو اب اپنی غلطیوں کا ازالہ کر لو...... قرۃ العین ماں بننے والی ہے، تم سے بہتر سہارا کون اسے دے سکتا

ہے...... اور پھر یہ میری نہیں بلکہ عائشہ بیٹی کی بھی خواہش ہے...... تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میری احسان صاحب سے بھی بات ہو چکی ہے...... وہ بھی یہی چاہتے ہیں... آخر کب تک تم یوں تنہا زندگی گزارو گے۔ وہ جان چکے ہیں کہ تمہیں ان کی جائیداد سے کوئی لگاؤ نہیں۔''

''تم نے عائشہ اور احسان انکل تک سے بات کر لی ہے اور مجھے خبر بھی نہیں ہونے دی۔'' انہیں کچھ ناگوار سا محسوس ہوا۔

''یہ بات میں نے نہیں بلکہ عائشہ نے مجھ سے کی تھی تب ہی میں چاہتا تھا کہ قرۃ العین اس کیس سے نکل کر فری ہو اور اپنے بارے میں سوچے...... لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ یہ کیس کوئی عام نہیں بلکہ خاص کیس ہے...... ابھی کل کی ہی بات ہے کہ ہم کیا سوچ رہے تھے لیکن کیا ہو گیا۔'' وہ شرمندہ سے کہہ رہے تھے۔

''میں جانتا تھا کہ عائشہ ایسا چاہتی ہے لیکن وہ اتنی سنجیدگی سے تم سے اور اپنے نانا سے اس کو ڈسکس کرے گی...... اس کا اندازہ نہیں تھا۔''

''چلو اب تو یہ بات کلیئر ہو گئی ناں کہ ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ تمہاری اور قرۃ العین کی شادی ہو جائے...... اب فیصلہ تم پر ہے...... لیکن ایسی نعمت کو ٹھکرانا...... ایسا نہ کرنا یار......'' بیرسٹر ارباب کا التجائیہ انداز دیکھ کر ان کا دل بھی پسیج سا گیا۔ لیکن انہیں... قرۃ العین کے ہامی بھرنے کی امید نہیں تھی۔

☆☆☆

دھوپ سرکتے، سرکتے دیوار سے جا لگی تھی۔ اس نے جلدی، جلدی طیب کے کپڑے الگنی پر سوکھنے کے لیے ڈالے ابھی بہت کام پڑے تھے۔ شام کو عمرانہ کی سسرال والوں کو بھی آنا تھا۔ اتنے جھنجٹ اور اتنا کم وقت...... یہ کیسے ہوگا...... وہ اپنی سوچ میں مگن تھی تب شہناز بیگم کمرے سے نکل کر آئیں۔

''یہ میں کیا سن رہی ہوں عینی......؟''

''کیا امی...... کیا سن لیا آپ نے......؟'' اس نے ایک اچٹتی سی نظر ان پر ڈالی۔

''یہ ثریا اب کیا کرنے آ رہی ہے یہاں...... سارا پیسہ تو تم نے اس کے حوالے کر دیا...... اب کیا باقی رہ گیا ہے یہاں......'' ان کے ماتھے پر شکنیں در آئی تھیں۔

''امی......! کیوں ناراض ہوتی ہیں...... روبی کی شادی ہو رہی ہے، اسی کا بلاوا دینے آ رہی ہیں۔''

''بلاوا فون پر بھی دیا جا سکتا ہے...... میں سب جانتی ہوں بیٹا......! وہ بہانے، بہانے سے کیوں آتی ہیں...... مجھے نہیں پسند اس کا یہاں آنا......''

''اچھا امی......! آپ فکر نہیں کریں...... میں ان کو سمجھا دوں گی۔''

''اچھی طرح سمجھا دینا...... مجھے اچھا نہیں لگتا...... لوگ باتیں بناتے ہیں۔''

''لوگوں کو تو باتیں بنانے کی عادت ہوتی ہے...... ویسے بھی آپ خون کے رشتے کو کیسے ختم کر سکتی ہیں۔''

''اچھا، اچھا مجھے نہ پڑھاؤ...... اپنے شوہر کی ساری کمائی سارا روپیہ، پیسہ انہیں دے کر بھی تم کو چین نہیں آیا اگر بیرسٹر صاحب تمہارے اکاؤنٹ میں چند لاکھ روپے نہ ڈلواتے تو تمہارے ہاتھ کیا آتا...... تمہارا حق ہے شرجیل کی چیزوں پر...... بیٹا ہے اس کا تمہارے پاس......'' انہوں نے پھر اپنے من کا بوجھ ہلکا کیا۔

''جی امی......!'' ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس نے بس اتنا ہی کہا اور اپنے کمرے میں چلی آئی...... طیب دودھ پی کر سو گیا تھا اسے دیکھتے ہی اس کا دل بھر آیا اور وہ رو پڑی۔

''کیسے بتاؤں آپ کو امی...... آپ کی بیٹی کس منجدھار سے نکل کر آئی ہے...... نہ آپ اور نہ ثریا آنٹی...... کسی کو نہیں پتا کہ شرجیل احمد، اکرم الٰہی یا پھر ولیم مسیح کیسے بنا...... امی اگر آپ کو پتا چلتا کہ آپ کی بیٹی کس عذاب سے گزر رہی ہے تو غم سے آپ کا کلیجا ہی پھٹ جاتا......''

''تم پھر رونے لگیں بیٹا......'' شہناز بیگم اس کے پیچھے کھڑی اسے روتا دیکھ کر بولیں۔

''نہیں تو...... بس یوں ہی......'' اس نے جلدی

سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

"میں جانتی ہوں عینی......! جوانی میں بیوگی کا غم......بہت بھاری ہوتا ہے بیٹا......" ان کا دل جوان بیٹی کے غم کو دیکھ کر چھلنی ہو رہا تھا۔ انہیں اپنے آپ پر غصہ آیا کہ انہوں نے بلاوجہ ہی فضول باتوں سے اسے زک دی۔

"مجھے معاف کر دو میری جان......! میں بوڑھی ہوں ناں...... چڑچڑی بھی ہو گئی ہوں......" انہوں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تو اس نے مچل کر ان کے بندھے ہاتھ تھام لیے۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ...... آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ آپ معافی مانگیں......"

"پہاڑ سی زندگی ہے تمہاری...... اتنے سے بچے کے سہارے کیسے گزارو گی...... میری زندگی کا کیا بھروسا...... اپنے بھائی کو تو تم جانتی ہی ہو...... عمرانہ اپنے گھر کی ہو چکی ہے...... پھر میرے پیچھے تمہیں کون دیکھے گا۔" انہوں نے اسے پھر سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود......

"میں جانتی ہوں...... آپ پھر سے مجھے شادی کے لیے مجبور کریں گی......"

"عشنہ لاکھ بری سہی لیکن...... اس نے تمہارے لیے پورے خلوص سے اس رشتے کی بات کی تھی۔"

"کیا میں آپ پر بوجھ ہوں امی......؟" اس کے چہرے کی اداسی دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھا۔

"ایسا نہیں ہے بیٹا......! اگر تم عشنہ کے رشتے کو پسند نہیں کرتیں تو...... میں رضیہ سے بات کرتی ہوں...... اس کے پاس اچھے رشتے ہوتے ہیں، وہ تمہارا پوچھنے بھی آتی تھی شرجیل کے انتقال کے بعد......"

"اچھا امی...... آپ ٹینشن نہ لیں، میں ضرور سوچوں گی۔"

اس کے الفاظ تھے یا مرہم ان کے چہرے پر رونق سی اتر آئی...... اتنے میں طیب اٹھ گیا اور رونے لگا وہ دوڑ کر اس کے پاس گئی۔

"ارے میں نے اس کا فیڈر دھونے کے لیے چولھے پر گرم پانی چڑھایا تھا...... کھول گیا ہوگا......" شہناز بیگم باورچی خانے کی جانب لپکیں۔

اس نے طیب کے گیلے کپڑے تبدیل کیے اور بستر کی چادر درست کرنے لگی کہ اس کے موبائل کی بیپ بجی۔

"السلام علیکم......" اس نے بنا دیکھے ہی فون اٹھالیا تھا۔

"وعلیکم السلام......! میں یاسر یزدانی بات کر رہا ہوں......" اتنے مہینوں بعد بھی وہ ان کی آواز بھول نہ پائی تھی۔

"جی، کیسے ہیں آپ...... عائشہ کیسی ہے...... امینہ کیسی ہے......؟" ایک ہی سانس میں وہ سوال کیے جا رہی تھی۔

"عائشہ بالکل ٹھیک ہے...... اس کے ایگزامز چل رہے ہیں، امینہ بھی اچھی ہیں، پچھلے دنوں ان کی کچھ طبیعت خراب تھی...... لیکن اب بالکل فٹ ہیں...... آپ سنائیں کیسی ہیں اور آپ کے صاحبزادے کیسے ہیں......" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"میں اچھی ہوں...... اور طیب ذرا بڑے ہو رہے ہیں ناں...... اس لیے تنگ بھی کرنے لگے ہیں...... لیکن ان کی وجہ سے گھر بھر میں رونق سی رہتی ہے۔"

"بالکل بچوں کے دم سے ہی گھر میں رونق ہوتی ہے...... آپ سے ایک بات پوچھوں تو... آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی۔"

"آپ کی کوئی بھی بات مجھے بری نہیں لگ سکتی...... آپ کے بہت احسان ہیں میری زندگی پر......" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے ادا ہو گیا۔

"ارے نہیں...... میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو شاید ایسا ہی کرتا...... بس...... میں پوچھنا چاہتا تھا کہ...... آپ کے مستقبل کے لیے کیا پلان ہیں...... میرا مطلب ہے کہ کیا آپ شادی کریں گی......" انہوں نے اتنی بڑی بات یوں اچانک ہی پوچھ ڈالی۔

"آپ نے یہ ہی پوچھنے کے لیے فون کیا تھا؟"

''میں دراصل یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ......'' وہ ذرا رک کے، اپنا گلا کھنکھار کر پھر گویا ہوئے۔

''آپ مجھ سے شادی کریں گی۔''

ان کے اس سوال پر اس کے لبوں پر تبسم سا بکھر گیا۔

''یہ عائشہ نے آپ سے کہا......؟'' اس نے پوچھا۔

''جی......'' انہوں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''مجھ سے بھی اس نے پوچھا تھا......'' اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھری۔

''کیا...... !'' ایک تحیر سا ابھرا۔

''یہی کہ...... میں آپ سے شادی کرلوں......''

''تو پھر...... آپ کا جواب کیا ہے؟'' وہ ہمہ تن گوش ہوئے۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں عائشہ کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔''

فنا مسکرا رہی تھی ایک عجب سی خودی چاروں جانب رقصاں تھی، یہ سب کیا ہے...... محبت، پیار یا کسی کی خواہش کا احترام......

☆☆☆

''محبت کیا ہے...... اس کا فلسفہ...... بڑا سیدھا سادہ ہے، میرے خیال میں ابو بن ادھم کی اس نظم میں میرے جیسے کم علم نوجوانوں کے لیے بڑا آسان سا پیغام ہے۔ ''کہ خدا ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کے بندوں سے محبت کرتے ہیں۔'' دل محبت کا مرکز ہے اور جب آدمی اپنی سانسوں کے ذریعے اس مرکز میں خون کھینچ کر لاتا ہے تو بھی شکر اللہ...... اور یہ ہی خون مرکز سے صاف ہو کر پھر سے پورے جسم کو سیراب کرتا ہے تو بھی شکر اللہ...... تو محبت شکر ہے اس رب کا کہ جس نے ہمیں زندگی کی نعمت سے نوازا یہ احساس ہے اس رب ذوالجلال کی بندگی کا جو پورے خلوص سے ہمیں اس کے سامنے جھکاتا ہے اور جب انسان رب العزت کی محبت کے شکر کے فلسفے کو پہچان لیتا ہے تو پھر اس کی روح، اس کی گفتار، اس کے عمل کا ہر گوشہ محبت بن جاتا ہے...... جس سے ایسی برکت پیدا ہو جاتی ہے کہ جو عصبیت اور تشدد سے پاک محبت کے پیکر کو جنم دیتی ہے کہ یہ در تو اس رب نے ہمیشہ کھلا رکھا ہے...... تو دوستو......! محبت کا در کبھی بند نہیں کیجیے کہ اس دنیا کی بنیاد ہی محبت پر رکھی گئی ہے۔'' کیسی لکھی ہے میں نے تقریر......'' عائشہ نے پیچھے سے آ کر اس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ میری اتنی سی بچی...... اتنی بھاری بھر کم اردو کیسے لکھ سکتی ہے۔''

''لکھتی نہیں ہوں...... دیکھتی ہوں......'' اس نے پیار سے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کیے۔

''کیا دیکھتی ہو......؟'' اس نے ذرا چونکتے اسے دیکھا۔

''آپ کو...... پپا کو اور طیب کو...... تو اپنے اللہ کا بہت شکر ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے مجھے اتنی پیاری محبت کرنے والی فیملی سے نوازا......''

قرۃ العین نے پیار سے اس کا ماتھا چوما...... تب ہی کمرے میں یاسر یزدانی تیزی سے داخل ہوئے۔

''ارے بھئی آپ لوگ ابھی تک یونہی بیٹھے ہیں، اتوار کو طیب کی سالگرہ ہے اس کے اتنے سارے کام پڑے ہیں شاپنگ کے لیے چلنا ہے یا نہیں......؟''

ان پر جیسے گھبراہٹ سوار تھی۔

''آپ ہلکان نہ ہوں...... بس اب ابھی تیار ہوتے ہیں۔''

''کمال کرتی ہیں آپ بیگم صاحبہ......! ہلکان کیوں نہ ہوں...... بیٹے کی پہلی سالگرہ ہے اور آپ ہیں کہ......''

قرۃ العین کے پیچھے یاسر یزدانی بڑبڑاتے چلے جا رہے تھے تب ہی عائشہ نے ذرا زور سے آواز لگائی۔

''میں تیار ہوں مما پپا......'' وہ دونوں کمرے سے نکل گئے اور عائشہ نے مسکراتے ہوئے اس شعر کے ساتھ اپنی تقریر ختم کی۔

''مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے''

ختم شد

نیا سال دوستوں کے سنگ

تسلیم شیخ

گیٹ پر کب سے بیل ہو رہی تھی۔ آفاق صاحب جو اپنا آفس ورک کرنے میں مصروف تھے۔ حیرت سے دیوار پر آویزاں گھڑیال کی جانب دیکھا۔ تو انہیں تعجب ہوا کہ رات کے بارہ بجے کون آگیا؟ اس وقت تو لوگ اپنے، اپنے بستر پر سکون سے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔
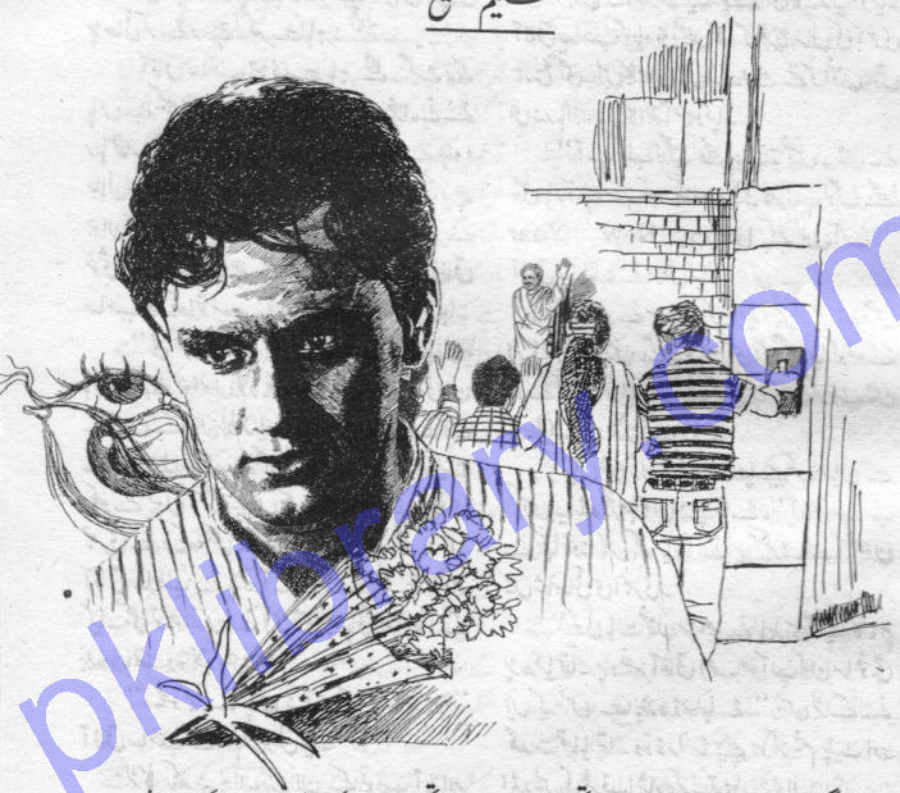
''اس سخت سردی میں کسی کو کیا پڑی۔ خدا خیر ہی کرے۔'' آفاق صاحب کی انگلیاں جو لیپ ٹاپ پر چل رہی تھیں... تھم گئیں۔ انہوں نے اپنی فائل جو کھلی پڑی تھی، اسے بند کیا۔ لیپ ٹاپ بند کیا اور چشمہ درست کرتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھے، اسٹڈی سے نکلے جو ان کے کمرے کے ساتھ ہی ملحق تھی۔ کمرے میں آئے۔ بیگم کو دیکھا جو لحاف اوڑھے گہری نیند میں تھیں۔

آہستہ، آہستہ قدم اٹھاتے، بنا آواز پیدا کیے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئے۔ راہداری سے گزرتے ہوئے انہیں خیال آیا کہ کہیں بچے تو باہر نہیں گئے۔ یہ سوچتے ہوئے انہیں غصہ آیا۔ ماتھے پر بل پڑ گئے۔ آفاق صاحب کا اصول تھا کہ دس یا زیادہ سے

زیادہ گیارہ بجے تک سب بچے سو جائیں۔ بچے جوان تھے مگر انہوں نے پھر بھی اصول نہ توڑا اور اسکول کے بچوں کی طرح ان پر سختی کی۔ بچے بھی عادی ہو گئے تھے۔ اس لیے وقت پر سو جاتے یا اپنے کمروں میں ہی پڑھائی کرتے رہتے۔ گھر سے باہر نہ نکلتے۔

آفاق صاحب تیزی سے باہر نکلے۔ گیٹ کے پاس بنے کیبن میں چوکیدار بھی مزے سے خراٹے لے رہا تھا۔ بیل ہنوز جاری تھی۔ انہوں نے بڑے جاہ و جلال کے ساتھ چھوٹا گیٹ کھولا تو سامنے پانچ، چھ جوان لڑکے لڑکیاں کھڑے نظر آئے۔ جن کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ مگر جب سامنے آفاق صاحب کو دیکھا تو سب نے ایک ساتھ ''اوووووو'' کہا۔

''جی فرمایئے!'' آفاق صاحب نے باری، باری سب نوجوانوں کو دیکھا۔ کوئی بھی لڑکا یا لڑکی ان کے بچوں کے کلاس فیلوز یا دوست احباب میں سے نہیں تھے۔ وہ تھوڑا سا ڈرے بھی کہ بنا سوچے سمجھے وہ گیٹ کھولنے کیوں آ گئے۔ یہاں تک کہ گیٹ پر بنی ذرا سی جھری سے دیکھا بھی نہیں۔ ایک نوجوان آگے بڑھا۔ آفاق صاحب نے ہاتھ آگے کر کے گویا اسے خبردار کیا۔ سبھی نوجوانوں نے اپنی ہنسی چھپائی جو لڑکا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ سنجیدہ ہی رہا۔

''دیکھو میرے پاس نہ آؤ۔ کیا چاہتے ہو؟'' آفاق صاحب نے سہم کر سوال کیا۔

لڑکا کچھ نہ بولا۔ بس ان کے قریب آیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ......'' اس نے یہ کہہ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور پھر سب یک زبان ہو کر بولے۔

"Happy New Year"

سب کے چہروں پر جوش امڈ آیا۔

آفاق صاحب نے خود کو ڈھیلا چھوڑا۔ اور لمبی سانس لی۔ ایک تو دسمبر کا مہینہ اور اوپر سے سرد ہوا کے جھونکے۔ ان کے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی جو نوجوان لڑکا ان کی طرف بڑھا تھا۔ اس کا چہرہ انہیں جانا پہچانا لگا۔ ایسا لگا جیسے بیس سال پرانا رشتہ سامنے آ گیا ہو۔ اس نوجوان نے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ آفاق صاحب کی طرف بڑھایا۔ ان کے چہرے پر خوشگوار حیرت امڈ آئی۔ انہوں نے گلدستہ لیتے ہوئے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔ آفاق صاحب کو یاد ہی نہیں تھا کہ آج سال کی آخری تاریخ تھی۔ بس کاموں میں ایسے الجھے تھے کہ انہیں ہوش ہی نہ رہا اور سال کا اختتام ہو گیا۔

''آپ سب لوگ مجھے جانتے نہیں۔ میں نے پہلی بار آپ سب کو دیکھا ہے۔ تو پھر آپ لوگ مجھے Happy New Year کہنے کیوں آئے؟'' آفاق صاحب نے سوال کیا۔

''سر ہم نے سوچا ہم کوئی ایڈونچر کریں اور جس ایریا میں کبھی نہیں گئے۔ وہاں کسی بھی گھر جا کر سوئے ہوئے کو جگا کر نیا سال وش کریں۔'' اس گروپ میں سے ایک لڑکی جوش سے بولی۔

''ہاں ضرور ایڈونچر تو کرنا چاہیے مگر دھیان سے کہیں یہ ایڈونچر مہنگا ہی نہ پڑ جائے۔'' آفاق صاحب نے کہا اور پھر کچھ یاد آنے پر مسکرائے۔ آنکھوں میں شناسائی سی ابھری۔

''کوئی بات نہیں سر ہم نے باہر ہی آپ کا نام پڑھ لیا تھا۔ پروفیسر آفاق احمد۔ سو آپ کون سا فوجی ہیں کہ جس سے بندہ ڈر جائے۔'' جس لڑکے نے گلدستہ تھمایا تھا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہو کر نیم پلیٹ اور ایڈریس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اچھا جی بہت خوب!'' آفاق صاحب ان سب کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سبھی نے قہقہہ لگایا۔

''ویسے آپ کو یہ ایڈونچر کا آئیڈیا دیا کس نے؟'' آفاق صاحب کو تعجب ہوا۔ کیونکہ نوجوانی میں یہ واقعہ ان کے ساتھ رونما ہو چکا ہوا تھا۔

سبھی نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو اُن کے گروپ کا ہی حصہ تھی۔

''میری مما جان نے بتایا ہے۔ یہ واقعہ کالج کے

زمانے میں ان کے اور ان کے دوستوں کے ساتھ رونما ہوا تھا۔'' لڑکی نے مسکرا کر بتایا۔

''کیا نام ہے آپ کی مما کا؟'' آفاق صاحب نے پوچھا۔

سبھی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آفاق صاحب نے محسوس کیا۔ جیسے وہ بتانا نہیں چاہتی۔ تو وہ خود ہی بول پڑے۔

''اگر آپ نہیں بتانا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔''

''سر ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ ہم پچھلے پانچ سال سے کر رہے ہیں۔ کسی نے کبھی مما کا نام نہیں پوچھا۔ تو بس اس لیے ہمیں حیرانی ہوئی۔'' اس لڑکی نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔ ''اور اس کے بابا بھی میری مما کے ساتھ تھے۔ اس ایڈونچر میں اور آج ہم دونوں ساتھ ہیں۔'' لڑکی نے اس لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس نے آفاق صاحب کو پھولوں کا گلدستہ پکڑایا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ دونوں کی نگاہوں میں بہت کچھ تھا۔ دونوں نے اپنے، اپنے والدین کا نام بتایا۔ جسے سن کر آفاق صاحب خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی دیکھ کر ان سب نے مزید کوئی بات نہیں کی خدا حافظ کہہ کر واپس مڑ گئے۔

ابھی وہ واپس مڑے تھے کہ آفاق صاحب نے آواز دی۔ وہ سب وہیں رک گئے۔

''چلیں کل آپ سب نئے سال کی پارٹی میری طرف کیجیے گا اور ساتھ اپنے والدین کو بھی لائیے گا۔'' ایسا لگ رہا تھا جیسے آفاق صاحب نے خود کو سمیٹا ہو۔

وہ سب بہت خوش ہوئے اور نیو ائیر پارٹی ان کے ساتھ ہی منانے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ آفاق صاحب ان سب کے جانے کے بعد کچھ پل تو وہیں کھڑے رہے پھر گھر کے اندر آ گئے۔ گیٹ مقفل کیا۔ چوکیدار کی طرف تاسف سے دیکھا جو بے خبر سو رہا تھا اسے کوئی ہوش نہیں تھا کہ کوئی باہر آیا ہے اور کتنی دیر سے گیٹ کھلا ہوا ہے۔ وہ راہداری عبور کر کے ٹی وی لاؤنج میں آ کر صوفے پر ڈھے سے گئے۔

آج سے بیس سال پہلے وہ بھی ایسے ہی تھے۔ جیسے باہر آئے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ زندگی کو ایڈونچر سمجھ کر گزار رہے تھے۔ کالج کی زندگی کے پل واقعی بہت خوشگوار ہوتے ہیں۔ ان خوب صورت پلوں کی یادوں کی سوندھی، سوندھی خوشبو ساری زندگی انسان کو اپنے آس پاس محسوس ہوتی رہتی ہے اور یوں یادوں کا یہ سلسلہ کبھی نہیں تھم پاتا۔ ہمیشہ آپ کے ساتھ، ساتھ سفر کرتی ہیں اور مسرور کر دینے والی یادیں تو ہوتی ہی ناقابلِ فراموش ہیں۔

آفاق صاحب اور ان کے ساتھ ان کے آٹھ دوست...... جس میں تین لڑکیاں اور پانچ لڑکے تھے۔ اسکول، کالج میں ایک ساتھ وقت گزارا۔ آفاق، اپنے گروپ کی ہی لڑکی علینہ کو پسند کرتے تھے مگر کبھی اظہار نہیں کیا۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ شرمیلے بہت تھے۔ آفاق کو پروفیسر بننے کا جنون تھا اور سب اسے چھیڑتے تھے کہ کیسے پروفیسر بنو گے۔ بولا تو تم سے ٹھیک جاتا نہیں ہے۔ شرما جاتے ہو پر آفاق یہی کہتا۔ کہ فکر نہ کرو بن جاؤں گا۔ تو سب اس بات پر قہقہہ لگاتے۔ وہ شرمیلا تو تھا۔ لیکن دوستوں کے ساتھ مل کر ہنگامہ کرنا، ایڈونچر کرنا اور زندگی کو بھرپور جینا...... یہ سب اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر کیا اور زندگی کے وہ چار سال خوب ہنگامے میں گزرے گویا بے فکری کی زندگی گزاری۔

وہ لوگ گریجویشن کر رہے تھے۔ آگے سب نے اپنی، اپنی اسپیشل ڈگری حاصل کرنے کے لیے مختلف یونیورسٹیوں میں ایڈمشن لینے تھے۔ سو انہوں نے سوچا گریجویشن کے آخری سال سے بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دسمبر کی چھٹیاں ہوئیں۔ مگر وہ سب کبھی کسی ریسٹورنٹ میں مل لیتے اور کبھی کسی کے گھر یا کبھی کسی پارک میں، وہ روز ملتے۔ ایسے میں ہی ان سب نے ایڈونچر کرنے کا سوچا کہ لوگ کسی کے گھر کی بیل بجا کر بھاگ تو جاتے ہیں۔ کیوں ناں آنے والے نئے سال میں ہم کچھ الگ کریں... تو یہ طے ہوا جس ایریا میں کبھی نہیں گئے۔ کسی کے رشتے دار یا کسی کی بھی اس ایریا میں رہائش نہ ہو۔ وہاں جا کر کسی کے بھی گھر...... کی بیل دے کر انہیں

جگا کر نئے سال کی مبارک باد دیتے ہیں۔
سب اس تجویز پر بہت پُر جوش تھے۔ ایسے میں آفاق کو ڈر بھی لگ رہا تھا کہ کہیں آگے سے ڈنڈے ہی نہ پڑ جائیں۔
"او کم آن آفاق... کچھ نہیں ہوگا۔" علینہ نے انگریزی میں تسلی دی۔
تو سب دوستوں نے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ منگوایا اور چلے گئے ایک پوش ایریا میں۔ جہاں رات کے اس پہر خاموشی کا راج تھا۔
"ایک بار پھر سوچ لو۔ کہیں آگے سے ہمیں کتے نہ پڑ جائیں۔" آفاق نے ڈرتے، ڈرتے سب کی طرف دیکھا اور اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے کہا۔
"کچھ نہیں ہوتا۔ کتے کو ہم ہینڈل کر لیں گے۔ تم بیل دو۔" دانیال نے بے پروائی سے بولا۔ اور ایک گھر کی بیل بجا دی۔ بیل بجانے کے پانچ منٹ انتظار کیا۔ مگر کوئی نہ آیا۔ پھر بیل دی۔ پھر بھی کوئی جواب ندارد۔
"مجھے تو لگتا ہے سب سو رہے ہیں۔ چلو کسی اور کے گھر بیل دیتے ہیں۔" ثانیہ نے اکتا کر کہا۔
آخری بار جب بیل دی تو بھی کوئی اثر نہ ہوا۔
"کیا کوئی ضروری کام ہے۔ جو بیل دی جا رہی ہے۔" ایک بھاری کم آواز پیچھے سے آئی۔ ان سب کی نظر تو گیٹ پر اور گیٹ کے پار تھی کہ کون آئے گا اس وقت گیٹ کھولنے۔ وہ سب پُر تجسس تھے۔
"ہاں جی بہت ضروری کام ہے۔ بلکہ ایمرجنسی ہے۔" دانیال نے چیونگم چباتے ہوئے ہوئے پھر بیل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
"مجھے بتا دیں کیا ایمرجنسی ہے۔ میں ان کو بتا دوں گا۔" پھر وہی مردانہ آواز گونجی۔ اس آواز میں ایسا رعب تھا کہ سب کی گردنیں پیچھے کو مڑیں کہ کون ہے جو ہمیں ڈسٹرب کر رہا۔ گردنیں مڑتے ہی۔ جب سب کی آنکھوں نے اس مردانہ آواز والے کی جسامت پر نظر کی تو سب ایک ساتھ پورے کے پورے مڑ گئے۔ آنے والا تقریباً کوئی سات، آٹھ فٹ کا تو ہوگا۔ کیا بڑی، بڑی چمکتی آنکھیں، جو انہیں ایسے گھور رہی تھیں کہ ابھی نہ ہلے تو یہ آنکھیں کبھی ہلنے کے قابل نہیں چھوڑیں گی۔ ان سب نے پاؤں سے سر تک، اور سر سے پاؤں تک اس لمبے تڑنگے آدمی کو دیکھا۔ بلکہ آدمی نہیں اس دیو قامت بندے کو دیکھا اور دیکھنا کیا تھا کہ ان سب کے پسینے چھوٹ گئے۔ بڑی، بڑی لال انگارے جیسی آنکھیں، موٹے، موٹے ہونٹ، خوب لمبی ناک کہ ابھی کوئی قریب ہوا... اور یوں وہ ناک لگی۔ اور آپ زخمی ہو گئے مگر قریب جا کر زخمی ہونے کے ڈر سے سب کی زبان جو کب سے چل رہی تھی۔ تالو کے ساتھ جا لگی۔ باڈی بلڈر جیسے بازو اور بڑے، بڑے ہاتھ کہ اگر ایک جھانپڑ کسی کو لگ جائے۔ تو بس وہ انسان ساری زندگی کے لیے سماعت سے محروم ہو جائے۔
"وہ سر ہم، ہم تو بس...... نئے سال کی مبارک باد دینے آئے تھے۔" سب تو بس آنکھیں پھاڑے، پھاڑے آنے والے کو دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں بس علینہ بولی۔ کیونکہ سب میں ایک وہی تھی۔ جس کا دماغ سلامت تھا۔ یعنی حواس باختہ تو ہوئی تھی مگر باقیوں کی طرح نہیں تھی کہ گنگ ہی ہو جاتی۔ اس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا تھا۔
"یہ وقت ہے کسی کی بیل بجا کر نیند ڈسٹرب کرنے کا۔" آنے والے کی آواز تھی یا بندوق کی گولی۔
"سر ہم معافی چاہتے ہیں۔ ہم اپنے، اپنے گھروں کو جا رہے تھے کہ سوچا کیوں ناں نئے سال کی مبارک باد دے دیں۔" اب کی بار دانیال سنبھل کر بولا۔ ایڈونچر کا لفظ نہیں بولا کہ کہیں وہ انہی کو ہی ایڈونچر نہ بنا دیں۔ اور عجائب گھر میں چھوڑ آئیں۔
وہ بندہ آگے بڑھا۔ وہ سب پیچھے کو ہوئے کہ اچانک آفاق کی نظر گیٹ پر لگی نمبر پلیٹ پر پڑی۔
"بھاگو اس سے پہلے کہ ہم ٹانگوں، پاؤں، انگلیوں، کسی سے بھی چلنے کے قابل نہ رہیں۔" آفاق نے پہلی بار صحیح وقت پر فیصلہ کیا اور سب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے نو دو گیارہ ہو گئے۔ آفاق کی بات آدھے لوگوں

نے سنی اور آدھے لوگوں نے ان صاحب کا دایاں ہاتھ پستول کی جانب بڑھتے دیکھا تو دوڑ لگا دی۔ ایسی دوڑ لگائی۔ جیسے کسی دوڑ میں حصہ لے رہے ہوں۔ بھاگتے ہوئے انہیں گولی کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

اور پھر کئی میٹر دوڑتے ہوئے آگے روڈ پر جا بیٹھے۔ لمبی،لمبی سانس لیتے ہوئے دانیال نے جب ان صاحب کے قصیدے پڑھے تو سب کے چہروں کی اڑتی ہوائیاں دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا۔ سب نے حالات کو سمجھا کہ ان کے ساتھ ہوا کیا۔ سبھی نے جھرجھری لی اور پھر ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

''اُف یار ایسا جی دار آدمی تو پہلی بار دیکھا۔'' ثانیہ نے خود کو سنبھالا۔

''شکر کرو ہم بچ گئے۔ اسپتال نہیں پہنچے۔'' عائشہ نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اس کے اس ایڈونچر نے اسپتال نہیں بلکہ قبرستان ہی پہنچانا تھا۔'' آفاق نے اتنا کہہ کر گھور کر دانیال کی جانب دیکھا۔

''یار گلدستہ تو وہیں گر پڑا۔'' طاہر بیچارگی سے بولا۔ کیونکہ گلدستہ اسی کے پیسوں سے آیا تھا۔

''یعنی ہم زندہ بچ آئے۔ اس کی پروا نہیں۔ پروا ہے تو صرف پیسوں کی۔ کیا کہنے۔'' سبھی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

اگلے دن ان کے پورے گروپ نے اپنی کلاس کے ساتھ نیا سال منایا اور پھر آخری سمسٹر کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ بہت کوشش کی آفاق نے کہ آخری سمسٹر میں وہ علینہ کو اپنے دل کا حال سنادے مگر ہمت نہ کرسکا۔

اور جس دن آخری پیپر تھا۔ اس دن آخر ہمت کر گیا۔ مگر افسوس اسے ایک نئی خبر ملی کہ دانیال اور علینہ کی آج رات منگنی ہے اور ماسٹر کرنے کے بعد شادی۔ علینہ اور دانیال سامنے سے آرہے تھے۔ آفاق کے کلاس فیلوز نے جب یہ خبر سنائی تو اس نے ایک نظر علینہ اور دانیال کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو اسی وقت صاف کیا اور پیچھے ہوگیا۔ راستے میں اسے دانیال،علینہ اور گروپ کے باقی لوگوں کے میسجز اور فون کالز آئیں۔ مگر اس نے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ اور پھر موبائل فون سے سم توڑ کر ہی نکال کر پھینک دی۔

''آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟'' آفاق صاحب سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔ جب پیچھے سے ان کی بیوی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

''ہیں میں یہاں؟ بس ایسے ہی نیند نہیں آرہی تھی۔'' انہوں نے ہڑبڑا کر جواب دیا اور ہاتھ میں بندھی گھڑی کی جانب دیکھا۔ صبح کے چار بج گئے تھے۔ یعنی وہ کئی گھنٹوں سے وہیں بیٹھے تھے۔

''خیریت؟ نیند کیوں نہیں آرہی تھی؟'' علیزہ بیگم پوچھتے ہوئے وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''پیاس لگی تھی۔ تو بعد میں پھر نیند ہی نہیں آئی۔ میں نے سوچا اب تہجد کا وقت ہونے والا ہے۔ نماز پڑھ کر ہی سونے کے لیے لیٹتا ہوں۔'' آفاق صاحب نے اپنی بیگم سے نظریں چراتے ہوئے وضاحت دیتے ہوئے جواب دیا۔ وہ کیا بتاتے کہ انہیں آج بے دھیانی میں پرانی محبت کی یاد آگئی،وہ جوانی میں اتنے کمزور تھے کہ جسے چاہتے تھے۔ اس سے اظہار نہیں کرسکے۔

''یک طرفہ محبت صحرا کی طرح ہوتی ہے۔ جو وسیع وعریض پھیلا تو ہوتا ہے مگر آگے سے شبنم کی ٹھنڈی پھوار، بارش اور دھنک کی رتی بھر امید نہیں ہوتی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تہجد پڑھ لوں۔ آپ بھی اٹھ کر وضو کرلیں تہجد پڑھ لیں۔'' علیزے بیگم شوہر کو بے دھیانی میں کہہ کر خود اٹھ کر چلی گئیں اور شوہر اپنی سوچوں میں دوبارہ الجھ گئے۔

☆☆☆

''آج شام کچھ مہمان آئیں گے۔ تو اس حساب سے کھانا بنالینا۔'' اگلی صبح آفاق صاحب نے ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہی بیگم کو حکم نامہ جاری کیا۔

''کون آرہا؟'' علیزے بیگم نے چائے رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میرے دوست آرہے ہیں۔'' آفاق صاحب

چائے کا سپ لیتے ہوئے بولے۔
"دوست......! وہ بھی چار، پانچ۔" کچن کو جاتی علیزے بیگم وہیں ٹھہر گئیں اور آنکھوں کو سیکڑتے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا۔ دونوں بچے بھی اپنا ناشتا چھوڑے باپ کے چہرے کو تکے جا رہے تھے۔
"ہاں کچھ پرانے دوست ہیں۔ کھانا اچھا بنانا۔ کسی چیز میں کوئی کسر نہ چھوڑنا۔ اگر کچھ چاہیے ہو تو مجھے فون کر کے بتا دینا۔" آفاق صاحب جانتے تھے سب انہیں ہی دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے بنا بیوی، بچوں کی طرف دیکھے، اپنی چیزیں اٹھائیں اور لمبے، لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔
"مما سچی کیا بابا کے دوست ہیں؟" دونوں بچوں نے ماں سے سوال کیا۔
"مجھے کیا پتا۔" حیران تو علیزے بیگم بھی تھیں۔ مگر کیا کر سکتی تھیں۔ شوہر نے اچانک ہی تو بم پھوڑا تھا۔ اب بیس سال بعد دوستوں کا ذکر حیران ہی کرے گا ناں سب کو۔ جس بندے کو دوستی لفظ سے ہی چڑ ہو۔ اس نے کیا دوست بنانے اور یہ بات ان کے بچے بھی اچھے سے جانتے تھے کہ بابا کو دوست پسند نہیں۔ اس لیے بچے اپنے دوستوں کو کالج تک ہی رکھتے۔ گھر کا تعاقب کروانے کی زحمت نہ کرتے۔ وجہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ سوائے آفاق صاحب کے خود کے۔

☆☆☆

"آیئے، آیئے۔" آفاق صاحب سبھی آنے والوں سے گرمجوشی سے ملے۔ علینہ اور دانیال نے جب انہیں دیکھا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔
"ہم تو سمجھے تم کب کے مرکھپ گئے ہو گے مگر تم تو زندہ ہو۔" علینہ کے فرینک انداز سے علیزے بیگم تو چونکی ہی چونکیں۔ آنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی چونک گئے۔ انہیں حیرت ہوئی کہ یہ انسان ان کے والدین کو کیسے جانتا ہے۔
"کچھ ایڈونچر زندگی بھر کی یاد بن کر دل کے نہاں خانوں میں سما جاتے ہیں اور بس خود کی ذات تک ہی ان کی یاد محدود رہ جاتی ہے۔" آفاق صاحب نے علینہ کی طرف دیکھ کر بات کی۔ اب یہ وہ خود ہی جانتے تھے کہ اس بات کی وجہ کیا تھی۔
"جی، جی بالکل۔ ویسے یار تم نے اچھا نہیں کیا۔ ہم نے تمہیں بہت کالز کیں۔ جس دن ہمارا آخری پیپر تھا۔ ہماری اس دن منگنی تھی۔" دانیال نے محبت سے علینہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔
"ہیں سچی کیا۔ تم لوگوں نے بتایا ہی نہیں۔" آفاق صاحب نے انجان بن کر خوشگوار لہجے میں پوچھا۔
"بس ہم سب کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ اس لیے بتا نہیں سکے۔ ہم نے یہی سوچا تھا کہ آخری پیپر والے دن بتائیں گے اور پھر ایک ساتھ شادی انجوائے کریں گے۔" علینہ نے محبت پاش نظروں سے شوہر کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔
"ٹھیک ہو گیا۔" آفاق صاحب نے بات کو ختم کرنا چاہا۔
"ویسے تم چلے کہاں گئے تھے۔ ہم تمہارے گھر بھی آئے تھے۔ انکل آنٹی کو بھی کچھ نہیں پتا تھا۔" ثانیہ نے سوال کیا۔
"میں نے اسکالرشپ کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ تو وہیں سے کال آ گئی تھی پھر میرے ماموں جو میری بیوی علیزے کے بابا ہیں۔ وہ وہیں مقیم تھے۔ بس اُدھر میں رہا۔ اسٹڈی مکمل کی اور تب وہیں علیزے سے محبت ہو گئی تو وہیں شادی کر لی۔ اب پانچ سال پہلے ہی یہاں شفٹ ہوا ہوں۔" آفاق صاحب نے علیزے بیگم کو پیار سے کندھے سے تھاما، سب سے تفصیلی تعارف کروایا۔
"تمہیں ہم سب سے رابطہ تو رکھنا چاہیے تھا ناں۔" ثانیہ غصیلی ہو کر بولی۔
"بس یار موبائل فون کھو گیا تھا میرا۔ رابطہ نہ کر سکا۔ میں آپ سب سے معافی چاہتا ہوں۔" آفاق صاحب نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے معافی مانگی تو سب ہنسنے لگے۔

"دیکھ لیں سر۔ ہمارے اس رات کے ایڈونچر کی وجہ سے آپ پھر سے اپنے دوستوں سے مل لیے۔" طاہر کے بیٹے نے فخر سے کہا۔

"کچھ حادثات ہمیں، ہمارے اپنوں سے ملانے کی وجہ بن جاتے ہیں۔" طاہر نے مسکرا کر کہا۔

"ایڈونچر!" ثانیہ نے تصحیح کی۔

"ہاں، ہاں وہی۔" طاہر نے مکھی اڑانے والے انداز سے کہا۔ تو سب ہنسنے لگ گئے۔

سب ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارک باد دینے لگے تھے۔ ایک طرف آفاق اور طاہر کھڑے تھے۔

"تم کافی بدل گئے ہو۔ کافی بااعتماد ہو گئے ہو۔" طاہر نے آفاق سے ایمپریس ہوتے ہوئے کہا۔

"ہماری زندگی میں جب کوئی پُراعتماد اور مضبوط ساتھی آتا ہے ناں تو اس کا ساتھ ہمارے اندر، ہمارے اپنے آپ میں خود اعتمادی بھی ساتھ ہی لے آتا ہے۔" آفاق صاحب نے جوس کا سپ لیتے ہوئے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں۔ آخری پیپر والے دن جو ہوا۔ اور جیسے تم نے سب کو بتایا۔ وہ سب جھوٹ بتایا ہے۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں اب جیسے تم نے سب کو بلایا ہے تو مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں یہ خود اعتمادی دانیال اور علینہ کی زندگی میں زہر نہ گھول دے۔" طاہر نے ڈرتے، ڈرتے کہا۔

"ایسا نہیں ہے۔ میں کیوں ان کی زندگی برباد کروں گا۔ بس مجھے پچھتاوا ہوا کہ میں خود ساختہ محبت کا خول چڑھا کر پھر رہا تھا۔ اظہار خود نہیں کیا تو کیا کسی اور کو الزام دیتا۔ اور ویسے بھی جب ان دونوں کی شادی کا اچانک پتا چلا...تو میں یہ بات سہہ نہ سکا۔ میں منظر سے ہی ہٹ گیا کہ اگر میں یہاں رہتا۔ ان کی شادی اپنی آنکھوں سے دیکھتا تو وہی ڈرا سہما آفاق ہی رہتا۔ آج جو ہوں وہ نہ ہوتا۔" آفاق صاحب کہہ کر خاموش ہوئے، [illegible] دوبارہ گویا ہوئے۔

"جو منظر یا حالات و واقعات آپ کی تکلیف کا باعث بنیں۔ اور آپ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر دکھ میں مبتلا ہوں۔ اس سے اچھا یہ ہے کہ آپ اس منظر سے کنارہ کشی کر لیں۔ سنبھلنے میں کچھ وقت لگتا ہے اور پھر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور آپ خود اعتمادی سے اپنی زندگی گزار لیتے ہیں۔ بنا کسی کی زندگی میں ہلچل کیے۔" آفاق صاحب نے وضاحت دیتے ہوئے گہری سانس لی اور طاہر کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

"بہت اچھا کیا۔" طاہر نے سراہا۔

پیچھے کھڑی علیزے بیگم بھی مسکرا دیں۔ جو اچانک ہی آ کر غیر ارادی طور پر ان سب کی باتیں سن رہی تھیں۔ وہ اب جان گئی تھی کہ آفاق صاحب کو دوست نام سے نفرت کیوں تھی۔ کیوں بچوں کو دوستی کرنے نہیں دیتے تھے۔ بس زندگی کے کچھ خلاؤں کو پورا کرنے میں وقت لگتا ہے۔ لیکن یہ خوشی تھی انہیں کہ ان کا شوہر ان کے ساتھ مخلص ہے۔ اپنی پرانی محبت کو دور کہیں دفنا آیا ہے۔

"یہاں کیوں کھڑی ہیں۔ مہمانوں کے لیے کھانا لگوائیں۔" آفاق صاحب جو علیزے بیگم کو ڈھونڈ رہے تھے۔ انہیں سوچوں میں کھڑے دیکھ کر کندھے سے ہلا کر کہا۔

"جی، جی میں ابھی کھانا لگواتی ہوں۔" علیزے بیگم نے جلدی سے اپنا دوپٹا سیٹ کیا تو آفاق صاحب مڑ گئے۔

"سنیں، نیا سال مبارک ہو۔" آفاق صاحب مڑنے ہی والے تھے کہ علیزے نے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ سجائے شوہر کو آواز دے کر مبارک باد دی تو وہ اس نادانی پر مسکرا دیے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں موجود ہر چیز مسکرا کر مبارک باد ان دونوں کو دے رہی ہو۔

کسی ایک کے جانے سے زندگی تھم نہیں جاتی۔ اگر ہم جسے چاہتے ہیں۔ وہ کسی اور کا ہو گیا ہے۔ تو اس کے لیے روگ نہ لگائیں۔ آگے بڑھیں۔ ان شاء اللہ اس سے بہترین ساتھی ضرور دے گا جو ہماری محرومیوں کو اپنی آغوش میں لے کر بھی ان کا ازالہ ضرور کر دے اور ہم کھل کر جی لیں گے۔

❀❀❀

مکمل ناول

میں اور فارہ

نگہت سیما

میں فارہ کو دیکھنا نہیں چاہتی لیکن مجھے اسے دیکھنا پڑتا ہے...... ہر روز، ہر صبح، ہر شام، ہر رات میں اسے رد کر دینا چاہتی ہوں...... لیکن نہیں کر سکتی۔

میں سب کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں اسے ناپسند کرتی ہوں لیکن میں بتا نہیں سکتی کیونکہ میں اسے ناپسند نہیں کر سکتی۔ اس میں ناپسند کرنے والی کوئی بات ہے ہی نہیں...... میں ہی کیا کوئی بھی اسے ناپسند نہیں کر سکتا۔ وہ میری بہن نہیں ہے...... میں ہر اس شخص کو بتانا چاہتی ہوں جو سمجھتے ہیں کہ فارہ میری سگی بہن ہے...... لیکن جب وہ میرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی میرا ہاتھ، ہاتھ میں لیے بڑے یقین اور اعتماد سے کہہ رہی ہوتی ہے کہ زارا اور میں ہم دونوں بہنیں ہیں...... تو میں اسے جھٹلا بھی نہیں سکتی۔ حالانکہ میں چیخ، چیخ کر بتانا چاہتی ہوں کہ فارہ میری سگی بہن نہیں ہے وہ تو...... ہاں وہ تو......

لیکن میرے لب سل جاتے ہیں... حلق خشک ہو جاتا ہے، میرا ہاتھ تھامے فخر سے مجھے دیکھتی اس کی

آنکھوں میں میرے لیے اتنی محبت، اتنا پیار ہوتا ہے کہ میں تردید نہیں کرسکتی۔ وہ کہتی ہے اسے میری بہن ہونے پر فخر ہے...... میں بھی اس پر فخر کرنا چاہتی ہوں لیکن نہیں کرسکتی۔ میں چاہتی ہوں وہ گھر جس میں، میں رہتی ہوں، وہ اس میں نہ رہے...... لیکن میں اسے اس گھر سے نکال نہیں سکتی کیونکہ یہ گھر اتنا ہی اس کا ہے جتنا کہ میرا...... میرے دادا کے دونوں بیٹے یعنی میرے بابا اور چاچو ہمیشہ سے میرے دادا کے بنائے اس گھر میں رہتے آرہے ہیں...... دادا، دادی کی زندگی میں تو خیر سب اکھٹے ہی رہتے تھے۔ کھانا بھی شاید اکھٹا ہی پکتا تھا۔ سب ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ شاید اس لیے کہ دادا، دادی میری پیدائش کے صرف دو سال بعد چند ماہ کے وقفے سے اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ لیکن دادا، دادی کے بعد بھی انہوں نے اس گھر سے جانے کا نہیں سوچا تھا۔ حالانکہ میں چاہتی ہوں کہ وہ ایسا سوچیں۔ کم از کم میرے بابا ہی ایک الگ گھر بنالیں۔ وہ گھر جو صرف میرا ہو اور جس میں فارہ کا عمل دخل نہ ہو لیکن میں یہ بات بابا سے نہیں کہہ سکتی...... ہاں کبھی بھی نہیں۔ بابا سے نہ اماں سے اور نہ ہی بڑے بھیا اور عابی بھیا سے کیونکہ وہ سب یہاں اس گھر میں بہت مطمئن اور بہت خوش ہیں۔

میں جانتی ہوں کہ اگر کبھی غلطی سے بھی میرے منہ سے ایسی کوئی بات نکل گئی تو وہ ایسی نظروں سے مجھے دیکھیں گے کہ میرا دل چاہے گا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں چھپ جاؤں...... اور وہ صرف مجھے ایسی تیر برساتی نظروں سے دیکھیں گے ہی نہیں یقیناً زبان سے بھی تیر چلائیں گے۔ بس ایک فارہ ہے جس سے میں ہر بات کہہ سکتی ہوں...... اور وہ میری کسی بھی بات کا برا نہیں مناتی۔ میں اسے مشورہ دے سکتی ہوں کہ وہ اپنا ایک الگ گھر بنالیں آخر اس کے بابا اور مما اتنے بڑے افسر ہیں اور یہ کہ وہ کسی بڑی سوسائٹی کسی پوش علاقے میں رہنا ڈیزرو کرتے ہیں۔ وہ بھی تو مجھے ہر روز نہ جانے کتنے مشورے دیتی ہے لیکن میں اس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ کہہ ہی نہیں پاتی اتنا بھی نہیں کہ چلو کہیں اور مت جاؤ اسی گھر کے دونوں پورشن الگ، الگ کرلیے جائیں کہ یہ تقریباً ڈیڑھ کنال پر بنا بڑا سا گھر کچھ نئے اور کچھ پرانے اسٹائل کا امتزاج ہے۔ دائیں طرف والا حصہ ہمارا ہے اور بائیں طرف والا چاچو کا...... بڑا سا صحن اور باہر والا ڈرائنگ روم جس کا ایک دروازہ باہر کشادہ گلی میں کھلتا ہے مشترکہ ہے کہ سب کے مرد دوست واحباب اسی ڈرائنگ روم میں آتے ہیں...... ایک گیسٹ روم بھی مع اٹیچڈ باتھ ..... مشترکہ ہے جس کے بھی مہمان آجائیں...... اسی طرح بڑا سا پورچ جس میں بیک وقت تین گاڑیاں کھڑی ہوسکتی ہیں اور تھوڑا سا گرین ایریا جسے ہم لان بھی کہہ سکتے ہیں وہ بھی مشترکہ ہے۔

ہمارے والے حصے میں تین بیڈ روم، ٹی وی لاؤنج پلس ڈرائنگ روم پلس سٹنگ، لونگ روم جو بھی کہہ لیں ایک بڑا سا کچن اور کچن سے ملحق ڈائننگ روم ہے، دوسرے حصے میں بھی سب کچھ ایسا ہے ہاں تیسرے بیڈ روم میں کچھ تبدیلیاں کرکے چاچو نے اسے اسٹڈی روم بنادیا ہے اور اس اسٹڈی روم کو چاچو کے علاوہ بابا، بڑے بھیا، چھوٹے بھیا سب ہی استعمال کرتے ہیں۔ یوں فارہ کا جب جی چاہتا ہے اپنے روم سے نکل کر ٹہلتی ہوئی میرے کمرے میں بھی اماں کے پاس، ہمارے لونگ روم میں کہیں بھی آجاتی ہے اور میں شدید خواہش کے باوجود اسے اِدھر آنے سے منع نہیں کرسکتی نہ ہی کسی کو مشورہ دے سکتی ہوں کہ درمیان میں ایک بڑی دیوار اٹھا کر گھر کے دو حصے کردیے جائیں کہ مانی بھائی یعنی بڑے بھیا عبدالرحمٰن اور عابی بھائی یعنی چھوٹے بھیا عبداللہ جنہوں نے بچپن میں کمال احمد رضوی کی کہانی...... ایک مکان دو دیواریں، نہ جانے خود کتنی بار پڑھی تھی اور پھر میرے اور فارہ کے بچپن میں جب ہم اردو پڑھنے کے قابل ہوئے تھے زبردستی پڑھا کر رُلانے کی کوشش کی تھی حالانکہ تب ہمیں شہزادیوں اور پریوں کی کہانیاں اچھی لگتی تھیں وہ تو ایسی کوئی بات سن کر مجھے کچا

ہی چبا جائیں گے۔

میں فارہ کو منع کرنا چاہتی ہوں کہ وہ مانی بھیا اور عابی بھیا سے لاڈ نہ کیا کرے اور نہ ہی ایسے ضدیں کیا کرے جیسے چھوٹی بہنیں کرتی ہیں کیونکہ وہ اس کے سگے بھائی نہیں ہیں، میں اسے جتانا چاہتی ہوں کہ مانی اور عابی بھیا صرف میرے بھائی ہیں، اس کے نہیں لیکن جتا نہیں سکتی...... کیونکہ وہ دونوں بھی تو اس کے چھوٹی بہنوں کی طرح لاڈ اٹھاتے اور پیار کرتے ہیں۔ یوں میں نے کئی بار اسے باور کرانا چاہا کہ مانی اور عابی بھیا میرے بھائی ہیں اس کے نہیں...... لیکن ہر بار مجھے لگا جیسے میں نے اگر ایسی کوئی بات کہہ دی تو اس کا دل پھٹ جائے گا وہ کتنے مان سے کہتی ہے۔

''میرے مانی بھائی......''

اور میں اس کا مان توڑ نہیں سکتی کہ اماں اکثر مجھے یہ سبق یاد کراتی رہتی ہیں۔

''فارہ کا دل بہت چھوٹا، بہت نازک ہے، اس سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کرنا جو وہ برداشت نہیں کر سکے۔''

پتا نہیں یہ مائیں کیسے اولاد کے دل کے اندر جھانک کر دیکھ لیتی ہیں شاید اماں نے بھی کبھی میرے دل کے اندر جھانک کر میری کسی ایسی خواہش کو جان لیا ہے تب ہی تو وہ مجھے سمجھاتی رہتی ہیں اور میں فارہ سے کچھ نہیں کہہ سکتی، دل مسوس کر رہ جاتی ہوں کہ کاش فارہ کا دل اتنا کمزور نہ ہوتا۔

کاش بچپن میں اس کے دل کا آپریشن نہ ہوتا...... کاش اس کے بجائے وہ ننھا سا سوراخ میرے دل میں ہوتا...... جو دو سال کی عمر میں ہی آپریٹ کر کے بھر دیا گیا تھا۔ پھر بھی سب کانچ کے نازک برتن کی طرح اسے سنبھال کر رکھتے تھے۔ اور میں وہ سب جو اس سے کہنا چاہتی تھی کہہ نہیں سکتی تھی۔

وہ جب میری اماں کے گلے میں بانہیں ڈالے یا ان کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوتی تو میرا جی چاہتا کہ اسے بازو سے پکڑ کر ہٹا دوں اور اسے یاد دلاؤں کہ یہ اس کی نہیں، میری اماں ہیں اور ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹنے کا حق صرف میرا ہے اس کا نہیں ہے۔

ہاں میں اسے یاد دلانا چاہتی ہوں کہ یہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی محبت سے اسے تکتی میری اماں ہیں...... اس کی مما تو وہ ہیں جو صبح، صبح نک سک سے درست ہو کر اپنا پرس جھلاتی چاچو کے ساتھ آفس چلی جاتی ہیں۔ لیکن میں اسے یاد نہیں دلا سکتی۔ کوئی چیز میرے اندر سے مجھے روک دیتی ہے۔

وہ میرے بابا کو بابا اور اماں کو اماں کہتی ہے۔ اور میں اندر ہی اندر بل کھا کر رہ جاتی ہوں کہ اسے آخر کیا حق ہے کہ وہ میرے بابا کو بابا اور اماں کو اماں کہے...... ایک بار جب وہ بابا کی کرسی کے پیچھے کھڑی ان کے کندھے دبا رہی تھی تو میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا تھا کہ ''تم میرے بابا کو بابا اور اماں کو اماں کیوں کہتی ہے؟ تایا ابا اور تائی اماں کیوں نہیں کہتیں۔ میں بھی تو تمہارے پاپا کو چاچو کہتی ہوں پاپا نہیں......'' وہ زور سے ہنس پڑی تھی۔

''ہاں تو...... میرے بابا اور اماں تو یہ ہی ہیں ناں وہ تو میرے پاپا اور ماما ہیں۔''

اور بابا تو جیسے اس ادا پر قربان ہی ہو گئے تھے۔

''بالکل فارہ کے بابا اور اماں تو ہم ہی ہیں...... مدثر اور روحی تو بس اس کے ماما، پاپا ہیں۔'' اور میں اندر ہی اندر کلس کر رہ گئی تھی۔

ہر روز سونے سے پہلے میں عہد کرتی ہوں کہ صبح جب وہ بابا کو آوازیں دیتی ہمارے پورشن میں آئے گی اور اخبار پڑھتے یا ناشتا کرتے بابا کو دیکھتے ہوئے کہے گی۔

''بابا...... بابا جلدی کریں میں کالج سے لیٹ ہو رہی ہوں۔'' تو میں صاف، صاف کہہ دوں گی کہ ''فارہ مدثر...... یہ میرے بابا ہیں تمہارے نہیں...... آخر تم اپنے پاپا کے ساتھ کالج کیوں نہیں جاتیں ان کا آفس بھی تو تمہارے کالج کے قریب ہی ہے۔'' لیکن جب بابا فوراً اخبار پھینک کر اور ناشتا ادھورا چھوڑ کر یہ کہتے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

''ہاں، ہاں چلو...... زارا ذرا میری گاڑی کی چابیاں تو لے آؤ دوڑ کر۔''

اور میں لب بھینچ کر انہیں گاڑی کی چابیاں پکڑا

دیتی ہوں۔ ایف ایس سی کے بعد مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا تھا جبکہ وہ اپنے اسی کالج سے ماسٹر کررہی تھی کہ یہ پوسٹ گریجویٹ کالج تھا اور ایم اے انگلش اور ایم اے اردو کی کلاسز ہوتی تھیں اور کالج، بابا کے آفس کے راستے میں آتا تھا سو وہ بابا کے ساتھ ہی جاتی تھی اور میں کبھی عالی بھیا کے ساتھ اور کبھی پوائنٹ سے...... واپسی میں بھی یوں ہی ہوتا تھا، میں یا تو یونیورسٹی بس سے آجاتی یا پھر کسی فرینڈ کے ساتھ۔

قصہ مختصر میں فارہ سے نفرت کرنا چاہتی تھی...... چاہتی ہوں...... لیکن نہیں کرسکتی...... کر ہی نہیں سکتی...... پتا نہیں کیوں؟

فارحہ عرف فارہ مدثر میرے چاچو مدثر حسن کی بیٹی ہے، اکلوتی بیٹی...... صرف چاچو کی بیٹی ہی نہیں بلکہ خالہ، خالو کی بھی...... رابعہ چچی میری خالہ بھی تھیں سگی خالہ تھیں۔ اس لیے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں اور روحی چچی، چاچو کی دوسری بیوی ہیں یعنی فارہ کی سوتیلی امی...... اماں اور بابا کی شادی کے چند سال بعد ہی نانی کا انتقال ہوگیا تھا۔ نانا پہلے ہی وفات پاچکے تھے۔ اماں اور خالہ دو ہی بہنیں تھیں اس لیے اماں اور بابا، رابی خالہ کو تنہائی کے خیال سے گھر ہی لے آئے تھے اور گھر لانے کے دو سال بعد ان کی شادی مدثر چاچو سے کردی تھی۔ اور جب فارہ پیدا ہوئی تو بڑے بھیا عبدالرحمٰن، چھ سال کے اور چھوٹے بھیا عبداللہ چار سال کے تھے۔ اماں بتاتی ہیں کہ فارہ کو دیکھ کر وہ اتنا خوش ہوئے تھے کہ سارا، سارا دن وہ رابی خالہ کے پاس بیٹھے رہتے...... بمشکل وہ رات کو زبردستی انہیں اپنے پورشن میں لاتی تھیں جبکہ وہ ہر روز ہی ضد کرتے تھے کہ فارہ کے کاٹ کو بھی ان کے کمرے میں ہی رکھ دیا جائے۔ اور فارہ کے ٹھیک تین ماہ بعد میری آمد ہوئی تھی اور اماں نے مجھے یہ کبھی نہیں بتایا تھا کہ میری پیدائش پر بھی مانی اور عابی بھیا اتنے ہی خوش ہوئے تھے جتنا کہ فارہ کی پیدائش پر لیکن مجھے پتا ہے کہ فارہ نے مجھ سے تین ماہ پہلے آکر میری اہمیت ختم کردی تھی۔ انہیں شاید میری ضرورت نہیں تھی کہ ان کے پاس پہلے سے ہی فارہ تھی بالکل اس ریموٹ کنٹرول ایروپلین کی طرح جو بابا نے عابی بھیا کو ان کی سالگرہ پر دیا تھا...... اور عابی بھیا اسے پاکر سارے گھر میں خوشی سے ناچتے پھرے تھے کہ بہت دنوں سے وہ بابا سے فرمائش کررہے تھے کہ وہ انہیں ایسا ہی ایروپلین لادیں...... لیکن جب ایک ہفتے بعد ہی چاچو کراچی سے ان کے لیے ویسا ہی ایروپلین لے آئے تھے تو انہوں نے بس ایک نظر دیکھ کر ڈبا الماری میں رکھ دیا تھا ہاں کافی دنوں مہینوں بعد جب ان کا بابا والا ایروپلین ٹوٹ گیا تھا تو انہوں نے چاچو والا نکال لیا تھا اور اگر فارہ بھی ایروپلین کی طرح ٹوٹ جائے مطلب مرجائے تو...... بچپن میں ایک بار میرے دل میں خیال آیا تھا اور پھر میں نے بڑی مشکل سے اس خیال کو دل سے نکالا تھا کہ چاچو اور چچی کے پاس تو صرف فارہ تھی اور اگر وہ مرجاتی تو پھر وہ کیا کرتے، وہ تو بالکل اکیلے ہوجاتے۔ اس لیے فارہ کو نہیں مرنا چاہیے، میں نے سیکڑوں بار دل ہی دل میں اس کی زندگی کی دعا کی تھی۔ کاش میں فارہ سے تین ماہ نہ سہی تین دن ہی بڑی ہوتی تو آج مانی اور عابی بھیا اسے جو اہمیت دیتے ہیں وہ مجھے دیتے لیکن جو ہونا تھا ہوچکا تھا...... وہ مجھ سے تین ماہ بڑی تھی اور یہ ایک اٹل حقیقت تھی اور میں چاہنے کے باوجود اسے بدل نہیں سکتی تھی...... اور نہ ہی میں ماضی میں پیچھے جانے کا طلسم جانتی تھی۔

مجھے نہیں پتا کہ مجھے فارہ کب بری لگنے لگی تھی۔ شاید جب میں پیدا ہوئی تھی تب سے ہی...... جب میں اپنی کاٹ میں لیٹی مزے سے انگوٹھا چوس رہی ہوں گی اور مانی بھیا اور عابی بھیا اسے گود میں لینے کے لیے لڑتے تھے اور جب اماں یا رابی خالہ آلتی پالتی مارے عابی بھیا کی گود میں اسے لٹاتی تھیں اور جب مانی بھیا اس کی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر اسے ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے عجیب، عجیب سی شکلیں بناتے اور اس سے باتیں کرتے ہوئے اسے میری شہزادی، میری پرنسس، میری چندا کہتے تو میں اپنی پوری طاقت سے اونچا، اونچا رونا شروع کردیتی

تھی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے بھوک لگ رہی ہوتی تھی یا پھر میرا ڈائپر گندا ہو جاتا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ سب میری طرف متوجہ ہوں، مجھے دیکھیں۔ اماں کہتی تھیں کہ میں نے بچپن میں انہیں بہت پریشان کیا ہے۔

''بس تم بلاوجہ ہی روئے چلی جاتیں۔ میں اور رابی تو ہلکان ہو جاتے تھے اور ہمیں سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ تم آخر رو کیوں رہی ہو۔'' اماں بتاتیں تو میرے لاشعور میں نقش کئی مناظر شعور میں اجاگر ہو جاتے تھے، میں اماں کو بتانا چاہتی تھی کہ میں اس لیے بلاوجہ روتی تھی کہ مجھے بھی عابی اور مانی بھیا کی گود میں لیٹنا تھا اور مجھے بھی ان کی توجہ چاہیے ہوتی تھی لیکن میں بتا نہیں سکتی تھی...... کہ بھلا اماں میری بات کا یقین کریں گی کہ چند ماہ کی بچی اور یہ سب......

لیکن یہ ہے تو سچ ہی ناں کہ میں پیدا ہوتے ہی فارہ کو ناپسند کرنے لگی تھی حالانکہ اس میں ناپسند کرنے والی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ وہ تھی بھی تو بہت پیاری، سرخ و سپید گول مٹول سی ہر آئے گئے کو اس پر پیار آتا تھا۔ اس کی سنہری، سنہری آنکھیں اور چھوٹی سی ناک، بے حد گلابی، خمیدہ ہونٹ...... وہ ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی اور میں چاہتی تھی کہ کوئی بھی اسے اہمیت نہ دے لیکن میرے چاہنے سے کیا ہوتا...... جب وہ چھ سال کی ہوئی تھی تو سب اسے پہلے سے زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ اس لیے کہ اب رابی خالہ اس دنیا میں نہیں رہی تھیں۔ اب وہ گول مٹول نہیں رہی تھی بلکہ وہ جوں، جوں بڑی ہوتی جا رہی تھی اس کے نقوش نکھرتے جا رہے تھے تیکھے، تیکھے سے بلاشبہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ بدصورت تو میں بھی نہیں تھی۔ میری گندمی رنگت خوب صورت تھی۔ گہری سیاہ آنکھوں اور گھنے سیاہ بالوں میں بھی بلا کی جاذبیت تھی۔

مجھے رابی خالہ کی وفات کا بے حد دکھ تھا۔ اور پہلی بار مجھے بابا، اماں اور بھائیوں کے علاوہ رابی خالہ سے بھی شکوہ ہوا تھا کہ وہ آخر اتنی جلدی دوسری دنیا میں کیوں چلی گئیں...... بیچاری فارہ بغیر ماں کے اکیلی رہ گئی تھی۔ لیکن وہ اکیلی کہاں تھی...... بیچاری فارہ کو تو اماں ہر وقت گود میں گھسائے رکھتی تھیں یا پھر وہ اماں کا پلو پکڑے، پکڑے ان کے پیچھے، پیچھے ہر جگہ موجود ہوتی تھی۔ کچن میں، لاؤنج میں ہر جگہ وہ اماں کے ساتھ چپکی ہوئی حتیٰ کہ وہ واش روم...... جاتیں تو وہ باہر دروازے کے پاس بیٹھی رہتی۔ شاید وہ ڈرتی ہو کہ کہیں اماں بھی اس کی ماما کی طرح اسے چھوڑ کر نہ چلی جائیں۔ لیکن بتا نہیں پاتی تھی۔ شاید اندر سے میں بھی ڈرتی تھی کہ کہیں اماں بھی رابی خالہ کی طرح...... سو میں بھی ان کے پاس ہی رہتی تھی۔ بابا، عابی بھیا اور مانی بھیا سب ہی اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگے تھے اور مجھے بھی تاکید کرتے تھے کہ مجھے فارہ سے لڑنا نہیں ہے...... اس کا خیال رکھنا ہے کیونکہ اس کی ماما اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔ میں نے اس کی ماما سے نہیں کہا تھا کہ وہ اللہ میاں کے پاس چلی جائیں لیکن پھر بھی میں فارہ سے لڑتی نہیں تھی، لڑ ہی نہیں سکتی تھی۔ ہاں میں دعا ضرور کرتی کہ رابی خالہ اللہ میاں کے پاس سے واپس آجائیں تاکہ میری اماں جو اب پوری کی پوری اس کے قبضے میں تھیں کم از کم آدھی تو مجھے واپس مل جائیں۔ اور جب میں نے فارہ سے کہا تھا۔

''آؤ فارہ...... ہم اللہ میاں سے رابی چچی کو واپس بھیجنے کی دعا کریں۔ اللہ میاں ہماری دعا ضرور سنیں گے کیونکہ بابا کہتے ہیں اللہ میاں بچوں کی دعا ضرور سنتے ہیں۔'' تو وہ لمحہ بھر آنکھیں میچے مجھے دیکھتی رہی تھی...... اور پھر بڑے مدبرانہ سے انداز میں بولی تھی۔

''جو مر جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے اور میری ماما بھی مر گئی ہیں...... مجھے پاپا نے بتایا ہے کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گی لیکن......'' اس کی سنہری آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

''اللہ میاں نے مجھے ان کے بدلے میں اماں کو دے دیا ہے۔''

''کیا اللہ میاں نے رابی چچی کے بدلے میں میری اماں کو تمہیں دے دیا ہے۔'' میرا دل تو جیسے

دھک سے رہ گیا تھا۔ تھیں تو ہم دونوں ہی ساڑھے چھ سال کی لیکن وہ شاید مجھ سے زیادہ سمجھدار تھی۔

''ہاں تو......!'' وہ بے حد مطمئن تھی۔

''لیکن وہ تو میری اماں ہیں۔'' میں رونے والی ہو رہی تھی۔

''ہاں تو ہیں ناں وہ تمہاری بھی اور میری بھی اماں......'' وہ سر اٹھائے مجھے دیکھ رہی تھی اور مجھے تھوڑی سی ڈھارس ہوئی تھی۔

''تمہارے پاپا تمہارے لیے نئی ماما کیوں نہیں لے آتے فارہ......؟''

''ہاں تو لے آئیں گے نئی ماما......''

''ہاں تو......'' اس کا تکیہ کلام تھا وہ آج بھی جب ایم اے کی طالبہ ہے اپنی گفتگو میں ہاں تو کا سابقہ ضرور لگاتی ہے۔

''کیا سچ میں چاچو تمہارے لیے نئی ماما لے کر آئیں گے؟''

''ہاں تو انہوں نے خود مجھے بتایا ہے۔'' اور وہ صحیح کہہ رہی تھی، مجھے یقین تھا۔ میں دل ہی دل میں بے حد خوش ہو گئی تھی کہ جب اس کی نئی ماما آجائیں گی تو وہ کم از کم... اتنی دیر تو اپنی نئی ماما کے پاس رہے گی جتنی دیر رابی چچی کے پاس رہتی تھی......لیکن یہ صرف میرا خیال تھا حقیقت میں تو ایسا کبھی نہیں ہو سکا...... میں رات سونے سے پہلے روز ہی دعا کرتی تھی کہ چاچو جلدی سے اس کے لیے نئی ماما لے آئیں...... اور جب میں مایوس ہونے لگی تھی اور مجھے لگنے لگا تھا کہ فارہ نے غلط کہا تھا کہ اس کے پاپا اس کے لیے نئی ماما لا رہے ہیں تب ایک رات کھانے کی ٹیبل پر انہوں نے بابا سے کہا تھا۔

''بھائی میں شادی کرنا چاہتا ہوں......''

''ہاں ضرور......'' اماں اور بابا بیک وقت بولے تھے۔

''میں تو خود تم سے بات کرنے والی تھی بس رابی کی پہلی برسی گزرنے کا انتظار کر رہی تھی کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ سال بھی نہیں گزرا......اس روز برسی کی قرآن خوانی میں پڑوس سے زبیدہ آپا آئی تھیں، انہوں نے ایک رشتہ بتایا تھا مجھے۔ سوچ رہی تھی تم سے پوچھ کر بات کروں گی۔'' اماں نے بات آگے بڑھائی تھی۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے بھابی، مجھے روحی سے شادی کرنی ہے۔''

چاچو نے شاید خود ہی فارہ کے لیے نئی ماما تلاش کر لی تھیں۔

''روحی......؟'' اماں کی سوالیہ نظریں چاچو کے چہرے پر تھیں۔

''ہاں، آپ کو یاد ہوگا روحی میری کلاس فیلو تھی اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، میں نے آپ کو بتایا بھی تھا لیکن اماں جان کی بیماری کی وجہ سے ہمیں اس کے گھر جانے میں دیر ہو گئی تھی اور اس کا رشتہ اپنے کزن سے طے پا گیا تھا اور وہ اپنے کزن سے شادی کر کے یو کے چلی گئی تھی اور بھائی جان کے اصرار پر میں نے رابی سے شادی کر لی تھی۔ اور پھر میں نے پورے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ رابی سے رشتہ نبھایا......لیکن اب جبکہ رابی نہیں ہے اور حالات اسے ایک بار پھر پاکستان لے آئے ہیں، یہ محض اتفاق ہے کہ اس نے چند ماہ پہلے میری ہی کمپنی میں جاب کی ہے۔ دراصل اس کی شادی برقرار نہیں رہ سکی تھی۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد ہی اس نے طلاق لے لی تھی۔ اور وہاں یو کے میں ہی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ، ساتھ جاب کرتی رہی۔''

''ہائے تو طلاق کیوں ہو گئی بیچاری کو، اتنی پڑھی لکھی خوب صورت......'' اماں کے دکھ پر مجھے ہنسی آئی تھی لیکن میں منہ نیچے کیے اپنے ڈول ہاؤس کے لان میں کرسیاں سجاتی رہی تھی۔ میں اور فارہ کھانا کھا کر اپنے سٹنگ روم میں کارپٹ پر بیٹھی کھیل رہی تھیں اور ڈائننگ روم کے کھلے دروازے سے سب ہمیں نظر آ رہے تھے اور ہم ان کی باتیں بھی سن رہے تھے۔

''اس کے شوہر کو اس کا جاب کرنا پسند نہیں تھا جبکہ روحی اپنی تعلیم کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔''

''ہائیں تو کیا اب تم سے شادی کے بعد بھی وہ

جاب کرے گی؟'' اماں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''ہاں، مجھے اس کے جاب کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' چاچو بے حد مطمئن اور خوش لگ رہے تھے۔

''اور فارہ، کیا فارہ!'' اماں کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''شادی میں اپنے لیے کررہا ہوں فارہ کے لیے نہیں، فارہ کے لیے آپ ہیں ناں...... اس کی اماں جان......'' چاچو نے قہقہہ لگایا تھا...... اور فارہ نے اس سے بڑی جتاتی نظروں سے مجھے دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''ہاں تو میری اماں ہیں ناں، بھلا مجھے نئی مما کی کیا ضرورت......'' اور میں جو چاچو کی شادی اور فارہ کی نئی ماما آجانے کے خیال سے خوش ہو رہی تھی میری خوشی میرے اندر ہی مرگئی تھی۔ میں نے بجھے دل سے اپنے کھلونے سمیٹ کر رکھ دیے تھے۔

چاچو کی شادی سے فارہ کو کوئی فرق...... پڑنا تھا یا نہیں لیکن اس کے حوالے سے سب ہی اپنے، اپنے طور پر کچھ پریشان تھے۔

''نہ جانے کس مزاج کی ہوگی...... فارہ کے اور ہمارے ساتھ اس کی بنے گی بھی یا نہیں......'' اماں دن میں دو، تین بار ضرور یہ کہتیں۔

مانی بھیا اور عابی بھیا فکر مند تھے کہ کہیں فارہ کی نئی مما سنڈریلا کی مما جیسی نہ ہوں...... انہوں نے سنڈریلا اور سنو وائٹ کی کہانیاں سنا کر ہمیں ڈرانے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں تو کیا ہوا، وہ بے شک سنڈریلا کی مما جیسی ہی ہوں، میرے پاس تو اماں ہیں ناں...... اور سنڈریلا کے پاس میری اماں جیسی اماں تو نہیں تھیں ناں......'' اور اماں نے سو جان سے اس پر فدا ہوتے ہوئے لپٹا، لپٹا کر اسے پیار کیا تھا۔

''ہاں تو میں ہوں ناں اپنی فارہ کی اماں......'' اور روحی چچی کو فارہ کے لیے نہیں چاچو کے لیے اس گھر میں آنا تھا۔ اس لیے وہ دلہن کے روپ میں بھی مجھے ذرا اچھی نہیں لگی تھیں۔ کچھ مغرور اور اکڑی، اکڑی سی اور آج تک وہ مجھے ایسی ہی لگتی ہیں مغرور اور خود پسند سی...... فارہ کی تو وہ بالکل پروا نہیں کرتیں۔

جب فارہ چھوٹی تھی اور چاچو کی نئی، نئی شادی ہوئی تھی تو اماں فارہ کو اِدھر ہی لے آئی تھیں۔ اور وہ میرے کمرے میں ہی سوتی تھی۔ صبح صبح اماں ہی اسے تیار کرواتیں اور بابا ہم دونوں کو اسکول چھوڑ آتے تھے۔ واپسی پر اماں یا بابا لاتے تھے لیکن جب ہم ہائی اسکول میں آئے تو فارہ کو اپنا الگ کمرا سجانے کا شوق ہوا اور وہ اب اپنے گھر اپنے کمرے میں رہنے لگی تھی۔

رابی خالہ تھیں تو خود ہی کلکنگ کرتی تھیں گو مدد کے لیے ایک چھوٹی لڑکی نازیہ تھی جبکہ گھر کے دوسرے کاموں صفائی، برتن اور کپڑے دھونے کے لیے دو ماسیاں آتی تھیں لیکن روحی چچی نے تو اب کک رکھ لیا تھا کیونکہ انہیں آفس جانا ہوتا تھا۔ وہ صبح چاچو کے ساتھ ہی آفس جاتیں اور ان کے ساتھ ہی واپس آتیں۔ انہوں نے کبھی فارہ سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ دن بھر کیا کرتی رہتی ہے، ہوم ورک کیا یا نہیں...... ہاں چاچو کبھی، کبھی ضرور پوچھتے تھے اور میں جسے گھر میں سب سے زیادہ چاچو کی شادی کی خوشی تھی۔ میں ہی سب سے زیادہ مایوس ہوئی تھی باقی کسی کو تو پروا ہی نہیں تھی کہ روحی چچی کیسی ہیں...... فارہ کو تو بالکل بھی نہیں...... میرے بابا اس کے بابا، میری اماں اس کی اماں، بھائی اس کے بھائی تھے اور میں زارا منیٰر اس کی بہن تھی۔ وہ بڑے فخر سے سب سے میرا تعارف کرواتی تھی۔ ''میری بہن زارا......''

جب ہم کڈ کیمپس سے ہائی اسکول میں آئے تھے جہاں سکس سے کلاسز اسٹارٹ ہوتی تھیں تو پہلے روز وہ میرا ہاتھ پکڑے کلاس میں داخل ہوئی تھی۔ حالانکہ میں اس سے ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی لیکن چھڑا نہیں سکی تھی۔

''آپ دونوں بہنیں ہیں؟'' ٹیچر نے پوچھا تھا۔ میں بتانا چاہتی تھی کہ نہیں یہ میرے چاچو کی بیٹی ہے لیکن وہ مجھ سے پہلے بول ہی پڑی تھی۔

''یس میم......!'' اور میں تردید نہیں کر سکی تھی۔

''جڑواں......؟'' ٹیچر دلچسپی سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔

''نو میم، میں زارا سے تین ماہ بڑی ہوں......''

''کیا سگی بہنیں ہو......؟''

''یس میم......!'' وہ اتنے اعتماد اور یقین سے ٹیچر کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی کہ ٹیچر کنفیوز ہو کر مجھے دیکھنے لگی تھیں۔

''کیا واقعی یہ آپ سے تین ماہ بڑی ہیں؟'' اور میرے یس کہنے پر وہ ٹیچر کی آنکھوں میں جمی حیرت سے بے پروا سی میرا ہاتھ پکڑ کر ڈیسک کی طرف بڑھ گئی تھی۔ یہ تو اماں نے پیرنٹس میٹنگ میں ٹیچر کا کنفیوژن دور کیا تھا ورنہ وہ تو اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی کہ وہ میری بہن ہے اور مجھ سے تین ماہ بڑی ہے اور اسکول کے پانچ سالوں میں اس نے اپنا موقف تبدیل نہیں کیا تھا۔ ہاں کالج میں آ کر اس نے تین ماہ والا سابقہ لگانا چھوڑ دیا تھا...... اکثر لڑکیاں ہمیں جڑواں سمجھتی تھیں تو سمجھتی رہیں اسے پروا نہیں تھی...... چچازاد اور خالہ زاد ہونے کی وجہ سے تھوڑی بہت مشابہت تو تھی ہی سو کبھی کسی نے وضاحت نہیں چاہی تھی۔ پھر کالج میں ہمارے مضامین بھی الگ، الگ ہو گئے تھے۔ میں نے سائنس لی تھی اور وہ آرٹس پڑھنا چاہتی تھی۔ مجھے مانی بھیا کی طرح ڈاکٹر بننا تھا اور وہ کیا بننا چاہتی تھی اس نے بتایا نہیں تھا۔ البتہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا تھا۔

''توبہ۔ میں مُردوں کی چیر پھاڑ نہیں کر سکتی۔''

وہ تو کسی کو انجکشن لگتے دیکھ کر پیلی زرد ہو جاتی تھی سب جانتے تھے سو عابی بھیا نے اسے انجینئر بننے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ وہ خود بھی یو ای ٹی سے انجینئرنگ کر رہے تھے وہ الیکٹریکل انجینئر بننا چاہتے تھے۔

''توبہ مجھ سے اتنی ٹف پڑھائیاں نہیں ہوتیں۔ میں تو سیدھے سادے آسان سے مضامین لوں گی۔''

میں پہلے تو خوش ہوئی تھی کہ چلو کچھ دیر کے لیے ہی سہی وہ اور میں الگ، الگ ہوں گے لیکن پھر میرا اس کے بغیر اپنی کلاس میں دل ہی نہیں لگتا تھا اور کئی بار میں نے سوچا تھا، میں بھی سائنس چھوڑ کر آرٹس لے لوں لیکن پھر ہولے، ہولے دو تین لڑکیوں سے میری دوستی ہوئی تھی۔ ایف ایس سی کے بعد میرا ایڈمیشن میڈیکل کالج میں ہو گیا تو وہ اسی کالج میں رہ گئی تھی۔ بی اے کے بعد اس کا ارادہ اسی کالج سے اردو ادب میں ماسٹر کرنے کا تھا۔

''کیا کرو گی اردو ادب میں ماسٹر کر کے، انگلش لٹریچر لے لینا۔'' عابی بھیا نے اسے سمجھایا تھا۔

''اردو والوں کو تو ڈھنگ کی جاب بھی نہیں ملتی۔''

''آپ سے کس نے کہا کہ مجھے جاب کرنی ہے۔'' اس نے حیران ہو کر کہا تھا۔

''میں تو اماں کی طرح گھر کے کام کروں گی......
مزے، مزے کے کھانے پکاؤں گی......اور وہ جو میرا
میاں ہوگا ناں تو کما کر وہ لائے گا ہاں تو......''
وہ بھیا کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور عابی بھیا
اسے دیکھ رہے تھے پھر یک دم وہ ہنس پڑے تھے۔
''ہاں ٹھیک ہے تم نہ کرنا جاب......تمہارا میاں
کمائے گا......اور تم اپنے میاں پر حکمرانی کرنا۔'' اس
روز عابی بھیا کی آنکھوں میں اتنی چمک تھی اور ہونٹوں
پر ایسی دل آویز مسکراہٹ تھی کہ میں انہیں دیکھتی رہ گئی
تھی۔ اس روز اس نے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ ''اماں
اس کی آئیڈیل ہیں......اور وہ بالکل اماں جیسا بننا
چاہتی ہے۔'' اور اس روز میں نے غور کیا تھا کہ اس میں
اماں جیسی بہت سی عادتیں ہیں......ویسی ہی کشادہ دل،
خوش اخلاق، ہنس مکھ، صابر اور سب کا خیال رکھنے والی
اور میں جو اماں کی بیٹی تھی میں عادات میں ان جیسی نہیں
تھی، ہاں شکل صورت کچھ، کچھ اماں سے ملتی تھی لیکن
عادات پتا نہیں کس پر تھیں یا شاید میری ذاتی تھیں۔
میری پڑھائی ٹف تھی، میں گھر آ کر تھوڑا سا آرام
کرنے کے بعد پھر پڑھنے بیٹھ جاتی مجھے بہت پڑھنا
ہوتا تھا لیکن جب وہ میرے کمرے میں آتی تو میں اس
سے نہیں کہہ پاتی تھی کہ مجھے پڑھنا ہے تم چلی جاؤ......
وہ خود ہی کہتی۔
''زارا تم پڑھتی رہو......میں تمہیں ڈسٹرب نہیں
کروں گی۔ بس کچھ دیر بیٹھوں گی......صبح سے تمہیں
دیکھا نہیں تو اندر کچھ خالی، خالی سا لگتا ہے۔''
اور میں اسے کہنا چاہتی تھی فارہ تم بھلا مجھے خاموشی
سے بیٹھ کر دیکھو لیکن میں اس طرح پڑھ نہیں سکتی۔ لیکن میں
نہیں کہہ سکتی تھی اسے خود ہی احساس ہوتا تھا کہ میں نے
کتابیں رکھ دی ہیں اور اس کی باتیں سن رہی ہوں۔
''مجھے پتا تھا تم بھی میرے لیے اداس ہو رہی ہو
گی......ہاں تو صبح کالج جانے کی افراتفری میں کہاں اچھی
طرح سے دیکھ اور بات کر سکتے تھے۔ اداس ہو ناں۔''
میں نفی میں سر ہلانا چاہتی تھی......لیکن اثبات میں

دسمبر بیت جائے گا

تمہارے ہونٹ ہلنے تک دسمبر بیت جائے گا
ہمارے زخم سلنے تک دسمبر بیت جائے گا
مجھے اس سرد موسم میں بہت یادیں ستاتی ہیں
تمہیں پیغام ملنے تک دسمبر بیت جائے گا
شاعر: نسیم شاہد
انتخاب: فائزہ شہزاد، حیات آباد، پشاور

سر ہلا دیتی اور اس کی آنکھوں کا سنہرا پن لو دینے لگتا۔
''ہاں تو کیا ضرورت تھی اتنی مشکل پڑھائی
کرنے کی......ہم دونوں ایک جیسے مضمون رکھتے تو کتنا
مزہ آتا ناں......'' اور وہ کچھ دیر باتیں کر کے اماں کے
پاس چلی جاتی......وہ ہمیشہ ہنستی اور خوش رہتی تھی......
روحی چچی کا رویہ اس کے ساتھ اتنا اجنبی، اجنبی سا ہوتا
تھا کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو ہر وقت روتی ... رہتی
لیکن اس نے صبر اور برداشت شاید اماں سے سیکھا
تھا......پہلی بار میں نے اسے روتے تب دیکھا تھا جب
مانی بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکا چلے
گئے تھے۔ وہ سارا دن روتی رہی تھی۔ کھانے کی ٹیبل پر
بھی وہ سوں، سوں کرتی رہی تھی اور اماں، بابا، عابی
بھائی سب اسے بہلا رہے تھے سمجھا رہے تھے حالانکہ
اماں کی اپنی آنکھیں بھی بار، بار نم ہوئی جاتی تھیں لیکن
وہ لقمے بنا، بنا کر اسے کھلا رہی تھیں۔ کھانا کھانے کو تو
میرا بھی جی نہیں چاہ رہا تھا اور ائر پورٹ سے آ کر اپنے
کمرے میں جا کر میں بھی بہت روئی تھی لیکن کسی کا
دھیان میری طرف نہیں گیا تھا۔
''ہمیں بھی مانی کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگ رہا
لیکن اولاد کے مستقبل کے لیے دل پر پتھر رکھنا پڑتا ہے
بیٹا......'' بابا نے بھی اسے سمجھایا تھا۔
''دعا کیا کرو کہ تمہارا بھائی جس مقصد کے لیے گیا
ہے اسے حاصل کر کے ہی لوٹے......اور جب وہ آئے گا
تو تمہیں بھی فخر ہوگا کہ تمہارا بھائی اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے بابا پر مانی بھائی یاد بہت آرہے ہیں۔'' وہ بھاں، بھاں کر کے رونے لگی تھی اور اماں نے اسے گلے لگالیا تھا، وہ اس کے سر کو چوم رہی تھیں اور ان کے اپنے آنسو اس کے بالوں میں گر رہے تھے۔ میرا کتنا دل چاہا تھا کہ اماں مجھے بھی گلے لگائیں اور میرے منہ میں بھی لقمے بنا، بنا کر ڈالیں، آخر میں بھی تو کچھ کھائے بے بغیر ٹیبل سے اٹھ آئی تھی بلکہ کسی سے بھی کچھ نہیں کھایا گیا تھا۔ سب دو، دو نوالے، لے کر اٹھ گئے تھے۔

''فارہ کا دل بہت کمزور ہے...... بہت چھوٹا اور نازک...... زارا بچے، فارہ کو ساتھ لے جاؤ، دونوں بہنیں گپ لگاؤ، کوئی ٹی وی پروگرام دیکھو یا کسی سہیلی کی طرف چلی جاؤ...... دل بہل جائے گا۔''

اماں نے کہا بھی تو مجھ سے کیا کہا میں نے سرخ سوجی ہوئی آنکھوں سے گلہ کرتی نظروں سے اماں کو دیکھا تو انہوں نے بے اختیار مجھے بھی اپنے ساتھ لگا لیا۔

''اپنے بھیا کی صحت و زندگی کے لیے دعا کیا کرو، اللہ اسے خیریت سے کامیاب واپس لائے۔''

آہستہ سے آمین کہتے ہوئے میں نے خود کو الگ کر لیا۔ مانی بھیا کے جانے کے بعد بہت دن بعد بھی گھر میں اداسی سی رہی۔ فارہ کی آنکھوں میں بار، بار آنسو آجاتے اور پھر سب اس کی دلجوئی میں لگ جاتے۔ اماں کچن میں اسے اپنے ساتھ مصروف رکھتیں۔ پھر ہولے، ہولے سب عادی ہو گئے...... یوں بھی مانی بھیا سیٹل ہونے کے بعد اکثر اسکائپ پر بات کرنے لگے تھے۔ سب ہی سٹنگ میں اکھٹے ہو جاتے تھے۔ عابی بھائی کے لیپ ٹاپ پر سب سے ہی بات ہوتی تھی۔ سب کی خیریت پوچھنے اور چند باتیں کرنے کے بعد وہاں صرف فارہ ہی رہ جاتی تھی۔ فارہ اور مانی بھائی کی باتیں سب کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی تھیں۔ مانی بھیا پوچھتے۔

''ارے فارہ تمہاری اس کالی کلوٹی ہیروئن کو ہیرو ملا؟''

''مل جائے گا......'' وہ بے پروائی سے کہتی۔

''آخر اتنی خوبیاں ہیں اس میں۔''

''اور وہ اس کا کزن جو تتلا کر بات کرتا تھا، وہ رشتہ کیا ہوا۔ اس نے لیلیٰ کو پرپوز نہیں کیا تھا۔'' بھیا کے لبوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ ہوتی تھی۔

''کیا تھا لیکن انکار کر دیا اس نے......'' وہ کندھے جھٹکتی۔

''ہائے تو اب کیا ہو گا بیچاری لیلیٰ کا اتنی کالی سی تو ہے...... اس سے اچھا رشتہ کہاں ملنا تھا اسے۔'' عابی بھیا افسوس کرتے۔

''کیوں نہیں ملے گا اچھا رشتہ...... اتنی گوری ہو گئی ہے وہ ہاں تو...... گورا کرنے والی کریمیں لگا، لگا کر۔''

اور مانی بھیا کا قہقہہ سب کو مسکرانے پر مجبور کر دیتا۔ شروع، شروع میں مجھے بابا اور اماں کو اس طرح کی باتیں سمجھ نہیں آتی تھیں کہ یہ کون لیلیٰ ہے اور کون سا ہیرو لیکن پھر عابی بھیا کے بتانے پر پتا چلا کہ وہ کہانیاں لکھتی ہے اور اس گفتگو کا تعلق اس کی کسی ادھوری کہانی سے ہوتا تھا جو مانی بھیا نے پڑھ رکھی ہوتی تھیں۔ فارہ کو افسانے اور کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا اس کا علم تو مجھے تھا لیکن وہ کہانیاں بھی لکھتی تھی اس کی اس نے مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ وہ کب سے لکھ رہی تھی مجھے علم نہیں تھا...... اور اپنی لکھی کہانیوں کو وہ کہیں چھپواتی بھی تھی یا نہیں...... یہ بھی میں نہیں جانتی تھی اور نہ میں نے پوچھا تھا لیکن جس روز عابی بھیا نے اس کے لکھنے کے متعلق بتایا تھا اس روز وہ میرے کمرے میں آئی تو اس نے اپنی لکھی چند کہانیوں کا پلندا میرے سامنے رکھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''وہ ادھوری نامکمل کہانیاں جو کچھ عرصہ پہلے میں نے لکھی تھیں تو عابی بھیا اور مانی بھیا نے پڑھی تھیں۔''

''لیکن مجھے تو دلچسپی نہیں ہے فارہ اور پھر میرے پاس وقت کہاں ہوتا ہے پڑھنے کا۔'' میں نے اپنی بھاری بھرکم کتاب ٹیبل سے اٹھائی۔

''تم ناراض تو نہیں ہو ناں زارا......؟''

''کس بات پر؟'' میں حیران ہوئی تھی۔

''یہ کہ میں نے تمہیں کہانیاں لکھنے کا نہیں بتایا۔'' اس نے اپنی کہانیوں کا پلندا اٹھایا۔

''نہیں بھلا اس میں ناراض ہونے والی کیا بات

ہے۔'' اور میری بات سن کر وہ مسکرائی۔
''دراصل مجھے خود یقین نہیں تھا کہ میں جو کچھ لکھ رہی ہوں وہ کسی قابل ہے، یہ تو مانی بھیا نے میری حوصلہ افزائی کی مجھے انہیں ضرور مکمل کرنا چاہیے تو بس اب میں امتحان سے فارغ ہو کر انہیں مکمل کروں گی...... اچھا تم پڑھو اب......'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی لیکن جاتے، جاتے مڑ کر دیکھا۔
''تو تمہیں مجھ سے کوئی گلہ نہیں ہے ناں......''
اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا...... اب میں اسے کیا بتاتی کہ اس کے علاوہ مجھے گھر کے ہر فرد سے ہی گلے تھے اور مانی بھیا سے تو بہت زیادہ...... فارہ سے باتیں کرتے وہ بھول ہی جاتے تھے کہ میں بھی وہاں ہوں...... میرا بھی ان سے باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن میں تو جیسے وہاں ہوتی ہی نہیں تھی اور میں اکثر وہاں سے اٹھ آتی تھی۔
''ارے یہ زارا کہاں چلی گئی؟'' کبھی مانی بھیا پوچھتے اور تو اماں کا ایک ہی جواب ہوتا۔
''تمہیں پتا تو ہے اس کی پڑھائی کتنی مشکل ہے، خواہ مخواہ ڈاکٹر بننے کا شوق چرایا ہے۔ اتنا سا منہ نکل آیا ہے میری بچی کا۔'' کیا اماں کو پتا نہیں چلتا تھا کہ میں وہاں سے کیوں اٹھ آتی تھی۔ مجھے لگتا تھا۔ سب حتیٰ کہ میری اماں بھی مجھ سے زیادہ اس سے محبت کرتی تھیں اور مجھے صرف لگتا ہی نہیں تھا بلکہ اس کا یقین بھی تھا اور اس یقین پر وقتاً فوقتاً مہر بھی لگتی رہتی تھی۔
ایم اے فائنل سے پہلے ہمارے کالج کی لڑکیوں کا ٹرپ جایا کرتا تھا۔ زیادہ تر شمالی علاقہ جات کی طرف اور لڑکیاں پورے چار سال اس لمبے ٹرپ کا انتظار کرتی تھیں۔ یوں ہر سال گرما کی چھٹیوں سے پہلے ایک دو روز کا ٹرپ اسلام آباد یا مری تک جایا کرتا تھا...... فارہ چاہتی تھی کہ میں بھی اس ٹرپ پر اس کے ساتھ جاؤں...... پرنسپل کی اجازت سے کچھ لڑکیاں اپنی بہنوں یا کزنز وغیرہ کو پے منٹ کر کے لے جا سکتی تھیں۔ میں نے پڑھائی اور ٹیسٹوں کا بہانہ کر کے بمشکل ٹالا تھا اسے۔ وہ لوگ ناران، کاغان جا رہے تھے۔ ان کا یہ ٹرپ پندرہ دن کا تھا۔ اور پندرہ دن مجھے لگا تھا کہ یہ پندرہ دن میری زندگی کے ان بہترین دنوں میں ہوں گے جب گھر میں صرف میں ہوں گی، فارہ نہیں ہوگی۔
لیکن فارہ تو نہ ہوتے ہوئے بھی گھر میں ہی تھی۔
''فارہ ہوتی تھی تو گھر میں کیسی رونق اور زندگی سی محسوس ہوتی تھی۔'' اماں اٹھتے بیٹھتے اسے یاد کر رہی تھیں۔
''یہ زارا تو ہر وقت کتابوں میں گھسی رہتی ہے۔''
''ہاں تو......!'' عابی بھائی نے شاید غیر ارادی طور پر اس کا تکیہ کلام استعمال کیا تھا۔'' اسے گئے ابھی دو ہی دن تو ہوئے ہیں اور لگتا ہے جیسے مہینے ہو گئے ہوں بس آئندہ مت جانے دیجیے گا کہیں۔''
اور اماں کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی اور میں جو اماں کی مدد کے خیال سے کچن میں جا رہی تھی واپس اپنے کمرے میں آ گئی تھی اور کتنی ہی دیر یونہی کتاب کھولے بیٹھی رہی تھی۔ پڑھنے میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا تو کیا مجھے بھی اس کی کمی محسوس ... ہو رہی ہے؟ میں نے خود سے پوچھا تھا اور خود ہی جواب بھی دے دیا تھا کہ بھلا میں کیوں اس کی کمی محسوس کروں گی اور مجھے اس کی کمی محسوس بھی نہیں کرنی تھی لیکن میں اس کی کمی محسوس کر رہی تھی تب ہی تو کچھ دیر بعد پھر اٹھ کر کچن میں آ گئی تھی کہ اماں کچن میں اکیلی مصروف تھیں...... وہ ہوتی تو اماں کے ساتھ کچن میں لگی رہتی تھی۔ کبھی سلاد بنا دی، روٹیاں بیل دیں، کبھی اماں کو ہٹا کر خود پکانے کھڑی ہو جاتی تھی اور اب وہ نہیں تھی تو مجھے اماں کی مدد کرنی چاہیے تھی۔
''اماں......'' میں نے کچن میں جا کر اماں سے کہا۔
''کوئی کام ہو تو مجھے بتائیں۔ آپ صبح سے اکیلی ہی کام کر رہی ہیں۔'' انہوں نے مڑ کر مجھے دیکھا اُن کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے حیرت سی نمودار ہوئی تو میں شرمندہ سی ہو گئی۔
''وہ فارہ نہیں ہے ناں، ورنہ وہ آپ کے ساتھ آپ کی مدد کروا دیتی تھی، آپ صبح سے مصروف ہیں کیا پکا رہی ہیں۔''
''چکن کڑاہی ہے اور ساتھ میں بھنا قیمہ بھی

ہے۔ دال، چاول بھی بنانے ہیں۔ روحی نہیں ہے آج تو تمہارے چاچو بھی ڈنر ہمارے ساتھ ہی کریں گے۔'' وہ مسکرائیں۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے کیا تھا، محبت، شفقت، ماما......

''میں کرلوں گی تم پڑھو......''

''نہیں اماں، تھک گئی ہوں پڑھ، پڑھ کر......''

اماں کی آنکھوں میں رقم یہ شفقت و محبت پہلے تو مجھے کبھی نظر نہیں آئی تھی یا میں نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

''تھک گئی ہو تو آرام کرلو کچھ دیر...... عابی سے گپ شپ لگاؤ...... ٹی وی دیکھ لو...... ابھی شازیہ بھی آجائے گی۔'' (ملازمہ) شازیہ شام تک کچن کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھی۔

ماما سے لبریز لہجہ...... میرا دل گداز ہوا۔ آخر کو وہ میری اماں تھیں، یقیناً انہیں مجھ سے بھی محبت تھی لیکن فارہ کے سامنے تو میں انہیں دکھتی ہی نہیں تھی۔

''تمہارے چاچو اور بابا آجائیں تو ٹیبل لگوا دینا۔'' وہ مڑ کر کڑاہی دیکھنے لگیں تو میں اپنے کمرے میں واپس آگئی۔

ان دنوں پتا نہیں میں کیوں اتنی زود رنج ہو رہی تھی۔ وہ نہیں تھی پھر بھی وہ تھی، کھانے کی ٹیبل پر، ناشتے کے وقت، ٹی وی لاؤنج میں ہر جگہ اس کا ذکرِ خیر موجود رہتا...... روحی چچی دو دن کے لیے کراچی گئی ہوئی تھیں اور چاچو نے دو دن کے لیے کک کو بھی چھٹی دے رکھی تھی بقول ان کے بیچارہ کب سے اپنے والدین سے ملنے کے لیے گاؤں جانا چاہ رہا تھا اور روحی چچی ٹال رہی تھیں...... اس کے اپنے بیوی بچے یہاں ہی چوبرجی کے قریب ہی رہتے تھے اور وہ صبح سویرے آتا تھا اور رات کو آٹھ بجے تک گھر چلا جاتا تھا۔ سو چاچو سے ناشتے اور ڈنر پر ملاقات ہوتی تھی اور میں نے پہلی بار چاچو کو فارہ کے لیے پریشان دیکھا تھا۔

''کل سے فون نہیں آیا اس کا بھابی، میں بہت پریشان ہو رہا ہوں۔''

''وہ جہاں ہیں وہاں سگنلز کا پرابلم ہے، آپ پریشان نہ ہوا کریں۔'' عابی بھیا نے انہیں سمجھایا تھا۔

''واپس ناران آکر وہ فون کرے گی۔''

چاچو، اماں سے مسلسل فارہ کے متعلق باتیں کرتے رہتے تھے اور پتا نہیں کیوں مجھے چاچو کا فارہ کے لیے پریشان ہونا اور اس کے متعلق باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ آخر میرے بابا اور اماں ہی اس کی فکر کیوں کریں، ان کا بھی تو فرض بنتا ہے ناں...... آخر کو وہ انہی کی بیٹی تو تھی۔ اور روحی چچی...... انہوں نے کراچی سے واپس آکر ایک بار بھی فارہ کے متعلق نہیں پوچھا تھا کہ اس نے کب آنا ہے اور اس کا کوئی فون آیا یا نہیں...... ہاں چاچو نے صبح آفس جاتے ہوئے اماں سے فارہ کے متعلق پوچھا تھا۔ اور انہیں بتایا تھا کہ رات فارہ فون کرتی رہی لیکن ان کا فون آف تھا انہیں پتا نہیں چلا...... اب صبح کھولا تو کالز آئی ہوئی تھیں۔ اماں انہیں فارہ سے ہونے والی گفتگو بتا رہی تھیں اور چاچو کے پیچھے کھڑی روحی چچی اپنی کلائی موڑ کر بے نیازی سے وقت دیکھتی مجھے اس وقت بالکل سینڈریلا کی مما ہی لگی تھیں۔ ان کی آنکھوں کی بے نیازی میں جیسے کہیں نفرت کروٹ لے رہی تھی۔ فارہ کے لیے نفرت......

''کیا کوئی فارہ سے بھی نفرت کرسکتا ہے؟'' میں نے حیران ہو کر سوچا تھا۔ ہاں شاید اس کی دوسری ماما...... کیونکہ چاچو کو بہرحال اپنی اکلوتی بیٹی سے بہت محبت تھی۔ شاید وہ اس سے جیلس ہوتی ہوں۔ اس سے وہ مجھے بہت بری لگی تھیں اور مجھے اپنا خیال ذرا بھی نہیں آیا تھا کہ میں بھی تو اس سے جیلس ہوتی ہوں...... ہاں تو میں ان دنوں بہت زود رنج ہو رہی تھی سارا دن فضول باتیں سوچتی رہتی ہوں... کالج سے امتحان کی تیاری کے لیے چھٹیاں ملی ہوئی تھیں اور میرا پڑھائی میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ کیا تھا اگر وہ ٹرپ پر نہ جاتی، میں نے کئی بار سوچا تھا میں اطمینان سے پڑھ تو لیتی اور ان بیزار دنوں میں آذین کی آمد نے جیسے میری ساری بیزاری دور کردی تھی۔ آذین میری اکلوتی پھپو کا دوسرے نمبر والا بیٹا تھا۔ پھپو شادی کے کچھ عرصے بعد ہی یوکے چلی گئی تھیں۔ شروع میں تو تقریباً ہر سال

ہی پاکستان آتیں کچھ دن سسرال میں اور کچھ ہمارے پاس گزار کر چلی جاتیں۔ لیکن پچھلے آٹھ نو سال سے وہ پاکستان نہیں آئی تھیں۔ ساس، سسر کا انتقال ہو گیا تھا اور انکل کی بیماری کی وجہ سے وہ نہیں آپاتی تھیں کہ وہاں علاج کی سہولتیں بہت تھیں۔ میں آذین کو بالکل نہیں پہچان سکی تھی۔ سترہ اٹھارہ سال کا ہوگا جب آخری بار پھپھو پاکستان آئی تھیں اور اب چھبیس، ستائیس سال کا وجیہہ اور شاندار سا آذین......

''پہچانا......؟''

میں اپنی فرینڈ نازش سے اپنی کتابیں لینے گئی تھی واپس آئی تو وہ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھا اماں سے ہنس، ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ میں ٹھٹک کر رک گئی تھی جب اماں نے مجھے دیکھ کر پوچھا تھا۔

''پہچانا......؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''آذین ہے تمہاری پھپھو کا بیٹا؟'' اماں بے حد خوش لگ رہی تھیں۔

''اور پھپھو کہاں ہیں؟''

''ماما ابھی نہیں آئیں......صرف میں ہی آیا ہوں۔'' وہ بے حد دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اور'' تم لوگوں کو سرپرائز دینے کے چکر میں خاصا خوار ہوا ہوں......ویسے تم زارا ہی ہوناں یا......''

''میں زارا ہی ہوں......'' میں نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''کمال ہے نامی......یہ بچپن میں تو اتنی پیاری نہیں تھی جتنی اب ہوگئی ہے۔''

اس نے بلا جھجک کہا تو میری پلکیں جھک گئیں۔ اور رخسار تپ اٹھے۔

''کیا پاکستانی لڑکیاں اب بھی شرماتی ہیں؟'' اس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر تھیں'' حالانکہ میں نے تو سنا تھا کہ اب......

مغرب، مشرق کے آنگن میں آ بیٹھا ہے
اور کپلنگ کا کہا کہ مشرق ہے مشرق ہے غلط ہو چکا ہے۔

لڑکیاں بغیر دوپٹوں کے جینز اور ٹی شرٹ پہنتی ہیں۔''

''بس بیٹا اپنے، اپنے گھر کا ماحول ہوتا ہے، تمہیں یہاں کچھ خاندان بہت آزاد اور لبرل ملیں گے اور کچھ ہم جیسے سیدھے سادے۔'' اماں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''تم زارا سے باتیں کرو، میں ذرا کچن دیکھ لوں......''

''میں آپ کی مدد کرتی ہوں اماں......''

''نہیں، میں نے رفیق کو بلالیا ہے۔''

اماں نے چاچو کے کک کا نام لیا اور میں وہیں بیٹھ گئی۔ اس روز آذین بہت دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا......اپنے شوق، اپنی دلچسپیاں، میرے شوق، میری دلچسپیاں اور باتیں کرتے، کرتے کوئی ایسی بات کر دیتا کہ میری پلکیں جھک جاتیں، رخسار گلگوں ہو جاتے......مثلاً ''زارا یار تمہاری آنکھیں کتنی گھور سیاہ ہیں اور پتا ہے سیاہ آنکھیں میری کمزوری ہیں......دیوانہ ہو جاتا ہوں میں ایسی آنکھیں دیکھ کر......'' اس کی اپنی آنکھیں لائٹ براؤن سی تھیں......یوکے میں رہنے کی وجہ سے اس کے اندر جھجک نہیں تھی۔ آرام سے ہر بات کہہ دیتا تھا۔ عابی بھائی آگئے تو میں اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ اماں نے رفیق کے ساتھ مل کر کافی کچھ تیار کر لیا تھا۔ میں کچھ دیر کچن میں کھڑی رہی پھر اپنے کمرے میں آگئی اور میں نے ایک کمینی سی خوشی محسوس کی کہ اس وقت فارہ یہاں نہیں ہے ورنہ فارہ کی موجودگی میں بھلا آذین مجھ سے اتنی باتیں کرتا......فارہ نے آذین کو کسی اور طرف کب متوجہ ہونے دینا تھا۔ وہ تھی بھی تو ایسی ہی اسے مقابل کو مسحور کرنے اور باتیں کرنے کا فن آتا تھا۔ آذین نے ایک بار بھی فارہ کا ذکر نہیں کیا تھا، وہ پورے کا پورا میری طرف متوجہ تھا شاید اماں نے اسے پہلے ہی فارہ کے متعلق بتا دیا تھا کہ وہ ٹرپ پر گئی ہوئی ہے۔ کھانے کی ٹیبل پر بھی کئی بار میں نے اس کی نظروں کو خود پر محسوس کیا تھا۔

فارہ کو سات دن بعد آنا تھا اور یہ سات دن میری زندگی کے خوب صورت ترین دن تھے۔ ان سات دنوں میں آذین نے مجھ سے ہر موضوع پر بات کی تھی۔ دن کو عابی بھیا اور بابا چلے جاتے تو گھر

میں صرف میں ہوتی اور اماں...... میں اگر کمرے میں ہوتی تو وہ مجھے بلا لیتا۔

''زارا فوراً سے پہلے باہر آجاؤ...... میں یہاں بور ہونے کے لیے نہیں آیا۔ چند گھنٹے نہیں پڑھو گی تو فیل نہیں ہو جاؤ گی۔''

اور میں کتابیں بند کر کے لاؤنج میں آجاتی۔ اماں کچھ دیر ساتھ رہتیں پھر چلی جاتیں...... انہیں کچن کا کام بھی کروانا ہوتا تھا۔ کلکنگ بھی کرنی ہوتی تھی۔

یہ میری زندگی کے قیمتی ترین دن تھے۔ آذین کو بھی فارہ کی طرح باتیں کرنے اور مقابل کو مسحور کرنے کا فن آتا تھا۔ اس کے ذومعنی جملے گھنٹوں میرے دل میں ہلچل پیدا کیے رکھتے۔ رات کو جب میں بستر پر لیٹتی تو آذین کی کہی باتیں میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑا دیتیں۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں۔

''یا اللہ...... یہ کیا ہے؟'' میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتی۔

''یہ میرے دل میں کیسے، کیسے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ شاید میں آذین کو پسند کرنے لگی ہوں...... ہاں شاید...... شاید یہ محبت ہے...... نہیں بھلا صرف چند دنوں میں ایسے کیسے محبت ہو سکتی ہے۔'' میں خود کو جھٹلا دیتی لیکن...... آذین نے مجھے ان دیکھی زنجیروں میں باندھ لیا تھا۔ میں کتاب کھولے بیٹھی رہتی اور تصور میں آذین چلا آتا۔ ہنستا، مسکراتا، شوخ نظروں سے مجھے تکتا...... ذومعنی جملے بولتا...... سات دنوں بعد جس روز فارہ نے آنا تھا وہ اپنی پھپھو سے ملنے فیصل آباد چلا گیا...... اماں نے اسے روکا کہ چند دن بعد چلے جانا۔

''پھپھو ناراض ہو رہی ہیں' اماں اور پپا بھی کہہ رہے تھے کہ اتنے دنوں سے لاہور میں ہو اور پھپھو سے ملنے بھی نہیں گئے۔''

''خیر پھپھو ہیں تمہاری' ملنے کو تڑپ رہی ہوں گی۔ ہو آؤ کچھ دنوں کے لیے۔''

اماں، ابا کے پکارنے پر کمرے میں چلی گئیں تو بیگ بند کرتے ہوئے اس نے بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔

''دو تین دن سے زیادہ نہیں رہوں گا۔''

''جی......''

میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں دل اداس سا ہو رہا تھا۔

''پوچھو گی نہیں کیوں...... خیر میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔ ایک جھکی نظروں والی لڑکی جس کی آنکھوں کی سیاہیاں گھٹاؤں کو شرماتی ہیں' وہ بہت یاد آئے گی۔''

میری پلکیں لرزنے لگیں۔

''ویسے زارا یار، یہ بڑی زیادتی ہے۔''

''کیا؟'' میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ اس کی مشتاق نظریں میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

''کیا ضرورت تھی تمہیں میڈیکل میں جانے کی...... ابھی ایک سال رہتا ہے تمہاری پڑھائی میں پھر ہاؤس جاب...... اتنا طویل انتظار...... بہت مشکل ہوگا۔''

اور مجھے لگا تھا جیسے میرا دل سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر آجائے گا۔

''زارا تم بہت پیاری ہو...... میرے تصور سے بڑھ کر حسین۔'' جھک کر بیگ اٹھاتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تھی اور مجھے لگا تھا جیسے اس وقت دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش قسمت لڑکی کوئی اور نہیں ہے...... فارہ بھی نہیں حالانکہ سات دن پہلے تک میں سمجھتی تھی کہ فارہ بہت خوش قسمت لڑکی ہے۔

اور میں...... حالانکہ فارہ کے پاس حقیقی رشتہ صرف چاچو کا تھا اور میرے پاس بابا...... اماں...... بھائی سب رشتے ہی تھے۔ پھر بھی میں نے فارہ کو ہمیشہ خود سے زیادہ خوش قسمت سمجھا حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ آذین چلا گیا تو میں اماں کو بتا کر اپنے کمرے میں آگئی...... میرے ایگزامز میں تین ہفتے ہی رہ گئے تھے اور میرا اتنا وقت ضائع ہو گیا تھا...... میں نے کتاب کھول کر گود میں رکھی لیکن کتاب کے صفحوں پر سے آذین جھانکنے لگا۔ کانوں میں اس کی خوب صورت مسحور کن آواز رس گھولنے لگی۔

''زارا تم بہت پیاری ہو......''

''چھوڑو یہ پڑھائی وڑھائی میرے ساتھ لندن

چلو......'' ایک لفظ بھی دماغ میں نہیں بیٹھ رہا تھا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ ''یا اللہ میں کیا کروں اگر یہ ہی حالت رہی تو میں فیل ہو جاؤں گی، کیا تھا اگر آذین میرے ایگزامز کے بعد آتا......لیکن نہیں اسے تو ابھی ہی آنا چاہیے تھا ابھی جب فارہ یہاں نہیں تھی......ورنہ فارہ کے سامنے میں اسے کہاں نظر آتی......'' تب ہی اماں نے کمرے میں جھانکا۔

''زارا میں اپنے لیے چائے بنا رہی ہوں تم پیو گی؟'' اماں کی عادت تھی دس ساڑھے دس بجے چائے پیتی تھیں۔

''جی......!'' میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''کیا ہوا زارا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ ماں تھیں ناں ایک نظر دیکھ کر میری پریشانی محسوس کر گئی تھیں۔

''کچھ نہیں بس سر میں درد ہے۔''

''چائے کے ساتھ سر درد کی ایک گولی لے لو......میں شازیہ کے ہاتھ چائے بھجواتی ہوں چائے پی کر کچھ دیر سو جانا......اور ہاں فارہ بھی آ گئی ہے عابی اسے لینے گیا ہے۔''

''فارہ کے کالج کی بس کالج میں ہی آنی تھی اور پھر کالج سے سب لڑکیوں نے اپنے، اپنے گھروں کو جانا تھا۔ رات اس نے مجھے بتایا تو تھا کہ صبح آٹھ، نو بجے تک وہ لوگ کالج پہنچ جائیں گے۔ لیکن میرے ذہن سے نکل گیا تھا......یوں بھی جب سے آذین آیا تھا میں نے فارہ کے متعلق بہت کم سوچا تھا بلکہ سوچا ہی نہیں تھا۔ اماں چلی گئیں تو میں آنکھیں موند کر لیٹ گئی لیکن بند آنکھوں کے پیچھے بھی آذین کا تصور چلا آیا تھا۔ شازیہ چائے اور سر درد کی گولی دے گئی تھی۔ میں چائے پی کر سونے کی کوشش کرنے لگی تھی کہ باہر یک دم ہلچل سی محسوس ہوئی۔ شازیہ کی بلند آواز......

''فارہ باجی آ گئیں۔ اللہ فارہ باجی آپ کے بغیر بالکل دل نہیں لگتا تھا۔''

''جھوٹی......'' میں نے زیرِ لب کہا اور کچھ دیر تک فارہ کی چہکتی آوازیں سنتی رہی......سوچا سوتی بن جاؤں لیکن جانتی تھی کہ وہ اندر آ جائے گی اور زبردستی اٹھا دے گی۔

''یہ زارا کی بچی کہاں ہے؟'' ٹی وی لاؤنج سے اس کی آواز آئی تو میں اٹھ کر باہر آ گئی۔ وہ ابھی تک اماں سے لپٹی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

''زارا کی بچی اتنی یاد آتی تھیں ناں تم وہاں مجھے اور پھر مجھے وہاں تم پر بہت غصہ آتا تھا۔ کیا تھا تم بھی ساتھ چلتیں میرے......'' اماں مسکرا رہی تھیں عابی بھائی کی آنکھوں میں چمک تھی اور نظریں اسی پر جمی تھیں۔

''آذین کہاں ہے؟'' سب سے مل کر وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

''وہ تو آج اپنی پھپھو کی طرف فیصل آباد چلا گیا ہے۔'' اماں نے بتایا تھا۔

''افوہ......تو کیا ایک دن رک نہیں سکتا تھا، اتنا شوق ہو رہا تھا اسے دیکھنے کا......اور عابی تم نے اسے بتایا نہیں تھا کہ مجھے آج آنا ہے......وہ کل بھی تو جا سکتا تھا ناں......'' وہ عابی بھیا کو نام لے کر بلاتی تھی۔ پتا نہیں کب اس نے عابی بھیا کو عابی بلانا شروع کیا تھا مجھے ہی پتا نہیں چلا تھا اور اب آذین کا بھی نام لے رہی تھی۔

''دو چار سال کی بڑائی اب کوئی اتنی بڑی بھی نہیں ہوتی کہ اتنا ادب واحترام کیا جائے یوں بھی عابی صرف ہمارا بھائی ہی نہیں دوست بھی تو ہے ناں......''

ایک بار اس نے میرے استفسار پر کہا تھا لیکن میں کبھی عابی بھیا سے اس طرح بے تکلف نہیں ہو سکی تھی جیسے وہ تھی۔

''بتایا تو تھا لیکن تم اب اتنی بھی اہم ہستی نہیں ہو کہ وہ تمہارے استقبال کے لیے رک جاتا۔'' عابی نے اسے چڑایا تھا لیکن مجھے اس کی بات مزہ دے گئی تھی۔

''نہ سہی اہم ہستی......اس کے ماموں کی بیٹی تو ہوں ناں......'' وہ بھی فارہ تھی وہ کسی بھی بات پر چڑتی نہ ناراض ہوتی تھی۔

''بہت تھکی ہوئی ہوں جا کر سو جاؤں گی لیکن اس سے پہلے اماں کے ہاتھ کی بنی چائے پیوں گی۔''

''ارے چائے تو میں نے ابھی دم کر کے رکھی

ہے۔'' اماں شازیہ کو آواز دینے لگیں کہ وہ چائے لے آئے۔ اور میرا دل چاہا کہوں، وہ تمہارے کچن میں رفیق احمد بیٹھا ہے ناں تمہارا کک اس سے کہو جا کر چائے بنا دے لیکن میں خاموش رہی تھی اور وہ اماں کے ہاتھ کی بنی چائے اور چکن سینڈوچ کھا کر سونے چلی گئی تھی۔ لیکن اپنا بیگ وہاں ہی چھوڑ گئی تھی لیکن جانے سے پہلے اس نے تنبیہہ کی تھی۔

''میں اب رات سے پہلے نہیں جاگوں گی...... خوب سونا ہے مجھے۔ کوئی مجھے مت جگائے۔'' اس نے باری، باری مجھے اور عابی بھیا کو دیکھا تھا۔

''سب کے گفٹ رات کو دوں گی اور ہاں رات کا کھانا میں اِدھر ہی کھاؤں گی۔ ہائے سچی کتنے دن ہو گئے اماں کے ہاتھ کا کھانا کھائے......''

''آج رات کی کیا بات ہے فارہ، تم تو اکثر کھانا اِدھر ہی کھاتی ہو۔'' پتا نہیں کیوں، میرے لبوں سے نکل گیا تھا ورنہ اس سے پہلے تو میں نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کی تھی۔ اس بات سے اماں کی آنکھوں میں ناگواری تھی۔ عابی بھیا نے بھی پہلو بدلا تھا جیسے انہیں میری بات پسند نہیں آئی ہو لیکن وہ ہنس پڑی تھی۔

''ہاں تو میں نے سوچا اتنے دنوں بعد آئی ہوں شاید اماں بھول گئی ہوں کہ......''

''میں کیوں بھولوں گی۔'' اماں نے بے چینی سے اس کی بات کاٹی تھی۔ ''میں نے تو آج تمہاری پسند کا کھانا بنایا ہے۔''

''سچ...... ویسے مجھے پتا تھا اماں نے میرا پسندیدہ کھانا بنایا ہوگا۔'' اس نے اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کے رخسار پر بوسہ دیا تھا۔

''میری سوئٹ اماں......''

''تو اماں اپنی لاڈلی کے لیے اس کی پسند کے کھانے تیار کرنے کے لیے صبح سے کچن میں گھسی ہوئی تھیں۔''

اس رات کھانا دیر سے کھایا گیا تھا۔ کیونکہ فارہ سو رہی تھی اور اماں نے اسے جگانے سے منع کر دیا تھا۔ عام طور پر رات کا کھانا نو بجے تک کھا لیا جاتا تھا کہ بابا اور عابی بھیا اپنے، اپنے آفیسز میں لنچ میں کچھ ہلکا پھلکا سا ہی کھاتے تھے لیکن اس روز کھانے سے فارغ ہوتے، ہوتے ساڑھے دس بج گئے تھے۔ پھر اس نے سب کو گفٹ دیئے۔ سب کے لیے وہ بہت خوب صورت اور نفیس گرم شالیں لائی تھیں جو سب کو ہی پسند آئی تھیں۔ مردانہ شالیں بھی انتہائی نفیس تھیں۔ میرے لیے وہ شال کے علاوہ روایتی جیولری بھی لائی تھی۔ کھانے کے بعد بھی کافی دیر تک سب لونگ روم میں بیٹھے اس کی باتیں سنتے رہے تھے، چاچو بھی آ گئے تھے ہاں روحی چچی نہیں آئی تھیں بقول چاچو کے وہ تھکی ہوئی تھیں۔ اس لیے ڈنر کے فوراً بعد ہی سو گئی تھی۔ حالانکہ فارہ پندرہ دن بعد آئی تھی اور رسمی طور پر ہی سہی انہیں ملنے کے لیے آنا تو چاہیے تھا کہ وہ جب آفس سے آئیں تو فارہ سوئی ہوئی تھی۔ اور جاگتے ہی وہ اِدھر آ گئی تھی کہ اسے پتا تھا کہ سب کھانے پر اس کے منتظر ہوں گے، وہ روحی چچی کے لیے بھی شال لائی تھی جو اس نے چاچو کو ہی دے دی تھی۔ میری آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں تو میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ سب جانے کب سوئے تھے کہ جب میں آئی تو وہ جھیل سیف الملوک پر ملنے والے کسی امریکن سیاح کا قصہ سنا رہی تھی۔ رات دیر سے سونے کے باوجود وہ صبح، صبح اٹھ کر ہماری طرف آ گئی تھی اور اماں کے ساتھ کچن میں ناشتا بنوا رہی تھی۔

مجھے اور نازش کو لائبریری سے کچھ بکس ایشو کروانی تھیں...... اور ٹیچر سے ایک ٹاپک کے متعلق ڈسکس کرنا تھا جو ہم دونوں کی ہی سمجھ میں نہیں رہا تھا سو آج ہمیں کالج جانا تھا...... میں تیار ہو کر باہر آئی تو اس نے کچن سے آواز لگائی۔

''زارا تمہارے لیے بھی فرنچ ٹوسٹ بنا دوں، عابی کے لیے بنا رہی ہوں۔''

''نہیں، میں صرف چائے اور ایک سلائس لوں گی۔'' مجھے اس کا اس طرح اتنے استحقاق سے ہمارے کچن میں اماں کے ساتھ مل کر کام کروانا شاید کبھی اچھا

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ”آفیشل پیج“ کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلااختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کرکے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

نہیں لگا تھا۔

"تمہیں تو ڈٹ کر کھانا چاہیے زارا اتنی ٹف پڑھائی ہے تمہاری۔" وہ چائے کا کپ اور سلائس ٹیبل پر رکھ کر میرے سامنے ہی بیٹھ گئی تھی۔

"جی اماں جان...... لیکن اس وقت مجھے دیر ہو رہی ہے، نازش انتظار کر رہی ہے۔" میں نے چائے کا کپ اٹھالیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"چلو اب اس موضوع پر پھر بات کرلیں گے۔"

"ویسے تم نے آج کالج نہیں جانا تھا۔"

"نہیں، اب دو تین دن ریسٹ کروں گی...... سب لڑکیاں ہی کہہ رہی تھیں۔ ویسے پرنسپل نے تو صرف ایک دن کی چھٹی دی ہے۔ کہہ رہی تھیں ہفتہ بھر بعد تو گرمیوں کی چھٹیاں ہو جائیں گی اس لیے وقت ضائع نہ کیا جائے لیکن۔"

"فارہ!" اماں نے آواز دی تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر کچن میں چلی گئی۔ چائے پی کر میں اماں کو خدا حافظ کہنے اور نازش کے ساتھ جانے کا بتانے گئی۔ اس کا گھر ہماری اسٹریٹ پر ہی تین چار گھر چھوڑ کے تھا۔ اور مجھے اس کے ساتھ ہی واپس آنا تھا۔

"میں چھوڑ آتا......" عابی بھیا بھی کچن میں ایک طرف موجود تھے۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" مجھے حیرت ہوئی۔

"مدد......" وہ مسکرائے۔

"صرف زبانی......" فارہ نے دودھ، انڈے اور چینی کا مسکچر اماں کی طرف بڑھایا۔

"ویسے تم بھی آج چھٹی کرلیتیں۔"

"بھئی وہ کس خوشی میں؟" میں نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا خالی کپ سنک میں رکھا۔

"میرے آنے کی خوشی میں سارا دن باتیں کرتے...... اتنی ساری باتیں ہیں کرنے والی۔"

"اس کے پاس فضول وقت نہیں ہے ضائع کرنے کو...... میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے...... تمہاری طرح فارسی پڑھ کر تیل نہیں بیچنا۔"

فارہ کے پاس آپشنل مضمون فارسی تھا اور عابی بھیا...... اکثر ہی فارسی کے حوالے سے اسے چڑاتے تھے کہ یہ کہاوت مشہور تھی۔

"ہاں تو...... تیل بیچنے میں کیا حرج ہے...... آج کل تو ہر طرح کا تیل بہت مہنگا ہے۔ کلنگ آئل ہو، سرسوں کا ہو، ناریل کا ہو، مٹی کا ہو...... بڑا منافع بخش کاروبار ہوگا...... ہیں ناں اماں......" اس نے تائید کے لیے اماں کی طرف دیکھا۔

"یقیناً ہوگا......" اماں زیرِ لب مسکرائیں۔

"لیکن بیٹا تم جلدی سے ناشتا لگاؤ، تمہارے بابا کو دیر ہو رہی ہوگی۔" اور میں اماں سے دعائیں لے کر بیزار سی گھر سے باہر نکل آئی۔ جاتے، جاتے میں نے مڑ کر دیکھا تھا۔ عابی بھیا ٹیبل پر برتن لگا رہے تھے اور اس روز واپسی پر گھر کا گیٹ کھولتے ہوئے میں نے دعا کی تھی کہ اللہ کرے اس وقت فارہ ہمارے گھر میں نہ ہو...... لیکن فارہ کے حوالے سے میری دعائیں پہلے کب قبول ہوئی تھیں جو آج ہو جاتیں...... وہ نہ صرف ہمارے گھر میں موجود تھی بلکہ اماں کے ساتھ کچن میں کھڑی سلاد بنا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بلند آواز سے بولی۔

"زارا جلدی سے change کر کے آجاؤ، میں کھانا لگاتی ہوں، میری آنتیں بھوک سے بلبلا رہی ہیں۔" اس کے اپنے ہی ایجاد کردہ محاورے اور مثالیں ہوتی تھیں۔ اس وقت کھانے پر ہم تینوں ہی ہوتے تھے۔ بابا اور عابی بھائی تو شام کو ہی آتے تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ مسلسل بولتی رہی، موضوعِ گفتگو وہی جھیل سیف الملوک، شوگراں، ناران، آنسو جھیل ہی تھے۔ کھانا کھا کر میں کمرے میں آگئی کہ مجھے پڑھنا تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد کچن سمیٹ کر چائے کے دو بھرے ہوئے کپ اٹھائے۔ وہ میرے کمرے میں آگئی تھی۔

"کیا یاد کرو گی کیسی اچھی بہن ملی ہے تمہیں۔"

اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر میرا کپ رکھا اور خود اپنا کپ لے کر روم چیئر پر بیٹھ گئی۔

"ہاں، اب بتاؤ آذین کیسا ہے؟"

''ٹھیک ہے......'' میں نے کپ اٹھایا اس وقت مجھے چائے کی واقعی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

''تمہیں کیسا لگا؟'' وہ متجسس سی مجھے دیکھ رہی تھی۔

''کیسا لگنا چاہیے تھا؟'' میں چڑ سی گئی۔ ''پھپھو کا بیٹا تو پھر اچھا ہی لگنا تھا۔''

''صرف اچھا......؟'' اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''کیا مطلب......؟'' میں چونکی۔

''کچھ نہیں' عابی اور اماں بہت تعریف کر رہے تھے اس لیے۔'' نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے ذرا سی آنکھیں میچے وہ کچھ دیر یونہی مجھے دیکھتی رہی۔

''تم میری غیر موجودگی میں کچھ زیادہ خوب صورت نہیں ہوگئی ہو یا میری آنکھوں کا دھوکا ہے۔''

''میں تو ویسی ہی ہوں جیسی تھی' تمہاری آنکھوں کا دھوکا ہے۔'' میں نے خالی کپ بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا اور تکیے کے پاس پڑی کتاب اٹھالی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ پورا ایک گھنٹا میرا سر کھانے کے بعد مجھے پڑھنے کی تلقین کرتے ہوئے چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پُرسکون ہو کر کتاب کھولی تھی۔ لیکن یہ کیا کتاب کے مضمون کے پیچھے سے آذین تنویر جھانکنے لگا تھا۔

''یا اللہ کیا بنے گا میرا۔ اگر میں فیل ہوگئی تو سب کیا کہیں گے ماں اور عابی بھیا کتنے فخر سے کہتے ہیں کہ ہماری بہنا تو بہت لائق ہے۔'' میں نے شعوری کوشش سے آذین کا خیال جھٹکنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ کبھی وہ کتاب کے مضمون پر سے جھانکنے لگتا تو کبھی کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتا۔ تنگ آ کر میں نے کتاب رکھ دی اور سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن سونے سے پہلے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کل سے نازش کے ساتھ مل کر کمبائن اسٹڈی کروں گی۔ ڈاکٹر بننا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی اور میں اس خواہش سے دستبردار نہیں ہو سکتی تھی۔ سو صبح ناشتے کے بعد میں اماں سے اجازت لے کر نازش کے گھر چلی گئی تھی۔ اگرچہ میرے جانے پر فارہ نے بہت منہ بنایا تھا اور کہا تھا کہ اگر میں اس کی وجہ سے جا رہی ہوں تو وہ وعدہ کرتی ہے کہ وہ مجھے بالکل بھی ڈسٹرب نہیں کرے گی۔ لیکن میں فیصلہ کر چکی تھی اور نازش کے گھر جا کر مجھے اندازہ ہوا کہ میرا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ میں جب شام کو واپس آئی تو کافی مطمئن تھی سوا اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ٹی وی لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی تھی۔ جہاں وہ اور اماں کوئی ککنگ پروگرام دیکھ رہی تھیں۔

''شکر ہے تم آگئی ہو......'' وہ یک دم خوش ہوگئی تھی۔

''چائے بناؤں......؟''

''ہاں بنا دو تو اچھا ہے۔'' اور وہ ریموٹ اماں کو دے کر چلی گئی تو اماں نے پوچھا۔

''کچھ فائدہ ہوا کمبائن اسٹڈی کا؟''

''جی کچھ نہیں بلکہ زیادہ ہی......'' میں مسکرائی۔

''کھانا کھایا تھا؟'' وہی ماؤں والی فکر۔

''جی اماں، نازش کی مما نے نرگسی کوفتے اور اچار چکن بنایا تھا۔'' اور اماں مطمئن ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''تم لوگ چائے پیو' میں کچھ دیر آرام کروں گی، فارہ کی وجہ سے بیٹھ گئی تھی۔ بچی اکیلی بور ہو رہی تھی۔ گھر میں بھی کوئی نہیں، روحی گھر پر بھی ہو تو بات تک نہیں کرتی فارہ سے۔'' وہ چلی گئیں تو فارہ چائے لے کر آئی......

اس کے پاس کرنے کے لیے ڈھیروں باتیں تھیں۔ میں چونکہ دن بھر پڑھتی رہی تھی اس لیے بہت سکون سے اس کی باتیں سنتی رہی......ان ڈھیروں باتوں میں کتنی ہی بار اس نے آذین کا ذکر کیا یوں ہی بلاوجہ اور آذین کے نام پر ہر بار ہی میرا دل زور سے دھڑکا۔

☆☆☆

''آج فارہ نہیں آئی، طبیعت تو خراب نہیں......

آج تو اسے کالج بھی جانا تھا۔'' خلافِ معمول آج وہ ناشتے پر نہیں تھی اور اماں بے چین تھیں۔

انہوں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے دو، تین بار مجھے دیکھا تھا۔ شاید وہ چاہتی تھیں کہ میں جا کر پتا کروں کہ محترمہ آج ناشتے پر موجود کیوں نہیں ہیں۔ لیکن میں اماں کی نظروں کو نظر انداز کر کے ناشتا کرتی رہی تب

عابی بھیا ناشتا کرتے، کرتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
''میں دیکھتا ہوں اماں......''
''کیا خبر آج اس کا جی اپنے گھر پر ناشتا کرنے کا چاہ رہا ہو اور ہو سکتا ہے وہ چاچو کے ساتھ ہی کالج چلی گئی ہو۔'' مجھے عابی بھیا کا ناشتا چھوڑ کر اٹھنا اچھا نہیں لگا تھا لیکن عابی بھیا میری بات کی پروا کیے بغیر چلے گئے تھے۔
''اگر کالج جاتی تو یہاں صحن سے گزر کر جانا تھا، میں تو کچن میں تھی نظر آتی ناں مجھے جاتے ہوئے۔'' اماں نے بغیر کسی کو مخاطب کیے عابی بھیا کے جانے کے بعد میری بات کا جواب دیا تھا۔
''کالج تو وہ میرے ساتھ ہی جاتی ہے۔ مدثر کے ساتھ تو کبھی نہیں گئی۔'' بابا چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ تب ہی عابی بھیا واپس آ گئے۔
''بابا آپ چلے جائیں اسے کالج نہیں جانا۔''
''کیوں، خیر ہے ناں......؟'' اماں پریشان ہوئی تھیں۔
''کہہ رہی تھی سر میں درد ہے۔'' عابی بھیا بقیہ ناشتا کرنے بیٹھ گئے تھے۔ بابا اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔
''چاچو تیار ہو رہے تھے۔ چچی کو اور انہیں آج کراچی جانا ہے۔ روحی چچی کی بھانجی کی شادی ہے۔''
''تو فارہ کو کہتے ناں اِدھر ہی آ جائے، اکیلی پڑی رہے گی۔ ہلکا پھلکا ناشتا کر کے کوئی سر درد کی ٹیبلیٹ لے لیتی۔''
''کہنے کی کیا ضرورت ہے وہ خود ہی آ جائے گی۔'' میں نے اماں کی بات کا جواب دیا تھا۔ عابی بھیا اور اماں نے بیک وقت مجھے دیکھا گو کہا کچھ نہیں لیکن ان کے دیکھنے کے انداز سے میں شرمندہ سی ہو کر کھڑی ہو گئی۔
''اچھا میں نازش کی طرف جا رہی ہوں۔'' میں نے اپنا کتابوں والا بیگ اٹھایا جو میں نے اپنے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ اماں نے صرف سر ہلایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے جاتے ہی بابا اور عابی بھیا کو رخصت کر کے اماں، فارہ کی طرف جائیں گی اور اسے زبردستی ساتھ لے آئیں گی۔ لیکن پھر بھی پڑھتے، پڑھتے کئی بار مجھے خیال آیا کہ مجھے خود فارہ کو دیکھنے چلے جانا چاہیے تھا کہیں اس کی طبیعت زیادہ خراب ہی نہ ہو ورنہ وہ ایسی معمولی سر درد کو لے کر بستر پر پڑی رہنے والی نہیں تھی۔ وہ تو میرے اٹھنے سے پہلے ہی اماں کے ساتھ کچن میں موجود ہوتی تھی۔ اور عابی بھیا تو باہر سے پوچھ کر آ گئے ہوں گے، وہ کون سا اس کے کمرے میں گئے ہوں گے۔ فارہ جب بھی مانی بھیا اور عابی بھیا سے بے تکلفی سے بات کرتی اور روحی چچی بھی موجود ہوتیں تو وہ بڑی عجیب نظروں سے فارہ کو دیکھتی تھیں۔ اور ان کے اس دیکھنے کو سب نے ہی محسوس کیا تھا۔ سو مانی اور عابی بھیا، روحی چچی کے سامنے بہت محتاط رہتے تھے سو وہ یقیناً چچی سے ہی پوچھ کر آ گئے ہوں گے کہ اماں، فارہ کو بلا رہی ہیں اور میں نے نہ جانے کتنی بار پڑھتے، پڑھتے فارہ کو سوچا اور اس کی طبیعت کی خرابی کا سوچ کر پریشان ہوئی لیکن جب میں گھر آئی تو وہ مزے سے لونگ روم میں بیٹھی آذین سے باتیں کر رہی تھی اور نہ جانے کس بات پر ہنس رہی تھی۔ آذین کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ میرا دل جیسے ایک لمحے کے لیے ڈوب کر ابھرا تھا۔
''السلام علیکم......!'' میرے سلام کرنے پر فارہ نے مڑ کر مجھے دیکھا تھا اور آذین نے میرے سلام کا جواب دیا تھا۔ اس کی نظریں لمحہ بھر کے لیے میرے چہرے پر رکی تھیں۔
''آ گئی آپ کی پڑھاکو کزن......'' فارہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔
''میں اب چائے بنا لاؤں......دراصل......'' اس نے میری طرف دیکھا تو اس کے لبوں پر بڑی شریر سی مسکراہٹ تھی۔
''آذین کا خیال تھا بلکہ اصرار تھا کہ چائے تمہارے آنے پر اکٹھی پی جائے سو ہم چائے کی پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔'' وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی تو میں کتابوں کا بیگ گود میں رکھ کر اسی صوفے پر ٹک گئی جہاں فارہ بیٹھی ہوئی تھی۔
''کب آئے آپ......؟'' میں نے بلاوجہ ہی بیگ کی زپ کو کھول کر بند کیا۔

''تقریباً بارہ بجے......'' آذین کی نظریں اب بھی میرے چہرے پر تھیں، میرے رخسار تپ اٹھے تھے۔
''اماں کہہ رہی تھیں آپ شاید کچھ دن وہاں رہیں گے۔'' میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔
''ہاں رہنا تو تھا لیکن دل نہیں لگا وہاں۔'' اس کی نظروں میں وارفتگی تھی اور میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو سن رہی تھی۔
''میں نے تمہیں بہت یاد کیا...... پپا کا ڈر اور پھپو کا خیال نہ ہوتا تو دوسرے ہی دن بھاگ آتا، کیا تم نے مجھے یاد کیا تھا زارا؟'' غیر ارادی طور پر میرا سر اثبات میں ہل گیا تھا۔ لیکن پلکیں مزید بوجھل ہو گئی تھیں۔
''تھینکس......!'' وہ تھوڑا سا آگے جھکا تھا تب ہی اماں ہاتھ میں تسبیح لیے وہاں آئیں...... وہ یقیناً عصر کی نماز پڑھ کر آ رہی تھیں۔
''زارا تم بھی پہلے نماز پڑھ لو...... اتنے میں فارہ چائے لگاتی ہے۔ تمہارے بابا بھی آج جلدی آ گئے تھے۔''
اور میں فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی کہ مجھ سے آذین کے سامنے بیٹھا نہیں جا رہا تھا کہ اس کی نظروں کی حدت سے میرے رخسار جل رہے تھے۔ میں نماز پڑھ کر آئی تو فارہ چائے لگا چکی تھی۔ چائے کے ساتھ نگٹس، کباب، دہی بھلے بہت کچھ تھا۔ بابا بھی آ گئے تھے اور آذین سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح سلام کر کے میں بابا کی دعا لے کر ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ چائے کے دوران فارہ مسلسل آذین سے باتیں کرتی رہی۔ اماں اور بابا بھی کبھی کوئی بات کر لیتے تھے۔ میں خاموش بیٹھی تھی۔ بابا تو جلدی اٹھ گئے تھے لیکن ہم نے سب چیزوں کے ساتھ خوب انصاف کیا تھا۔ مجھے اس روز فارہ کا بولنا برا نہیں لگا تھا بلکہ ان کے درمیان ہونے والی ہلکی پھلکی نوک جھوک اچھی لگ رہی تھی۔ لیکن اگلے چند دنوں میں مجھے ان کی بے تکلفی بری لگنے لگی تھی۔ دونوں میں ہی ان میں اتنی بے تکلفی ہو گئی تھی کہ فارہ اسے تم کہہ کر بلانے لگی تھی۔ میں جب بھی نازش کے گھر سے واپس آتی تو وہ دونوں یا تو باتوں میں مگن ہوتے یا پھر بقول اماں فارہ، آذین کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی ہوتی کہ آذین کو یہاں کی مارکیٹوں وغیرہ کا پتا نہیں تھا اور نہ ہی اسے خبر تھی کہ کون سی چیز کہاں ملے گی۔ سو فارہ اس کی مدد کر رہی تھی کہ پھپو نے اسے خاصی لمبی لسٹ دی تھی۔ اور اس نے خود بھی سب کے لیے گفٹ لینے تھے۔ ظاہر ہے میں تو اپنی پڑھائی کی وجہ سے اس کے ساتھ نہیں جا سکتی تھی لیکن کڑھ اور جل تو سکتی تھی۔ نازش کے گھر بھی کتابیں کھولے میرا دھیان ان دونوں کی طرف ہی لگا رہا تھا سو کیا فائدہ تھا آنے کا...... نازش بھی ڈسٹرب ہوتی تھی مجھے اس طرح پڑھائی کی طرف متوجہ نہ دیکھ کر سو اب میں نے گھر میں ہی رہ کر پڑھنے کا فیصلہ کیا۔
اس دن اتوار تھا۔ عابی بھیا اور بابا بھی گھر پر ہی تھے۔ عابی بھیا باہر سے ناشتا لائے تھے...... نان، نہاری اور پوریاں، چنے اور آذین کم مرچیں کھانے کا عادی تھا سو اس کی حالت ایسی تھی کہ فارہ بے اختیار ہنس پڑی تھی۔
''تمہارے لیے کم مرچوں والا آملیٹ بنا دوں۔''
''نہیں......'' آذین نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔
''میرا دماغ خراب ہے جو اتنے مزے کی نہاری اور چنے چھوڑ کر آملیٹ کھاؤں......''
''اپنی حالت دیکھی ہے رونے والے ہو رہے ہو۔'' فارہ پھر ہنس پڑی تھی۔
''ہنس لو...... کسی دن مجھے بھی موقع ملے گا تمہاری ایسی ہی حالت پر ہنسنے کا۔'' آذین نے نہاری کا ڈونگا اپنی طرف کھسکایا۔
''سبز مرچیں اور ادرک وغیرہ مت ڈالیں پھر اتنی کڑوی نہیں لگے گی۔'' بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا۔
''ان کے بغیر مزہ کہاں آئے گا۔'' آذین نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر کتنی دیر تک دیکھتا رہا۔ فارہ ہولے سے کھنکھاری تو اس نے چونک کر میرے چہرے سے نظریں ہٹا لیں اور سلاد والی پلیٹ سے لیموں کا ٹکڑا اٹھایا اور میرا دل بلاوجہ ہی کتنی دیر تک تیزی سے دھڑکتا رہا۔

اماں اور بابا ناشتا کر کے اٹھ گئے تھے۔ عموماً چھٹی والے دن وہ چائے کمرے میں ہی پیتے تھے۔ آج بھی وہ اماں کو چائے اور اخبار کمرے میں بھجوانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے جبکہ عابی بھیا، آذین، میں اور فارہ وہاں ہی بیٹھے رہے۔ عابی بھیا اور آذین پاکستان اور یو کے کے سیاسی حالات کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

"آپ لوگ لاؤنج میں ہی جا کر ایزی ہو کر بیٹھ جائیں۔ چائے وہاں ہی پی لیتے ہیں۔" فارہ اٹھی اور پھر میری طرف دیکھا۔

"تمہیں آج نازش کی طرف نہیں جانا۔"

"نہیں جو ٹاپک مل کر پڑھنے تھے وہ پڑھ لیے...... اب گھر پر ہی پڑھوں گی۔"

"گڈ......" فارہ خوش ہوگئی۔ "اب مزہ آئے گا۔"

"زارا کا امتحان ہے...... گھر پر رہنے کا مطلب گپیں لگانا نہیں بلکہ پڑھنا ہے۔" عابی بھیا نے اسے گھورا۔

"ہاں تو...... سارا دن تو گپ نہیں لگائیں گے ناں بس جب زارا ریسٹ کرے گی تو تب ناں......" فارہ نے برا سا منہ بنایا اور پھر آذین کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا آذین کہ تم اپنی چھٹی بڑھوا لو جب زارا فارغ ہو جائے گی تو پھر خوب گھومیں گے۔ مری، بھوربن سب جگہ جائیں گے۔" فارہ ابھی نئی نئی نادرن ایریا سے آئی تھی تو پہاڑوں کا عشق سر سے اترا نہیں تھا...... تقریباً ہر روز ہی ایک بار تو ناران، کاغان، سوات، گلگت کی سیر کا پروگرام بناتے ہوئے سب کو وہاں جانے کا مشورہ دیتی تھی۔

"پاکستان کی طرح وہاں آسانی سے چھٹیاں نہیں ملتیں...... سال میں صرف دو ہفتے کی اور یہ جو چار ہفتے کی چھٹیاں لی ہیں ناں میں نے تو صرف اس لیے مل گئی ہیں کہ پچھلے دو سال سے میں نے کوئی چھٹی نہیں لی تھی کہ مما کہتی تھیں کہ پاکستان جانا ہے۔ تو کم از کم ایک ماہ تو رہیں گے۔" اس نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔

"میں غریب تو سرپرائز کے چکر میں مارا گیا۔ ورنہ میں زارا کے پیپرز کے بعد آتا۔ زارا تو زارا عابی بھی بس چھٹی والے دن ہی یہاں ہوتا ہے۔"

"سوری یار...... ان دنوں آفس میں کام بہت زیادہ تھا اس لیے چھٹی نہیں لے سکا لیکن کل سے میں ایک ہفتے کی چھٹی لے رہا ہوں۔" عابی بھیا اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"سچ پھر تو خوب مزہ آئے گا۔" آذین سے زیادہ فارہ خوش ہوئی تھی۔

"تو اسی خوشی میں اب فٹافٹ چائے پلا دو۔ آؤ یار......" انہوں نے آذین کی طرف دیکھا۔

"اس وقت ایک بڑا زبردست ٹاک شو ریپیٹ ہوتا ہے۔" تب ہی امی، بابا کے لیے چائے لیے کچن سے باہر آئیں۔

"میں نے اور چائے دم کر دی ہے فارہ تم بنا لو......"

فارہ کچن میں چلی گئی تو میں نے ٹیبل سمیٹ کر چھوٹے برتن کچن میں آکر سنک میں رکھے...... فارہ نے دودھ گرم کرتے ہوئے اس شاپنگ کی تفصیل بتائی جو آذین نے کی تھی۔

"اماں نے بھی پھپھو وغیرہ کے لیے گفٹ لینے کو کہا ہے تمہیں اگر تھوڑا سا وقت مل جائے تو دونوں جا کر لے آئیں گے۔ اسی کے ساتھ جا کر ان کے لیے گفٹ خریدنا اچھا نہیں لگتا ناں......" اس نے کپ ٹرے میں رکھے۔

"نہیں فارہ، تم اماں کے ساتھ چلی جانا...... میرا اتنا وقت ضائع ہو رہا ہے، مجھے لگتا ہے جیسے جو پڑھا ہے وہ بھی ذہن سے نکل گیا ہے۔ میں اس بار فیل ہو جاؤں گی فارہ......" میں روہانسی ہو رہی تھی۔

"تمہیں ایسا لگ رہا ہے زارا ورنہ میری بہن تو آنکھیں بند کر کے الٹے قلم سے بھی لکھے گی ناں تو فیل نہیں ہو سکتی۔ ہاں تو......" اس نے سر ہلایا اور شوگر پاٹ (چینی دان) اٹھا کر ٹرے میں رکھا اور ٹرے اٹھالی۔

"چلو تھوڑی دیر گپ شپ لگاؤ گی تو فریش ہو جاؤ گی۔" میں فارہ کے ساتھ ہی ٹی وی لاؤنج میں آئی تھی۔ ابھی ٹاک شو نہیں لگا تھا۔ آذین اور عابی

بھیا اب کسی انگلش ہارر مووی کی باتیں کرر ہے تھے۔ پھر چائے پیتے، پیتے بات مووی سے ادب کی طرف چلی گئی تو فارہ بھی زور وشور سے اپنی رائے دینے لگی۔ اس کا مطالعہ بہر حال بہت تھا انگلش، اردو دونوں زبانوں کے ادب سے اسے بے حد دلچسپی تھی جو کتاب بھی ہاتھ لگتی تھی ختم کر کے ہی اٹھتی تھی۔ مجھے وہاں اپنا وجود فالتو لگ رہا تھا۔ میں اپنا خالی کپ کچن میں رکھ کر کمرے میں آ گئی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل بھر آیا تھا اور آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور میں نے سوچ لیا کہ ''آئندہ میں ان کی محفل میں نہیں بیٹھوں گی۔ مجھے اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرنا تھا۔ اگر آذین، فارہ کا اسیر ہو گیا ہے تو مجھے کیا...... میں کون سا اس سے محبت کرنے لگی ہوں...... محبت......'' میں اپنی ہی سوچ پر چونکی......'' یہ محبت کہاں سے آ گئی بھلا...... وہ پھپو کا بیٹا ہے اور اچھا لگا ہے بس......'' میں نے کتنی ہی دیر تک خود کو سمجھایا اور اس محبت کی نفی کرتی رہی جو دل کے اندر کسی خودرو پودے کی طرح پھوٹ پڑی تھی...... اور یہ سب کتنے غلط وقت پر ہوا تھا اگر آذین نہ آتا تو میں اب تک نہ جانے کتنے ٹاپک کمپلیٹ کر چکی ہوتی...... اور اس روز کے بعد سے میں نے خود کو کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ رات دیر تک پڑھنے کی کوشش کرتی...... ناشتا، کھانا سب کے ساتھ نہ کھاتی جب بھوک لگتی، موڈ ہوتا تو کمرے میں ہی لے آتی...... فارہ اور اماں میری ایک جیسی ہی فکر کرتی تھیں۔ بابا اور عابی بھیا سمجھاتے کہ ''مسلسل پڑھنے سے بیمار ہو جاؤ گی تھوڑا ریسٹ کیا کرو...... سب کے ساتھ آ کر بیٹھو اس طرح فریش ہو جایا کرو گی......'' اب میں انہیں کیا بتاتی کہ مجھے فارہ اور آذین کی بے تکلفی تکلیف دیتی ہے اس لیے میں سب کے ساتھ آ کر نہیں بیٹھتی تھی۔

آذین سے آتے جاتے جب بھی نظر ملتی وہ شاکی نظروں سے دیکھتا لیکن کہتا کچھ نہیں تھا۔ اس کی نظریں مجھے الجھا دیتی تھیں۔ کبھی، کبھی فارہ مجھے زبردستی باہر لے آتی لیکن کچھ دیر بعد میں اٹھ جاتی کہ عابی بھیا، فارہ اور آذین کی اپنی ہی باتیں اور اپنے ہی پروگرام تھے اور اس روز کی طرح مجھے وہاں اپنا وجود فالتو اور اضافی دکھتا تھا۔ چند دنوں میں بھیا نے آذین کو لاہور کی کافی جگہیں دکھا دی تھیں۔ گھر آ کر بھی وہ تینوں اکٹھے بیٹھے سر جوڑے نہ جانے کیا باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں نے کئی بار آذین، فارہ اور عابی بھیا کو رات کے کھانے کے بعد برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے یا صحن میں ٹہلتے دیکھا تھا۔ باتیں کرتے کبھی فارہ کی مدھم ہنسی اور عابی بھیا کا بلند قہقہہ کان میں پڑتا تو میں یاد کیا ہوا بھول جاتی کہ ابھی کیا پڑھ رہی تھی۔ میرے اندر ہمہ وقت کہیں کن من ہوتی رہتی پھر بھی شعوری کوشش سے میں فارہ اور آذین کا خیال ذہن سے جھٹک کر پڑھنے کی کوشش کرتی۔

ابھی تین ہفتے پہلے زندگی میں آذین کے آنے سے یک دم کیسی تبدیلی آئی تھی۔ آذین کے وہ ذو معنی جملے...... وہ گہری اندر تک اترتی نظروں سے دیکھنا جیسے سب کچھ خواب سا تھا۔ لیکن کتنا خوب صورت خواب تھا کہ زندگی اچھی اور خوب صورت لگنے لگی تھی خیر زندگی پہلے بھی بری تو نہیں تھی لیکن آذین نے آ کر اس خوب صورت زندگی کو اور بھی خوب صورت بنا دیا تھا...... لیکن...... میرا جی چاہتا میں فارہ کو بتاؤں۔

''فارہ مجھے آذین سے محبت ہو گئی ہے۔'' لیکن میں نہیں بتا سکتی تھی...... کیا خبر فارہ اور آذین...... ہاں کیا خبر وہ دونوں...... اور تب فارہ کتنی ہرٹ ہو گی۔ اور میں ناپسندیدگی کے باوجود اسے ہرٹ نہیں کر سکتی تھی جانے نہیں کیوں......

مجھے فارہ اور آذین کی بے تکلفی اچھی نہیں لگتی تھی لیکن جب روحی چچی نے چاچو سے کہا۔

''آپ کو کچھ احساس ہے مدثر، یہ فارہ کیا کرتی پھر رہی ہے۔''

''کیا؟'' چاچو نے اخبار سے نظریں ہٹا کر روحی چچی کو دیکھا تھا۔

''ہر وقت آذین کی بانہوں میں بانہیں ڈالے گھومنے نکلی ہوتی ہے۔''

''افوہ یہ چچی بھی ناں کس قدر مبالغہ کرتی ہیں......'' میں نے ناگواری سے ہونٹ سکیڑے تھے۔

''گھر پر ہوں تو دونوں سر جوڑے جانے کن کہانیوں میں کھوئے ہوتے ہیں۔ بھابی بھی منع نہیں کرتیں کل کو کچھ کہیں غلط ہوگیا تو نام سوتیلی ماں کا بدنام ہوگا۔ حالانکہ مبشر بھائی اور بھابی نے بگاڑ رکھا ہے اسے۔''

''فضول باتیں مت کرو روحی......'' چاچو کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

''فارہ ان کی ہے، بگاڑیں یا سنواریں...... آئندہ میں فارہ کے متعلق اس طرح کی منفی بات نہ سنوں، وہ میری بیٹی ہے اور میں اسے جانتا ہوں۔''

اور میں جو چاچو کو بابا کا پیغام دینے آئی تھی کہ وہ آفس جاتے ہوئے بابا کو بھی ساتھ لے جائیں کہ ان کی گاڑی ورکشاپ میں تھی۔ روحی چچی کی طرف دیکھے بغیر میں چاچو کو پیغام دے کر فوراً ہی واپس پلٹ آئی تھی۔

''ہوں...... سنڈریلا کی امی نہ ہوں تو......'' مجھے روحی چچی پر غصہ آ رہا تھا اور فارہ کے لیے میرا دل دکھ رہا تھا کیا تھا اگر فارہ کی ماما روایتی قسم کی سوتیلی ماما نہ ہوتیں تو...... اس روز میں نے سارا دن فارہ اور آذین کے متعلق نہیں سوچا تھا سکون سے پڑھتی رہی تھی لیکن روز کی طرح میں اپنا کھانا کمرے میں ہی لے کر آئی تھی۔ رات کو بھی جب میں پڑھتے، پڑھتے تھک گئی تو سونے کے ارادے سے کتابیں سمیٹ کر ٹیبل پر رکھیں، کمرے میں حبس ہو رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کھول کر پردہ ہٹایا اور وہ دونوں سامنے ہی برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے میں نے لائٹ آف کردی اور کتنی ہی دیر تک کھڑی انہیں دیکھتی...... ابھی بہت زیادہ رات تو نہیں ہوئی تھی شاید گیارہ بجے تھے لیکن اماں، بابا سونے کے لیے جا چکے تھے۔ فارہ کو بھی تو چاہیے تھا کہ اب سونے کے لیے چلی جاتی۔ روحی چچی ویسے ہی اتنی باتیں کرتی ہیں...... میں کچھ دیر وہاں ہی کھڑی دیکھتی رہی کبھی، کبھی فارہ کی مدھم سی ہنسی بھی سنائی دیتی تھی لیکن ان کی باتوں کی آواز مجھ تک نہیں آ رہی تھی۔ فارہ نے ایک بار مڑ کر پیچھے دیکھا...... اس کے چہرے پر چاند کی روشنی پڑ رہی تھی اور وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد عابی بھیا صحن کی طرف سے آتے دکھائی دیے ان کے ہاتھ میں فون تھا شاید کچھ دیر پہلے وہ بھی ان کے ساتھ ہی ہوں گے اور فون سننے صحن کی طرف گئے ہوں، میں نے اندازہ لگایا اور کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی لیکن میرے اندر جیسے کچھ بجھ سا گیا تھا۔ میں بیڈ پر لیٹی تو میری آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

''اگر آذین، فارہ میں اور فارہ، آذین میں دلچسپی لے رہی ہے تو بھلا اس میں آذین یا فارہ کا کیا قصور...... آذین نے کون سا مجھ سے محبت کے دعوے کیے تھے۔ کبھی کبھار کوئی ذومعنی جملہ یا تعریف کردینے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آذین مجھ سے۔'' میں نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں پونچھیں۔ ''دراصل اس کے دل میں جو بھی بات ہوتی ہے اسے کہتے ہوئے وہ جھجکتا نہیں...... اس نے یقیناً فارہ کی بھی...... تعریف کی ہوگی...... فارہ ہے بھی تو کتنی خوب صورت اور بقول نازش کے اس کی مسکراہٹ کتنی قاتل ہے۔ جب وہ ہنستی ہے یا وہ مسکراتی ہے تو دیکھنے والا مبہوت سا ہو کر اسے دیکھتا رہ جاتا ہے۔ پھر اگر آذین...... اور میں نے خواہ مخواہ ہی اس کے چند جملوں اور ستائشی نظروں سے کہانیاں گڑھ لیں،'' میں نے سوچا۔

''یقیناً آذین اور فارہ...... ہاں یقیناً آذین اور فارہ......'' مجھے یقین سا تھا...... ایسا یقین کہ جب اماں نے مجھ سے کہا کہ تمہاری پھپو نے آذین کے لیے تمہارے رشتے کی بات کی ہے تو میں کتنی ہی دیر حیرت سے انہیں دیکھتی رہی، یہ اسی صبح کی بات ہے۔ آذین اور فارہ ناشتا کرتے ہی شاپنگ کے لیے نکل گئے تھے۔ عابی بھیا کی چھٹی بھی ختم ہوگئی تھی سو وہ آفس چلے گئے تھے۔ اور آذین کے جانے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ اور اس کی شاپنگ ابھی باقی تھی...... اماں ان کے جانے کے بعد میرے کمرے میں آئی تھیں۔

''میرا ارادہ تھا کہ تمہارے امتحان کے بعد ہی تم

سے بات کروں گی لیکن تمہاری پھپو کی خواہش تھی کہ آذین کے جانے سے پہلے اس کی موجودگی میں ہی چھوٹی سی رسم کر دی جائے پھر دسمبر کی چھٹیوں میں وہ سب آئیں گے تو نکاح ہو جائے گا اور رخصتی تمہاری تعلیم مکمل ہونے کے بعد......'' اماں تفصیل بتا رہی تھیں اور میں حیرت سے اماں کو دیکھ رہی تھی۔

''میرے لیے...... پھپو نے میرے لیے کہا؟''

میں نے بے یقینی سے اماں کو دیکھا۔

''ہاں......'' وہ مسکرائیں۔

''تمہاری پھپو کی ہمیشہ سے ہی یہ خواہش تھی اور جب آخری بار وہ آئی تھی تب بھی تمہارے بابا سے بات کی تھی اس نے لیکن تمہارے بابا نے کہا تھا کہ ابھی بچے چھوٹے ہیں اور اتنی کم عمری میں اس طرح کا کوئی بندھن باندھنا مجھے مناسب نہیں لگتا...... بڑے ہونے پر جانے بچوں کا کیا رجحان اور کیا سوچ ہو...... حالانکہ تمہاری پھپو کی تو شدید خواہش تھی کہ تمہاری منگنی کا فنکشن کریں...... شاہ زیب کا رشتہ تو انہوں نے اس کے چچا کے گھر طے کر دیا تھا۔''

''اور کتنا اچھا ہوتا اگر آذین کی اور میری منگنی تب ہو جاتی پھر بھلا فارہ کیسے میرے منگیتر کو...... وہ ایسی تو نہیں کہ.....'' میرے دل میں خیال آیا تھا۔

''تمہارے بابا نے کہا تھا کہ تمہاری پھپو کو کوئی حتمی جواب دینے سے پہلے تمہاری مرضی معلوم کر لوں۔'' اماں نے بات ختم کی تو میرے اندر جیسے جل تھل ہونے لگی تھی۔

''میری مرضی......'' میں نے اپنے اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو اپنے اندر اتارا۔ ''مجھے ڈاکٹر بننا ہے...... پڑھنا ہے۔''

''تو میری جان پڑھتی رہنا...... رخصتی تو تمہارے ہاؤس جاب کے بعد ہی ہو گی ناں......''

''لیکن اماں......'' میں نے دل کڑا کیا۔

''وہ...... میرا مطلب ہے آذین اور فارہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں......''

''نہیں......'' اماں نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

''کیا فارہ نے تم سے کہا؟''

''نہیں لیکن مجھے پتا ہے اماں، آپ پھپو کو فارہ کے لیے کہہ دیں۔'' میرے لہجے کے یقین نے اماں کے چہرے کا رنگ بدل دیا تھا۔

''لیکن فارہ...... فارہ کے لیے تو میں نے......''

اور پھر وہ چپ کر گئیں...... اور کتنی ہی دیر تک چپ بیٹھی رہیں...... میرے اندر جل تھل ہو رہی تھی اور میں پلکیں جھپک، جھپک کر آنسوؤں کو آنکھوں تک آنے سے روک رہی تھی۔

''فارہ بھی تو آپ کی بیٹی ہے ناں اماں......''

میں جیسے پل صراط سے گزر رہی تھی۔

اماں نے سر ہلایا تھا لیکن میں نے ان کی آنکھوں میں پھیلتی نمی محسوس کر لی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر چلی گئیں...... لیکن جانے سے پہلے انہوں نے بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھا تھا اور میں نے نظریں چرا لی تھیں۔

''تمہیں غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے زارا......'' وہ پلٹ کر آئی تھیں۔

''نہیں...... کیا آپ کو نہیں لگتا کہ......'' میں نے بھیگی پلکیں چھپانے کے لیے رخ موڑ لیا تھا اور پھر دروازہ اندر سے لاک کر کے چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اندر پھیلتا درد بے تحاشا تھا اور ایسے میں پڑھنا...... میں نہ جانے کتنی ہی دیر تک یونہی لیٹی رہی...... اور اس درد کو پینے کی کوشش کرتی رہی جو پورے وجود میں پھیلتا جا رہا تھا۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی فارہ کی آواز آئی۔

''زارا...... زارا یار دروازہ کھولو...... بند کیوں کر رکھا ہے۔''

''سونے دو فارہ پلیز بہت تھک گئی ہوں......''

میں اس وقت کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''یہ زارا کو کیا ہوا ہے اماں...... اس وقت تو وہ کبھی نہیں سوئی......؟'' زارا، اماں سے پوچھ رہی تھی۔ شاید اماں بھی کہیں آس پاس ہی تھیں۔

''اسے سونے دو فارہ، اس کے سر میں درد ہے۔''

مجھے اماں کی آواز بھیگی، بھیگی سی محسوس ہوئی۔ کیا اماں نے میرا درد جان لیا تھا۔ اور میرے آنسو آنکھوں کے کونوں سے نکل کر تکیے کو بھگونے لگے تھے۔ پتا نہیں میں کتنی دیر تک روتی رہی اور پھر جانے کب سوگئی......

میری آنکھ باتوں کی آواز سے کھلی تھی۔ ٹی وی پر کوئی ٹاک شو لگا ہوا تھا اور شاید اماں، عابی بھیا، آذین، فارہ سب ہی ٹی وی لاؤنج میں موجود تھے۔ میں منہ ہاتھ دھو کر لاؤنج میں آئی اور اماں کے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا اماں بہت غور سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ آذین نے ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر عابی بھیا کی بات کا جواب دینے لگا...... فارہ نے مجھے دیکھتے ہی منہ پُھلا لیا تھا۔ میں جانتی تھی وہ زیادہ دیر تک اس کیفیت میں نہیں رہ سکتی تھی۔ اور ایسا ہی ہوا تھا۔

''میں تم سے سخت ناراض ہوں زارا......''

''سوری فارہ میرے سر میں شدید درد تھا اور مجھے نیند آرہی تھی۔''

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' عابی بھیا چونکے تھے آذین بھی میری طرف دیکھنے لگا۔

''اب تو ٹھیک ہوں......'' میں زبردستی مسکرائی تھی۔

''اپنی ہمت سے زیادہ محنت مت کرو گڑیا......'' عابی بھیا کے لہجے میں شفقت، محبت، تشویش سب کچھ تھا۔

''نہیں تو اس بار تو مجھ سے پڑھا ہی نہیں جا رہا...... پتا نہیں کیسے پیپرز ہوں گے...... ڈر لگ رہا ہے مجھے......''

''ڈر تو خیر تمہیں ہمیشہ ہی لگتا ہے۔'' فارہ ہنسی۔

''اور پھر ٹاپ بھی کر لیتی ہو......''

''لیکن اس بار ٹاپ نہیں کر سکتی......'' میں بے حد مایوس سی تھی۔

''لیکن ہم نے تو آپ کی خاطر خود پر پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ بالکل بھی ڈسٹرب نہیں کرتے...... ہمیں قصور وار مت ٹھہرانا......'' آذین، فارہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''بالکل......'' فارہ نے اس کی تائید کی۔

''کتنا جبر کرنا پڑتا ہے ہمیں ورنہ جی چاہتا تھا ہر جگہ تمہیں گھسیٹ کر ساتھ لے جائیں......'' آذین کی مسکراہٹ گہری ہوئی اور اس کی چمکتی آنکھوں نے مجھے حصار میں لیا تو اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر میں رخ موڑ کر فارہ کو دیکھنے لگی۔

''تمہاری شاپنگ مکمل ہوگئی......''

''ہاں تقریباً ہو ہی گئی تھی۔ آج تو کچھ خاص خریدنے گئے تھے۔''

''اچھا کیا خریدا......؟'' میں نے بغیر کسی اشتیاق کے پوچھا۔

''خاص خریداری کی رونمائی تو پھر خاص موقع پر ہی ہونی چاہیے' ہے ناں ذین......'' اس نے آذین کی طرف دیکھا تو وہ مسکرایا۔

میں نے وہ خاص چیز دیکھنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی اور اماں سے بابا کے متعلق پوچھنے لگی کہ وہ آفس سے آگئے ہیں یا نہیں۔

''تمہارے بابا تو آج آفس سے ہی گجرات چلے گئے ہیں...... کسی کولیگ کے بیٹے کے ولیمے میں شرکت کے لیے...... کہہ رہے تھے رات فنکشن ختم ہوتے، ہوتے دیر ہو جائے گی اس لیے کل صبح ہی واپسی ہوگی۔ تمہیں کوئی کام تھا ان سے؟'' اماں میری طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

''نہیں صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی اور بابا چلے گئے تھے تو میں نے سوچا سلام کر آؤں انہیں......'' میری عادت تھی کہ میں صبح اٹھنے کے بعد اماں بابا کو سلام کرنے ضرور جاتی تھی۔

''تم نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا گرم کروں......؟'' انہوں نے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔

''نہیں بس ایک کپ چائے بناؤں گی، آپ کے لیے بھی بنا دوں......''

''نہیں، میں اب کچھ دیر آرام کروں گی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں...... وہ مجھے بہت اداس اور سنجیدہ سی لگی تھیں۔

مجھے دکھ ہوا، میری اماں تو بہت خوش مزاج تھیں۔ ہمیشہ ان کے لبوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر ایک خوشگوار اور خوش کُن سا تاثر ہوتا اور یہ میری وجہ

سے تھا لیکن نہیں میری وجہ سے کیوں فارہ کی وجہ سے...... میں نے فارہ کی طرف دیکھا جو آذین کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہہ رہی تھی اور آذین بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ اشاروں اشاروں سے باتیں ہو رہی تھیں شاید وہ کسی بات سے منع کر رہا تھا لیکن وہ فارہ ہی کیا جو منع ہو جاتی جب وہ کوئی بات دل میں ٹھان لیتی تھی تو کر کے ہی رہتی تھی اب بھی وہ آذین کے اشارے کو نظر انداز کر کے کارنر ٹیبل کی طرف بڑھ گئی تھی جہاں کچھ شاپنگ بیگز کے ساتھ اس کا ہینڈ بیگ بھی پڑا تھا۔ اس نے ہینڈ بیگ سے ایک بہت خوب صورت سی ڈبیا نکالی...... اور وہ میری طرف بڑھی۔

''دیکھو زارا یہ کیسی ہے؟'' اس نے انگوٹھی نکال کر مجھے دکھائی۔

''اچھی ہے......'' چھوٹے، چھوٹے ڈائمنڈ سے سجی وہ انگوٹھی خوب صورت تھی۔

''صرف اچھی......'' فارہ نے یوں آنکھیں پھاڑیں جیسے میرے جواب سے اسے سخت مایوسی ہوئی ہو۔

''نہیں، بہت خوب صورت ہے۔'' اماں نے جو ابھی تک کھڑی تھیں دل سے تعریف کی...... صوفے کی بیک پر ہاتھ رکھے میں نے اماں کو فارہ اور آذین کی طرف دیکھتے پایا شاید اماں نے بھی انہیں اشارے کرتے دیکھ لیا تھا اسی لیے ابھی تک کھڑی صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''ہاں تو ہے ناں خوب صورت......'' اس نے مڑ کر آذین کی طرف دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔ ''میں نے پھپو کو بھی اس کی تصویر سینڈ کر دی ہے انہیں بھی بہت پسند آئی ہے۔''

''اچھا تو پھپو نے منگوائی ہے۔'' میرا دل جیسے ڈوبتے، ڈوبتے تیرا تھا۔

''تم نے ماما کو بھی سینڈ کر دی......؟'' آذین پوچھنے لگا۔

''ہاں تو کر دی ناں......'' آذین کی بات کا جواب دے کر اس نے یک دم میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر

محبت کیا ہے

کسی شاعر کا ہے کہنا محبت مر نہیں سکتی
محبت مر نہیں سکتی، محبت مار دیتی ہے
آنکھوں کے رستے دل میں اتار دیتی ہے
محبت بے غرض ہو تو زندگی نکھار دیتی ہے
خزاں کی رُت میں امیدِ بہار دیتی ہے
کبھی جیتی ہوئی بازی محبت ہار دیتی ہے
فقط چار حرفوں کا یہ مجموعہ ہے محبت
مگر جب ہو جائے تو زندگی سنوار دیتی ہے
محبت کرنے والے پھر جیتے ہیں، نہ مرتے ہیں
زندگی کے رستوں کو بھی بہت دشوار کرتی ہے
گر محبت ہو یکطرفہ تو بہت ہی خوار کرتی ہے
خوشیوں کا گلا گھونٹ کر جیتے جی مار دیتی ہے
محبت کرنے والوں کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے
محبت کچھ نہیں کہتی، محبت مار دیتی ہے
محبت تم نہیں کرنا، بہت دشوار ہوتی ہے
محبت مر نہیں سکتی، محبت مار دیتی ہے

کاوش: مریم بشریٰ...... آزاد کشمیر

یادِ ماضی

کبھی ہونٹوں پر فسانے تھے
جو اُن کو بھی سنانے تھے
وہ جو روٹھ کر چلے گئے
وہ یار ہم نے منانے تھے
ہائے وہ بھی کیا زمانے تھے
جب لبوں پر محبتوں کے ترانے تھے
دل مسکراتا تھا چپکے سے
نگاہوں میں محبت کے فسانے تھے
کبھی ہم بھی مسکراتے تھے
ہونٹوں سے گیت گنگناتے تھے
پھولوں کے سنگ مسکراتے تھے
کبھی ہم بھی محبتوں کے گیت گاتے تھے

از: فائزہ فاروق سحر، ماڈل ٹاؤن، لاہور

میری انگلی میں وہ انگوٹھی پہنا دی۔
''کیا کر رہی ہو فارہ......'' میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کیا اور انگوٹھی اتارنے لگی لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر تھوڑا سا بلند کیا۔
''واہ کس قدر سج رہی ہے زارا کے ہاتھ میں لگتا ہے جیسے اسی ہاتھ کے لیے بنی ہے......ایک دم فٹ...... واہ دیکھا ذین، فارہ کے اندازے......'' اس نے خود کو خود ہی تھپکی دی تو میں نے جلدی سے ہاتھ چھڑا کر انگوٹھی اتاری اور کسی قدر ناگواری سے فارہ کی طرف دیکھا۔
''یہ کیا حماقت ہے......؟''
''حماقت نہیں میری جان یہ تو بس......'' وہ بلاوجہ ہی ہنسی تھی......اور انگوٹھی ڈبیا میں رکھ کر آذین کی طرف بڑھائی۔
''لو بھئی سنبھالو اپنی امانت......'' آذین کے پاس ہی بیٹھے عابی بھیا نے بھی انگوٹھی دیکھ کر تعریف کی۔
''مجھے تو ایک اور پسند آئی تھی اس میں بھی ڈائمنڈ لگے تھے لیکن آذین کو یہ پسند تھی۔ حالانکہ وہ زیادہ خوب صورت تھی۔''
''اچھا وہ زیادہ خوب صورت ہم نہ لے لیں......''
عابی بھیا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
''ہاں تو لے لیں ناں......'' فارہ کی سنہری آنکھیں لو دینے لگی تھیں۔
تو ٹھیک ہے پھر کل جا کر لے آتے ہیں۔'' عابی بھیا بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور فارہ کی بے حد سفید رنگت پر بکھرتی گلابیاں صاف نظر آرہی تھیں۔
اماں کچھ حیران سی باری، باری دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ آذین ہولے سے کھنکھارا تو اماں چونکیں۔
''میں بھی انگوٹھی دیکھنے کو رک گئی۔ زارا تم اپنے لیے چائے بنا لینا اگر کسی اور نے بھی پینی ہو تو پوچھ لینا۔'' وہ لاؤنج سے نکل گئیں اور میں اٹھنے لگی۔
''تم بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں کہ چائے تو ہم سب ہی پئیں گے۔''
فارہ اماں کے پیچھے ہی باہر نکل گئی تو آذین اور عابی بھیا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیے یوں جیسے دونوں کے درمیان کوئی راز ہو......تب ہی عابی بھیا کا فون بجنے لگا تو وہ فون آن کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔
''کیسی ہو زارا، اپنا خیال رکھا کرو کچھ ویک ہو رہی ہو......'' اب آذین براہِ راست میری طرف دیکھ رہا تھا پتا نہیں کیوں میں کنفیوز سی ہونے لگی حالانکہ اس کے فیصل آباد جانے سے پہلے میں آذین سے ڈھیروں باتیں کرتی رہی تھی۔
''جی ٹھیک ہوں......'' میں اٹھنے لگی تو اس نے یک دم تھوڑا سا آگے جھکتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔
''ارے کہاں جا رہی ہو......میرا صبر زیادہ نہ آزماؤ، اتنے دنوں سے تو تمہاری پڑھائی کے خیال سے ڈسٹرب نہیں کیا تمہیں......اب جبکہ میرے جانے میں صرف ایک ہفتہ ہی رہ گیا ہے تو کچھ دیر تو بیٹھو یار......بلکہ کچھ زیادہ دیر......چلو آج سب باہر چلتے ہیں......چند گھنٹوں سے کیا ہو جائے گا۔ مجھے پتا ہے تم کتنی ذہین ہو......''
''نہیں، آج سارا دن نہیں پڑھ سکی، سر میں درد تھا۔ اب چائے پی کر پڑھائی شروع کروں گی۔'' میں ہاتھ چھڑاتے ہوئے بیٹھ گئی۔
''تمہیں انگوٹھی پسند آئی زارا......؟'' اس نے پوچھا تو میں نے سر ہلا دیا۔
''میں تو تمہارے ساتھ جا کر خریدنا چاہتا تھا لیکن پھر اس لیے کہ تمہاری پڑھائی کا حرج نہ ہو اپنی پسند سے ہی لے لی۔ اگر تمہیں پسند نہیں آئی تو میں نے سوچ رکھا تھا کہ تبدیل کر لوں گا۔''
یہ آذین کیا کہہ رہا تھا مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میرا پسند کرنا کیا ضروری تھا......میں الجھی، الجھی سی تھی...... پھپھو کو پسند آگئی تھی تو پھر......
''کیا تم کچھ ڈسٹرب ہو......دو ہفتے پہلے جب میں فیصل آباد گیا تھا......تب تم اس طرح پریشان نہیں لگتی تھیں۔ کوئی پریشانی ہے تو تم میرے ساتھ شیئر کر سکتی ہو......چلو میرے ساتھ نہیں تو فارہ کے ساتھ ہی شیئر

کرسکتی ہو، وہ تو تمہاری بہت اچھی دوست اور بہن ہے......'' وہ بے حد خلوص سے کہہ رہا تھا۔

''ہاں میں فارہ سے اپنی پریشانی شیئر کرسکتی تھی لیکن نہیں کرسکی تھی...... میں اس سے کہنا چاہتی تھی فارہ میں آذین سے محبت کرنے لگی ہوں پلیز تم لیکن میں نہیں کہہ سکی تھی۔''

''نہیں بس پڑھائی کی ٹینشن ہے......'' میں نے جھٹ سے کہا۔

''مت لو اتنی ٹینشن یار...... دو ہی تو باتیں ہوتی ہیں پاس یا فیل......'' وہ ہولے سے ہنسا تو میں بھی مسکرادی۔

''زارا مامی نے تمہیں بتایا کہ ماما نے ماموں جان کو فون کیا تھا اور......'' تب ہی عابی بھیا فون ہاتھ میں لیے اندر آگئے اور آذین کی بات ادھوری رہ گئی۔

''ایک کولیگ کا فون تھا یار اپنی شادی کی دعوت دے رہا تھا۔ بیچارے نے بڑے پاپڑ بیلے ہیں اس شادی کے لیے۔ بڑی مشکل سے والدین رضامند ہوئے۔''

عابی بھیا تفصیل بتارہے تھے جب فارہ چائے لے کر آگئی۔

''کیا خیال ہے، آج ڈنر باہر نہ کیا جائے۔''

چائے پیتے ہوئے آذین نے عابی بھیا سے رائے لی۔

''بشرطیکہ بل تم دو......'' فارہ چہکی۔

''فارہ کو بڑا خیال ہے تمہاری جیب کا......''

آذین ہنسا تو عابی بھیا نے بھی قہقہہ لگایا اور فارہ کی سنہری آنکھیں ایک بار پھر لودینے لگیں اور رخساروں پر شفق اتر آئی تھی۔ میں چائے پی کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک آٹھ بجے تیار ہوکر آجانا اور کوئی ایکسکیوز نہیں سنا جائے گا۔'' آذین نے تنبیہہ کی۔

''وہ اماں گھر پر اکیلی ہوں گی...... بابا بھی نہیں ہیں ناں......'' میں نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر آذین کی طرف دیکھا۔

''ہاں تو اماں بھی تو ساتھ جائیں گی ناں، ہم کب روز، روز نہیں جاتے ہیں باہر کھانے...... سالوں بعد تو کہیں پروگرام بنتا ہے۔ روحی ماما اور پاپا تو اکثر باہر ہی ڈنر کرتے ہیں......'' فارہ نے سالوں کہہ کر سراسر مبالغے سے کام لیا تھا۔ تین چار ماہ بعد تو چکر لگ ہی جاتا تھا۔

''وہ تو بڑے لوگ ہیں بھئی، ان کی کیا بات ہے......'' عابی بھیا ہنسے تھے۔

''ہوں بڑے لوگ چھوٹی باتیں......'' مجھے روحی چچی کی باتیں یاد آئیں...... ''سنڈریلا کی ممی......''

''تو ٹھیک آٹھ بجے...... آٹھ بجے تک جتنا پڑھنا ہے پڑھ لو......'' فارہ نے انگلی اٹھائی تو میں سر ہلا کر اپنے کمرے میں آگئی...... لیکن پڑھائی...... آہ میری پڑھائی کا تو اللہ ہی حافظ تھا۔ آذین، عابی بھیا اور فارہ کی باتوں نے مجھے الجھا دیا تھا۔ کہیں کچھ تھا...... کچھ ایسا جو میری نظروں سے اوجھل تھا۔ لیکن کچھ تھا میرے گمان سے مختلف......

آٹھ بجے تک کا وقت میں نے یونہی کتاب کھولے اور بغیر پڑھے گزارا...... اور پھر آٹھ بجے میں تیار ہوکر کمرے سے نکلی تو اماں برآمدے میں کھڑی فون پر بات کررہی تھیں۔ ریسیور رکھ کر انہوں نے میری طرف دیکھا۔

''تمہارے بابا کا فون تھا خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔'' اور پھر انہوں نے میرا جائزہ لیا اور مسکرائیں۔

''ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو......''

''آپ بھی بہت اچھی لگ رہی ہیں......'' اماں ہمیشہ سادہ سی رہتی تھیں لیکن جب کبھی ہلکا پھلکا تیار ہوتی تھیں تو بہت پیاری لگتی تھیں۔ میں نے بغور انہیں دیکھا وہ پہلے کی طرح اداس اور پریشان تو نہیں لگ رہی تھیں لیکن آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی لگتی تھیں۔

''ارے لوگ ہم سے پہلے ہی تیار ہوگئے۔'' فارہ نے ہمارے برآمدے میں قدم رکھتے ہی بلند آواز سے کہا۔

''واہ آج تو نظر نہ لگ جائے۔'' اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا۔

''ماشاء اللہ میری دونوں بیٹیاں ہی بہت پیاری لگ رہی ہیں۔'' اماں نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھونکا۔

''اور ہماری اماں بھی تو غضب ڈھارہی ہیں۔ کاش بابا بھی ہوتے......'' فارہ شرارت سے اماں کو

دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اماں سے فارہ کی طرح بے تکلف ہونا چاہتی تھی لیکن نہیں ہو سکتی تھی۔ فارہ تو اماں سے دل کی ہر بات کہہ دیتی تھی۔ وہ دونوں ''گوڑھی سہیلیاں'' لگتی تھیں۔ لیکن میں نہیں کہہ سکتی تھی...... میں کبھی اماں سے دل کی بات نہیں کر سکتی تھی۔

''اماں جی چاہ رہا ہے آپ کی تصویر بنا کر بابا کو send کر دوں...... کر دوں ناں......''

فارہ، اماں کے بازو سے لگی کھڑی تھی اور اماں ہنس رہی تھیں۔ کاش میں اماں کی گود میں سر رکھ کر ایک بار بہت سارو لیتی تو دل پر دھرا بوجھ کم ہو جاتا...... تب ہی عابی بھیا اور آذین بھی تیار ہو کر آ گئے پھر سب کے مشورے سے ولیج جانے کا پروگرام بنا...... میں نے کئی بار آذین کی خود پر پڑتی ستائشی نظروں کو محسوس کیا اور جھینپ سی گئی۔ عابی اور فارہ اپنی پسندیدہ ڈشز والی ٹیبل کی طرف گئے تو میں ان سے ذرا پیچھے تھی اماں ٹیبل پر ہی تھیں۔ ہمیشہ فارہ ہی ماما اور بابا کی پسند کا کھانا لے کر آتی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بار بی کیو آئٹمز کو تلاشا تب ہی مجھے اپنے بالکل قریب سے آذین کی سرگوشی سنائی دی۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو زارا......''

''فارہ بھی بہت پیاری لگ رہی ہے۔'' بالکل غیرارادی طور پر میرے لبوں سے نکلا۔

وہ ذرا سا حیران ہوا پھر ہنس دیا۔

''ہاں وہ بھی......'' اس نے اپنی پلیٹ میں سیخ کباب اور چکن تکے کا پیس رکھا اور پھر میری پلیٹ میں بھی رکھ دیا۔

''تھینکس......''

''ویلکم......'' اس نے ہلکا سا سر خم کیا اور میں جھینپ سی گئی۔

''کچھ اور لینا ہے۔''

''ابھی نہیں......''

ہم ٹیبل پر واپس آئے تو فارہ اور عابی بھیا بھی آ چکے تھے۔ اور فارہ اماں کی پلیٹ میں بریانی ڈال رہی تھی۔

''نان چنے، پوریاں، حلوا، ٹنڈے کدو سب کچھ ہے۔'' اس نے آذین سے کہا تو آذین ہنس دیا۔

''لیکن یہ سب کچھ کھایا نہیں جا سکتا...... بس دیکھا ہی جا سکتا ہے۔'' آذین نے ولیج کے ماحول اور کھانوں کو بہت انجوائے کیا تھا اور وہاں موجود ایک لوک فنکار سے ہیر کے چند بول بھی سنے تھے۔ واپس آتے، آتے دیر ہو گئی تھی اور کچھ میرا پڑھنے کا موڈ بھی نہیں تھا...... آذین کی والہانہ نظروں کی تپش جیسے اب بھی مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہو رہی تھی۔ سو نیند بھی کچھ دیر سے آئی تھی لیکن میں نے تین بجے کا الارم لگا دیا تھا۔ اور تین بجے اٹھ کر میں نے پوری یکسوئی سے دو ٹاپک کمپلیٹ کیے اور پھر فجر کی نماز پڑھ کر چائے بنانے کی غرض سے کچن میں آ گئی۔ تو اماں وہاں پہلے سے ہی موجود تھیں۔ چائے دم ہو چکی تھی۔ اور اماں نے دودھ گرم کرنے کے لیے رکھا ہوا تھا۔

''میں نماز پڑھ کر چائے بنانے کے لیے آئی تو تمہارے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ تمہارے لیے بھی چائے دم کر دی تھی۔'' انہوں نے چائے کا کپ بنا کر میری طرف بڑھایا۔

''زارا میں کل شام سے سوچ رہی ہوں تمہیں کہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔'' میں بے دھیان سی کپ اٹھائے واپس جا رہی تھی کہ اماں کی آواز پر رک گئی۔

''کیسی غلط فہمی اماں......؟''

''یہی فارہ اور آذین کے متعلق مجھے تو......'' اور انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں تو خود کل سے الجھی ہوئی تھی اماں سے بھلا کیا کہتی۔

''شکر ہے تمہارے بابا یہاں نہیں تھے اور میں نے ان سے بات نہیں کی......'' وہ اب اپنے لیے چائے بنا رہی تھیں اور میں چائے کا کپ ہاتھ میں اٹھائے خاموش کھڑی تھی۔

''میرا خیال ہے میں تمہارے بابا سے بات کرنے سے پہلے فارہ اور عابی سے بات کر لوں......''

''اماں آخر فارہ اور عابی بھیا سے کیا بات کریں

گی۔شاید وہ فارہ سے آذین کے متعلق اس کی پسند پوچھیں گی اور عابی بھیا سے کہیں گی کہ وہ آذین سے پوچھے۔''

''ساری رات میں سوچتی رہی زارا تمہاری پھپھو نے تمہارے بابا سے آذین کی مرضی کے بغیر تو بات نہیں کی ہوگی...... وہ کسی دقیانوسی خاندان کا کوئی مجبور لڑکا نہیں ہے...... زارا بیٹی کہ اس کے ماں، باپ اس سے زبردستی کریں، وہ انگلینڈ میں پلنے بڑھنے والا ایک خود اعتماد لڑکا ہے۔اور جہاں تک میرا خیال ہے آذین کے یہاں آنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ باقاعدہ رشتے کی بات کرنے سے پہلے وہ تمہیں ایک بار دیکھ لے اور مل لے...... ظاہر ہے بچپن کی بات تھی تو...... تمہاری پھپھو نے بہتر ہی سمجھا ہوگا کہ دوبارہ بات کرنے سے پہلے بچوں کی رائے پتا چل جائے تمہارے بابا کا بھی یہی خیال تھا۔''

اماں نے لمبی بات کی تھی اور میں نے بہت دھیان سے اماں کی بات سنی تھی شاید اماں کا خیال صحیح ہو، پھپھو نے آذین کی مرضی پوچھ کر ہی بابا سے بات کی ہو...... لیکن پھر وہ آذین اور فارہ کی بے تکلفی...... دیر تک باتیں کرنا اور...... میں اماں سے بنا کچھ کہے اپنا کپ لے کر کمرے میں آگئی تھی اور کتاب کھول لی تھی کہ مجھے ہر خیال جھٹک کر اب پڑھنا تھا بس...... فارہ نے دو تین بار میرے کمرے میں جھانکا تھا اور پھر مجھے پڑھتے دیکھ کر منہ بنا کر چلی گئی تھی۔ عابی بھیا آج آذین کو ساتھ ہی لے گئے تھے کہ آذین کو ایک دو کام تھے۔اگرچہ لنچ تک بابا بھی آگئے تھے لیکن میں نے کھانا اپنے کمرے میں ہی منگوالیا تھا۔عصر کی نماز کے بعد اماں میرے کمرے میں آئیں تو بہت خوش لگ رہی تھیں...... وہ میرے بیڈ پر بیٹھ گئیں تو میں نے کتاب بند کر کے کرسی کا رخ ان کی طرف مڑا۔

''زارا تمہیں غلط فہمی ہوئی تھی، فارہ اور زین کے بیچ ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اماں نے پتا نہیں فارہ اور عابی بھیا سے کیسے اور کیا بات کی تھی۔۔ لیکن وہ پورے یقین سے کہہ رہی تھیں۔

''میں نے ہمیشہ فارہ اور عابی کے لیے سوچا تھا زارا...... جب فارہ پیدا ہوئی تھی تب ہی میں نے رابی سے کہا تھا کہ یہ تو میرے عابی کی دلہن بنے گی۔اور عابی جانتا تھا کہ ہم نے کیا سوچا ہوا ہے...... لیکن جب تم نے کہا تو میں الجھ گئی...... کہ کہیں فارہ...... حالانکہ فارہ بھی عابی کو پسند کرتی تھی...... پھر بھی...... اور آذین نے خود تمہارے لیے کہا تھا۔ آج رات میں اور تمہارے بابا مدثر سے باقاعدہ عابی کا رشتہ مانگیں گے۔ اور پھر سنڈے کو ایک چھوٹی سی تقریب میں تم دونوں کی بات طے کر دیں گے۔'' میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''اور وہ سنڈریلا کی ممی کوئی رکاوٹ تو نہیں ڈالیں گی۔'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا...... لیکن میں نے جھکا سر نہیں اٹھایا۔اماں میری بات پر ہنس پڑی تھیں۔

''ارے نہیں بھلا روحی، فارہ کے ساتھ کیسا بھی سلوک کرے۔ مدثر کے سامنے کچھ نہیں بول سکتی۔مدثر نے تو بہت پہلے رابی کے مرنے کے بعد ہی فارہ کو مجھے سونپ دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے متعلق ہر فیصلے کا اختیار بھی آپ کا...... یہ تو بس رسمی طور پر بات کرتی ہے۔''

''کیا روحی چچی کا سلوک فارہ کے ساتھ اچھا نہیں تھا؟'' میں چونکی تھی۔

''وہ یوں ہی تو سارا دن ادھر نہیں گزارتی تھی۔'' اماں کھڑی ہوگئی تھیں۔

''تو کیا روحی چچی فارہ کو مارتی بھی تھیں؟'' مجھے بچپن میں مانی اور عابی بھیا کی سنائی ہوئی کئی کہانیاں یاد آگئی تھیں۔

''زبان کے گھاؤ جسم کے زخموں سے زیادہ گہرے اور اذیت ناک ہوتے ہیں بچے......'' اماں بھی اداس ہوئی تھیں اور میرے اندر تو جیسے برسات ہونے لگی تھی۔ میں بھی کتنی انجان اور بے خبر تھی۔

''اصل بات تو پوچھنا ہی بھول گئی۔'' اماں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں...... آذین کے رشتے پر......'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے بے اختیار آگے بڑھتے ہوئے میری

پیشانی کو چومتے ہوئے دعا دی۔

''خوش رہو میری بچی اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے۔'' ان کی آواز بھیگ سی گئی تھی ایک بار پھر انہوں نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ لے کر میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''آذین بہت اچھا ہے اور تمہاری پھپو بھی، مجھے یقین ہے میری بیٹی بہت خوش رہے گی۔'' وہ بات مکمل کر کے تیزی سے باہر نکل گئیں تو میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں...... اور ابھی میں نے اپنی آنکھیں پونچھی بھی نہیں تھیں کہ فارہ اپنے مخصوص انداز میں دروازے کو زور سے کھولتی ہوئی اندر آگئی۔

''یہ کیا بکواس کی تھی تم نے اماں سے......''

''کیا......؟'' میں انجان بن گئی تھی۔

''کاکی مت بنو......'' اس نے میرے بازو پر مکا مارا۔

''خدانخواستہ کچھ ہو جاتا ناں ایسا جیسا تم نے کہا تھا تو میں نے تو خودکشی کر لینی ہی تھی اور عابی نے بھی کنویں میں چھلانگ لگا دینی تھی۔''

''اللہ نہ کرے......'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''اور وہ جو تمہارے عشق میں آتے ہی گوڈے، گوڈے ڈوب چکا تھا...... بیچارہ ذین وہ کیا زندہ رہ پاتا؟''

''بکو مت......'' میں جھینپ سی گئی اور مجھے اپنے رخساروں پر حدت کا احساس ہوا۔

''بک نہیں رہی، آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی بتا رہی ہوں...... بھلا ایسا بھی کوئی عاشق صادق ہوگا کہ کئی، کئی گھنٹے میری فضول باتیں صرف اس لیے برداشت کرے کہ میں زارا بی بی کو جا کر ڈسٹرب نہ کروں اور اس کی پڑھائی کا حرج نہ ہو...... اور محترمہ تین، تین بندوں کا قتل اپنے سر لینے چلی تھیں ہاں تو......''

''اور تم گھنی میسنی تم نے کبھی ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ میرے بھیا کو اپنی ان سنہری آنکھوں کے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔'' میں نے بھی اس کے بازو پر مکا مارا۔

''میں نے ہوا نہیں لگنے دی یا تم نے ہی آنکھیں بند کر رکھی تھیں ورنہ تو بوٹا، بوٹا، پتا، پتا حال ہمارا جانے تھا۔'' اور وہ بات کرتے، کرتے ہنس پڑی تو مجھے بھی ہنسی آگئی۔

اب ہم دونوں ہنس رہے تھے اور اس ہنسی سے میرے اندر لگے جالے صاف ہو رہے تھے............

بے تحاشا ہنسنے سے میری آنکھوں کے کونے بھیگ گئے تھے۔ میں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا...... زیادہ ہنسنے سے اس کی آنکھیں بھی نم ہوئی تھیں...... سنہری آنکھوں میں اتنی چمک تھی کہ ہزاروں جگنو ایک ساتھ ان آنکھوں میں اتر آئے ہوں۔

اس اتنی پیاری...... اتنے خوب صورت دل کی مالک لڑکی کو میری اماں کی بہو بننا تھا۔

فارہ مدثر جو اماں کی بیٹی تھی جو اماں کی گوڑھی سہیلی تھی۔

میں نے بے اختیار اسے گلے لگا کر پیار کیا۔

''میری اماں کتنی خوش قسمت ہیں انہیں بہو کے روپ میں بیٹی مل گئی تھی...... میرے جانے کے بعد بھی میری اماں اکیلی نہیں ہوں گی...... فارہ تھی ناں ان کے پاس...... اور فارہ تو ہمیشہ سے ہی ان کے پاس تھی۔''

''چلو ہٹو پیچھے......'' اس نے مجھے خود سے الگ کیا۔

''مجھے ابھی عابی کو فون کرنا ہے جا کر کہ واپس آتے ہوئے وہ انگوٹھی لانا نہ بھولے۔''

''وہی جو تم نے پسند کی تھی۔''

''ہاں تو......'' وہ ہنستی ہوئی میرے کمرے سے چلی گئی۔ میں ہمیشہ سے فارہ کو جاننا چاہتی تھی کھوجنا چاہتی تھی لیکن نہیں جان سکی تھی۔

میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ میں اسے پسند نہیں کرتی...... لیکن میں اسے ناپسند کر ہی نہیں سکی تھی۔

میں اس سے نفرت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن کبھی نفرت نہ کر سکی...... میں فارہ سے نفرت کر ہی نہیں سکتی تھی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی کیونکہ میں فارہ سے محبت کرتی تھی۔

ہاں تو مجھے فارہ سے محبت تھی۔

۞۞۞
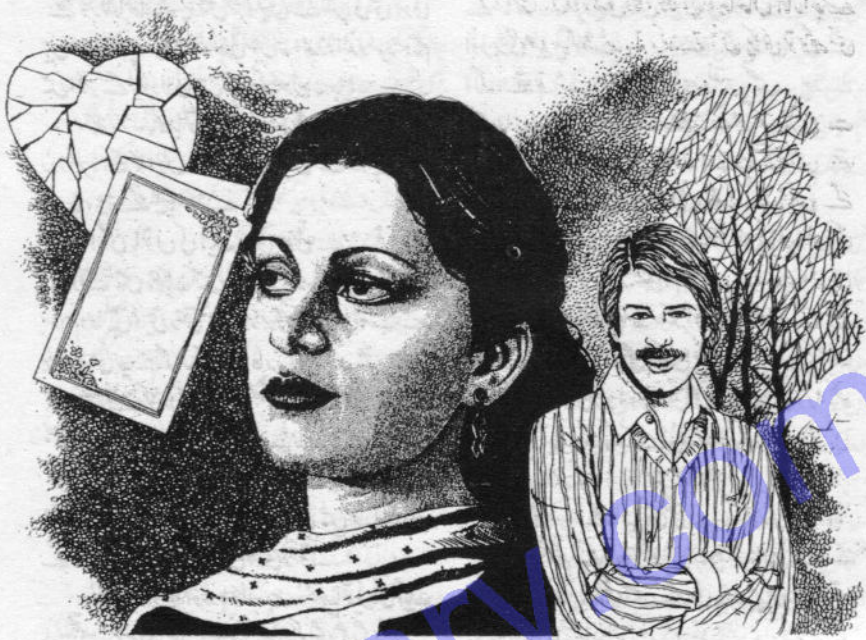
عورت بلحاظ

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے . . . مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنف مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار **فرحین اظفر** نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جُداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

کچھ باتیں سمجھ آنے تک انسان کی زندگی بیت جاتی ہے۔

سب اچھا تھا۔ گھر، گرہستی خاندان، خاوند.... اولاد..... معمولات و معاملات ٹھیک ٹھاک ہی چل رہے تھے۔ شاکر اور عالیہ کے دو ہی بچے تھے۔ دو کے ذکر پر ہمیشہ ہی ان کی آنکھیں نم.. ہو جاتیں اور دل بھر بھر آتا تھا..... لیکن وہ خود کو سنبھال لیتی تھیں۔ حالانکہ اب تو ان کی اپنی عمر کی نقدی بھی اتنی باقی بچی تھی جسے

گنتے ڈر لگتا تھا۔ کچھ چوٹیں سردیوں کے نیل کی سی ہوتی ہیں اوپر، اوپر صاف ہو جاتی ہیں۔ اندر، اندر سرد موسم میں ابھر کے یاد دلاتی ہیں کہ ہم کو بھول نہ جانا۔

خیر...... کچھ باتوں کو بھولنا بھی کون چاہتا ہے......

روز مرہ کے کاموں میں جہاں سکون کے دو پل میسر آئے، بیٹھ گئے کلیجا ساڑنے......

اچھی باتوں کی ایک خامی ہوتی ہے۔ یہ فرصت کے وقت میں جھلک نہیں دکھاتیں۔ ہاں چلتے پھرتے سلام دعا لیتی دیتی رہتی ہیں اور بری باتوں کی سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ یہ آتی ہی فارغ اوقات میں ہیں۔ جم کے بیٹھنے کو، لاکھ دماغ جھٹکو، دل پلٹاؤ لیکن نہ بھئی...... بہتر یہی ہے کہ بندہ فارغ ہی نہ بیٹھے۔

عالیہ دل و جان سے مصروفیت کی احسان مند رہتیں۔ دن بھر یہاں وہاں کے کاموں میں خود کو گم رکھ کے، فضول سوچوں سے جان چھٹی رہتی۔

''نہ بندہ ویلا ہو نہ باؤلا بنے۔'' سو باتوں کی ایک بات تھی۔ پر سالہا سال سے جی جان کو لگا رکھی تھی۔

شاکر میاں ڈبل شفٹ میں ڈیوٹی کرتے تھے۔ شاید وہ بھی اندر، اندر کچھ بھولنا بھلانا چاہتے ہوں گے۔ روپے پیسے کی تو کوئی خاص تنگی نہیں تھی پر عالیہ نے کبھی نہیں کہا۔ عالیہ سمجھتی تھیں تو اپنے تئیں سمجھتی رہیں۔ وہ اس کہی ان کہی کے جھنجٹ سے آزاد ہی تھے۔ جانے کب سے...... بس وہ عالیہ کا اور عالیہ ان کا اور وہ دونوں مل کے دونوں بچوں کا اور بچے، ماں باپ کا خیال رکھتے تھے۔

گھر میں محبت اور احترام کی فضا بنی ہوئی تھی۔ اوپر سے عالیہ نے دو جہان تو کیا سب جہانوں کے کام اپنے کندھوں پر لیے ہوئے تھے۔ وہی کافی تھے۔

ہر موسم کے پکوان، سردی، گرمی کے اچار و حلوا جات ان کے یہاں پکتے...... خاندان کے قریبی گھروں میں بانٹے جاتے...... گرمی میں جگ بھر، بھر ستو بنتا، کچے آم کا کھٹ مٹھا اسکوائش اور سکنجبین تیار رہتی۔ ہر آئے گئے کو وہی پیش کی جاتی۔ برسات میں پوری گلی کے ہر، ہر گھر میں پکوڑے جاتے، وہ بھی چٹنی کے ساتھ...... سردیوں میں پنیوں کی سوغات عید پر شیر اور بڑی عید پر گوشت...... رمضان کے پکوان اس سے الگ تھے تو شب رات کی اپنی رونقیں تھیں۔ پورے محلے والے عالیہ کو آپا بلاتے تھے۔ ہر، ہر گھر میں عزت کی جاتی تھی۔ شاکر میاں خود تو اتنے سوشل نہیں تھے لیکن عالیہ کی بدولت مشہور کافی تھے۔ انہیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بس گھر، بچے اور ماں، باپ ان کی زندگی کا محور و مرکز تھے۔ یہی بہت تھا۔

یوں عمر کی نقدی سکہ، سکہ وقت کے گلک کے کھلے منہ سے گر رہی تھی۔ کبھی سکون کبھی ہلچل...... اسی مدوجزر میں دکھ سکھ کی ناؤ ڈول رہی تھی کہ ایک دن ذرا کچھ الگ سا ہو گیا۔ بلکہ کچھ نہیں شاید بہت کچھ......

☆☆☆

''امی!...... مجھے ثانیہ اچھی لگتی ہے...... میں اس سے......''

وہ شلجم کے اچار کا بھرا ہوا مرتبان لے کے باورچی خانے سے نکلی تھیں۔ ثمیر کی بات پر مرتبان ہاتھ سے ہی چھوٹ گیا۔

''دھڑام......'' اتنی زوردار آواز اور وہ بھی چینی کے مرتبان کے ٹوٹنے کی ہوئی کہ ثمیر کی باقی آواز اس میں کہیں کھو ہی گئی۔ یا شاید وہ خود ہی خاموش رہ گیا۔

عالیہ کا ردعمل بڑا غیر فطری سا تھا۔ وہ کتنے ہی لمحے وہاں کھڑی افسوس سے زمین پر پھیلے، چپچپے پانی اور شلجم کے سفید قتلوں کو دیکھتی رہیں۔ سفیدی مائل سرمئی فرش پر گرد کی تہ جو کبھی محسوس تک نہ ہوتی تھی اب سفید شلجم کے نفاست سے کٹے ٹکڑوں پر دھبے بن کے چمٹ چکی تھی۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ جیسے خود پر ضبط کر کے اندر ہی اندر خود کو دبایا ہو پھر خاموشی سے صفائی میں لگ گئیں۔

ثمیر سامنے لاؤنج میں بیٹھا ان کی بے نیازی دیکھتا رہا۔ وہ منہ موڑ کے کام نمٹا رہی تھیں یا پھر دانستہ اس کی طرف سے رخ پھیر لیا تھا۔

ثمیر نے کچھ دیر ان کو دیکھ کے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ جانتا تھا، اس کی بات صرف ایک بات نہیں، ایک دھماکا

''میں حیران ہوں کہ آخر ثمی نے اس لڑکی کو اتنا جانچ کیسے لیا کہ اس سے شادی کا فیصلہ ہی کر ڈالا۔ وہ بھی خود سے پورے چھ سال بڑی لڑکی سے......'' ان کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں ہلکی سرخی تھی۔ وہ روئی تھیں یقیناً...... لیکن اب شاکر میاں کے سامنے خود کو نارمل رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔

''ہم مم...... ملا ہوگا کبھی۔''

''ہاں ہاں۔ ملا تو ہوگا۔ ظاہر ہے ایک ہی خاندان کے ہیں۔ بچپن ساتھ گزارہ ہے انہوں نے لیکن...... بڑے ہونے کے بعد تو......'' وہ سوچ میں ڈوب گئیں۔

شاکر ان کی رگ، رگ سے واقف تھے۔ وہ اس وقت صرف یہ سوچ رہی تھیں کہ ان سے بے پروائی کہاں ہوگئی کہ ثمیر خاندان کی ایک لڑکی کو دوسری نگاہ سے دیکھنے لگا اور انہیں خبر تک نہیں ہوئی لیکن یہ ان کی بے پروائی نہیں تھی۔ ثانیہ اور ثمیر کی عمروں میں فرق ہی اتنا تھا کہ کوئی اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''اب یہ بات اتنا سوچنے والی نہیں۔ تم یہ بتاؤ آگے کیا کرنا ہے؟''

شاکر کی بات پر عالیہ نے شدید ناگواری سے ان کو دیکھا۔

''کیا مطلب کیا کرنا ہے...... کچھ نہیں کرنا...... منع کر دیں آپ ثمیر کو......''

''کیوں......؟''

عالیہ نے اس سوال پر ایک دم آنکھیں نکال کے انہیں گھورا۔

''میرا مطلب ہے بے شک ثمیر نے پہلی بار اس طرح کی کوئی بات کی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تم نے خود ہی ارادہ ظاہر کیا تھا کہ ثمیر کی شادی اب ہو جانی چاہیے۔ تو اب اس کو منع کرو گی تو کہو گی کیا......؟''

عالیہ نے غصے میں ایک گہری سانس بھری۔

''مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ سے بات کی ہے، منع بھی آپ ہی کریں گے۔ کہہ دیں کہ وہ تمہیں سوٹ نہیں کرتی اور سوٹ کرتا کیا۔ خود سے اتنی بڑی عورت تھی جو عالیہ کے حواس پر اس نے خود ہی کیا تھا۔

عالیہ کی خاموشی طوفان سے پہلے کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی تھی۔ یہ وہ بم تھا جو ٹائم کا انتظار کر رہا تھا اور مخصوص وقت پر پھٹنا بھی تھا لیکن اس کے نہیں، اس کے باپ کے اوپر......

شاکر میاں کو تو اس بات کی الف، ب بھی پتا نہیں تھی لیکن وہ ان کو گھر کی وہ مظلوم عوام سمجھتا تھا جو ہر حکومتی فیصلے کے برے ثمرات جھیلنے کے لیے ہوتے ہیں۔ نرم مزاج، ہنستے مسکراتے، نفیس طبیعت شاکر میاں کی ہم سفری میں رہتے ہوئے عالیہ بھی کسی حد تک ان کے رنگ میں رنگ چکی تھیں لیکن دو انسان کسی نہ کسی حد تک مختلف تو ہوتے ہی ہیں۔

یہی حال عالیہ کا تھا۔ بہت مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ خود کو ٹھنڈا رکھنے میں شاکر میاں کی قربت کا کمال تھا۔ لیکن وہ بھی، کبھی گرم بھی ہو جاتی تھیں۔ عام انسانوں کی طرح ضد، غصہ اور ہٹ دھرمی بھی دکھا دیتی تھیں۔ چونکہ گھر پر حکمرانی انہی کی تھی اس لیے گھر والے جھیل بھی لیتے تھے۔ ان کا لحاظ کرتے تھے اسی لیے بھرم قائم تھا۔ زچ ہوتے تھے وہ الگ بات تھی۔ لیکن کم سے کم جب سے ثمیر اور ماہین نے لڑکپن میں قدم رکھا تھا۔ ہر فیصلہ ماں کو ہی کرتے ہوئے پایا تھا۔ کبھی شاکر کی...... مرضی چلتی بھی تو عالیہ ہی کی مرضی سے چلتی تھی۔

خاندان والوں سے دور دراز اس علاقے میں گھر لینا بھی عالیہ ہی کی مرضی تھی۔ شاکر میاں کی جیب اجازت نہیں دیتی تھی۔ لیکن عالیہ کی خوشی کو مقدم رکھتے ہوئے انہوں نے استطاعت سے بڑھ کے، خرچ کیا بھی تھا اور سالوں قرضے کا بوجھ ڈھویا تھا۔ پھر بھی کبھی شکوہ کرتے ہوئے نہیں پائے گئے۔

ثمیر کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا اب کہ بس وہ شاکر میاں کی واپسی کا انتظار کرتا اور ان کو صورت حال بتاتا۔

قوی امید تھی کہ عالیہ اگر ابھی راضی نہ بھی ہوتیں تو کچھ دیر کے بعد ہو جاتیں......

☆☆☆

سے شادی کرے گا کیا وہ۔ بچہ لگے گا اس کے سامنے۔‘‘
’’اور وہ نہ مانا تو......‘‘ شاکر نے بہت دھیرے سے سوچ سمجھ کے آگے کی بات کی تھی۔ عالیہ کا ردِعمل کچھ بھی ہو سکتا تھا۔
اور ہوا بھی وہی......
انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چادر زمین پر اس زور سے پٹخی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بے نیاز نہ رہ سکے۔ شکر تھا کہ چادر ہی تھی ورنہ کوئی کانچ کا برتن یا کچھ بھی اور چیز ہوتی تو اس کی آواز سے دیواریں ہل جاتیں۔
شکر ہوا کہ انہوں نے اسی پر توقف کیا اور مزید کچھ کہے بنا ہی باہر نکل گئیں۔
شاکر صاحب ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئے۔ انہیں یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آ رہی تھی۔
☆☆☆
سالہا سال پرانی بات تھی۔ تقریباً تیس سال پرانی...... لیکن تیس صدیاں بھی گزر جاتیں تو عالیہ کے دل سے وہ بات نہیں نکل سکتی تھی جواب فقط ایک کسک بن کے رہ گئی تھی۔ دھیمی، دھیمی سلگتی ہوئی آنچ جو کسی، کسی وقت ذرا سا بھڑکتی تو اس کی تپش سے ان کا روم، روم جلنے لگتا۔
رات کے کسی پہر جب نیند روٹھ جاتی تو آنکھیں بھر آتیں۔ یہی وہ تکلیف دہ یادیں اور سوچیں تھیں جن سے بھاگنے کے لیے انہوں نے خود کو حد درجہ مصروف کر رکھا تھا۔
ایک ہنستے بستے گھر کی راجدھانی چلاتی عورت کے دل میں کیا شکوہ دبا تھا۔ روز ملنے والا کبھی جان ہی نہیں سکتا تھا لیکن یہ وہ گلہ تھا جو ساری عمر اُن کے دل میں رہنا تھا۔ یہ وہ شکوہ تھا جس کی تلافی ممکن نہیں تھی۔ یہ وہ شکایت تھی، جسے وقت کے پنوں میں درج کرتے، کرتے ان کی انگلیاں ٹوٹ گئی تھیں لیکن وہ تھکی نہیں تھیں۔ ایک لمحہ تھا جو گولی کی طرح آ کے ان کی زندگی سے نکل گیا تھا لیکن انہوں نے ایک دھڑکن کو اس لمحے پر روک لیا تھا۔ اور یہ وہ شکوہ تھا جو انہیں کسی اور سے نہیں، شاکر میاں سے ہی تھا۔ ہاں......اپنے جیون ساتھی سے۔
☆☆☆
نسرین، شاکر میاں کی خالہ زاد بہن اور ایک بچی کی ماں تھیں جو جوانی میں بیوہ ہو کر شاکر میاں کے ہی گھر کے اوپری پورشن میں رہتی تھیں۔ گورنمنٹ ٹیچر کی نوکری، کر کے عزت سے گزر بسر کر رہی تھیں۔ جب عالیہ بیاہ کے آئی...تو گھر میں ساس کی حکومت تھی۔ اور بڑی رعب دار حکومت تھی۔ دو بیاہی اور ایک کنواری نند مع ایک جیٹھ، جیٹھانی کے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ان کے حکم کے آگے دم مار سکے۔
عالیہ بھی کم سن لڑکیوں کی طرح ڈھیروں خواب لیے گھر کی دہلیز تک آئی تھی۔ شاکر حقیقی معنوں میں بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ ہر طرح سے بیوی کا خیال رکھنا۔ پیار محبت، بھروسا، اعتماد، اعتبار...... وہ کون سی شے تھی جس کی ایک نو بیاہتا کو چاہ ہو اور وہ شاکر نے عالیہ کو نہ دی ہو۔
عالیہ اتنے اچھے ہم سفر کو پا کے، جہاں بے انتہا خوش تھی وہیں رفتہ، رفتہ گزرتے دنوں کے ساتھ گھر کے ماحول نے اسے اول، اول الجھن میں مبتلا کیا۔ بعد میں پریشان، بیزار اور آخر میں نفرت کی حد تک چڑا دیا۔
شاکر کی والدہ، افسر سلطانہ اپنے نام کی ہی طرح افسرانہ مزاج رکھتی تھیں۔ بیٹھے، بیٹھے حکم چلانا ان کی عادتِ خاص بلکہ عادتِ بد تھی۔
گھر میں ملازم مہ رکھے جانا، بے انتہا معیوب بات تھی۔ عالیہ کو کام کرنے میں کوئی عار نہ تھا لیکن اس کی طبیعت میں وہ پھرتی اور تیزی نہیں تھی جس کی افسر سلطانہ طلبگار تھیں۔
کسی بھی قسم کا موقع ہوتا باہر سے کھانا تو دور روٹیاں تک لانا شدید بدنامی جیسا تھا۔
’’جس گھر میں تین جوان جہان عورتیں ہوں، وہاں بازار سے روٹیاں آئیں......تھو، تھو کریں گے لوگ ... بھئی تم لوگ کس مرض کی دوا ہو۔‘‘ آواز بھی ان کو اللہ نے بہت پاٹ دار دی تھی مگر غیروں کے لیے بہت شفیق اور نرم مزاج تھیں۔
بیاہی بیٹیاں گھر آتیں تو خوب آؤ بھگت ہوتی۔

شروع، شروع میں ان کے رویّوں پر اس کا دل مسوس کر رہ جاتا پھر رفتہ، رفتہ اسے عادت پڑ گئی۔
فجر کے بعد سونے پر پابندی تھی۔ عالیہ کو ظہر کے بعد نیند کے ایسے جھونکے آتے کہ اس سے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن وہ ساس کے غصے کے ڈر سے خود کو بمشکل سنبھالتی رہتی۔
جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اسے گھر اور گھر والوں کے مزاج سمجھ آتے گئے تو اس نے نوٹ کیا کہ اس کی جیٹھانی بظاہر ساس کی ہر بات سنتی بھی تھیں اور مان بھی لیتی تھیں۔ لیکن اسی فرمانبرداری کے درمیان کہیں نہ کہیں اپنی من مانی بھی کر جاتی تھیں۔ ساسو ماں مزاج کے خلاف کچھ ہوتا دیکھتیں تو غصہ بھی کرتیں جسے جیٹھانی چپ چاپ سن لیتیں۔ جیسے گھر میں سب کو سننے کی عادت ہی تھی۔ کچھ دن سکون سے گزرتے پھر وہ دوبارہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کر جاتیں۔
چھوٹی نند نازو ماں کی بہت فرمانبردار تھی لیکن اس کی ایک اچھی عادت یہ تھی کہ وہ ماں سے بھابیوں کی لگائی بجھائی نہیں کرتی تھی۔ کام میں بھی ہاتھ بٹاتی تھی۔ عالیہ کے لیے ان دونوں کا وجود بھی غنیمت تھا۔ ورنہ جس طرح کا ماحول اس نے دیکھا تھا وہ اس ماحول کی عادی نہ تھی اور نہ خود کو عادی بنا پا رہی تھی۔
آہستہ، آہستہ جب وہ سب کے مزاج سمجھنے لگی تو اس نے بھی امی جان کو اتنا ہوا بنانا کم کر دیا اور بھابی والی روش اپنالی۔
اب وہ بھی کبھی دوپہر میں کمرا بند کر کے گھنٹے دو کی نیند لے لیتی۔ شروع، شروع میں امی جان (ساس) نے باتیں بنائیں۔ ڈانٹا پھٹکارا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنا کام نمٹا کے فارغ ہو جاتی ہے اور گھر میں کوئی مرد بھی نہیں ہوتا تو پھر کہنا سننا کم کر دیا...... بقول خود اُن کے عالیہ کی ڈھٹائی کے آگے ہار مان گئیں۔
اسی پابندیوں بھرے ماحول میں نازو کی شادی ہوئی۔ اسے اچھا سسرال اور کھلے دل و دماغ کے سلجھے ہوئے لوگ ملے۔

وہ جب بھی آتی۔ چہرہ کھِلا پڑ رہا ہوتا۔ کئی ماہ گزر گئے، ہر دوسرے روز چکر لگاتی رہی۔ تب عالیہ کے دل میں رہ، رہ کے خیال اٹھتا کہ دوسروں کی بیٹیوں کو تنگ کرنے والوں کی اپنی بیٹیاں اتنی سکھی کیسے رہ لیتی ہیں۔
وہ کسی کا برا چاہتی تھی نہ سوچتی تھی۔ لیکن امی جان نے ظالم ساس بن کر جس قسم کی فضول پابندیوں سے اس کی زندگی خراب کی تھی ان کی وجہ سے وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔
وہ لوگ شادی کے بعد کہیں گھومنے گئے۔ نہ اسے کبھی اتنی جلدی، جلدی میکے جانے کی اجازت ملی۔ اسے کہیں بھی شوہر کے ساتھ ساس کی اجازت کے بغیر جانے کا حکم ہی نہیں تھا۔ شادیوں کے علاوہ جہاں کہیں جانا ہوتا رات نو بجے تک واپسی کا آرڈر اس کا موڈ خراب کر دیتا۔ کئی، کئی ہفتوں بعد ایک دن کے لیے میکے رکنے کی اجازت مل پاتی۔ اس پر ساسو ماں فرماتیں کہ ہماری بیٹی کی تو نئی، نئی شادی ہے۔ وہ تو کبھی رہنے نہیں آئی۔
عالیہ مارے حیرت کے ان کا منہ دیکھتی رہ جاتی۔
''بھلا جو روز دروازے پر کھڑی ہو۔ اسے ابھی رکنے بھی آنا چاہیے۔'' وہ دل مسوستے ہوئے بس سوچ ہی سکتی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر وقت اپنا اور نازو کا مقابلہ کرتی رہتی۔ اور دل ہی دل میں کڑھتی رہتی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ نازو اور اس کا اصل تقابل ابھی باقی ہے۔
نازو امید سے ہوگئی۔ اس کے پاس ایسی کوئی خبر دور، دور تک نہیں تھی۔ اس رات اسے نیند نہیں آئی۔ پوری رات کروٹیں ہی بدلتی رہی۔ شادی کو ڈیڑھ سال ہونے والا تھا۔ اور ابھی تک اگر کسی کو خیال آیا بھی تھا تو اس نے عالیہ کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔
نازو کی خبر ملتے ہی امی جان نے عالیہ کی خبر گیری شروع کر دی۔ نازو اب ہفتہ، ہفتہ بھر رکنے کے لیے آتی۔ وہ تو ماں بننے والی تھی اسے آرام کی ضرورت تھی لیکن عالیہ ایسی کسی بھی ضرورت سے مستثنیٰ تھی۔ اس لیے وہ خدمتوں کے لیے وقف ہوگئی۔
مرے پر سو دُرّے کہ شاکر کے بڑے بھائی،

ذاکر کا تبادلہ دوسرے شہر ہوگیا۔
عالیہ کے لیے دل کی بات کہنے سننے کا ایک ہی در تھا سو وہ بھی بند ہوا۔ کیونکہ شاکر اپنی ماں کے سامنے بے بس تھے۔ وہ بیوی کے حامی تھے لیکن صرف بند کمرے کے اندر، اندر...... ایسے میں صرف جیٹھانی، فردوس بھابی ہی تھیں جن سے کبھی دکھ سکھ کرلیا جاتا تھا۔
وہ دوسرے شہر کیا گئیں عالیہ بالکل ہی اکیلی سی ہوگئی۔ دن گزر جاتا، گھر کے کام ختم نہ ہوتے۔ جھاڑو، برتن، کپڑے، کھانے کے علاوہ گھر بھر کو ہر وقت چمکا کے رکھنا۔ سسر کے لیے پرہیزی کھانے' ہر کام میں وقت کی پابندی اور تاخیر کا عذر نا قابلِ قبول ہوتا۔ پھر آئے روز کئی، کئی دن کے لیے نازو آتی تو دوسری نندوں کو بھی ساتھ ہی بلا لیتی۔ وہ اور ان کے بچے تین' تین دن رک کے جاتے۔ تینوں وقت کا کھانا، عالیہ کی ذمے داری تھا۔
نندیں ہاتھ بٹا بھی دیتیں لیکن ان کی کوئی ذمے داری نہیں تھی۔ توفیق ہوگئی تو کرلیا ورنہ عالیہ کو جھاڑ پڑتی رہتی۔
اسے یوں لگتا جیسے کسی ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہی ہے۔ ذہنی طور پر حد درجہ بیزار ہو کے، اعصابی طور پر نڈھال ہو کے، وہ دلی طور پر شاکر سے دور ہوتی جا رہی تھی۔
سونے پر سہاگا کہ نازو ایک بار ماں بن کے دوسری بار امید سے ہوگئی لیکن عالیہ کی کوکھ سوکھی پڑی رہی۔ اب وہ گھر کی بہو سے صرف ایک ملازمہ بن چکی تھی۔ الجھے بال اور بکھرا حلیہ لے کے سارا دن یہاں وہاں ضروری اور غیر ضروری کام نمٹاتی وقت گزار دیتی۔
شاکر گھر آتے تو انہیں ایک تھکی ہوئی پژمردہ بیوی ملتی۔ جو نہ اُن کی طرف محبت سے دیکھتی تھی، نہ ان کی کسی بات کا ڈھنگ سے جواب دیتی تھی۔
وہ خود تو سلجھے ہوئے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ عالیہ کی محرومی اور اس محرومی کو بڑھاوا دینے والے ماں کے تلخ رویے کو سمجھتے تو تھے لیکن ماں سے کچھ کہنے کی مجال نہیں تھی۔ امی جان نے ماں باپ کی فرمانبرداری کے ثواب اور ناراضی کے گناہ کے اسباق ان کو گھٹی میں پلا رکھے تھے۔ ان کے پیشِ نظر ہر دم ماں کی رضامندی ہی رہتی تھی۔
جب نازو کے دوسری بار ماں بننے کی خبر ملی، تب افسر سلطانہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ انہوں نے گھر میں شاکر کی دوسری شادی کی بات چھیڑ دی۔
عالیہ کے دل پر یہ بات بجلی بن کے گری اور اس دن ضبط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔
تمام لحاظ و مروت بالائے طاق رکھ کے اس نے امی جان کو جی بھر کے باتیں سنائیں۔ گو افسر سلطانہ بوڑھی ہوگئی تھیں۔ لیکن چند سالوں میں اتنا بھی فرق نہیں پڑا تھا کہ بے بس ہو کے چپ ہو جاتیں۔ یوں بھی زندگی میں پہلی بار کسی نے اُن کو للکارا تھا۔
وہ گھمسان کا رن پڑا کہ پورے محلے نے تماشا دیکھا۔ نازو پہلے تو ماں کو پھر کبھی بھابی کو چپ کراتی رہی۔ لیکن جب بات بڑھتی ہی چلی گئی، تب اس نے گھبرا کے بھائی کو فون کیا۔
شاکر جب گھر پہنچا تو فساد اپنے عروج پر تھا۔ آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ اور ایک دو عورتیں دروازے پر تذبذب کے عالم میں کھڑی تھیں۔
افسر سلطانہ کے جلال سے تو سب ہی واقف تھے لیکن عالیہ کا یہ روپ پہلے کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔
شاکر بھی ہڑبڑا سے گئے۔ کبھی ماں تو کبھی بیوی کو چپ کروانے میں انہیں دانتوں پسینہ آگیا۔ بالآخر بوڑھی ہوتی ساس ہی بول، بول کے ہانپ گئی لیکن عالیہ تو آج پہلی بار پھٹی تھی۔
شاکر اس کو گھسیٹ کے کمرے میں اور نازو ماں کو پکڑ کے ان کے کمرے میں لے گئی۔
''میں بتائے دے رہی ہوں آپ کو...... جو آپ اور سب مل کے سوچ رہے ہیں۔ وہ میرے جیتے جی کبھی نہیں ہوگا۔'' اس کی آواز پھٹی ہوئی تھی۔ چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

''ارے کچھ نہیں سوچ رہا میں اور امی کی تو عادت ہے کچھ بھی بول جاتی ہیں۔ تبھی کچھ سوچ لیتیں...... ذرا لحاظ نہیں آیا تمہیں۔ پورے محلے میں تمہاری آواز جا رہی ہے۔''

''آپ کو میری آواز کی پڑی ہے۔ اپنی ماں کو کچھ نہیں کہا جاتا آپ سے...... جو نسرین سے آپ کو بیاہنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ جا کے سمجھائیں اس پاگل عورت کو......'' سالوں کا جمع غبار، نفرت سے اس کی زبان اگل رہی تھی۔ لیکن شاکر کے لیے ماں کے لیے اس طرح کا انداز ناقابلِ قبول تھا۔

غصہ تو انہیں عالیہ پر آ ہی رہا تھا۔ بے اختیار ان کا ہاتھ اٹھا اور عالیہ کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں اجنبیت سانسیں لے رہی تھی۔ ثمیر اور چھوٹی ماہین کی عمروں میں کافی فرق تھا ورنہ عالیہ کہہ سکتی تھیں کہ بہن کی شادی سے پہلے اپنا سوچنا بھی مت...... لیکن ابھی تو یہ تھا ثمیر کی شادی کے لیے بہت ہی مناسب عمر تھی اور ماہین تو ابھی سولھویں میں لگی ہی تھی۔

ڈائریکٹ باپ کو بیچ میں ڈال کے بات کرنے کا۔ مطلب بھی یہی تھا کہ شاید وہ پکا فیصلہ کر چکا ہے اور اب اسی پر جما رہے گا۔ عالیہ کو اپنی تربیت پر ناز تھا لیکن قسمت پر نہیں۔ پہلے بھی ایک بڑا دھچکا لگ چکا تھا۔ جس کا درد اب بھی کبھی، کبھی چمک جاتا تھا۔

وہ کسی صورت ثانیہ کو اپنی بہو نہیں بنا سکتی تھیں۔ شاید مر کے بھی نہیں...... نسرین سے بظاہر کوئی تعلق واسطہ اور بات تک نہ ہو سکنے کے باوجود وہ جانی دشمن کی طرح ان کے حواسوں پر سوار رہی تھی۔ اور اب اس کے بعد ان کی بیٹی...... اور وہ بھی عمر میں ثمیر سے کئی سال بڑی......

عجب نہ ہوتا کہ وہ رات کو سوتے سے اٹھ کے بیٹھ جاتیں۔ بات کرتے، کرتے سوچ میں ڈوب جاتیں۔ بے بات ہی ماہین پر برس جاتیں...... وہ بیچاری سب سے زیادہ زیرِ عتاب تھی۔

ثمیر اور شاکر میاں سب دیکھ اور سمجھ رہے تھے لیکن عالیہ کے آگے بے بس تھے۔ عالیہ کی ضد اور ہٹ

بچوں کے نام

میرے پیاروں میرے بچوں
تمہیں جب میری یاد آئے
میری چاہت ستائے تو
ہاتھوں کو اٹھا لینا، ہونٹوں پر دعا رکھنا
میرے پیارو، میرے بچوں
تمہیں جب میری یاد آئے
اور آنکھیں چھلک جائیں
خود کو تنہا نہ کر لینا، اک دوجے سے مل لینا
میرے پیارو جگر گوشو
کبھی جب گھر میں آؤ تم
کہیں نہ مجھ کو پاؤ تم
جدائی درد بن جائے، درد حد سے گزر جائے
تو دادی سے لپٹ جانا
بڑے تایا کی بانہوں میں سمٹ جانا
انہی چہروں میں، میں ہوں گا
اسی خوشبو میں، میں ہوں گا
میرے پیارو، میرے بچوں
میرے پیارو جگر گوشو

ہما علی، اسلام آباد کے قلم سے
اپنے مرحوم بھائی کے بچوں کے نام

پیارے ابو کی یاد میں

بہت ہجوم ہے میرے ارد گرد
مگر تم سا لاجواب کوئی نہیں
مسکراہٹیں بکھری ہیں یہاں وہاں
پر تیری مسکراہٹ والا کوئی نہیں
ڈھونڈتی ہوں تجھے اکثر بے اختیار ہو کر
مگر تجھ سا دلرُبا کوئی نہیں
مانا کہ جانا تھا تمہیں وقتِ رخصت تھا
مگر جیسے بچھڑے ہو ایسے بچھڑتا کوئی نہیں
لوٹ آؤ کبھی تو گزرا وقت پلٹ آئے
گو کہ ایسا وعدہ تم نے کیا کوئی نہیں

مرسلہ: زرتاشیہ نعمان، ملتان

دھرمی کو شاکر میاں کسی حد تک حق بجانب بھی سمجھتے تھے۔ ماضی میں جو کچھ بھی اُن کے ساتھ ہوا اور شاکر میاں جس طرح جانے انجانے میں اس کے حصے دار رہے اس کی انہیں ہمیشہ ندامت رہی۔

یہ الگ بات کہ وہ جتنے بھی نادم ہوتے، عالیہ کے لیے وہ سب کچھ ایک ڈرامے سے زیادہ اوقات نہیں رکھتا تھا۔

انہوں نے ایک تھپڑ کے بعد کی ساری زندگی ہی عجیب کیفیت میں گزاری تھی۔ اگر یہ کہا جاتا تو غلط نہ ہوتا کہ وہ ایک اذیت جو انہوں نے اس وقت محسوس کی تھی۔ اس کے اثرات انہوں نے کبھی معدوم نہ ہونے دیے تھے۔ ایک ہنستی کھیلتی پُرسکون زندگی میں بے سکونی کا کوئی نہ کوئی کنکر آ کے گرتا ہی رہتا تھا۔ نہ وہ خود کچھ بھی بھولی تھیں اور نہ شاکر میاں کو بھولنے دینا چاہتی تھیں۔

ایسے حالات میں نسرین کی بیٹی کو بہو بنانا سب ہی کے نزدیک آسان ترین الفاظ میں ناممکن ہی تھا۔ لیکن ناممکن کو ممکن کرنے والی ایک ذات سب سے اوپر اور سب سے بالاتر بیٹھی ہے۔ جس کی مصلحتوں اور ان کی گہرائیوں سے ہم سب واقف نہیں لیکن جانتے اور مانتے ضرور ہیں......

ابھی ثمیر نے کھل کے دوبدو ماں سے اپنی اور ثانیہ کی بات بھی نہیں کی تھی کہ خبر آ گئی کہ نسرین پر فالج کا شدید حملہ ہوا ہے اور اس کی حالت بہت خراب ہے۔

☆☆☆

بستر مرگ پر پڑی نسرین کو دیکھ کے عالیہ کا دل پگھل، پگھل گیا۔ خدا جانے اس بے بس عورت کے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں، عجیب سی آواز میں یا کانپتے ہلنے کی کوشش کرتے جملوں میں ایسا کون سا سوز تھا کہ وہی عالیہ جو زندگی بھر اُن سے ایک ان دیکھی نفرت میں بندھی رہی تھیں۔ بے اختیار آنسو بہانے لگیں۔

گھر بلکہ گھر کہاں دو قدم کا قطعہ تھا جس کے کونے، کونے سے زبوں حالی برستی تھی۔

بے حد صفائی کے باوجود اِک ناگوار سی بُو، اور گھٹن کا احساس سانس لیتا تھا۔ دیواروں کو کبھی صاف کیا گیا ہوگا لیکن اب ان کا روغن اتنا باسی ہو چکا تھا کہ در و دیوار عجیب قحط کا شکار لگتے تھے۔

دو ہاتھ کے برآمدے کا فرش اکھڑا ہوا تھا۔ دروازوں میں زنگ تھا۔ اور سب سے بڑھ کر اکلوتا بستر جس پر ایک لاچار وجود شاید ہمیشہ کے لیے پناہ گزین تھا۔

نسرین نہ صاف بول سکتی تھی، نہ ایک ہاتھ ہلا سکتی تھی اس کا ایک طرف کا جسم بیکار تھا۔ پھر بھی اس نے دوسری طرف کا ہاتھ اٹھا کے بے جان ہاتھ سے جوڑنے کی ناکام کوشش کی تو عالیہ بے اختیار اس کا ہاتھ تھام کر رو پڑیں۔

اس سمے سے بہت پہلے آسمانوں پر ثمیر اور ثانیہ کا جوڑا لکھا جا چکا تھا۔

☆☆☆

عالیہ ناراض ہو کے اپنے میکے چلی گئی۔

شاکر کے ایک تھپڑ نے جیسے اسے اس کی اوقات یاد کروادی تھی۔ اسے زمین پر پٹخ دیا تھا۔ حالات تو ان کے درمیان پہلے ہی بہت اچھے نہیں تھے۔

افسر سلطانہ کی مسلسل تنقید اور نکتہ چینی کی وجہ سے وہ پہلے ہی شاکر سے ناراض اور اکھڑی، اکھڑی رہتی تھی۔ شاکر سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی الجھ جاتے تھے۔ یوں دونوں کے درمیان محبت وجود رکھتے ہوئے بھی معدوم سی ہونے لگی تھی۔ جس کا ذمے دار عالیہ لامحالہ افسر سلطانہ کو ٹھہراتی تھی لیکن ان کی شاکر کے لیے دوسری شادی کی بات، اس پر فضیحتہ اور آخر میں شاکر کے ردِعمل نے اس کا دل اجاڑ کے رکھ دیا۔ سسرال میں رہی سہی عزت بھی گئی اور سب کے سامنے جو تماشا لگا وہ الگ......

ماں کے گھر بھی بھائیوں نے بظاہر ہمدردی تو کی لیکن اندر ہی اندر بھابیاں بے چین سی ہونے لگیں۔

فقط دو دن بعد ہی شاکر کو بلانے اور بات چیت کرنے کی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ ماں باپ بھی کیا کر سکتے تھے۔ بھلے وہ جوان تھی، بچے نہیں تھے لیکن وہ یوں بیٹھے بٹھائے اس کا گھر تو نہیں اجاڑ سکتے تھے۔

ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ عالیہ کو خود شاکر سے دوری کھلنے لگی۔ پندرہ دن بعد تو اس کے لیے وہاں رہنا دوبھر ہو گیا۔

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس شخص کے لیے اس کے دل میں چند روز پہلے غصے اور نفرت کا ایک ابال اٹھ رہا تھا۔ وہ شخص اس کے لیے اور اس کی ذات کے لیے کتنا ضروری تھا۔ ماں کے گھر سے اس سے پہلے کبھی اتنی اجنبیت نہیں جھلکی تھی جیسی اب جھلکنے لگی تھی۔

وہ پورا، پورا دن کبھی لاؤنج میں بیٹھی رہتی، کبھی اٹھ کے کچن میں چلی جاتی۔ وہاں بھی اس کے پاس ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

بھابیوں نے اس کو بظاہر ہتھیلی کا چھالا بنا کے رکھنے کی پوری اداکاری کی تھی لیکن درحقیقت وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں کہ عالیہ خود کو وہاں مہمان ہی سمجھے۔ شاکر نے بھی جیسے اسے بالکل بُھلا دیا۔ جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں تھی۔

اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ عالیہ کو خود ہی شاکر کو فون کرنا پڑا کہ آ کے اسے لے جائے۔

☆☆☆

اس رات وہ عشا کی نماز پڑھ کے معمول سے بہت جلدی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ سونے بھی کہاں وہ تو رونے کے لیے ہی لیٹتی تھی۔

عصر کے وقت، خاندان کی کوئی خاتون ملنے آئی تھیں جو شاکر میاں کے محلے کی رہائشی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ افسر سلطانہ نے شاکر کی دوسری شادی کا پکا ارادہ کر لیا ہے اور بھی جانے کیا، کیا کہا۔

''اے بہن میں تو کہتی ہوں۔ خاندان کے دو چار بڑوں کو بیچ میں ڈالو اور اس کو واپس بھیجو...... ورنہ تمہارا داماد نکل جائے گا ہاتھ سے...... ماں کے آگے کب تک ٹکے گا۔ بیوی سامنے ہوگی تو کچھ تو خیال آئے گا ہی ناں... بچے ویسے ہی نہیں ہیں۔ یہ نہ ہو کہ یہ یہاں میاں کا انتظار کرتی رہے اور وہ دوسری لے آئے۔

سچ کہو جب سے عالیہ کا سنا ہے میرا تو دل قابو میں نہیں ہے......''

عالیہ کو لگتا تھا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ رو، رو کر گلا بیٹھ گیا۔ آنکھیں سوج گئیں۔ اسی تنہائی کے عالم میں کیسے اس نے نماز پڑھی اور رو، رو کے گڑگڑا کے اللہ سے اپنا گھر بچانے کی دعائیں کیں، اسے کچھ یاد نہ تھا۔ یاد تھا تو بس ایک ہرجائی کا چہرہ، جو اس کو اپنا بنا کے اب چھوڑنے کے درپے تھا اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

روتے، روتے جانے کب اس کی آنکھ کھلی تو رات تقریباً آدھی بیت چکی تھی۔ گھر والے سب سو چکے تھے۔ اس کو شدید بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ کچن میں جا کے پانی پیا۔ جب کھانے کے لیے، چولھے پر دھری دیگچی میں جھانکا تو پتا چلا کہ رات کو بننے والا سالن پورا ختم ہو چکا ہے۔ چنگیر میں صرف آدھی روٹی پڑی ہوئی تھی۔

پیٹ میں دوڑتے چوہے اور تنہائی کا احساس ایک بار پھر غالب آ گیا۔ اس نے دل پر پتھر رکھا اور اپنی زخمی انا کو سہلاتے ہوئے کس طرح شاکر کو کال ملائی یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔ اور یہ بھی کہ اس کی بھلائی شاکر کے ساتھ میں ہی تھی۔ ورنہ آج اپنے ہی ماں باپ کے گھر میں اسے اپنی اہمیت کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ اس رات جیسے عالیہ کے مستقبل کا فیصلہ تو ہو گیا...... لیکن مستقبل ایسا کہ جس میں سوائے اندھیرے کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اگر وہ بے اولاد ہی رہتی اور شاکر دوسری شادی کر لیتے اور ان کے بچے ہو جاتے تو...... تو کیا ہوتا......؟

بے انتہا مرے دل اور کپکپاتے ہاتھوں سے عالیہ نے فون اٹھا کے شاکر کا نمبر ملایا تھا۔

☆☆☆

اتنا آسان بھی نہیں تھا سب کچھ......

اول، اول تو شاکر بات سننے کو تیار نہ تھے۔ پھر کہا تو صرف اتنا کہ......

''بھائیوں کے ساتھ آ جاؤ۔ خود ہی گئی تھیں ناں... نہ میں نے بھیجا تھا نہ میں لینے آؤں گا......''

اپنی انا کو کچل کے۔ پتا نہیں کس آس پر وہ واپس

گئی۔ اور یہ واپسی کتنی کٹھن تھی۔ اس کا پہلے سے اندازہ ہونے کے باوجود نئے سرے سے تکلیف ہوئی۔ ساس نے اسے وہ، وہ طعنے دیے، خوب مضحکہ اڑایا...... اتنا ذلیل کیا کہ شاکر بھی شرمندہ ہو کے رہ گئے۔ اب تو وہ بیٹے کی موجودگی کا بھی لحاظ نہیں کرتی تھیں۔

عالیہ خون کے گھونٹ پی کے شکوہ کناں آنکھوں سے شاکر کی طرف دیکھتی لیکن شاکر ماں کے سامنے ایک لفظ منہ سے نہ نکالتے، ہاں اکیلے میں بیوی کی خوب دلجوئی میں کوئی کسر بھی نہیں چھوڑتے۔

افسر سلطانہ بات، بات پر بیٹے کو اکساتیں کہ اس کو واپس چھوڑ آؤ' یہ بے فیض عورت ہے۔ شاکر کے لیے بھی ماں کو برداشت کرنا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ تندیں آتیں تو ہمیشہ عالیہ کو ہی چپ کراتیں۔ یہ بھی ماں کو بڑھاوا دینے کا ہی ایک انداز تھا۔

بالآخر جب افسر سلطانہ نے شاکر کو ایک فیصلہ کُن ٹائم دے دیا تو بات گھر تک محدود نہ رہی۔ گھر سے باہر نکل گئی۔ عالیہ کے ماں باپ اور بھائی بھی افسر سلطانہ کی اس ظالمانہ روش سے تنگ آ چکے تھے۔ ساس کا دوٹوک انداز دیکھ کے عالیہ نے اپنے بھائیوں اور خاندان کے بزرگوں کو بالآخر بلا بھیجا۔

☆☆☆

ثمیر کی شادی بڑی سادگی سے انجام پائی۔ یہ خود ثمیر کی ہی خواہش تھی۔

عالیہ اس قدر بھی سادگی کے حق میں نہ تھیں کہ چار لوگ لے جا کے رخصتی کروالی جائے لیکن ایک تو نسرین کی حالت اور دوسری ان کی مالی حالت۔

ثمیر کی نئی نئی نوکری تھی۔ ایسے میں دونوں طرف کے تمام اخراجات خود کرنے کے چکر میں نہ، نہ کرتے بھی کافی بوجھ بڑھ گیا۔ پہلے اوپری حصے میں تعمیر...... ایک ہی کچا پکا کمرا تھا اس کی رینوویشن، ایک چھوٹا سا لاؤنج بھی...... حالانکہ عالیہ کے بقول یہ نری فضول خرچی تھی لیکن شدید گرمی کے دنوں میں ایک اکیلا کمرا تندور بن جاتا تھا۔ اس کی دیواروں کو ڈائریکٹ دھوپ سے بچانے کے لیے آگے بھی کچھ بنانا ضروری تھا۔ اس کے بعد فرنیچر کی باری، سستے سے سستا بھی ان کے لیے مہنگا تھا۔ زیور بھی خود ہی بنوایا اور بری کے ساتھ عام روزمرہ کے کپڑے بھی۔

خاندان والے ثانیہ کے جہیز کے نام پر مل ملا کے جو دینا چاہتے تھے۔ ثمیر نے وہ بھی لینے سے انکار کر دیا۔

''اگر ثانیہ لینا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن جو اس کا ہے وہ اسی کا رہے گا۔ میرا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ وہ جیسے چاہے استعمال کرے......''

عالیہ جز بز ہو کے رہ گئیں۔

''بے شک اس ہی کا ہے۔ لیکن اگر کوئی سہولت کی چیز تم لے لیتے تو استعمال بھی تم ہی کرتے ناں کون سا ہم نے چھین لینا تھا۔'' دبے، دبے الفاظ میں انہوں نے کہہ ہی ڈالا۔

''امی میں بعد میں کسی کا کوئی طعنہ یا کوئی بات نہیں سن سکتا۔ اگر کوئی نیکی کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو ٹھیک سے کما لینے دیں۔ جب وہ آ جائے گی تو جو دل کرے خریدے، میں نہیں روکوں گا۔ لیکن ثانیہ سے ہمدردی کی آڑ میں، میں خاندان والوں سے پیسے نہیں بٹور سکتا۔''

عالیہ اس دوٹوک بات پر ہکا بکا ہو گئیں۔ کچھ دیر کو اپنی تربیت پر رشک بھی آیا۔

''واہ میرا بیٹا...... شاباش ہے۔''

لیکن آگے چل کے آنے والی کے لیے جو رج کے خرچے ہوئے انہیں چکر سے آ گئے۔

ولیمے میں ان سب رشتے داروں کو بھی بلانا تھا جو اکلوتے بیٹے کی یوں خاموشی سے رخصتی کرنے پر منہ پھلائے بیٹھے تھے۔ دینا دلانا بھی اچھی طرح تھا کیونکہ وہ ایک یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے والی تھیں۔ کسی کو باتیں بنانے کا موقع نہ ملے اس لیے......

خیر شادی نمٹی خیر و عافیت کے ساتھ...... نسرین کو ان کی بہن کچھ دن کے لیے اپنے گھر لے گئیں۔ لیکن صرف کچھ دن کے لیے۔ عالیہ کو جھٹکا تب لگا جب ثمیر نے اپنے کمرے کے باہر والے لاؤنج میں ان کا بیڈ لا

کے ڈالا...... مجبوری تھی کہ ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ سوائے ایک بیٹی کے......

عالیہ دل میں سخت ناگوار گزرنے کے باوجود کہہ کچھ بھی نہیں سکتی تھیں کہ نسرین کو انہوں نے معاف تو کر دیا تھا لیکن شاید دل اب بھی صاف نہیں کر سکی تھیں۔

☆☆☆

زندگی روٹین پر واپس آ گئی ایک فرد کے اضافے کے ساتھ...... عالیہ کو یہ اضافہ کچھ ایسا بھایا نہیں تھا۔ لیکن بیٹے کی پسند تھی اور کوئی بری بھی نہیں تھی صورت میں نہ سیرت میں......

ثانیہ سے جس قدر ممکن ہوتا عالیہ کا ہاتھ بٹاتی۔ اوپر نسرین تو خیر بیڈ پر ہی تھیں۔ ان کو جب ضرورت پڑتی، سرہانے لگی بیل بجا دیتیں۔ ثانیہ ہر کام ادھورا چھوڑ کر اوپر لپک جاتی۔ عالیہ کو سخت برا لگتا...... سب کچھ جانتے بوجھتے بھی وہ یہ انداز ہضم نہیں کر پا رہی تھیں۔

شروع، شروع کے شادی کے دن بھی ثمیر اور ثانیہ بہت کم ہی کہیں گھومنے باہر نکلے۔ جب بھی گئے۔ ماہین کی ڈیوٹی لگا کے......

بھائی بھابی کی واپسی تک اسے اوپر بیٹھنا ہوتا یا پھر وہی بیل کی آواز پر بھاگنا پڑتا۔ ماہین کبھی اپنا اسکول کا کام لے کے اوپر چلی جاتی اور وہیں بیٹھ کے کر لیتی۔ اسے بظاہر اس ڈیوٹی کو نبھانے میں کوئی عار نہ تھا لیکن عالیہ کے لیے یہ قطعی نامنظور تھا۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ وہ لوگ کہیں جانے لگے تو عالیہ نے ماہین کو جان بوجھ کے کسی اور کام میں مصروف کر دیا۔ نتیجتاً دونوں نے اپنے جانے کا ارادہ کینسل کر دیا۔

خاندان والوں کی طرف سے دعوتیں بھی وہی قبول کی گئیں جس میں صرف ان دونوں میاں بیوی کو بلایا گیا کیونکہ ایک وقت میں سب لوگ نسرین کو اکیلا چھوڑ کے نہیں جا سکتے تھے۔

عالیہ کو یہ سب کچھ بہت برا لگنے لگا۔ ان کے اندر غبار جمع ہونے لگا۔ یوں لگتا گھر میں ان سے زیادہ نسرین کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ ان کی اپنی ذات کہیں پس منظر میں جا رہی ہے۔

ثمیر آفس سے آتا تو وہ اس وقت تک اسے پاس بٹھا کے رکھتیں جب تک ثانیہ خود نیچے نہ آ جاتی کیونکہ فارغ وقت وہ اوپر ماں کے پاس ہی گزارتی تھی۔

عالیہ کو یہ بھی پسند نہیں تھا کہ اگر ثانیہ کھانا پکا دیتی ہے تو دسترخوان لگانے کی ذمے داری ماہین پر چھوڑ کے اوپر کیوں چلی جاتی ہے۔ وہ اس چکر میں ماہین کو آرام پسند بنا رہی تھیں یہ انہیں منظور تھا اور ثانیہ کیسی گھن چکر بن رہی تھی اس کا کوئی احساس نہ تھا۔

ثمیر پر کچھ قرضہ چڑھ چکا تھا۔ اسے چکانے کے لیے اور کچھ مزید اخراجات میں اضافے کی وجہ سے اسے دوسری پارٹ ٹائم نوکری ڈھونڈنی پڑی۔

عالیہ کے دل پر چھریاں چل گئیں۔

”تم ماں بیٹی نے آتے ساتھ ہی کمائی کا گدھا بنا لیا میرے بیٹے کو ورنہ پہلے تو اتنے خرچے نہیں تھے۔ آرام سے گزارہ ہو رہا تھا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دن انہوں نے دبی آواز میں ثانیہ کو جتا ہی دیا۔ اور پھر اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار دیکھنے کے لیے رکی بھی نہیں۔

☆☆☆

وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ عالیہ کی بھی وہی خو ہو گئی جو افسر سلطانہ کی تھی۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کب اور کیسے وہ ثانیہ کے لیے ایک سخت گیر الجھن پسند ساس بنتی چلی گئیں۔

ان کو اپنے لیے کام پھیلا کے رکھنے کا شوق تھا لیکن ثانیہ اس سب کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ زندگی بھر جس ماں نے اسے پالا پوسا پڑھایا لکھایا۔ اب جب وہ بستر پر پڑی تھی تو وہ اس کی اس طرح خدمت نہیں کر پا رہی تھی جس طرح وہ چاہتی تھی۔

ثمیر ڈبل نوکری کرنے کے بعد گھریلو تلخیوں کا بار نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن عالیہ آئے دن کوئی نہ کوئی بات نکال کے رکھتیں۔

وہی ہوا جس کا عالیہ کو کوئی ڈر خوف نہ تھا۔

ثمیر اور ثانیہ کے درمیان تلخیاں بڑھنے لگیں۔

کبھی، کبھی ایسا بھی ہونے لگا کہ وہ بنا ناشتے کے ہی آفس چلا گیا۔ کبھی آ کے کھانا نہیں کھایا۔

وہ تو ماں تھیں ناں... میاں بیوی میں چاہے جو بھی کھٹ پٹ ہو۔ اس سب میں وہ اپنے بیٹے کو خوار تو نہیں کر سکتی تھیں۔ حالانکہ بیٹا خوار ہو رہا تھا لیکن ان کو احساس تھا بھی تو پروا نہیں کرتی تھیں۔

ان ہی دنوں ثانیہ امید سے ہو گئی۔ گھر کی تناؤ زدہ فضا میں کچھ دن خوشگواریت سے گزر گئے۔

"شکر ہے اللہ نے ساتھ خیریت کے یہ دن دکھائے۔ ورنہ میں تو ناامید ہی ہو گئی تھی۔ ثانیہ کی عمر کی وجہ سے۔" دبے، دبے الفاظ میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ شاکر میاں کے سامنے اظہار کر گئیں۔ جواب میں شاکر میاں نے انہیں جن تاسف زدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ انہیں شرمندہ کرنے کے لیے کافی نہیں تھیں۔

☆☆☆

آئے دن کے جھگڑوں اور تلخیوں کی وجہ سے شاکر کے دماغ کا دھارا الٹی سمت بہنے لگا تھا۔ اب انہیں بیوی مظلوم اور ماں ظالم دکھائی دیتی تھی۔ کچھ یہ بھی تھا کہ دوسری شادی کے لیے وہ کبھی دل سے راضی نہیں تھے اور نسرین سے تو تب بھی نہیں جب وہ خود کنوارے تھے لیکن اب نسرین کی خاموشی اور چشم پوشی ان کی رضامندی کا اظہار تھی۔ اس نے خوشیوں کے دن دیکھے بھی بہت کم تھے۔

سال بھر کی بھی نہیں تھی بچی جب ایک حادثے میں شوہر کو کھو دیا تھا۔ اگر قدرت اسے گھر بسانے کا ایک موقع اور دے رہی تھی تو وہ خود سے کیوں انکار کرتی۔ یہی بات عالیہ کو نسرین سے نفرت دلا رہی تھی جو کہ ایک فطری بات تھی۔

خاندان کے بزرگ جن میں ایک طرف عالیہ کے ماموں اور افسر سلطانہ کے بڑے بھائی اور بھابی بھی شامل تھے جب آمنے سامنے مل کے بیٹھے تو خوب لعن طعن ہوئی۔ عالیہ کے بھائیوں نے جس حد تک ممکن تھا افسر سلطانہ اور عالیہ کے شوہر کی کوتاہیاں گنوائیں۔

ان کی تلخ کلامی اور سخت طبیعت کے سبھی گواہ تھے۔

آخر جب بات یہ رخ اختیار کر گئی کہ افسر سلطانہ سب کی باتوں کے جواب دیتے، دیتے ہارنے لگیں تو شاکر جو شروع سے آخر تک خاموش بیٹھے تھے۔ ایک دم بول پڑے۔

"بس اب آپ لوگ ختم کر دیں سب باتیں...... اور عالیہ سے پوچھیں کہ وہ کیا چاہتی ہے؟"

سب کی نظریں بے اختیار عالیہ کی طرف اٹھ گئیں۔

"میں چاہتی ہوں کوئی میرے شوہر سے دوسری شادی کی بات نہ کرے......" بلا کسی تامل کے اس نے رکے بغیر مدعا بیان کر دیا۔

"کوئی نہیں کر رہا یہ بات۔ تم یہ بتاؤ...... تمہیں شاکر سے کوئی شکایت ہے تو کہو۔" افسر سلطانہ کی بھاوج بڑے سبھاؤ سے بولیں۔

"مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہم بڑے سکون اور خوشی سے رہ سکتے ہیں اگر یہ درمیان میں نہ آئیں۔ سارا جھگڑا انہوں نے کھڑا کیا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔" اس نے خود پر ضبط کرتے ہوئے ساس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دوبارہ بھڑک کے کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن اس کے بھائی نے اسے روک دیا۔

"تم بتاؤ شاکر، تمہیں کوئی شکایت ہے عالیہ سے......؟"

کمرے میں چند منٹ خاموشی رہی۔ عالیہ دم سادھے بیٹھی تھی۔ اسے پتا تھا اب شاکر اپنی ماں کی بد زبانی اور بد مزاجی کا بھرم کھولیں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ لیکن......

"جی مجھے عالیہ سے کچھ شکایتیں ہیں......"

شاکر کی آواز خاموشی میں گونجی اور عالیہ کے اوپر سے منوں وزنی ٹرک گزر گیا۔

"اس کے اندر برداشت نہیں ہے بالکل...... ذرا سی بھی امی کی کوئی بات یہ برداشت نہیں کرتی۔ حالانکہ اگر یہ موقع پر چپ کر جاتی تو اس سب کی نوبت ہی نہ آئے۔"

عالیہ منہ کھولے شوہر کو دیکھتی رہ گئی۔

شاکر نے ماں کی فرمانبرداری میں سب کے سامنے اسے جھوٹا بنا دیا تھا۔ گویا اپنے اس رویے کی

ذمّے دار وہ خود ہی تھی اور باقی سب معصوم تھے۔

''میں نے عالیہ کو پہلے بھی منع کیا تھا سمجھایا بھی تھا کہ امی بڑی ہیں اگر کچھ کہہ بھی دیں تو بڑا سمجھ کے سن لیا کرو لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اب بھی آپ سب کو بلانے سے پہلے بھی میں نے روکا تھا۔ لیکن اس نے میری بات نہیں سنی......''

شاکر بول رہے تھے اور الفاظ کے بھاری بھرکم ملبے تلے عالیہ کا وجود دبتا چلا جارہا تھا۔

اب سب کی ملامت آمیز نظریں اس پر جمی تھیں۔ وہ اپنے دفاع میں ایک بھی لفظ نہیں بول سکتی تھی کیونکہ ظاہر ہے بڑوں سے زبان چلانے کی حمایت کوئی بھی نہیں کرسکتا تھا۔

شاکر نے اسے وہاں لا کے مارا تھا۔ جہاں پانی بھی نہ ملے...... اس کو ابھی تک صرف شاکر کے اس تھپڑ کا دکھ تھا جو اس کو بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ آج اندازہ ہوا تھا کہ جو تھپڑ ہاتھ اٹھا کے نہیں مارے جاتے وہ کتنے دردناک ہوتے ہیں۔

ذرا دیر پہلے دبتی ہوئی افسر سلطانہ اب خوب چوڑی ہو کے بیٹھ گئی تھیں۔

''میں نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ میں دوسری شادی کبھی نہیں کروں گا لیکن اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ میں اس کو اب بھی یقین دلانے کو تیار ہوں کہ......''

کمرے کے دروازے کی چوکھٹ سے لگی کھڑی نسرین جانے کب وہاں سے ہٹ کے اوپر چلی گئیں کسی نے نہیں دیکھا۔ شاکر کی بات ابھی جاری تھی کہ عالیہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

شاکر بولتے ہوئے رک کے اسے دیکھنے لگے۔

عالیہ نے ایک زخمی نگاہ شاکر کے وجود پر ڈالی۔ یہ شخص، یہ بندہ ان کی زندگی اس کی دنیا، اس کا حال، مستقبل سب کچھ تھا اور یہ بندہ اس کا اپنا کتنا تھا۔ یہ اندازہ ابھی ابھی ہوا تھا۔ اس ایک نگاہ میں دنیا جہان کا درد تھا۔ جسے صرف اس کا دل ہی محسوس کرسکتا تھا۔

عالیہ نے دھیرے، دھیرے اثبات میں سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

''آج میں نے آپ کو ٹھیک سے پہچان لیا شاکر!...... بھری محفل میں میرا مان توڑنے والے...... آپ اور آپ کا ساتھ آزمالیا میں نے...... دیکھ لیا آپ کو......'' اس کے چہرے پر سرخی اور ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں میں وہ اذیت رقم تھی کہ شاکر اس کی تاب نہ لا سکے۔ وہ بے اختیار نظریں چرا گئے۔

''مجھے کسی یقین دہانی کی ضرورت نہیں۔ آپ جو مرضی کریں۔ مجھے نہ کوئی اختیار ہے نہ میری کوئی مرضی...... آپ دوسری شادی کریں یا نہ کریں...... مجھے اب آپ سے کوئی امید نہیں......'' گہری سانس بھر کے اس نے بات مکمل کی اور بے اختیار سسک پڑی پھر اسی طرح روتے ہوئے، نڈھال قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی...... اسے لگا کہ وہ زندگی کی ہر بازی ہار گئی۔ وہ اپنی زندگی ہار گئی تھی۔

☆☆☆

سردیوں کا موسم آیا تو ثمیر نے ان کے آگے ایک تجویز رکھی۔

''میں چاہ رہا ہوں۔ اوپر کچن کا تھوڑا اسیٹ اپ ہو جائے۔ سردی میں رات کو ثانیہ کو نیچے نہ آنا پڑا کرے۔ وہ اوپر ہی چائے وغیرہ بنالیا کرے۔'' اس نے بے حد دھیرے سے بات شروع کی تھی۔ لیکن عالیہ کا میٹر کسی اور بات پر گھوما ہوا تھا۔

''کیوں' اسے کون سا دس منزل نیچے آنا پڑتا ہے۔ دو چار قدم پھلانگ کے اتر نہیں سکتیں محترمہ۔''

''امی...... آپ کو پتا ہے وہ ماں بننے والی ہے۔ اب اس سے پہلے کی طرح مشقت نہیں ہوتی۔ میں چاہ رہا تھا۔ کھانا بے شک نیچے ہی بنتا رہے۔ لیکن چائے وغیرہ کے لیے......''

''ارے رہنے دو تم یہ چونچلے اور بہانے بازیاں۔ سب ڈرامے دیکھے ہیں میں نے۔ اسی طرح الگ ہوتے ہیں باورچی خانے اور پھر گھر...... رہنا ہے

تو اسی طرح رہے سب گھر والوں کے ساتھ مل جل کر..... اس لیے بیاہ کے لائے ہیں ہم اسے کہ آتے ہی تمہیں ہم سے الگ کر کے بیٹھ جائے۔"

"امی آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کس طرح کی باتیں کرنے لگی ہیں۔" وہ چڑا ہوا سا لگنے لگا۔

"تم اپنے آپ کو دیکھو۔ جب دیکھو اسی کی طرفداریاں..... اسی کے آرام کا خیال..... ایسا بھی کیا جادو کیا ہے اس نے تم پر کہ تم کو ماں میں ہی کیڑے دکھنے لگے ہیں....."

عالیہ نے ثمیر کو کچھ کہنے کے لائق نہیں چھوڑا۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ بعد میں ہمیشہ کی طرح شاکر نے اس سے معافیاں مانگیں۔ اسے منانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ عالیہ کے لبوں پر چپ اور آنکھوں میں نمی کی ایک قابلِ دید تہ جم گئی۔

وہ شاکر سے اجنبیوں کا سا سلوک کرتی۔ کھانا بھی برائے نام کھاتی۔ اسے لگتا کہ اس کے اندر آتش فشاں پکتا ہے۔ شاکر نے زیادہ چھیڑ چھاڑ کی تو پھٹ ہی نہ پڑے۔

جو طوفان اس کے اندر دبا تھا اس کے شور سے وہ خود بھی خوفزدہ سی ہو گئی تھی۔ جی کرتا تھا ساری دنیا کو آگ لگا دے۔ سب کچھ تہس نہس کر دے یا خودکشی کر لے۔ شاکر نے سب کے درمیان بیٹھ کے ان سے شکایتوں کا جو رونا رویا تھا وہ لاکھ جھوٹا سہی لیکن اس پر زندگی مزید تنگ کر گیا تھا۔ وہ دل میں عہد باندھ بیٹھی تھی کہ اب زندگی بھر شاکر سے نہ پہلے کی طرح بات کرے گی نہ ان کی اس طرح عزت کر پائے گی۔ رہی محبت تو، وہ تو ساتھ رکھنے سے جانوروں سے بھی ہو جاتی ہے۔

شاکر کے سامنے وہ ایک جیتی جاگتی عورت سے روبوٹ بن چکی تھی۔ شاکر ہمیشہ کی طرح اس کی دل جوئی کی کوشش کرتے تو وہ منہ پھیر لیتی..... صرف ایک بار اس کے حد درجے اصرار پر صرف اتنا کہا۔

"آپ نے اچھا نہیں کیا..... اکیلے میں آپ چاہے جتنی بھی محبت جتائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے اور جھوٹ پر رویا جا سکتا ہے، ہنس کے جھوٹ کے سہارے زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔"

"میں مجبور تھا عالی.....! اگر میں ماں باپ کا لحاظ نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔"

"میری زندگی بھر کی ریاضت ایک کاغذ کے ٹکڑے سے جڑی تھی۔ آپ نے ان کا لحاظ کیا اور میرا مان اور بھرم توڑ کے مجھے رسوا کر دیا..... اب میں بالکل خالی ہاتھ اور خالی دل ہو گئی ہوں۔ مجھ سے کوئی امید مت رکھیں۔ کاش میرے پاس اولاد ہوتی تو یہ نوبت ہی نہیں آتی..... میں تو بچوں کا واسطہ دے کے آپ کو مجبور بھی نہیں کر سکتی۔" عالیہ نے شاکر کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ان کے ہر دعوے کو جھٹلا دیا۔ ان کی محبت کے مظاہرے کو جھوٹ اور ڈراما کہہ کے ٹھکرا دیا۔ اور اس کا بے اولادی کا شکوہ قدرت کا دل پسیج گیا۔

رب تعالیٰ کو اس کی خالی کوکھ پر رحم آ گیا۔ اور اس کی بے روح زندگی میں دوبارہ سے خوشی کی نوید جاگ گئی۔

اللہ تعالیٰ نے پانچ سال کے طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد عالیہ کو ثمیر جیسا پیارا بیٹا عطا کیا۔

ماں بننے کی نوید سن کے جہاں افسر سلطانہ کی ضد ختم ہو گئی۔ وہیں اگر نسرین کے دل میں کوئی خیال تھا تو وہ بھی جاتا رہا۔

افسر سلطانہ کو وارث ملا تو ان کے رویے میں کچھ بہتری بھی آ گئی لیکن عالیہ کو اب کسی سے کسی قسم کی کوئی امید تھی نہ خواہش.....

اب اس کی مرضی کے دن شروع ہوئے تھے تو وہ من مانی کیوں نہ کرتی..... رفتہ رفتہ شاکر کو احساس دلا کے اس نے پہلے کچن اور بعد میں گھر الگ کر لیا۔ سسرال سے دور نئی رہائشی کالونی میں سستے داموں۔

اب اس کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ ساس سسر کے پاس کون رہے گا۔ ان کی خدمت کون کرے گا۔ شاکر سالوں بعد باپ بننے کی خوشی میں اس کا بہت خیال کرنے لگے

تھے اس لیے اس نے فوراً تجویز دی کہ اب بڑے بیٹے کو بھی والدین کی خدمت کا موقع ملنا چاہیے۔

جب ذاکر نے یہ حالات دیکھے کہ اب شاکر کسی صورت اس گھر میں رہنے کو تیار نہیں تو بالآخر اپنا تبادلہ واپس اسی شہر میں کروایا۔ بڑی بھابی کا منہ تو بہت بنا لیکن مجبوری تھی۔ انہوں نے بہت عرصے تک تنہا گھر کی مالکن بن کے مزے لوٹے تھے۔ اب یہ مزے عالیہ کے حصے میں آنے والے تھے تو وہ موقع کیوں گنواتی۔

سسرال سے دور جانے کی ایک بڑی وجہ نسرین کا وجود بھی تھا۔ جس سے اس کو اوپیں میں خار چڑھتی تھی۔ اس کو کیا پتا تھا مستقبل میں نہ صرف نسرین بلکہ اس کی بیٹی سے بھی مستقلاً اس کا پالا پڑ جائے گا۔

گھر الگ ہونے کے بعد عالیہ نے سسرال والوں کے ساتھ اپنا رویہ بالکل روکھا اور خشک کرلیا۔ شاکر تو شوہر تھے۔ ان سے بھلا کب تک ناراضی دکھائی جاسکتی تھی اور بچے کے ہونے کے بعد تو گزری ہوئی باتیں بھلا دینے میں ہی عافیت تھی لیکن عرصہ دراز گزر جانے کے باوجود عالیہ کے دل سے اس دن کی ذلت نکالے نہیں نکلتی تھی۔

وہ ہر کچھ عرصے کے بعد جب بھی شاکر میاں کی طرف سے کسی شکایت کا سامنا کرتی تو ان کو یاد دلانا نہیں بھولتی تھی کہ کیسے انہوں نے اپنی ماں کا پلڑا ابھاری کرنے کے لیے عالیہ کو سب کے سامنے جھٹلایا تھا۔

اب تو یہ بات اتنی پرانی ہو چکی تھی کہ شاید شاکر میاں کے دل سے وہ احساسِ ندامت بھی مٹ چکا تھا جو طویل مدت تک عالیہ کی باتوں کی وجہ سے ہر بار جاگ اٹھتا تھا اور وہ ہر بار ہی عالیہ کو اس امید پر نئے سرے سے صفائیاں دیتے کہ شاید وہ اس واقعے کو بھول جائے گی لیکن عالیہ بھلا نہیں سکی۔ وہ بھولنا چاہتی بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

عالیہ کا ماتھا ٹھنک گیا۔ افسر سلطانہ مع بیٹی، داماد ان کے گھر پہنچ گئی تھیں۔ الگ ہونے کے بعد سے انہوں نے سسرال والوں کو کبھی اتنی گھاس نہیں ڈالی تھی کہ وہ یوں اچانک پہنچ جاتے۔

ننھیال والوں کی آمد پر ثانیہ بے طرح خوش تھی۔ خوب دل لگا کے سب کے لیے میٹھا اور پلاؤ بنایا۔ نسرین کے پاس لڑکیوں کو بھیج دیا ماہین کے ساتھ کیونکہ اب اوپر ٹی وی بھی لگ چکا تھا۔ کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔

اس کا خوش ہونا بنتا بھی تھا۔ افسر سلطانہ اس کی نانی ہی تو تھیں اور بچپن ان ہی کے گھر میں گزرا تھا۔ سب سے ایک فطری سی محبت تھی۔

وہ بھاگ، بھاگ کے کام کر رہی تھی۔ اپنی حالت کی اور اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس کی یہ پھرتیاں ابھی کچھ ہی دیر میں کیا گل کھلانے والی ہیں۔

''تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ لڑکی!...... جب سے ہم آئے ہیں تم ہی کام میں لگی ہوئی ہو۔ ایسا لگتا ہے تمہاری ساس نے بالکل ہی پلنگ پکڑ لیا ہے۔'' کھانے کے بعد جب وہ سب کو قہوہ پیش کررہی تھی تو افسر سلطانہ بالآخر رہ نہیں سکیں اور بات کی بھی تو عادت کے عین مطابق......

عالیہ جو پہلے ہی بہو کی تیزیاں دیکھ، دیکھ کے جز بز ہو رہی تھیں۔ ایک دم جل بھن گئیں۔

''نصیب والی ہیں آپ جو اتنا ٹائم دے دیا آپ کو...... ورنہ ہم تو شکل دیکھنے کو بھی ترس جاتے ہیں۔ جو ایک پلنگ پر پڑی ہیں ان کی مصروفیت کے لیے وہی کافی ہیں۔'' ساس سے دب کر رہنے والی عالیہ نے دبنا تو کبھی کا چھوڑ دیا تھا۔ اب تو وہ خود ماشاءاللہ سے ساس تھیں تو اب کاہے کی شرم یا ڈر......

کمرے میں اِک دم سے خاموشی چھا گئی۔ ثانیہ کی رنگت فق ہوگئی۔ یوں جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

''لگ تو نہیں رہا...... جب سے ہم آئے ہیں بچی ہی کام میں لگی ہوئی ہے۔''

''تو آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ آپ کو تو بہویں کام کرتی ہوئی اچھی لگتی تھیں۔ پھر بھی اس گھر سے زیادہ آرام سے ہے یہاں......'' عالیہ کی آواز و انداز سے ناگواری جھلکنے لگی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ ماحول میں بدمزگی پھیلنے ہی والی ہے۔

"وہ تو میں دیکھ ہی رہی ہوں کتنے آرام سے ہے۔ جب سے ہم آئے ہیں......"

"ارے جب سے ہم آئے ہیں، جب سے ہم آئے ہیں...... کتنے دن ہو گئے آپ کو یہاں آئے ہوئے۔ دو گھنٹوں میں کون سے پہاڑ توڑ لیے اس نے جو اتنی ہمدردی ہونے لگی آپ کو......اور کس نے سنا دیں اس پر ظلم کی کہانیاں جو آپ آتے ہی برسنے لگیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ثانیہ نے خود ہی کہہ سن کے بلایا ہو۔"

عالیہ ایک دم ہی تیز ہو گئیں۔ انہوں نے ثانیہ کو گھورا۔ سب کی نظریں ثانیہ پر جم گئیں۔ بڑی بھابی کی بچیوں اور ماہین کے علاوہ سب ہی موجود تھے۔

"مم...... میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا امی...... آپ میرا یقین کریں......" ثانیہ بری طرح گھبرا گئی۔ اس کے حلق سے آواز بھی بمشکل نکلی تھی۔

"لو...... اس کی تو آواز ہی نہیں نکل رہی...... میں پوچھتی ہوں عالیہ...... یتیم بچی سے ایسا سلوک کرتے ہوئے تمہیں ذرا بھی افسوس نہ ہوا۔"

یہ براہ راست وار سب کے لیے اچانک اور...... ناقابلِ یقین تھا۔ عالیہ کے ساتھ، ساتھ باقی سب بھی حیران تھے کہ آج افسر سلطانہ کو ہو کیا گیا ہے۔ البتہ ان کی بیٹی اور داماد کچھ پُرسکون سے تھے۔ جیسے ان کو اندازہ تھا کہ وہ کیا بات کرنے کے لیے آئی ہیں۔

"ارے ایسا بھی کون سا ظلم کر دیا میں نے جو آپ میرے گھر پر کچہری لگا کے بیٹھ گئیں۔ کون سی لڑکی ہے جو سسرال میں کام نہیں کرتی اور آپ سے کس نے کہہ دیا کہ یہاں اس پر کوئی ظلم ہو رہا ہے۔ ذرا ہاتھ پیر ہلا کے یہ خود کو مظلوم کیوں سمجھ رہی ہے۔ اس کو احسان مند ہونا چاہیے میرا کہ اپنا اکلوتا اور جوان بیٹا میں نے اس سے بیاہ دیا۔ اور کیا کروں میں......کیا......؟"

عالیہ باقاعدہ تنک گئیں۔ ان کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ ساس صاحبہ ثانیہ سے کچھ کہہ سن کر ہی یہاں تک آئی ہیں۔ ان کی اچانک آمد...... بے مقصد نہیں تھی......ابھی وہ اور کتنا ہی سنا ڈالتیں لیکن کمرا جو اچانک ہی اکھاڑا بن گیا تھا۔ خاموش سا ہو گیا۔ عالیہ کی بات بھی ادھوری رہ گئی۔

"خاموش ہو جائیں سب لوگ۔" ثمیر کی آواز اونچی نہیں تھی۔ لیکن مضبوط اور واضح ضرور تھی۔

"دادی......آپ سے کس نے کہا کہ ثانیہ کے ساتھ یہاں کوئی زیادتی ہوئی ہے۔ اگر ثانیہ نے ایسا کہا ہے تو یہ بہت غلط بات ہے۔ ثانیہ تم نے دادی کو ایسا کچھ کہا ہے کیا؟"

ثانیہ کا سر جھک گیا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ یہ اسی کی کارستانی ہے۔

عالیہ کو تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ انہیں اس سے اس چالاکی کی امید نہیں تھی۔

"اس سے کیا پوچھ رہے ہو۔ اگر تم سننے والے ہوتے تو ہمیں یہاں بلانے کی نوبت ہی کیوں آتی۔ کیا تم نے کبھی جاننے کی کوشش کی کہ وہ گھر میں کس طرح رہ رہی ہے۔ کوئی مشکل تو نہیں اور سب سے بڑھ کے تمہاری ماں کا رویہ کیسا ہے اس کے ساتھ......" افسر سلطانہ بڑے جلال سے بولی تھیں۔ ساتھ ہی انہوں نے ایسی کاٹ دار نظریں عالیہ پر ڈالیں کہ وہ بری طرح گڑبڑا کے رہ گئیں۔ ان کی سہمی ہوئی نگاہیں ثمیر کی طرف اٹھ گئیں۔ جو خود ملامتی انداز میں ان ہی کو دیکھ رہا تھا۔ عالیہ کے دل میں ہول اٹھنے لگے۔ شاکر ہمیشہ کی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ لیکن ان کے چہرے کے تاثرات بھی ایسے تھے۔ جیسے انہیں اپنی ماں کی بات کا بھروسا ہو اور وہ ان ہی کی تائید کر رہے ہوں۔ لمحے بھر میں عالیہ کو اپنا آپ تنہا سا لگنے لگا۔

ثمیر نے گلا کھنکھارا۔

"مجھے بہت افسوس ہے کہ ثانیہ نے گھر کے معاملے میں...... میرے اور اپنے معاملے میں کسی تیسرے کو ڈالنے کی غلطی کی...... اگر ایسا ہی ہے تو پھر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ثانیہ کا گھر والوں کے ساتھ کیا رویہ اور کیا کردار ہے۔ میں زیادہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا......لیکن ثانیہ کے اس عمل نے مجھے بہت شرمندہ کیا

شہر لاہور میں ایک باوقار تقریب منعقد ہوئی جس میں شاعرہ، مصنفہ اور سماجی کارکن ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ کی نئی کتاب بالِ ہما کی رونمائی ہوئی۔ کتاب پر شعر و ادب کی نامور شخصیات نے اظہار رائے بھی کیا۔ جس میں ڈاکٹر جاوید اقبال، اعتبار ساجد، گل نوخیز اختر، اسد خان اور زبیر انصاری شامل تھے۔ ادارہ جاسوسی پبلی کیشنز کی روح رواں محترمہ عذرا رسول کے تاثرات بھی کتاب میں شامل ہیں۔ معروف ڈراما نگار خلیل الرحمٰن قمر نے بک ایوارڈ سے انہیں نوازا...... (بہت مبارک ہو سعدیہ)

ہے۔ غلط فہمیاں اور تلخیاں کس گھر میں نہیں ہوتیں۔ میں نے کبھی ان باتوں کو اس حد تک نہیں بڑھنے دیا کہ نوبت یہ آئے کہ باہر سے لوگ آکے ہمارے مسئلے حل کریں۔ اگر ثانیہ کو مجھ سے کوئی شکایت تھی تو اسے مجھ ہی سے کہنا چاہیے تھا۔ کسی اور سے نہیں......"

وہ بے ربط سا بول رہا تھا۔

"لیکن...... لیکن میں نے آپ کے بارے میں تو کوئی بات نہیں کی...... بس...... امی...... امی کا رویہ بہت تکلیف دہ ہے۔ آپ تو جانتے ہیں۔ میں...... میں کیسے......" وہ بات ادھوری چھوڑ کے سسکنے لگی۔

"تم نے میرے بارے میں بات نہیں کی کیونکہ تمہیں مجھ سے کوئی تکلیف نہیں۔ تو پھر تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے تھا کہ تمہارا رشتہ بھی سب سے پہلے میرے ساتھ ہے باقی سب کے ساتھ بعد میں۔ مجھے خود بھی ثانیہ سے شکایتیں ہیں لیکن میں ان کا اشتہار لگانا پسند نہیں کرتا۔ یہ ثانیہ کا اپنا عمل ہے۔ بہتر ہوگا کہ وہ اس پر نظرِ ثانی کرے۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت اچھا بلکہ بہت سوں سے بہتر ہے۔ اگر ثانیہ خود کو یہاں ٹھیک محسوس نہیں کرتی...... تو وہ کوئی بھی فیصلہ کرے۔ اس پر کوئی دباؤ نہیں......" ثمیر نے گویا ہر بات ہی ختم کردی۔

عالیہ منہ کھولے، اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ کس لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ ثانیہ کی

طرف دیکھ تک نہیں رہا تھا۔

کیا یہ وہی برسوں پرانا منظر نہیں تھا۔ جس کا زخم آج تک ان کے دل میں آنچ دیتا تھا۔ کیا ثمیر بالکل، شاکر میاں کے انداز میں نہیں کھڑا تھا۔ کیا ثمیر بالکل اپنے باپ کی طرح بھری محفل میں اپنے ماں باپ کا لحاظ نہیں کر رہا تھا۔

گھر کا ہر فرد جانتا تھا کہ زیادتی ہمیشہ، عالیہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ ثانیہ ماں بننے والی تھی اور انہوں نے اس کے جسمانی تو کیا ذہنی آرام کا بھی کچھ خیال نہیں کیا تھا۔ وہ روز ثمیر سے ثانیہ کی شکایتیں لگاتی تھیں۔

آج اگر ان کا بیٹا اپنی بیوی کے بجائے سب کے ساتھ مل کے ان سے جواب طلبی کرتا تو کیا باقی بچتا ان کے پاس۔

ایک عورت سامنے بیٹھی تھی۔ روتی ہوئی بے یقین آنکھوں سے اپنے ہم سفر کو تکتے ہوئے۔ جس نے کتنی بڑی بے وفائی کی بات کی تھی۔ اپنی ماں کا بھرم بچانے کے لیے گھر تک توڑنے کا کہہ دیا تھا۔ کیا اس کے اپنے دل پر آرے نہیں چلے ہوں گے۔ وہ اندر ہی اندر کس طوفان سے لڑ رہا تھا۔ عالیہ اب جا کے سمجھی تھیں۔

اب...... اب...... دہائیوں کے بعد...... شاکر میاں کیوں مجبور تھے۔ انہوں نے کیوں، عالیہ کی طرفداری نہیں کی تھی۔ سب کے بیچ میں اپنی وفا کو گروی رکھ کے والدین کی عزت بچائی تھی...... کیوں، کیسے......؟ ان کی آنکھوں سے پردے ہٹتے جا رہے تھے اور دھند بھرتی جا رہی تھی۔

کمرے میں سب ثمیر کی بات سن کے ہکا بکا رہ گئے تھے۔

لمحوں کا کھیل تھا سارا...... اور انہیں پوری زندگی کا سبق دے گیا تھا۔

ثانیہ میں ان کو اپنی جھلک دکھائی دی۔ وہ بالکل اسی طرح ہارے ہوئے انداز میں اٹھی جیسے برسوں پہلے وہ اٹھی تھیں۔ اپنوں کی عدالت میں سے ایک پرائے مجرم کی طرح......

ثانیہ نے بھی آج اپنا سب کچھ ہار دیا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے...... وہ بالکل ان ہی کی طرح رو رہی تھی۔ اسی طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

کچھ فرق نہیں تھا اس منظر میں سوائے اس ایک بات کے کہ وہ ماں بننے والی تھی۔

ایک خیال گولی کی طرح ان کے دماغ میں جا کے لگا۔

''ثانیہ رکو......''

وہ ایک دم پکاریں۔ پھر تیزی سے اٹھ کے اس کے پاس گئیں۔

''چلو تم میرے کمرے میں چل کے لیٹو آرام کرو۔ اور تم ثمیر...... خبردار جو آئندہ ایسی بات غلطی سے بھی منہ سے نکالی ہو تو...... گھر کے بچے ہیں، بڑوں سے ناراضی ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر ایسے بڑے، بڑے الفاظ منہ سے نکالے جائیں۔'' بھری ہوئی آنکھوں سے انہوں نے مزید کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''ثانیہ میری بہو نہیں بیٹی ہے...... میں اس کی کوئی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی...... وہ مجھے اتنی ہی پیاری ہے جتنی ماہین...... چلو تم۔'' انہوں نے مڑ کے ثانیہ کو مخاطب کیا۔ اور اسے سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے گئیں۔

ثانیہ کو لٹا کے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر انہیں اپنے آنسوؤں پر کوئی اختیار نہ رہا۔

ثانیہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ دونوں ساس بہو مل کے دیر تک روتی بھی رہیں اور ایک دوسرے کو چپ کرانے کی ناممکن کوشش بھی کرتی رہیں۔

وہ دن ایک سبق آموز دن تھا۔ وہ رات اپنے محاسبے کی رات تھی۔ انہیں یقین تھا کہ جس طرح انہوں نے ایک معمولی بات کو سمجھنے میں سالوں لگائے، اس طرح کی کج فہمی کا مظاہرہ شاکر بالکل نہیں کریں گے۔ انہیں ماں باپ کے لحاظ کا مطلب سمجھ آ گیا تھا۔ اور شاکر یہ بات سنتے ہی انہیں فوراً معاف کر دیں گے......

❁❁❁

زہد...... قربِ الٰہی

تمام تر حمد و ثنا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، وہی ہمارا مالک ہے، ہمارا خالق ہے اے اللہ یہ صرف تیرا ہی کرم ہے اور یہ تیرا ہی حلم ہے کہ تو نے ہم گناہ گاروں کو کبھی اپنے درِ رحمت سے دھتکارا نہیں۔ تمام تر نافرمانیوں، ڈھٹائیوں، سرکشیوں اور گناہ کی غلاظتوں کے باوجود تو ہم سے کہتا ہے کہ اے میرے بندے مانگ جتنا مانگنا ہے اور جس قدر مانگنا ہے۔ مانگ لے کہ میرا دامنِ رحمت اب بھی تجھے پناہ دینے کے لیے تیار ہے۔

ارے ہمارے رب......! تیرا یہ حلم، یہ عفو و درگزر یہ چشم پوشی ہمیں اس پُر خطا زندگی میں کبھی مایوس نہیں کرتی...... اے ہمارے رب! تو ہی ہمیں گناہوں کے اندھیروں سے نکال کر اپنی اطاعت کی روشن راہوں پر لانے والا ہے۔ ہم پر تیری نوازشیں، تیری مہربانیاں، تیرے انعامات اس قدر ہیں کہ ہم ان نعمتوں پر شکر ادا کرنے کے بھی قابل نہیں...... تو اے اللہ...... ہمیں نیک اور پرہیز گار بنادے، اپنا پسندیدہ بنادے اور ہمیں ہمارے پیارے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت پر چلنے کی توفیق عطا فرما، آمین۔ درود وسلام ہو ہمارے پیارے آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور ان کی آلؓ پر اور ان کے اصحابؓ پر......

آج ہمارا موضوع ''زہد'' ہے...... زہد کے لغوی معنی ہیں، پرہیز گاری، تقویٰ...... تقویٰ یا پرہیز گاری ایسا عمدہ خزانہ ہے اگر ہم اسے پانے میں کامیاب ہو گئے تو ہماری دنیا و آخرت دونوں سنور جائیں تمام تر بھلائیاں صرف ''تقویٰ'' میں جمع کر دی گئی ہیں...... اور اس پر بے تحاشا اجر و ثواب ہے تمام سعادتیں تقویٰ کی ہی مرہونِ منت ہیں تو تقویٰ قدر و منزلت میں بہت زیادہ ہے اور میدانِ معرفت میں اس کی شدید ضرورت ہے۔ تقویٰ ایک عظیم شے ہے لہٰذا اس کی طلب اور جستجو کے لیے مشقت اور مجاہدے بھی زیادہ ہیں کیونکہ مراتب و مکارم حسبِ مشقت ہی عطا کیے جاتے ہیں۔

☆☆☆

حضرت سفیان بن عینیہؒ فرماتے ہیں کہ لفظ ''زہد'' میں صرف تین حروف ہیں۔ 1۔ ''ز'' ۔ دنیا کی زینت کو ترک کرنا۔ 2 ۔ ''ہ'' ہوائے نفس کو چھوڑنا ہے۔ (اپنے دل کی خواہش کو چھوڑنا) 3۔ ''د'' تمام دنیا کو ترک کر دینا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ فرماتے ہیں کہ زہد کی تین اقسام ہیں۔

1 ۔ فرض یعنی حرام امور سے بیزاری۔ 2 ۔ واجب یعنی مشتبہ امور سے بچنا جن میں حرام یا حلال ہونے کی خبر نہ ہو۔ 3 ۔ سنت یعنی ایسی حلال چیزوں سے بچنا جو بے فائدہ ہوں اور نقصان دہ ہوں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ...... ''اور بعض لوگ وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی طلب میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں...... اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑی مہربانی کرنے والا ہے۔'' (سورۂ بقرہ)

زہد اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کا وصف ہے۔ وہ

اللہ تعالیٰ کی خاطر اس کی رضا کے لیے اپنا تن من اور دھن تک قربان کر دیتے ہیں۔ اور جب اللہ کی خاطر اس کے لیے اپنی دنیا کو بالکل لٹا دیتے ہیں تو اللہ بھی ان سے راضی ہو جاتا ہے۔ اس طرح اللہ کی خاطر سب کچھ ترک کرینا زہد کہلاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ زاہدوں کا دوست ہے کیونکہ زاہد اپنے آپ کو یادِ الٰہی کے لیے دنیا کی طلب سے محدود کر لیتا ہے یعنی گزر اوقات کے لیے جو مل جاتا ہے اس سے گزارہ کرتا ہے اور دنیا کی رغبت چھوڑ کر آخرت کی طرف رغبت کرتا ہے۔ دنیا کی خواہشات کو رضائے الٰہی کے تابع کر دیتا ہے۔ ہر قسم کی فضول آرزوؤں کو ترک کر دیتا ہے اور اپنے دل کو دینوی امیدوں اور امنگوں سے بالکل خالی کر لیتا ہے۔ تاکہ خالی دل میں اللہ کی یاد سما جائے جس دل میں یادِ الٰہی سما جائے وہ اس کے نور سے منور ہو جاتا ہے اور جو اللہ کے نور سے منور ہو جائے تو وہ دنیا کی فانی چیزوں سے افضل اور اعلیٰ ہو جاتا ہے۔ اور فنا کے بجائے بقا میں چلا جاتا ہے۔ جس طریقے سے فنا سے بقا حاصل ہو وہی زہد ہے۔

دنیا کو چھوڑ کر جنگل میں جا کر کنارہ کش ہو جانا زہد نہیں...... کیونکہ جنگل میں جا کر بھی سونا...... پہننا، چلنا پھرنا ترک نہیں ہوتا۔ یوں دنیا تو ترک نہ ہوئی بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے تھوڑے وسائل پر اکتفا کر لینا زہد ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ سے دوستی کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں خود بخود یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ دنیا تو ختم ہونے والی ہے اور آخر کار موت نے آنا ہے تو پھر دنیا کی اشیا اللہ کے طالب کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ دنیاوی چیزوں کو وہ ذلیل و خوار سمجھتا ہے اور اللہ کی طلب کے مقابلے میں انہیں ترک کر دیتا ہے...... اللہ تعالیٰ کی طلب ہر حال میں دنیا سے بہت زیادہ بہتر ہے اس لیے وہ دینوی اشیا کے حصول کو دل سے نکال دیتا ہے اور اسی دنیا کی لگن کو دل سے نکالنا زہد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر زہد کی تعریف کی ہے...... اور اپنے بندوں کو اس کی ترغیب دی ہے۔ فرمایا...... ''اور جن لوگوں کو فہم عطا ہوئی تھی وہ کہنے لگے ارے تمہارا ناس ہو، اللہ کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لایا۔'' ایک جگہ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ......

''ہم نے زمین کے اوپر کی چیزوں کو اس کے لیے باعثِ رونق بنایا تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے۔'' (سورۂ کہف)

''اور جو آخرت کی کھیتی چاہے گا ہم اس کی کھیتی میں اضافہ کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دینا۔ (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔''

آقائے دو جہاںؐ کا ارشاد ہے کہ ''جو شخص دنیا کی فکر میں مستغرق رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا کام منتشر اور اس کا نظام معیشت درہم برہم کر دیتا ہے اور اس کے فقر کو اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے اور اسے دنیا میں سے صرف اسی قدر ملتا ہے جتنا اس کے لیے لکھا ہوا ہے۔ اور جو شخص فکرِ آخرت میں مستغرق رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ہمت مجتمع کر دیتا ہے اور اس کی معیشت محفوظ رکھتا ہے اور اس کے دل میں مالداری ڈال دیتا ہے اور دنیا اس کے پاس ذلیل و خوار ہو کر آتی ہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد نبویؐ ہے کہ...... ''جب تم بندے کو دیکھو کہ اسے سکوت اور دنیا میں زہد عطا ہوا ہے تو تم اس سے قریب ہو جاؤ اس لیے کہ اسے حکمت سکھلائی جاتی ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑے خیر کی چیز مل گئی۔'' (سورۂ بقرہ)

اسی لیے یہ مقولہ مشہور ہے کہ جو شخص چالیس برس تک دنیا میں زہد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے اور وہی حکمت کی باتیں اس کی زبان سے ظاہر کرتا ہے...... بعض اصحاب رسولؐ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا...... یا رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون سا شخص بہتر ہے؟

فرمایا...... ''ہر وہ مومن جو دل کا صاف اور زبان کا سچا ہو......'' ہم نے عرض کیا...... یا رسول اللہؐ مخموم القلب سے کون مراد ہے؟ ارشاد فرمایا...... ''وہ پرہیز گار اور صاف دل انسان ہے جس میں نہ خیانت ہو نہ فریب ہو نہ کھوٹا پن ہو نہ سرکشی ہو اور نہ حسد ہو۔'' ہم نے عرض کیا...... ''اس کے بعد کون زیادہ اچھا ہے؟'' فرمایا۔ ''جو دنیا سے نفرت کرتا ہے اور آخرت سے محبت کرتا ہے۔''

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا...... '' اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تم سے محبت کرے تو تم دنیا میں زہد کرو......'' اس حدیث میں زہد کو محبت کا سبب قرار دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوبین کے لیے بلند درجات ہیں...... اس لیے دنیا میں زہد کرنا افضل ترین مقامات میں سے ایک مقام ہے۔

☆☆☆

حضرت عیسیٰؑ درختوں کے پتے کھاتے دوسرے روز کے لیے کبھی کھانا جمع نہ کرتے تھے جس جگہ شام ہو جاتی آپ وہیں سو جاتے تھے۔ آپ علیہ السلام اپنے حواریوں سے فرمایا کرتے ...... ''میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ راکھ سے ملا ہوا جو کا بورا کھانا اور رکتوں کے ساتھ کوڑوں پر سونا اور سخت ٹاٹ کے کپڑے پہننا اس شخص کے لیے بہت کافی ہے جو مر جائے گا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہ کبھی بستر بنایا اور نہ تکیہ اور نہ ہی پیالہ...... ایک دفعہ آپ نے سر کے نیچے کچی اینٹ رکھ لی...... تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے پاس آئے اور فرمایا...... ''اے عیسیٰ! علیہ السلام کیا دنیا کو ترک کرنے کے بعد پھر دنیا کی طرف راغب ہونے لگے ہو کہ اینٹ کا تکیہ رکھا ہے؟ اس دن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ معمول ہو گیا کہ آپ بیٹھے، بیٹھے سو جاتے...... آپ اپنی قوم سے...فرمایا کرتے کہ تم صاف پانی اور جنگل کی گھاس پھونس اور جو کا بورا ہی کافی جانو اور گیہوں کی روٹی کھانے سے باز رہو کیونکہ تم جو کے ذرے کا بھی شکر ادا نہیں کر سکتے۔''

امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک کرتا تین درہم میں خریدا حالانکہ آپؓ اس وقت خلیفہ تھے آپؓ نے اس کی آستین کو پہنچوں سے کاٹ کر پہنا اور فرمایا...... ''شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے یہ لباسِ فاخرہ پہنایا۔''

حضرت حسن بصریؒ کرتا پہنتے جب تک وہ پرانا نہ ہو جاتا اسے نہ اتارتے ایک دفعہ کسی نے آپؒ سے کہا کہ آپ اپنا کرتا کیوں نہیں دھوتے؟ آپؒ نے فرمایا۔ ''موت اس سے جلد آنے والی ہے۔''

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں۔ ''اگر تمام دنیا میرے قبضے میں ہو تو بھی میں خوش نہ ہوں اور اگر کوئی مجھ سے تمام دنیا چھین لے تو میں اس کا پیچھا نہ کروں اور نہ اس پر غمگین ہوں......'' آپؒ مکہ میں پانی پلا کر گزارہ کیا کرتے تھے آپؒ کے پاس ایک اونٹ تھا جس پر پانی لایا کرتے اور بیچتے اور اس سے آپ کے اہل و عیال گزارہ کیا کرتے تھے۔

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے تھے کہ آدمی پر واجب نہیں کہ وہ اپنے اہل و عیال کو زہد پر مجبور کرے بلکہ انہیں اس کی ترغیب دے۔ اگر مان جائیں تو خیر...... ورنہ خود زاہد ہو جائے اور ان کے لیے ضروریات مہیا کرے...... کیونکہ ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا اس کی شرعی ذمے داری ہے۔ آپؒ فرماتے تھے کہ ''ہر وہ چیز جو تجھے پروردگار کی یاد سے روکے خواہ اہل و عیال ہوں یا مال وغیرہ...... وہ تیرے لیے منحوس ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے بندے کو پروردگار کی یاد دلانے کے لیے پیدا کی ہے...... اگر وہ شے بندے کو اللہ کی یاد دلاتی رہے تو وہ اس کے لیے مبارک ہو گی برخلاف اس سے جب وہ اللہ سے قلباً وقالباً دور ہو...... یہی وجہ ہے کہ مال اور اولاد آدمی کے لیے سخت فتنہ ہوتے ہیں...... کیونکہ ان کی محبت اور طلب کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں ہوتا...... بس اس میں غور کر۔''

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے

زہد کے متعلق بہت سی باتیں سنی ہیں لیکن ان میں سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی یاد سے روکے اس سے پرہیز کرنا لازم ہے خواہ علم ہو یا عمل یعنی علم حاصل کرے تو دنیا کو دکھانے کے لیے اور عمل کرے تو دنیا کو دکھانے کے لیے یا تکبر پیدا ہو یا لوگوں کی زبان سے اپنی تعریف پر طبیعت خوشی محسوس کرے تو ایسا علم اور عمل نہ ہوتو بہتر ہے کیونکہ علم اور عمل میں اخلاص ہی انسان کا دل اللہ کی طرف راغب کرتا ہے...... واللہ اعلم......

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمام برائیوں کو ایک کوٹھڑی میں بند کررکھا ہے۔ اور دنیا کی محبت کو اس کی کنجی بنایا ہے۔ اسی طرح تمام نیکیوں کو ایک کوٹھڑی میں بند کررکھا ہے جس کی چابی زہد مقرر کی ہے۔''

حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ ''دنیا کی صحبت ایمان کی مٹھاس کو دل سے نکال دیتی ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ''دنیا اور آخرت کی محبت ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتی جیسے کہ آگ اور پانی ایک برتن میں جمع نہیں ہوسکتے......''

حضرت ابوخازمؒ فرماتے ہیں کہ ''جس نے حلال طریق سے دنیا کمائی اور اس کو رضائے الٰہی میں خرچ کیا اس نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرلیا۔''

حضرت بشر حافی فرماتے ہیں کہ ''زہد'' ایک حال ہے جو صرف ان لوگوں کے دلوں میں سکونت اختیار کرتا ہے جن کے دل دنیا سے خالی ہوں......''

☆☆☆

حضرت علی عطارؒ فرماتے ہیں کہ میں بصرہ کی ایک سڑک سے گزرا وہاں بچے کھیل رہے تھے اور بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے...... میں نے بچوں سے کہا کہ تمہیں ان بزرگوں سے شرم نہیں آتی......؟ ان میں سے ایک بچے نے جواب دیا کہ ان بزرگوں کی پرہیز گاری میں کمی واقع ہوگئی ہے اس لیے ان کی ہیبت بھی کم ہوگئی ہے۔

حضرت مالک بن دینارؒ چالیس برس تک بصرہ میں رہے مگر انہوں نے بصرہ کی ایک کھجور کھانا بھی درست نہ سمجھا یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی۔ اور انہوں نے بصرہ کی ایک کھجور بھی نہیں چکھی ان کا دستور تھا کہ جب تازہ کھجور کا موسم گزر جاتا تو کہتے...... ''اے بصرہ والو! یہ میرا پیٹ ہے اس میں سے کچھ کم نہیں ہوا اور نہ تم میں کچھ زیادتی ہوئی ہے۔''

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے مکہ میں تانبے کا ایک برتن ایک سبزی فروش کے پاس گروی رکھا...... جب انہوں نے اسے چھڑانا چاہا تو سبزی فروش دو برتن نکال لایا اور کہا...... جو سا چاہو لے لو...... تو امام احمدؒ نے فرمایا...... کہ میں اپنا برتن پہچان نہیں سکا لہٰذا یہ برتن بھی تیرا ہے اور یہ درہم بھی تیرے ہیں...... اس پر سبزی فروش نے کہا...... آپ کا یہ برتن ہے میں تو صرف آپ کو آزمانا چاہتا تھا...... لیکن آپؒ نے فرمایا۔ اب میں اسے نہیں لوں گا...... اور برتن اس کے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔

☆☆☆

حضرت ابو صالح حمدون اپنے ایک دوست کے پاس اس کی حالتِ نزع میں موجود تھے...... جب وہ شخص مرگیا تو ابو صالح نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیا۔ کسی نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا...... کہ ''اب تک چراغ کے تیل کا مالک وہ خود تھا...... مگر اب یہ تیل اس کے وارثوں کا ہے لہٰذا کوئی اور تیل لاؤ تب چراغ جلاؤں گا...... اللہ اکبر......''

حضرت کھمسؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک گناہ کر بیٹھا ہوں...... جس کی وجہ سے میں چالیس سال سے رو رہا ہوں...... بات یہ ہے کہ میرا ایک بھائی مجھ سے ملاقات کے لیے آیا میں نے اس کے لیے تلی ہوئی مچھلی خریدی...... جب وہ مچھلی کھا چکے تو میں نے اپنے ایک پڑوسی کی دیوار سے مٹی کا ایک ٹکڑا لیا جس سے انہوں نے ہاتھ صاف کرلیا...... اور میں اس کی اجازت نہ لے سکا تھا۔

کہتے ہیں کہ حضرت رابعہ عدویہؒ نے اپنی قمیص کا ایک چاک شاہی مشعل کی روشنی میں سی لیا...... تو اُن

کے دل کا سکون چلا گیا۔ جب انہیں یہ بات یاد آئی تو قمیص کو دوبارہ پھاڑ دیا۔ جب ان کا سکون واپس پلٹا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک قبرستان سے گزرے آپ علیہ السلام نے ایک مردہ شخص کو آواز دی...... اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا۔ تو کون ہے......؟ اس نے کہا...... میں مزدور تھا اور لوگوں کا بوجھ اٹھا کر لے جاتا تھا...... ایک دن ایک شخص کی لکڑیاں اٹھا کر لے گیا جس سے میں نے ایک خلال توڑ کر اس سے دانتوں کا خلال کیا تھا...... جب سے مرا ہوں مجھ سے اس کا مطالبہ ہو رہا ہے۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو دنیا سے اعراض کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں کہہ دیں کہ دنیا کی سود مندی تو بہت ہی کم ہے اور پرہیز گاروں کے لیے آخرت ہی بہتر ہے۔" (سورۂ نساء)

بعض محققین کہتے ہیں کہ زہد اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے کہ "تا کہ تم اس چیز پر افسوس نہ کرو جو تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے اور نہ اس چیز پر خوش ہو جو اللہ تعالیٰ تمہیں دے۔" (سورۂ حدید)

لہٰذا زاہد دنیا کے ملنے پر خوش نہیں ہوتا اور نہ ہی دنیا کی اس چیز پر افسوس کرتا ہے جو اسے نہ ملی ہو۔

حضرت ابن جلاءؒ فرماتے ہیں کہ زہد یہ ہے کہ تو دنیا کی طرف دیکھے کہ یہ ایک زوال پزیر چیز ہے تا کہ دنیا تمہاری نگاہ میں حقیر معلوم ہو اور تمہارے لیے اس سے اعراض کرنا آسان ہو جائے۔"

حضرت عبد اللہ بن مالکؒ فرماتے ہیں کہ "فقر کی محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے کا نام زہد ہے۔" یہی قول حضرت شفیق بلخیؒ اور حضرت یوسف بن اسباطؒ کا ہے۔

اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا بھی زہد کی علامات سے ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں کہ جب تک کسی میں تین خصلتیں نہ پائی جائیں اس وقت تک وہ زہد کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا۔

1۔ عمل کرے تو اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے سوا کوئی اور خواہش نہ ہو۔

2۔ بات کہے تو بغیر کسی لالچ کے۔

3۔ اور بغیر ریاست کے اپنے آپ کو ذی عزت بنائے رکھے۔

حضرت ابو عثمانؒ فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ زاہد کو اس کی خواہش سے زیادہ عطا کرتا ہے اور دنیا کی رغبت کرنے والے کو اس کی خواہش سے کم دیتا ہے۔ اور قانع شخص کو اسی قدر عطا کرتا ہے جتنا وہ چاہتا ہے۔"

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ دنیا اور دنیا کی چیزوں سے بغض کا نام زہد ہے۔

☆☆☆

ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مردہ بکری کے قریب سے گزرے اور فرمایا...... "دیکھو یہ مردار کس درجے ذلیل و خوار پڑا ہے۔ کوئی بھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا...... فرمایا...... اللہ کی قسم جس کے قبضے میں مجھ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہے اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مچھر کے پر جیسی بھی ہوتی تو کسی کافر کو ایک چلو بھر پانی بھی نہ ملتا......"

"دنیا کی محبت تمام گناہوں کی سردار ہے دنیا برباد شدہ لوگوں کا گھر اور مفلسوں کا مال ہے۔"

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کرتے تھے کہ "میں چاہتا ہوں کہ کاش میں سبزہ ہوتا اور مجھے چرند پرند کھاتے اور خوفِ عذاب اور وحشتِ یوم حساب کا سوچ کر خیال کرتا ہوں کاش مجھے پیدا ہی نہ کیا جاتا......" آپؓ یہ دعا فرماتے تھے...... "اے اللہ! میری آخری عمر میں برکتیں اور بھلائی عطا فرما...... اور نیک اعمال پر میرا خاتمہ ہو اور تیری ملاقات کا دن میری زندگی کا بہترین دن ہو۔"

حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے تھے کہ "ہم حلال کے نو حصے چھوڑتے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں حرام کے ایک حصے میں گرفتار نہ ہو جائیں...... آپؓ

کی یہ حالت تھی کہ چہرہ مبارک پر آنسوؤں کے جاری رہنے سے دوسیاہ نشان بن گئے تھے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپؓ نے خزانے کے دروازے پر کھڑے ہوکر فرمایا......"اے سونا، چاندی! جا میرے سوا کسی اور کو دھوکا دے۔"

☆☆☆

حضرت سیدنا امام جعفر صادقؓ نے حضرت داؤد طائیؒ کی اس درخواست پر کہ حضرت مجھے کوئی نصیحت کیجیے......ارشاد فرمایا کہ......"مجھے تو یہی خوف دامن گیر ہے کہ کہیں قیامت کے دن میرے جد امجد حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری گرفت نہ فرمالیں اور مجھ سے یہ نہ پوچھ لیں کہ خود تو نے میری اتباع کیوں نہیں کی......یہ معاملہ نسب سے نہیں اللہ کی بندگی سے متعلق ہے......" یہ سن کر حضرت داؤد طائیؒ زاروقطار رونے لگے اور کہا کہ جن کا خمیر ہی نبوت کے پانی سے تیار ہوا ہے جب وہ لوگ اس حیرانی اور پریشانی میں ہیں تو داؤد طائیؒ کس گنتی میں ہے۔"

ایک روز کسی نے آپؓ کو قیمتی لباس میں ملبوس دیکھ کر اعتراض کیا اور کہا اتنا قیمتی لباس اہلِ بیت نبوت کے لیے کیسے زیب دیتا ہے؟ آپؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آستین کے اندر پھیرا......اندر کا لباس ٹاٹ کی طرح کھردرا تھا......آپؓ نے فرمایا......"وہ مخلوق کے لیے ہے اور یہ خالق کے لیے ہے۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت اویس قرنیؓ سے ملاقات کے دوران جب آپ کی ظاہری حالت انتہائی خستہ دیکھ کر خواہش ظاہر کی آپؒ ذرا اسی جگہ ٹھہریں میں آپ کے لیے کچھ سامان لے آتا ہوں......آپؒ نے اپنی جیب سے دو درہم نکال کر دکھائے اور کہا کہ "یہ اونٹ چرانے کا معاوضہ ہے اگر آپؓ یہ ضمانت دیں کہ یہ درہم خرچ ہونے سے پہلے میری موت نہیں آئے گی تو پھر آپ کا جو چاہے لے آئیے......ورنہ یہ دو درہم میرے لیے کافی ہیں۔"

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اب میں تمہارے سامنے تقویٰ کے ان بارہ اوصاف کا ذکر کرتا ہوں جو ایک متقی میں ہوتے ہیں۔

1۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔"

2۔ دشمنوں سے امن وحفاظت میسر آتی ہے۔

3۔ اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت حاصل ہوتی ہے۔

4۔ تکالیف اور مصائب سے نجات اور رزقِ حلال نصیب ہوتا ہے۔

5۔ اعمال میں اصلاح نصیب ہوتی ہے۔

6۔ گناہوں کی مغفرت وبخشش کی سعادت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

7۔ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی محبت نصیب ہوتی ہے۔

8۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال کی مقبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

9۔ بارگاہِ الٰہی میں شانِ اعزاز واکرام نصیب ہوتی ہے۔

10۔ موت کے وقت دیدار وبخشش کی بشارت دی جاتی ہے۔

11۔ جہنم سے آزادی کا پروانہ مل جاتا ہے۔

12۔ جنت الفردوس میں ہمیشہ کے ٹھکانے کی سعادت نصیب ہوجاتی ہے۔

☆☆☆

حضرت عامر بن قیسؒ کے بارے میں یہ اطلاع ملی کہ وہ اپنی موت کے وقت رو دیے......حالانکہ وہ ہر روز ایک ہزار نوافل ادا فرماتے تھے پھر اپنے بستر پر تشریف لاتے تو بستر سے کہتے......اے ہر برائی کے ٹھکانے بخدا میں پلک جھپکنے کی مقدار بھی تجھ سے خدائے تعالیٰ کی خاطر راضی نہیں۔ ایک دن آہ وزاری کررہے تھے کہ کسی نے پوچھا۔ حضرت روتے کیوں ہیں؟

تو آپؒ نے فرمایا......کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول نے رُلادیا ہے کہ۔"قبول فرماتا ہے اللہ تعالیٰ صرف

پرہیزگاروں سے۔'' (سورۂ مائدہ) تو جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے ہمیشہ کی پُرکیف زندگی نصیب ہو تو شرائط تقویٰ کی حدود کی پابندی اس پر لازم ہے۔ حدود تقویٰ کا بیان سورۂ بقرہ کی ان آیات میں ہے کہ......

''ساری اچھائی مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنے میں ہی نہیں بلکہ حقیقتاً اچھا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ پر اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو...... جو مال سے محبت کرنے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والے کو دے۔ غلاموں کو آزاد کرے...... نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرے، جب وعدہ کرے تو اسے پورا کرے...... تنگدستی، دکھ، درد اور لڑائی کے وقت صبر کرے...... یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں۔'' (سورۂ بقرہ: (177)

مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ ''زاہدوں کی دنیا میں حالت ایسی ہوتی ہے کہ بظاہر وہ ہنستے معلوم ہوں گے مگر ان کے قلب روتے ہوں گے اور بظاہر دیکھنے میں وہ خوش و خرم معلوم ہوں گے مگر ہر وقت آخرت کی فکر اور غم میں مبتلا ہوں گے خواہ دوسرے لوگ مال و دولت پر رشک کریں مگر وہ خود سے ناخوش ہوں گے۔''

''زہد دین کی جڑ ہے اور سچائی پرہیزگاروں کا لباس ہے۔''

''زہد مخلفین کی خصلت ہے۔''

''زہد یہ ہے کہ انسان دنیاوی امیدوں کو مختصر کرے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ اور حرام کاموں سے اجتناب برتے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو یہ ضرور کرے کہ حرام چیزوں کو خود پر غالب نہ آنے دے اور نعمتوں کے شکر کو فراموش نہ کرے اللہ تعالیٰ نے روشن اور ظاہر دلیلیں بیان کی ہیں اور اپنی کتابوں کے ذریعے تمہارے سب عذر دور کر دیے ہیں۔

''جو لوگوں سے کنارا کش ہو جاتا ہے...... اس کا زہد و تقویٰ کمال حاصل کرتا ہے۔

☆☆☆

یہ دنیا فقط تین سانسوں کا نام ہے۔ ایک سانس جو گزر چکی...... اس میں تم نے جو کرلیا سو کرلیا...... ایک موجودہ سانس اور ایک آنے والی اس کے بارے میں کوئی علم نہیں کہ وہ نصیب بھی ہوتی ہے یا نہیں...... حقیقت میں ہم ایک گھڑی کے نہیں بلکہ ایک سانس کے مالک ہیں تو بس اس سانس کو غنیمت جانتے ہوئے عبادت و اطاعت اور توبہ و استغفار کی طرف دوڑ پڑیں اس سے پہلے کہ موت آ پکڑے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے اور ہمیں نیک اور پرہیزگار بنا دے، آمین۔

☆☆☆

مندرہ ذیل کتب اور قابل ترین ہستیوں کے نام

۱۔ احیاء العلوم ...... جلد چہارم، حضرت امام ابو حامد محمد الغزالیؒ

۲۔ الرسالۃ القشیریۃ کا ترجمہ بنام تصوف کا انسائیکلوپیڈیا، امام ابوالقاسم القشیریؒ

۳۔ منہاج العابدین، امام ابو حامد محمد الغزالیؒ

۴۔ اللہ سے دوستی، علامہ عالم فقری

۵۔ اسلامی تربیتی نصاب، پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری جلد دوم

۶۔ تذکرے اور صحبتیں، ڈاکٹر محمد طاہر القادری

۷۔ اقوال علیؓ، علامہ محمد اقبال قادری

حرفِ آخر:

اے میرے پیارے رب! انتہائی ادب اور نادم دل کے ساتھ تیری بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی کم علمی یا بشری تقاضے کے تحت ہوگئی ہو تو مالک مجھے معاف کردے، درگزر فرمادے...... اور ہمیں نیک ہدایت دے اور ہماری رہنمائی فرما......'' آمین......!

ان قابل ترین ہستیوں کی شکر گزار ہوں کہ جن کے کتب سے میں نے مضامین کا انتخاب کیا...... اللہ تعالیٰ ان سب کے درجات بلند فرمائے...... آمین۔

تمام پڑھنے والوں کے لیے دعائے خیر۔

لاک ڈاؤن اور لاڈلے کی شادی

ریحانہ اعجاز

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے وہ دن دکھایا میرے خیال میں جس کی تمنا ہر انسان اولاد کی پیدائش کے ساتھ ہی کرنا شروع کر دیتا ہے۔

مجھے بھی اپنے لاڈلے بیٹے "اسامہ اعجاز" کی شادی کا ارمان اس کی عمرِ رواں کے ہر گزرتے پل کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور بالآخر میری زندگی کے چند حسین دنوں میں مزید ایسے انمٹ، انمول اور یادگار دن شامل ہو ہی گئے کہ جن کا محض تصور ہی میرے چہرے کے گرد رنگ و روشنیوں کا نور بکھرا دیتا ہے۔

اسامہ کی شادی کے لیے پلان کرتے وقت کہیں خواب و خیال میں بھی کسی "لاک ڈاؤن" کا گزر نہیں تھا لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔

شادی کی تاریخ بارہ جون قرار پائی تو دل میں خوشیوں کے سوتے پھوٹ پڑے۔ ہر چیز اعلیٰ اور پرفیکٹ ہو اس لیے کئی ماہ پہلے ہی مالز کے چکر لگانا شروع کر دیے کہ میری خوشی دیدنی تھی۔

میں نے سوچا تھا بری اور گھر والوں کے شادی میں پہننے والے ڈریسز کی خریداری شروع میں کر لوں گی اور ان کی سلائی کا کام رمضان میں شروع کرواؤں گی کہ رمضان میں مجھے شاپنگ کے لیے نہیں نکلنا پڑے گا۔ باقی کی اشیا میک اپ، جیولری، آرٹیفیشل جیولری، جوتے، بیگز، کلچر، چوڑیاں وغیرہ بھی تسلی سے میچنگ کے ساتھ خریدوں گی۔

سب سے پہلے میں نے ایک عقلمندانہ کام یہ کیا کہ اپنی ہونے والی بہو کو ساتھ لے جا کر ولیمے کے لیے میکسی پسند کروائی اور اس کی پسند کے مطابق آرڈر کر دیا۔

پھر میں نے بچوں کے لیے ڈریسز کی خریداری شروع کی اور تقریباً ایک دن چھوڑ کر ایک دن مارکیٹ کے چکر لگانا شروع کر دیے۔

ولیمے کے موقع پر دائیں سے بیٹا علی، بیٹی علینہ، دولھا دلہن، ریحانہ اعجاز اور ان کے شوہر اعجاز صاحب

''میری اکلوتی بیٹی ''علینہ'' کی ڈیمانڈ تھی۔'' میں دولھا کی اکلوتی بہن ہوں سو ایسا ڈریس چاہیے جو کسی کا بھی نہ ہو۔علینہ کی اس ڈیمانڈ نے میرے کتنے دن فالتو کے چکر لگوائے' یہ میں جانتی ہوں یا میرا خدا۔

بہو کے لیے کپڑوں کی خریداری میں کچھ یوں چاہتی تھی کہ ہر طرح کا سوٹ بناؤں بری میں، گوٹے کے کام کا سوٹ، بنارسی، ویلویٹ، ستاروں کے کام کا، نقشی، دبکے کے کام کا، تِلے کے کام کا، لان، کا، لینن کا، کاٹن کا، چائنا سلک کا۔جارجٹ کا، مقیش کا......اس لیے مختلف مالز اور مارکیٹس کے چکر لگا رہی تھی۔

اس دوران اسامہ کی شیروانی، پگڑی اور کھسے کا آرڈر بھی دے ڈالا ساتھ ہی چھوٹے بیٹے علی اور اپنے سرتاج اعجاز کے ساتھ جاکر ویسے کے لیے تھری پیس اور مہندی کے لیے ''پرنس کوٹ'' بھی آرڈر کر دیے ان کی پسند سے جو تقریباً ایک ماہ میں ہی تیار ہونے تھے۔

ان سب کاموں میں ایک ماہ یوں گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا۔

ایک روز ٹیلر کی کال آئی۔''میڈم، آپ کی آرڈر کردہ میکسی تیار ہے بقیہ پے منٹ کر دیجیے اور میکسی لے جائیں۔''

مقررہ وقت سے چند دن پہلے کال آئی تھی، پہلے سوچا کچھ دن بعد لے آؤں گی پھر ایک دم سے خیال آیا شاید ٹیلر کو رقم کی ضرورت ہو ابھی چلنا چاہیے۔جب ایک دُھن سوار ہو جائے پھر تو میں اپنی بھی نہیں سنتی۔

خیر میں اُسی وقت جا کر میکسی لے آئی۔(کن دقتوں سے آنا جانا ہوا وہ الگ کہانی ہے)

شام سات بجے کے قریب میں میکسی لائی ہوں اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اگلے دن سے لاک ڈاؤن لگ گیا۔

مارچ کا پہلا سخت لاک ڈاؤن۔

اب دن رات ایک ہی فکر۔

''میرج ہال کا ایڈوانس دیا ہوا ہے، بے شمار کپڑے مختلف ٹیلرز کے پاس ہیں وہ بھی صدر میں ان سب کا کیا، کیا جائے؟''

12 جون شادی کی ڈیٹ فکس تھی۔

ابھی تک بری کے صرف کپڑے ہی خریدے تھے، سلوانے باقی تھے۔

خیر اعجاز صاحب کو دُہائی دی۔

''کچھ کیجیے، بہو کے کپڑے تو سلوالوں۔''

اللہ انہیں سلامت رکھے، بہترین ٹیلر کا انتظام کر دیا جو ہر ہفتے گھر آتا، دو چار سوٹ لے جاتا، دوپٹوں کی پیکو شیکو بھی مکمل کروا کے لاتا تو اگلے سوٹ لے جاتا۔یوں سلائی کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔

اب بیٹے کے کمرے کے لیے فرنیچر لانا تھا کہ میرا بیٹا جہیز لینے کے سخت خلاف ہے، ہمیشہ یہی کہتا تھا جب میں شادی کروں گا تو بالکل جہیز نہیں لوں گا، مجھے فخر ہے اپنے بیٹے پر جس نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔

روز پلان بنتا کہ آج ضرور جائیں گے فرنیچر مارکیٹ لیکن لگتا تھا دن بھی چھوٹے ہو گئے ہیں کہ لاک ڈاؤن میں صبح آٹھ سے شام پانچ بجے تک کی چھوٹ تھی اور مختلف کاموں میں سارا دن چٹکی بجاتے نکل جاتا۔

بارات کے روز دولھا دلہن کا دلکش پوز

خیر اللہ، اللہ کر کے میں اور اعجاز' اسامہ کو ساتھ لے کر فرنیچر مارکیٹ گئے جس کے لیے اسامہ نے پہلے ہی بندوبست کر لیا تھا کہ دو چار شاپس والوں کو کال کر کے ایڈریس لے لیا اور کنفرم کیا کہ ان کی شاپس کھلی ہوں گی کہ اس ٹائپ کی دکانیں کھولنے کی ممانعت تھی۔

جس وقت ہم مارکیٹ پہنچے دو پہر کے دو بج رہے تھے بھری پُری مارکیٹ میں سناٹے کا راج تھا آدھے، آدھے شٹرز کے ساتھ کچھ دکانیں کھلی تھیں۔

بالآخر ایک شاپ پر جس وقت فرنیچر فائنل کیا تقریباً

ساڑھے چار ہو گئے تھے تب ہی اچانک سے سائرن بجنے لگا اور دکان والوں نے لپک کر شٹر گرا دیا۔ میرا دل یوں دھک دھک کرنے لگا جیسے چوری کرتے رنگے ہاتھوں کسی نے پکڑ لیا ہو۔

کچھ دیر انتظار کے بعد ساری ضروری کارروائی مکمل کر کے ہم ڈرتے ڈرتے دکان سے نکلے اور دکان والے کی یقین دہانی پر کہ ان شاء اللہ کل دوپہر میں سارا فرنیچر گھر پہنچ جائے گا ہم اطمینان کی سانس لیتے گھر کو روانہ ہوئے۔

اگلا مرحلہ تھا جیولری کا اور جیولرز کی دکانیں مکمل بند تھیں۔ ان کے کھلنے کے انتظار میں دیگر کام نبٹائے گئے جن میں جوتے، میک اپ، آرٹیفیشل جیولری اور بری سے متعلق ضروری اشیا کی خریداری جو بے شمار کٹھن مراحل سے گزر کر بالآخر انجام کو پہنچی کہ رمضان المبارک بھی شروع ہو چکا تھا ایسے میں روزہ رکھ کر گھر سے نکلنا شدید گرمی اور حبس کے دنوں میں مارکیٹس کے چکر لگانا، میں کبھی اتنی چوزی نہیں رہی کچھ بھی خریدنے کے معاملے میں لیکن یہ میری اپنی ذات کے لیے نہیں تھا میں نے اپنی بہو کے لیے خریداری کرنا تھی سو کسی بھی چیز پر کمپرومائز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

تب اچانک ہی میاں جی کو خیال آیا کہ جب عید کے فوراً بعد شادی کرنی ہی ہے تو کیوں نہ ماہِ مقدس میں مسجد میں نکاح کا فریضہ انجام دے لیا جائے۔

جب فریقین نے بات کر لی تو مرحلہ آیا مساجد کا جو کہ مکمل طور پر بند کر دی گئی تھیں اور مولویوں نے چار سے زائد افراد کے داخلے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ سب مایوس ہو گئے تھے کہ چلو اب مقررہ تاریخ پر ہی نکاح ہو جائے گا۔

تب دلہن والوں نے کہا۔

ہم مسلسل رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں شاید کوئی صورتِ حال نکل آئے۔

تب نکاح سے محض دو دن پہلے دلہن کے گھر سے کال آئی کہ آنے والے جمعے کو نکاح کیا جائے گا، قریبی مسجد والوں سے بات ہو گئی ہے۔ اب نکاح کا احوال سنیئے۔

صورتِ حال یہ تھی کہ میرے اور علینہ کے مہندی اور ولیمے کے ڈریسز تیار تھے اور بارات والے دن کے لیے ابھی کوئی ڈریس نہیں لیا گیا تھا۔

جبکہ اسامہ، علی اور اعجاز کا شادی کے حوالے سے ایک بھی ڈریس تیار نہیں تھا۔

تب میں نے اعجاز سے کہا۔

”کم از کم اپنے اور اسامہ کے لیے ایک ایک سوٹ سلوا لیں کسی بھی طرح درزی کی منت کر لیں“ کیونکہ لیڈیز ٹیلر تو ہمیں دستیاب تھا جو اپنے گھر میں سلائی کر رہا تھا ہمارے کپڑے لیکن میل ٹیلرز کی شاپس بند تھیں اور اتنی جلدی کوئی بھی سینے پر رضامند نہ تھا۔

خیر اللہ کی مدد شاملِ حال تھی سو ایک ٹیلر نے دو دن میں صرف ایک سوٹ سینے کی حامی بھری تو اعجاز نے اسامہ کے لیے بوسکی کا شلوار قمیص سلنے کو دے دیا۔

میرے پاس بنارسی کا کریم کلر کا بہت خوب صورت کپڑا تھا جو میں نے اسامہ کو تھماتے ہوئے کہا۔

”بیٹا، سوٹ تو سل جائے گا لیکن میں چاہتی ہوں سب کچھ نیا پہنو، اس کی اگر واسکٹ بن جائے تو بہت اچھا ہو گا۔“

سدا کا فرمانبردار میرا بیٹا کپڑا تھام کر بولا۔

”او کے مما کوشش کرتا ہوں لیکن مشکل ہے کوئی راضی ہو۔“

اور جب اللہ کی مدد شامل ہو تو حل یوں نکلا کرتے ہیں۔

اسامہ کے دوست نے پوری رات مختلف بند ٹیلر شاپس پر جا کر ان کے نمبر نوٹ کر کر کے کالز کرنا شروع کیں اور ایک ٹیلر کو تین گنا زیادہ سلائی دے کر ایک دن میں واسکٹ سینے پر راضی کر لیا۔

اللہ، اللہ کر کے جمعے کا مبارک دن آیا اور ہماری تیاریاں شروع ہوئیں۔

لیکن رکیے۔ اہم مرحلہ تو رہ ہی گیا۔

میں نے اور علینہ نے مہندی کے لیے بنوائے گئے کپڑے پہننے کا فیصلہ کیا کہ مسجد میں نکاح کے بعد دلہن والوں کے گھر باقاعدہ ڈنر کا اہتمام تھا اور راتوں رات قریبی احباب بھی مدعو کر لیے گئے تھے سو دولہا کی امی اور بہن کا حق تھا پوری طرح سے تیار ہونا۔

کپڑوں کے بعد میک اپ کا مرحلہ۔

اس کا حل یوں نکالا کہ میری دوست ردا آفتاب جو ”مسالا ٹی وی“ پر تڑکا پروگرام کرتی ہیں اور میری پڑوسی بھی

ہیں اس نے ازخود ہی آفر دی ہوئی تھی کہ میک اپ کے لیے ضرورت ہو تو مجھے بتانا سو ایمرجنسی میں ردا کی یاد آئی فوراً اس سے رابطہ کیا اور اس نے ہم ٹی وی کی میک اپ آرٹسٹ کو جمعے والے دن وقت پر پہنچنے کی تاکید کر ڈالی، یوں یہ مشکل مرحلہ بھی بخوبی انجام پایا۔

ظہر سے کچھ دیر قبل اسامہ آن لائن کلاس لے رہا تھا جب لیپ ٹاپ آف کرتے ہوئے موبائل پر کلاس لیتا جھٹ پٹ گیٹ کی طرف بڑھا۔

''اسامہ کہاں جارہے ہو بیٹا؟''

میری آواز پر ''ابھی آیا مما'' کہتا اسامہ باہر چلا گیا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد واپسی ہوئی تو ایک ہاتھ میں موبائل ہنوز آن تھا اسامہ کا لیکچر جاری تھا اور دوسرے ہاتھ میں جوتے کا ایک ڈبا تھا جو مجھے تھماتے ہوئے اسامہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

بعد میں بتایا کہ ایک دوست کو جوتوں کی شاپس کی نگرانی سونپی ہوئی تھی کہ جیسے ہی کہیں کوئی دکان کھلی۔ کلے مجھے فوراً بتانا ''پشاوری'' جوتا لینا ہے نکاح کے لیے۔

مجھے اپنے بیٹے پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

ایسے بے شمار یادگار مراحل سے گزرتے ہوئے وہ لمحہ بھی آ پہنچا جب میرا بیٹا عصر کے وقت 15 مئی بروز جمعہ 21 رمضان المبارک کو ایک مقدس بندھن میں بندھ گیا۔

اب لے دے کر ایک ماہ کی قلیل مدت رہ گئی تھی شادی میں اور کام ڈھیر سارے باقی تھے۔

یہ لاک ڈاؤن کے سخت ترین دن تھے اور وبا نے بری طرح دنیا کو اپنے بس میں کیا ہوا تھا۔ ہر پل اس پروردگار کا شکر ادا کرتی ہوں جو مرحلہ وار اپنے کرم کی عطا سے ہر مشکل کو آسانی میں بدلتا گیا یوں کہ جیولری بھی تیار کر لی گئی، بری بھی جیسی میں چاہتی تھی الحمدللہ بالکل ویسی ہی تیار ہوئی۔

عین شادی سے پندرہ دن پہلے اسامہ، علی، اعجاز کے تمام کپڑے بھی تیار ہو کر گھر پہنچ گئے جبکہ یہ سب ہونا ناممکن نظر آتا تھا۔ میری اور بیٹی علینہ کی تیاری بھی بہترین انداز میں مکمل ہوئی۔ بارات اور ولیمے پر بھی ردا کی فراہم کردہ بیوٹیشن سے ہی استفادہ کیا گیا۔

نکاح کے موقع پر ریحانہ اعجاز اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ

میرج ہال پر سخت پابندی تھی سو وہاں تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

ہمارے ارد گرد کئی ایسے واقعات دیکھنے میں آئے جب چار/ چھ لوگوں کے جمع ہونے پر پولیس دولھا کو اٹھا کر لے گئی۔

شکر اللہ کا کہ ہم نے پرائیویٹ لان میں بہترین طریقے سے فنکشنز ارینج کیے جس کے لیے اللہ کے بعد اسامہ کے قریبی دوستوں کی شکر گزار ہوں۔ کھانے سے لے کر ڈیکوریشن تک ہر چیز بہترین تھی اور سب سے آخری مرحلہ دولھا کے کمرے کی سجاوٹ بھی جو عین میری خواہش کے مطابق کی گئی بقول اسامہ۔

''مما نے میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کی ہے اس لیے اب باقی سب مما کی پسند سے۔''

میرے بیٹے کی پسند پہلے دن سے ہم سب کی بھی پسند ہے۔ میرے گھر کی یہ پہلی بڑی خوشی تھی جس کے ارمان ہر والدین کی طرح ہمیں بھی تھے سب کچھ حسب خواہش نہیں ہوا لیکن ان نامساعد حالات میں جتنا بھی ہوا الحمدللہ بہترین ہوا بس جو ایک بڑی خواہش تشنہ رہ گئی بینڈ باجے کے ساتھ بارات لے جانے کی تو وہ ان شاء اللہ چھوٹے بیٹے ''علی'' کی مرتبہ پوری ہو جائے گی۔

2020ء کی یہ یادگار شادی ہمارے گھر میں رونق و خوشیوں کا باعث بنی ہے۔ اللہ سے دعا ہے یہ رونقیں یہ خوشیاں سدا قائم رکھنا۔

آمین ثم آمین۔

ایک خوب صورت نشست کا احوال

افتخار شوق

تقریب کے معزز شرکا

پنجاب کونسل آف دی آرٹس ساہیوال ڈویژن کے زیر اہتمام اور اسسٹنٹ کمشنر، ایڈمنسٹریٹر میونسپل کارپوریشن چیچہ وطنی کے تعاون سے 14 نومبر 2020ء کو علامہ اقبال عالمی کانفرنس جناح ہال میں منعقد کی گئی۔ یہ اقدام محکمہ اطلاعات و ثقافت حکومت پنجاب کی زیر نگرانی لیا گیا۔ اس ایک روزہ تقریب میں تین باقاعدہ سیشن رکھے گئے تھے جو نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی سے منعقد کیے گئے۔

اس خیال افروز اور دلکش ادبی تقریب میں بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر علامہ محمد اقبال کی فکر اور بیدار شاعری سے محبت و عقیدت رکھنے والے، نہایت باذوق روشن فکر و نظر کے حامل احباب نے بھرپور شرکت کی۔ نظم و ضبط کے حوالے سے تقریب نہایت کامیاب رہی۔ سب ہی شرکا کی تینوں سیشنز میں توجہ و دلچسپی برقرار رہی۔ اس موقع پر شاعر مشرق علامہ اقبال کے فلسفہ خودی، فلسفۂ آزادیٔ فکر اور نوجوانوں کے لیے ان کی کیا سوچ اور تعلیمات ہیں اس پر بھرپور اظہار خیال کیا گیا۔ تقریب میں نوجوانوں کی بھی خاصی بڑی تعداد تھی جو اپنے قومی شاعر کے پیغام کو بھرپور سمجھنے کی کوشش کررہے تھے۔ سب سے آخر میں اصغر مغل، یونس انصاری، عبدالمتین اور مغل جی کے خوب صورت خطاطی کے فن پاروں
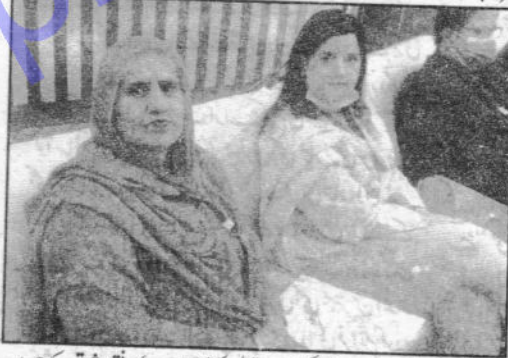
پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین (ڈائریکٹر یس اقبال اکیڈمی لاہور)، افتخار شوق کے ہمراہ

کی نمائش بھی تھی اور اقبال اکادمی پاکستان کی جانب سے بے انتہا پُرمغز اور ضخیم و معلوماتی کتب کی نمائش بھی تھی غرضیکہ ہر حوالے سے یہ ایک جاندار، یادگار اور روح پرور تقریب تھی جس کا مقصد علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے کلام کی معنویت کو اجاگر کرنا تھا اور نسلِ نو کے خیالات اور اقبال کی تعلیمات کو ہم آہنگ کرنے کا ذریعہ تلاش کرنا تھا۔ علاوہ ازیں شاعر مشرق کے افکار کو عہد جدید کے تقاضوں کے مطابق پرکھنے کی مثبت ترغیب بھی دینا تھا۔

میں بحیثیت ماہر تعلیم آج کے نوجوانوں کو یہ ترغیب دوں گی، نصیحت کروں گی کہ اپنی تعلیم کے ساتھ، ساتھ اپنے مشاہیر کے حالات زندگی اور بلند اور مثبت سوچ و فکر رکھنے والی کتب کو شاملِ مطالعہ ضرور رکھیں۔ ایسی تقاریب روح و ذہن کی بالیدگی کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہیں۔ ادارہ پاکیزہ ہمیشہ ہی تعاون کرتا ہے اور تمام قارئین بھی بالغ نظری اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہیں تبھی میرا بھی دل چاہا کہ اپنے دور بیٹھے دوستوں کو بذریعہ تحریر اس تقریب میں شامل کروں......

جناب منیب اقبال نے کہا کہ کلیات اقبال ہر بچے کے بستے میں ہونی چاہیے اور کتاب سے محبت کے کلچر کو فروغ دیں، کتاب کو اپنا ہم سفر بنائیں......نور حسین (اقبال کے والد) کا نور ان کے پوتے میں جھلک رہا تھا۔ اس تقریب نے ثابت کردیا کہ چھوٹے شہروں میں بھی بڑی تقریبات نہایت کامیابی سے ہوسکتی ہیں۔

☆☆☆

افتتاحی سیشن کی صدارت جناب منیب اقبال (جانشین علامہ اقبال) نے کی جبکہ کلیدی خطبہ پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران (اسلام آباد) نے دیا۔ مہمانان خصوصی میں رائے مرتضیٰ اقبال (ممبر قومی اسمبلی) ڈاکٹر عبدالرؤف رفیقی (یونیورسٹی آف بلوچستان) پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین (ڈائریکٹریس اقبال اکادمی پاکستان) اور سید تقی عابدی نے کینیڈا سے بطور خاص آن لائن شرکت کی۔

خطبۂ استقبالیہ ڈاکٹر ریاض ہمدانی نے پڑھا جبکہ نظامت پروفیسر منیر ابن رزمی نے نہایت کامیابی سے کی۔ سیشن کے اختتام پر تحائف کی تقسیم اور گروپ فوٹو کے بعد پُرتکلف ظہرانہ دیا گیا۔

دوسرا سیشن پروفیسر مظفر وڑائچ (ساہیوال) کی نگرانی

افتخار شوق کے بھانجے منیب اقبال کے ہمراہ

میں شروع ہوا جس میں مہمان خصوصی، فضل الرحمن فاضل تعینات (افغانستان) نے آن لائن شرکت کی۔

مہمانان اعزازی میں ڈاکٹر محمد آصف۔ (ملتان) اور ڈاکٹر اعجاز الحق اعجاز (لاہور) شامل تھے۔

مقالہ نگاران میں ڈاکٹر عروبہ مسرور (لاہور) اور پروفیسر ڈاکٹر روبینہ یاسمین (اسکالر اسلامیہ یونیورسٹی پشاور) شامل تھیں۔ جبکہ نظامت: محمود احمد جو (چیچہ وطنی) کی معروف سماجی شخصیت ہیں نے کی۔

☆☆☆

اختتامی نشست کا احوال کچھ یوں ہے کہ اس میں صدارت پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران (اسلام آباد) نے کی اور اس پُروقار تقریب کے اختتامی کلمات: رائے مرتضیٰ اقبال خان نے ادا کیے جبکہ پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان، پروفیسر منیر ابن رزمی، پروفیسر محمد علی و دیگر مہمان اسکالرز نے نہایت مدلل اور پُراثر اظہار خیال کیا۔ اظہار تشکر کے دل پزیر کلمات ڈاکٹر ریاض ہمدانی نے ادا کیے۔ اس آخری سیشن کی نظامت پروفیسر محمد اقبال عابد نے کی غرضیکہ ہر لحاظ سے یہ تقریب نہایت جامع پُروقار اور دل نشین ثابت ہوئی۔ دعا ہے کہ ہماری نوجوان نسل بھی ایسے ہی تجدیدِ عہد وفا کرتی رہے۔

❀❀❀

وہ آئے بزم میں

نزہت اصغر

سینئر پروڈیوسر، صداکار، کمپیئر، شاعرہ اور پاکیزہ کی خیر خواہ

سیمارضا ردا

کی خوب صورت باتیں

موسم سرما کا لطف اٹھاتی پیاری بہنو سال 2020ء کے اس آخری شمارے میں ایک بہت ہی متنوع اور باصلاحیت شخصیت سے ملاقات کروا رہے ہیں۔ اتنے شعبوں میں اپنی شاندار کارکردگی دکھانے کے باوجود طبعیتاً وہ بہت ہی سادہ ہیں، بے حد ملنسار ہیں اور صلاحیتوں کی قدر دان بھی۔ جی بہنو! آج ہماری بزم معروف لکھاری اور براڈ کاسٹر سیمارضا کی آمد سے سجی ہے۔ آیئے ان سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... جی سیما، کافی عرصے سے ہم آپ کی مصروفیات کچھ کم ہونے کے انتظار میں تھے۔ پہلے آپ اپنے ناول کی طباعت کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ اب بتائیں کہ کیا حال احوال ہیں؟

سیمارضا ❖...... اللہ کا شکر ہے۔ حال بہت اچھے ہیں، نہ گلہ ہے دوستو کا نہ شکایتِ زمانہ۔ (بہت خوب بھئی)

پاکیزہ ✧...... چلیں مصروفیت تو خیر کم نہیں ہوتی اور آپ جیسی شخصیت جو بیک وقت صداکار، سینئر پروڈیوسر،

براڈ کاسٹر، مصنفہ، شاعرہ، کمپیئر اور بھی جانے کتنی ہی ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں تو اس میں وقت نکالنا کچھ مشکل ہو جاتا ہوگا ناں؟

سیمارضا ❖......آپ نے بالکل درست کہا......مختلف جہتوں میں کام کرنا اتنا آسان بھی نہیں......لیکن اگر آپ دیکھیں تو یہ سارے راستے ایک ہی سمت جاتے ہیں اور ان ہی راستوں سے وقت کا تعین ہوتا ہے۔ بس وقت کو استاد سمجھ کر اس کی مریدنی بن گئی اور وقت نکالنا آسان ہو گیا۔

پاکیزہ ✧......اب ہم باقاعدہ سوالات کا آغاز آپ کے بچپن سے کرتے ہیں کہ یہ لکھنے لکھانے، پڑھنے کا ادبی ذوق کب بیدار ہوا یا یوں سمجھیں کہ کب پہلی تحریر منظرِ عام پر آئی؟

سیمارضا ❖......اچھا! اپنے لکھنے لکھانے اور پڑھنے سے بہت پہلے ہمارے گھر کا ماحول ہی ایسا تھا۔ میرے ابو بے حد پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انگریزی میگزین کے ساتھ انگریزی ناول اور ادبی شاہکار کتابیں بھی گھر میں تھیں۔ اردو ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ میرے ابو کے مطالعے میں شامل تھے اور بہت کم عمری سے ایک تجسس نے مجھے ان کتابوں کے قریب کیا کہ آخر میرے ابو اتنے شوق سے انہیں کیوں پڑھتے ہیں۔ پہلی تحریر بچوں کے رسالے میں چھپی تھی جو ایک معصوم سی کہانی تھی۔ (ہنستے ہوئے) پھر سلسلہ بنتا چلا گیا۔ (واہ بہت خوب)

پاکیزہ ✧......اسی طرح شعر گوئی کے بارے میں بھی بتائیں کہ پہلا شعر کب وارد ہوا؟

سیمارضا ❖......بھئی ہمیں شعر کہنے کا بہت شوق تھا مگر بہت دنوں بعد احساس ہوا کہ شعر کی تو آمد ہوتی ہے کچھ خیال تو باندھا میں نے شعر کہے، نظمیں کہیں، غزلیں بھی مکمل کیں، مختلف رسالوں میں بھی چھپیں، ادھورے مصرعے کہتی تھی ابو مکمل کرتے تھے، تصحیح کرتے تھے۔ پہلے، پہلے یہ اشعار وارد ہوئے۔

ہوں جن اقوال پہ سب عمل پیرا
وہی زریں اصول ہوتے ہیں
ہم تو جھیلیں گے دکھ زمانے کے
آپ ناحق ملول ہوتے ہیں

پاکیزہ ✧......ویسے تو کہتے ہیں بچپن سے شوق تھا۔ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟

سیمارضا ❖......جی بالکل بچپن سے شوق تھا مگر کالج تک پہنچتے ہی یہ شوق پروان چڑھا، بیت بازی کے مقابلوں نے شعری فضا ہموار کردی......بس ادھوری فائلیں پڑھتے ہوئے عمریں کٹیں۔

پاکیزہ ✧......گھریلو ماحول تو خیر اثر انداز ہوتا ہے۔ آپ کے گھر والوں نے کس حد تک ساتھ دیا؟

سیمارضا ❖......گھریلو ماحول میں، میرے والد کا

دائیں سے سیمارضا، افشاں آفریدی، دردانہ نوشین خان، عذرا رسول اور نزہت اصغر (مظفر گڑھ سے تشریف لائی نامور رائٹر دردانہ نوشین خان کے ساتھ خصوصی نشست......جس میں جرمنی سے آئی معروف قلم کار افشاں آفریدی نے بھی خصوصی شرکت کی)

کردار بہت اہم ہے۔ وہ بہت روشن خیال تھے۔ اور میری امی ان کے اصولوں کا احترام کرتی تھیں۔

پاکیزہ ✧...... ریڈیو پر کیسے آمد ہوئی؟ آپ کی آواز، انداز، لہجہ تو بلاشبہ بہت نرم، خوب صورت، پُراثر اور متاثر کُن ہے۔ یہ احساس آپ کو خود ہوا یا جوہری نے جوہر تلاشا؟

سیما رضا ❖...... ریڈیو پر آمد...... کالج سے ہی بزم طلبہ پروگرام میں حصہ لیتی تھی۔ 60 سیکنڈ میں تحریر پڑھی اور پھر بزم طلبہ کرتی رہی...... جب یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئی تو نیلوفر عباسی (معروف آرٹسٹ) کے شوہر جناب قمر علی عباسی مرحوم نے جو اُن دنوں ریڈیو پاکستان، کراچی کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے میری آواز سنی، میری تحریر کا انداز دیکھا اور مہر بلقیس صاحبہ (پروڈیوسر) ہوا کرتی تھیں ان کے ساتھ منسلک کر دیا...... یوں آواز کو راستہ مل گیا...... بلاشبہ اس کا سہرا بہت سے لوگوں کو جاتا ہے۔ سائرہ غلام نبی جو میری بہت عزیز سہیلی ہیں، وہ بھی مجھے پکڑ کر ریڈیو لے گئی تھیں۔ آواز اور لہجے کا احساس بہت سے لوگوں نے دلایا اور اب بھی دلاتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی وضع پہ قائم ہیں۔ (ٹیلنٹ تو ہے ناں، اس میں کیا کسرِ نفسی)

پاکیزہ ✧...... اس کے ساتھ، ساتھ آپ کے لکھنے کا سفر بھی جاری رہا۔ آپ کے نزدیک نثر اور نظم ...... کیا خوب صورت ذریعۂ اظہار ہے؟

سیما رضا ❖...... لکھنے کا سفر مسلسل جاری رہا، جاری ہے۔ ریڈیو، ٹیلی وژن اور مختلف میگزین میں خوب لکھا۔ نثر اور نظم دونوں خوب صورت اظہار ہیں۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں شعبوں میں مہارت ہو۔ (جی بالکل درست کہا ہنر اور صلاحیت اپنا راستہ خود بناتے ہیں)

پاکیزہ ✧...... اچھا کچھ اپنی فیملی کے بارے میں مختصراً بتائیں؟

سیما رضا ❖...... میرے والدین حیات نہیں۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، (آمین) میری ایک چھوٹی بہن نائمہ شاہد ہیں جو شادی شدہ ہیں۔ میں نے بہت دیر میں شادی کی اور اپنی پسند سے کی۔ ”خودسر جو ہوں“ اور اس کی وجوہات بہت ساری ہیں۔ شوہر بہت خوش اخلاق مگر غصے کے سخت ہیں مگر اچھے ہیں شاید سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ (ارے شوہروں کے غصے میں بھی پیار ہوتا ہے مگر عزت، احترام، خیال ضرور ہونا چاہیے)

پاکیزہ ✧...... بچپن / لڑکپن کی یادیں تو بہت ہوں گی مگر کچھ ایک آدھ ہم سے بھی شیئر کریں کہ جس یاد نے آپ کے کیریئر کو ایک رخ دیا یا مددگار ثابت ہوا۔ وہ لمحہ...... وہ یاد...... وہ تاثر......؟

سیما رضا ❖...... بچپن کی یادیں، لڑکپن کی یادیں تو بہت ہیں مگر والدین کی وفات کے بعد دنیا ایک نئے روپ میں سامنے آتی ہے، بہت قریب سے دیکھا تو پتا چلا کہ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ وہ کچھ سال میں نے بہت تکلیف میں گزارے۔ پھر اللہ نے آسانیاں دیں...... اور مہربان مشفق لوگوں سے ملا دیا تو زندگی گلزار ہوگئی۔ الحمدللہ ...... بہت کرم ہے...... پھر میں سوچتی ہوں تو مجھے اللہ پر بڑا پیار آتا ہے کہ وہ پہلے توڑتا ہے اور اس کے بعد انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔ (یہی تو امتحان، برداشت، صبر کی منزل ہے اور پھر انعام الحمدللہ)

پاکیزہ ✧...... سچی بات ہے سیما آپ خود انٹرویوز کی ماسٹر ہیں۔ بہت ہی عمدہ اور جامع سوالات کرتی ہیں اس لیے ہمیں ذرا دقت پیش آرہی ہے کہ کیا، کیا پوچھیں...... آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟

سیما رضا ❖...... انٹرویو ضرور کرتی ہوں...... لیکن نزہت آپ نے سوالنامہ بہت محنت سے مرتب کیا ہے بلکہ مجھے دقت ہو رہی ہے جواب دینے میں...... آپ جو چاہیں سوال کریں...... آپ کو اختیار ہے...... اب آپ کا خیال کیا ہے؟ (نوازش ڈیئر)

پاکیزہ ✧...... اچھا اپنے تعلیمی مدارج کے دوران ہی آپ نے زانوئے ادب طے کیا، مطلب باادب تو ہوں گی مگر ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا یا خود اپنی تخلیقات کے ساتھ شامل ہونا کچھ اس کے بارے میں بتائیں؟

سیما رضا ❖...... اپنے تعلیمی مدارج کے ساتھ ہی ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی، کالج میں بیت بازی میں حصہ لینا، ادبی نشستیں، افسانہ پڑھنا پھر تنقید کی زد میں آنا...... سیرت کوئز، اقبال کوئز، مشاعروں کی نظامت، آرٹس کونسل اور اس سے ملحقہ جگہوں میں کمپیئرنگ کرنا، اپنی تخلیقات پیش کرنا...... پھر سب کے

روبرو اپنی تحریر کا فیصلہ سننا ایک بڑا امتحان تھا۔ ان نشستوں میں، میں نے بہت حصہ لیا...... اور اپنی نئی تخلیق کو جید شعرا اور نثر نگاروں کے مقابل پیش کیا...... اس سے بہت کچھ سیکھا۔ (واہ پھر تو آپ کی خوب تربیت ہوئی جبھی تو ہر شعبے میں ماشاءاللہ باصلاحیت ہیں۔)

پاکیزہ ✧...... آپ کا مطالعہ بھی یقیناً وسیع ہوگا۔ اپنے ہم عصروں میں کن رائٹرز سے متاثر ہیں؟ ویسے یہ سوال مشکل ہوتا ہے یوں سمجھیں کس قسم کے موضوعات پسند کرتی ہیں؟ کن تحریر نگاروں کو بار بار پڑھنا چاہتی ہیں؟

سیمارضا ❖ .... یہ سوال بہت مشکل ہے، مطالعہ وسیع تو نہیں ہے مگر پڑھتی ضرور ہوں...... مجھے موضوعات...... ذات سے لے کر کائنات تک پسند ہیں...... بشریٰ رحمٰن کو بہت پڑھا...... بانو قدسیہ اور جمیلہ ہاشمی کو پڑھا...... اور ان کو بار، بار پڑھنا چاہتی ہوں۔ ہم عصروں کے بارے میں رائے محفوظ ہے۔ (ہم...... م...... م...... محتاط انداز)

پاکیزہ ✧...... آپ کے دوست احباب کا حلقہ بھی وسیع ہے اس بات سے اتفاق یا اختلاف کریں گی کہ......

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔

سیمارضا ❖...... سو فیصد اتفاق ہے۔

پاکیزہ ✧...... ماہنامہ پاکیزہ سے دوستی کا احوال بتائیں...... کچھ یادیں، باتیں اس حوالے سے ہمارے قارئین کو بھی بتائیں؟

سیمارضا ❖...... ماہنامہ پاکیزہ سے دوستی کا رشتہ 2000ء میں قائم ہوا۔ انجم انصار بارش کا پہلا قطرہ بنیں...... انہوں نے بہت حوصلہ افزائی کی...... پھر عذرا رسول صاحبہ سے پاکیزہ کی تقریب میں ملاقات رہی...... بہت ملنسار ہیں وہ...... اور یوں محبتوں کا سفر ابھی تک قائم ہے...... اس کو قائم رکھنے میں نزہت اصغر آپ کی کاوشوں کو سلام۔ (بس جی آپ نے اس دوستی کی، تعلق کی قدر کی...... شکریہ)

پاکیزہ ✧...... لٹریری فیسٹیول، بک فیئر، لوک میلا، پھولوں کی نمائش، یہ ذہن و دل کو کھولنے والے ایونٹس ہیں۔ ان سے کس حد تک فیض اٹھایا؟

سیمارضا اپنی عزیز ترین دوست سائرہ غلام نبی کے ہمراہ

سیما رضا ❖...... بالکل، یہ تمام ایونٹس ذہن و دل کھولتے ہیں...... جب، جب موقع ملا ان تمام جگہوں پر شرکت کی...... لٹریری فیسٹول سے کئی کتابیں خرید کر دوستوں کو تحفے میں دیں۔ اپنی بک شیلف کی زینت بنایا...... لوک میلے میں جانے کا اتفاق کم ہوا مگر جب بھی گئی تو اپنے ملک کی ثقافتوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ شیشے، مکرامے سے سجی ٹوپیاں، رلیاں، بیگز اور نادر کڑھائیاں میری کمزوری ہیں...... مگر خریدنے میں مہنگی بھی ہیں...... ہر خواہش پر دم نکلنے والی بات ہے۔ (ہاں غیر ملکی خوب خریدتے ہیں۔ دوسرے اصل کاریگر اور ہنرمند کو تو بہت تھوڑا معاوضہ جاتا ہے بس یہ مارکیٹنگ کے کرشمے ہیں)

پاکیزہ ✧...... اپنا کراچی...... اپنا پاکستان...... کیسا دیکھنا چاہتی ہیں؟

سیمارضا ❖...... ہائے کراچی...... یہ شہر تو میری نس، نس میں سمایا ہے، میری جائے پیدائش یہی ہے...... کراچی کے ساحل سمندر دلکش خوب صورت کراچی، بچپن سے اب تک کراچی جیسا کوئی شہر نہیں دیکھا...... اور اپنے پیارے پاکستان کو سرسبز و شاداب دیکھنا چاہتی ہوں، کرپشن سے پاک پاکستان...... مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ (چاہتیں حقیقت بھی بن جاتی ہیں فکر نہ کریں)

پاکیزہ ✧...... آپ نے اپنا علم و ہنر، اپنی صلاحیتیں

دوسروں تک پہنچانے میں بخل سے کام لیا یا فیاضی سے؟ یہ اس لیے پوچھا کہ ریڈیو کے حوالے سے نئے آنے والوں کی کس طرح رہنمائی کرتی ہیں؟

سیما رضا ❖ ......ہمیشہ بہت فیاضی سے کام لیا ہے......حدیث مبارکہ ہے خیر الناس من ینفع الناس، ترجمہ......لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا اللہ کے ہاں بہترین شخص ہے......میں آپ کو بتاؤں کہ میرے ابو بیک وقت تین کام ایک ساتھ کرتے تھے، نوکری، ٹیوشن سینٹر، ڈاکٹری......انہوں نے اپنی ذات سے مرتے دم تک لوگوں کو فائدہ پہنچایا......مفت علاج کیا۔ پاکستان نیوی ڈاکیارڈ میں تھے تو بہت سے بیروزگار لوگوں کے لیے نوکری کے راستے آسان کیے......اور وہ لوگ آج تک میرے والد کو دعائیں دیتے ہیں......تو بس پھر اپنے والد کے نقشِ قدم پر ہوں......جو کچھ میں نے سیکھا سچائی سے اپنے ساتھ نئے لوگوں کو سکھایا......پوری ایمانداری کے ساتھ اور انہیں راستہ دیا۔ جو باظرف ہوتے ہیں وہ ہر مقام پر ضرور نام لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت محبتیں ملیں......میں نے زندگی سے یہ سبق سیکھا ہے کہ جب آپ کسی کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں اور اسے وہ کچھ دیتے ہیں جو آپ کا علم اور تجربہ ہے تو آپ کی شخصیت مزید نکھرتی ہے اور سنورتی ہے۔ بخدا اس کے ثمرات میں نے اپنی شخصیت میں ہر لمحہ محسوس کیے......اور اندر کا اطمینان حاصل رہا......یہ بھی اللہ کی شکر گزاری ہے۔ (بہت خوب صورت بات لی سیما، اس حوصلہ افزائی کے تو ہم خود بھی گواہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی مثبت طرزِ فکر سب کو دے، الٰہی آمین!)

پاکیزہ ✧......ریڈیو پر رہتے ہوئے آپ نے ڈھیروں ڈھیر پروگرام کیے۔ مختلف دن، تہوار اور محفلیں منعقد کیں، ان سب میں ٹیم ورک ہوتا ہے یا آپ کی اکیلے کی کوششیں؟

سیما رضا ❖......بے تحاشا پروگرام کیے......میرے ہر آئیڈیا کی میرے سینئرز نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ مجھے اعتماد ملا......اُن کے اعتبار سے ہی ٹیم ورک ہوجاتا ہے جو کامیابی کی دلیل ہے۔ اس ضمن میں عفت تقی، سبطین جعفری، ربیعہ اکرم، شگفتہ آفتاب نے ہمیشہ میری ذہانت کی قدر کی اور میرے کام کو آگے بڑھایا۔ (بلاشبہ اپنے سینئرز اور ساتھی افراد کے اعتماد اور تعاون سے صلاحیتیں اور نکھرتی ہیں)

پاکیزہ ✧......ہم جس جگہ کام کررہے ہوں۔ کسی بھی شعبے میں تو اپنے آس پاس، اردگرد ہر قسم کے لوگوں سے نمٹنا پڑتا ہے۔ آپ کی حکمتِ عملی کیا ہوتی ہے؟

سیما رضا ❖......شعبہ کوئی بھی ہو، خواتین کے لیے ہر جگہ مشکلات ہیں......اردگرد کے لوگوں سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے کہ کام کی جگہ پر خواتین کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے......حد درجہ خوش اخلاقی ان کو گلے پڑجاتی ہے۔ اس لیے بہت احتیاط کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ ہم چاہیں چاند پر چلے جائیں یا ستاروں پر کمند ڈال دیں۔ مردوں کے منفی رویے سے نہیں بچ سکتے......لہٰذا حکمتِ عملی احتیاط میں پنہاں ہے۔ (بے شک اپنی عزت اپنے ہاتھ)

پاکیزہ ✧......خوش اخلاقی، مروت، رواداری، درگزر جیسی خصوصیات کبھی خود اپنے لیے مشکلات پیدا کردیتی ہیں یا نہیں؟

سیما رضا ❖......اُف اللہ ایسی ویسی، ارے بہت مشکلات پیدا کردیتی ہیں، یہ تمام باتیں جو آپ نے پوچھی ہیں......مجھے تو اتنے تجربات ہوئے ہیں زندگی میں کہ کیا بتاؤں......بچپن میں امی میری خوش اخلاقی پر بہت چڑتی تھیں اور بہت ڈانٹتی تھیں مگر اس وقت ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا اور آج جب کبھی مروت اور خوش اخلاقی گلے پڑجاتی ہے تو امی کے الفاظ کانوں میں گونجتے ہیں۔ ”ارے اس کا بس چلے تو یہ کسی راہ چلتے کو بلا کر گھر میں بٹھائے اور چائے پلوائے اور پھر ہماری گرہستی لٹوادے......“ پھر امی غصے سے ہاتھ جوڑتیں اور دو ہتڑ بھی رسید کرتیں اور آج بھی یہ مرض ہے میرے اندر مگر کچھ کم ہوا ہے زیادہ نہیں......اور درگزر کا جہاں تک معاملہ ہے تو درگزر ضرور کرتی ہوں......اور اللہ کے حوالے معاملہ کردیتی ہوں۔ (بے شک وہی معاملات کو سنبھالنے والا ہے)

پاکیزہ ✧......آپ دوسروں کو سراہنے اور ان کے ٹیلنٹ ابھارنے میں بھرپور کردار ادا کرتی ہیں۔ کبھی منفی خیالات تو پیدا نہیں ہوتے کہ یہ ہم سے آگے نکل جائے گا؟

سیما رضا ❖......بالکل، دوسروں کے ٹیلنٹ کو

ریڈیو پاکستان کراچی کا مقبول و دلچسپ پروگرام ''یادوں کی پیالی میں باتوں کی چائے'' کے موقع پر سیمار رضا، طلعت اقبال سے مصروف گفتگو

ابھارنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتی ہوں...... ہمیشہ سچے دل کے ساتھ کام سکھایا ہے، منفی خیالات کبھی مجھ پر حملہ آور نہیں ہوتے...... جن لوگوں نے میرے ساتھ کام کیا ہے وہ آج بھی مجھے دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ اور آگے وہ ہی نکلتا ہے جو محنت کرتا ہے۔ جن لوگوں نے میرے ساتھ کام کیا ہے، وہ پیچھے مڑ کر ضرور دیکھتے ہیں......فون پر بات کرتے ہیں، ایسے لوگ تو میرا ایوارڈ ہیں...... ان کے آگے نکلنے کا مطلب ہے میں آگے نکلی ہوں...... میرے اللہ کا مجھ پر کرم ہے۔ (جی دوسرا بھی ایسی قدر دانی کرے تو واقعی اللہ کا شکر ہے)

پاکیزہ ✧...... بھئی اب سوال تو طرح، طرح کے پوچھے جائیں گے لیکن آپ بور تو نہیں ہو رہی ناں؟

سیمار رضا ❖...... ہرگز بور نہیں ہو رہی ہوں...... آپ کے سوال تو بڑے زبردست اور دلچسپ ہیں لطف آیا ہے پوچھیے ضرور پوچھیے۔ (جی شکریہ)

پاکیزہ ✧...... اچھا اپنی پروفیشنل لائف کے علاوہ کیا، کیا مشاغل، شوق ہیں جن میں وقت صرف کرنا اچھا لگتا ہے؟

سیمار رضا ❖...... لکھنا اور پڑھنا بہترین مشاغل ہیں، کوکنگ کرنا مجھے اچھا لگتا ہے...... اور دل چاہتا ہے کہ بہت پڑھوں اور جو پڑھوں مجھے ازبر ہو جائے۔ میں لیکچرز دے رہی ہوں...... اور آج کل کورس کنسلٹنٹ کے طور پر ایک ادارے سے وابستہ ہوں...... گارڈننگ کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ کاش ایک نرسری میرے قبضے میں آجائے تو میں خود کو بہت خوش نصیب سمجھوں گی۔ (ڈیئر ہمیں بھی گارڈننگ کا بہت شوق ہے، چلیں مل کر پلان کرتے ہیں کیونکہ ایک پودے سے ہزار پودے بن سکتے ہیں بس مناسب دیکھ بھال چاہیے ہوتی ہے)

پاکیزہ ✧...... دوستوں کی دوست ہیں...... مگر کس حد تک؟

سیمار رضا ❖...... دوستوں کی دوست ہوں...... دوست کا لطف تو احسان ہے جب ہو جائے۔ کیونکہ میری ساری دوستیں بہت اچھی ہیں...... اور دوستی کی حد تو ستاروں سے بھی آگے ہے مگر خوشی اور غمی میں دوست، دوست ہیں۔ (بے شک یہ خوش نصیبی ہوتی ہے کہ بے ریا اور پُرخلوص دوست میسر آجائیں) میرے سارے دوستوں کی مثال گلاب کے پھول کی طرح ہے۔ گلاب جو پھولوں کا بادشاہ ہوتا ہے کہ جن سے ملائیں ہاتھ تو خوشبو نہ ہاتھ کی جائے...... کچھ پھولوں کے نام غزالہ رشید، سائرہ غلام نبی، شائستہ زریں، صائمہ نفیس، میمونہ شمیل، ہما بیگ، رضوانہ پرنس، سیما مناف، افشاں آفریدی، تنویر عشرت، شگفتہ شفیق، منزہ سہام، عینی اور عنبرین حسیب عنبر۔ (بہت اچھے)

پاکیزہ ✧...... ناپسندیدہ افراد کون ہیں...... مطلب عادات، اطوار، اخلاق کے حوالے سے؟

سیمار رضا ❖...... جن میں منافقت کوٹ، کوٹ کر بھری ہو، جو اپنے مفاد کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوں اور ایسے لوگ بہت جلد پکڑ میں آجاتے ہیں...... اور چالاک لوگ مجھے قطعی پسند نہیں۔ (چالاک بیچارے نادان ہوتے ہیں اپنی دانست میں سمجھتے ہیں بڑا تیر مار لیا)

پاکیزہ ✧...... اگر کسی ناپسندیدہ فرد کے ساتھ کام کرنا پڑ جائے تو کیا کرتی ہیں؟ کہیں اپنی صلاحیتیں تو متاثر نہیں ہوتیں؟

سیمار رضا ❖...... اچھا سوال ہے، صلاحیتوں کا امتحان ناپسندیدہ فرد کے ساتھ کام کرنے میں ہی آتا ہے۔ صلاحیتیں متاثر بھی ہو سکتی ہیں اور صلاحیتیں نکھر بھی سکتی ہیں...... صرف خود میں قوتِ برداشت پیدا کرنا ہے...... اور ذہن کو ہر لمحہ حاضر رکھنا ہے...... کامیابی اور ناکامی انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ (بہت خوب صورت جواب دیا)

پاکیزہ ✧...... اچھا اب ذرا اپنی پسند و ناپسند بھی

بتائیں۔ مثلاً پسندیدہ رنگ، موسم، ذائقہ، نام، مشروب، کھانا، تفریحی مقام، جملہ، تہوار، لباس، رشتہ، شخصیت، کتاب، کوئی شعر بھی بتائیں۔

سیما رضا ❖...... پسندیدہ رنگ، سفید، سبز، سردی کا موسم، میٹھا اور نمکین دونوں، بی بی ہاجرہ کا نام اور شخصیت بھی، انار کا مشروب، پلاؤ اور شامی کباب۔ ساحل سمندر، الحمد للہ، عید الفطر، کرتا، جوڑی دار پاجامہ۔ والدین...... رشتے تو سب ہی محترم ہوتے ہیں۔ والدین (ماں، باپ) ایسا انمول رشتہ تو ہو ہی نہیں سکتا...... باقی رشتے وقت کی دھول میں اپنا رنگ بدلتے ہیں۔ مگر والدین کے رشتے کا رنگ پکا ہوتا ہے۔ (درست کہا)

پسندیدہ شعر: بہت سارے شعر پسندیدہ ہیں مگر ایک شعر آپ کی نذر......

وفا، خلوص، محبت ضرور ہوں گے کہیں
کبھی ملیں تو تبرک سمجھ کے لے آنا

پاکیزہ ✧...... شاعری کے حوالے سے کچھ بات ہو جائے۔ کوئی مجموعہ منظرِ عام پر آیا؟

سیما رضا ❖...... شاعری کا جہاں تک معاملہ ہے میں نے اس کو سنجیدہ نہیں لیا...... جب بھی کوئی خیال آیا اسے نظم اور غزل کی صورت میں ڈھال لیا۔ مگر یہ بہت مشکل فن ہے...... اس لیے جو کچھ بھی لکھا چھپا کر لکھا۔ مجموعے کی طرف توجہ نہیں دی...... مگر مشاعرے ضرور پڑھے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کو بے شمار اشعار ازبر ہیں اور بروقت یاد بھی آجاتے ہیں۔ واقعی یہ زبردست صلاحیت ہے، ماشاءاللہ۔ آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں؟

سیما رضا ❖...... اللہ کا کرم ہے کہ اشعار واقعی بہت ازبر ہیں...... اسکول، کالج، یونیورسٹی کے زمانے سے ہی اچھے علمی و ادبی لوگوں کا ساتھ رہا...... تو یہ صلاحیت پنپتی چلی گئی...... بیت بازی میں بہت حصہ لیا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگرامز میں حصہ لیتی رہی، شرکت کرتی رہی...... موضوعاتی بیت بازی کے فن نے اور بھی نکھار دیا۔ اس لیے اشعار حسبِ حال یاد رہ جاتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... ماشاءاللہ! سیما آپ بہت باصلاحیت ہیں پھر بھی کسرِ نفسی سے کام لیتی ہیں۔ یقیناً یہ آپ کی تربیت ہی ہوگی؟

سیما رضا ❖...... اللہ کا احسان ہے کہ اس نے بہترین ذہن دیا...... لیکن ساری بات یہ ہے نزہت کہ جس نے اللہ کے لیے جھکنا سیکھ لیا۔ وہی علم والا ہے...... کیونکہ علم کی پہچان عاجزی ہے۔ اور میں بہت نہ سہی مگر اس دائرے میں رہنے کی کوشش کرتی ہوں...... اور یہ میرے والدین اور استاد کی تربیت ہے۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... اچھا نوجوان بچیوں کو کوئی پیغام دیں۔ کس طرح سے وہ اپنی صلاحیتیں، اپنا ہنر اجاگر کریں؟

سیما رضا ❖...... ادب زندگی کا قرینہ ہے...... علم جب تک حاصل نہ ہوگا جب تک آپ ادب کو نہیں اپنائیں گے۔ ادب میں آپ کی شخصیت پنہاں ہے، احترام اور ادب کے رشتے کو اپنائیں گی تو وہ سب کچھ ملے گا جس کی آپ تمنا کرتی ہیں۔ (جی بالکل)

پاکیزہ ✧...... ہماری یہ بزم آپ کو کیسی لگی، اپنے خیالات سے ضرور آگاہ کریں؟

سیما رضا ❖...... آپ کی بزم بہت اچھی لگی...... بہت سادہ اور معیاری بزم تھی اور آپ کو بزم پر چھانے کا ہنر آتا ہے، سوالات کے ذریعے میرے ذہن کی بہت ساری گرہیں کھلیں۔ اگر آپ اس بزم میں سوالات کا جال نہ بچھاتیں تو پھر پھیکی، پھیکی محفل ہوتی۔ آپ نے مجھے موقع دیا کہ یادوں کے دریچے سے میں اپنے آپ کو تلاش کر سکوں...... بہت مہربانی آپ کی۔ (ہم تو کافی عرصے سے چاہ رہے تھے مگر کبھی آپ مصروف کبھی ہم اچھا ہوا کچھ دیر مل بیٹھے)

پاکیزہ ✧...... اپنی شاعری سے کچھ قارئینِ پاکیزہ کو بھی لطف بخشیں...... ارشاد......

سیما رضا ❖...... شاعری کم، کم کی ہے...... مگر پھر بھی غالب کی زمین میں ایک غزل کہی تھی۔ مصرعہ تھا......

بخش دو گر خطا کرے کوئی......

زمانہ طالب علمی کی یاد سے......

زخم ہو تو سیا کرے کوئی
درد کی کیا دوا کرے کوئی
ہم وفاؤں سے منہ نہ موڑیں گے
جتنی چاہے جفا کرے کوئی
رابطہ چاہیے ہے آپس میں
ہم کو غم ہی عطا کرے کوئی

ساری دنیا ہی ایک جیسی ہے
کس کا، کس کا گلہ کرے کوئی
وہ سراسر ہے پر جفا لیکن
دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
بات اچھی کہی ہے غالب نے
بخش دو گر خطا کرے کوئی
جب زمانہ ہی بے وفا ہے ردا
کیا کسی دل میں جا کرے کوئی

(سبحان اللہ، بہت خوب)

پاکیزہ✧......ہاں سیما اپنے معرکتہ الآرا ناول عشق ابن السبیل کے بارے میں بھی ضرور بتائیں؟

سیما رضا✧......عشق ابن السبیل بنیادی طور پر دنیاوی راستوں سے گزرتا ہوا اللہ کی راستوں کی تلاش ہے۔یوں تو اس ناول کا شمار پاپولر فکشن میں ہوتا ہے کہانی کے جو مختلف باب ہیں اس میں عام کہانیاں ہیں اور ہر کہانی کی سطح مختلف ہے۔ایک ایسی بچی کی بھی کہانی ہے۔ جو بچپن سے وعدے کی زنجیر میں لپٹی ہوئی ہے اور وہ وعدہ اس کے ذہن میں بس چکا ہے جس سے وہ ہر لمحے ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہتی ہے اور ایک ایسی لڑکی کی بھی کہانی ہے جسے ہم عرفِ عام میں دہریہ کہہ سکتے ہیں پھر ایک لڑکا اپنے کردار سے اسے مسلمان کرتا ہے اور یہی بات اسے اللہ کے راستوں پر گامزن کرتی ہے تو عشق ابن السبیل اللہ کے راستوں کی تلاش ہے۔دونوں قوتیں اس ناول کا حصہ ہیں شیطانی بھی اور رحمانی بھی۔

پاکیزہ✧......بہت شکریہ سیما یقین جانیں آپ کے خیالات جان کے بہت لطف آیا۔

☆☆☆

عزیز قارئین ...... سیما رضا سے ملاقات کیسی رہی اپنے خیالات سے ضرور آگاہ کیجیے گا اب اس چھوٹی سی بات کے ساتھ اجازت کہ اللہ کی یاد میں مشغول ہونے کے ساتھ، ساتھ اللہ کے بندوں کی خبر گیری ضرور کیجیے کہ یہی مقصدِ حیات ہے،خوش رہیے، اپنی اور اپنے پیاروں کی محبت کا ضرور خیال رکھیں، ان شاء اللہ جلد ہی پھر ملیں گے۔اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

کفارہ

رات کا پچھلا پہر ہے اور میں ہوں
گزرتی رات کی ویرانیاں ہیں
اداسیاں ہیں بے سروسامانیاں ہیں
الفتوں کا رنگ ہے
بیکراں سی جنگ ہے
اِک شور سا ہے مچا ہوا
مجرموں کی طرح سے
عدالت ضمیر میں
نادیدہ نگاہیں جھانکتی ہیں
کہ جیسے!
جرم کے پردے کے پیچھے
بیکراں سچ مچلنے لگتا ہو
آگہی آگ سی لگاتی ہو
مجھ کو معلوم ہے کہ الفت کا
سالِ نو کے سفر سے پہلے بھی
خواہشوں کے در پردہ
احتساب ہوتا تھا
آج کی شب کے بعد پھر کل سے
سالِ نو کے حسین لمحوں میں
کچھ نئے باب کھولنے ہوں گے
کچھ کہانیاں جنم لیں گی
ہر کہانی میں خواہشیں ہوں گی
خواہشوں کے گلاب مہکیں گے
جانے کتنے ہی خواب بکھریں گے
سالِ دوراں کی آخری شب ہے
اور شب کی یہ آخری گھڑیاں
جاگ کر میں نے کیوں گزاری ہیں
سالِ نو کی خوشی سمجھ لینا
یا کہ گزرے دنوں کا کفارہ

کلام: سیما رضا ردا

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

2020ء میں کورونا وبا کے باعث تغیرات کے اثرات اور سالِ نو سے خدشات اور توقعات

شائستہ زریں

معزز قارئین، السلام علیکم!

سال 2020ء میں روزِ اوّل سے اختتام تک کورونا وبا کے زیرِ اثر عالمی سطح پر آزمائشوں اور ابتلا کا دور دورہ رہا۔ امجد اسلام امجد نے کیا خوب کہا۔

بند ہو جائے گی ایک دم زندگی ایسے سوچا نہ تھا
یہ جواب ہو گیا خواب میں بھی کبھی ہم نے سوچا نہ تھا

بلاشبہ یہ حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین واردات تھی جو اَن دیکھے وائرس کے طفیل عالمی سطح پر بیک وقت بلاکسی تفریق مذہب، رنگ و نسل، صنف اور عمر سب پر گزری۔ متحرک زندگی کا یوں یکایک ساکت ہو جانا انسان کو تحیر میں مبتلا کر گیا۔ اگر ہم اپنے اردگرد کا جائزہ لیں تو ایک فرق بہت واضح طور پر محسوس ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ عوام الناس میں جو فکرمندی اول، اول کے لاک ڈاؤن کے دوران تھی لاک ڈاؤن کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہوتی نظر آئی اور بیشتر نے تمام احتیاطی تدابیر کو بالائے طاق رکھ کر آزاد طرزِ زندگی اختیار کرنا شروع کر دیا۔ ماسک کا استعمال کرنے والے آشفتہ سر کہلائے اور لوگوں کے مذاق کا نشانہ بھی بنے۔ لیکن پھر ہوا یوں کہ یہ بے احتیاطی رنگ لائی اور کورونا کی دوسری شدید وبا ایک بار پھر حملہ آور ہوئی۔

سال گزشتہ میں کورونا وبا کے زیرِ اثر جو معاشی صورتِ حال درپیش آئی اس سے معاشرتی طور پر بھی لوگ متاثر ہوئے۔ 2020ء تیسری چوتھی سہ ماہی میں کورونا وائرس کی دوسری لہر آئی جس نے پہلی لہر سے بڑھ کر شدت سے سر اٹھایا اور مطمئن ہوتے لوگ ایک مرتبہ پھر ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئے۔ اور کئی خدشات ستانے لگے لیکن ساتھ ہی توقعات بھی بڑھ گئیں جو ثبوت ہے اس بات کا کہ انسان اگر جلد مایوس ہو جاتا ہے تو آس کے دیپ بھی کہیں نہ کہیں ضرور جلائے رکھتا ہے۔

اسی خیال کے پیشِ نظر ہم نے چند معزز خواتین سے معلوم کیا کہ

سوال ۱☆ 2020ء میں کورونا وبا کے زیرِ اثر عالمی سطح پر رونما ہونے والے تغیرات کے اثرات آپ پر کس طرح مرتب ہوئے؟

سوال 2☆ 2020ء کے تناظر میں سالِ نو سے آپ کو کیا خدشات اور کیا توقعات ہیں؟

رضیہ سبحان
(ماہر تعلیم، شاعرہ)

۱: 2020ء اپنی نوعیت میں یکتا اور منفرد رہا۔ اس میں کورونا کی وجہ سے جو تغیرات ہوئے ہیں، وہ بے شمار اور لاتعداد ہیں۔ یہ گلوبل تبدیلیاں ہیں اس سے کوئی ایک ملک یا ایک فرد متاثر نہیں ہوا بلکہ تمام عالم کو ایک جھٹکا لگا اور سب ایک ہی کشتی کے سوار ہوئے بغیر کسی جغرافیائی، معاشرتی، سماجی اور مذہبی تفریق کے اور یہی اس کی حیرت انگیز بات ہے اور تسلی کا باعث بھی یہی بات ہے کہ ایک ہم ہی نہیں سب ہی متاثر ہیں۔ انفرادی طور پر اس کے اثرات مختلف لوگوں پر مختلف ہوئے ہیں۔ جہاں تک مجھ ناچیز کا سوال ہے تو میں ایک ریٹائرڈ پرسن ہوں تو ویسے ہی اپنا زیادہ وقت گھر پر مطالعہ، لکھنے، مصوری اور کوکنگ میں صرف کرتی ہوں۔ سماجی دوری بھی رہی باقی سب وہی کچھ تھا۔ مجھے مشاہدے اور مطالعے کا وقت مل گیا اور لوگوں سے کم، کم ملنے کا وقت ملا۔ جس کا افسوس رہا مگر فون اور سوشل میڈیا کے ذریعے آدمی ملاقات تو ہوتی

رہی۔ بہر حال...... زندگی بہت تیز دوڑ رہی تھی۔ ایک دم جیسے کسی نے pause کا بٹن دبا دیا ہو۔ سب وہیں رک گئے، پتھر کے ہو گئے پھر ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ play کا بٹن بھی دبا دیں گے اور زندگی بھی پوری رونقوں کے ساتھ ایک دم رواں دواں ہو جائے گی۔

۲: آج کے دور میں، میں سمجھتی ہوں کہ انسان کو اللہ نے بہت علم اور فہم وادراک سے نوازا ہے۔ مگر جہاں تک آنے والے دور کی بات کی جائے تو ظاہر ہے اس کا بہتر علم تو صرف اللہ ہی کو ہے۔ آئندہ سال اپنی جھولی میں ہمارے لیے کیا سوغات لا رہا ہے واللہ اعلم۔ مگر مجھے لگتا ہے یہ جھٹکا بعض لوگوں پر اتنی زور سے پڑا ہے کہ ان کی زندگی اور سوچ یکسر بدل گئی ہے اور بعض لوگ بالکل کورے کے کورے ہی رہے۔ ان کو یہ جھٹکا چھو کر بھی نہیں گزرا تو آنے والا وقت مجھے ڈر ہے کہ اگر اچھا ہوا تو لوگ پھر اسی روش پر نہ چل پڑیں جو غفلت اور بے ہوشی کی روش تھی اگر ایسا ہے تو انسان خسارے میں رہے گا۔ گزرا ہوا ایک، ایک پل ہمارے لیے سبق ہے۔ آنکھیں کھولیے اور آنے والے وقت کو بہت قیمتی سمجھ کر اس کی قدر کیجیے اور بہتر سے بہتر انسان بن کر زندہ رہیں اچھی امیدوں کے ساتھ۔

شگفتہ فرحت
(سماجی وثقافتی شخصیت)

ا: 2020ء میں کورونا وائرس نے اچانک نمودار ہو کر نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی سطح پر دھوم مچا دی اور ہم سب کی جانوں پر عذاب بن کر رہ گیا۔ معاشی ترقی کا پہیا جام ہو گیا۔ لوگ گھروں تک محدود رہ گئے، رشتے داروں کی خبر گیری نہ محلے پڑوس میں...... کسی کی بیماری کی خبر سن کر دل مسوس کر رہ جاتے اور فون پر ہی مزاج پرسی کر لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کہیں سے انتقال کی خبریں آ جاتی تھیں تو لاک ڈاؤن اور وائرس کے دوران افسوس ہوتا تھا کہ ہم نہیں جا پا رہے ہے۔ میرے شوہر اویس ادیب انصاری جوائنٹ مینجمنٹ کا کام کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ اپنی فرم چلا رہے ہیں۔ وہ ان تین چار مہینوں میں اپنے دفتر نہیں جا سکے۔ آن لائن کام کیا۔ کیونکہ ان کا ملنا جلنا بہت زیادہ ہوتا ہے اور جو کام ہوتا تھا اس پر بہت اثر پڑا۔ اور ایک ان کا ہی کیا رونا سب ہی اس کا شکار ہوئے تو ہمارے سماجی رابطے ختم ہو کر رہ گئے تو میری ساری سرگرمیاں بالکل ختم ہو گئیں۔

۲: ناامیدی تو بہت ہے لیکن ساتھ، ساتھ امیدیں بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بالکل مایوس نہ ہو۔ اللہ امتحان لیتا ہے ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو خوشیاں بھی دکھاتا ہے۔ بہر حال میں پریشان ضرور ہوئی لیکن اللہ کی ذات سے امید ہے کہ پریشانی کا خاتمہ ہوگا اور اللہ ہمیں ضرور اچھی زندگی گزارنے کا موقع اور حوصلہ بھی دے گا ان شاء اللہ۔

ثریا وقار
(فیشن ڈیزائنر۔ Entrepreneur بزنس وومین)

ا: 2020ء میں آنے والی وبا نے وہ اثرات مرتب کیے جو انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھے۔ خصوصاً معاشی طور پر کچھ چیزیں بالکل زیرو پر آ گئیں لیکن جن ممالک نے پہلے سے اس کے خطرات محسوس کر لیے تھے انہوں نے بڑی ذہانت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ اس میں کچھ بچت ہو گئی لیکن ایکسپورٹ، امپورٹ میں بہت فرق پڑا۔ میں فیشن ڈیزائنر ہوں جہاں میرا کام بنتا

تھا وہ بیشتر جگہیں کرائے پر ہیں کرایہ ہر حال میں دینا ہے۔ اندرون ملک کسٹمر آرڈر نہیں دے رہے۔ ہم جیسے لوگ جو اپنا ذاتی کام کر رہے ہیں ہم خود بھی نقصان سے دوچار ہوئے ہمارے ساتھ کام کرنے والوں کا بھی نقصان ہوا۔ جب آرڈر کینسل ہوئے اور آرڈرز ملنا بند ہو گئے سب مال ملنا بند ہو گیا جو مال تیار تھا وہ اٹکا اور پھر مزید مال بننے سے روکا گیا۔ کاریگر گھر بیٹھے تھے۔ جو اُن کو دے سکتے تھے دیا۔ چھوٹے کاروبار والے زیادہ متاثر ہوئے لیکن لوگوں نے بڑی دیانتداری سے قربانی دیتے ہوئے اپنے ملازمین کی مدد کی۔ اللہ نے بہت ساری چیزوں کی بچت بھی کی۔ اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ملا سب سے بڑھ کر اللہ سے رشتہ پہلے سے بڑھ کر مضبوط ہو گیا۔

۲: کورونا وبا کی دوبارہ لہر اٹھی ہے لیکن پچھلے وقت سے بڑے تجربات ہو گئے۔ لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ کس چیز کی کیسے بچت کی جا سکتی ہے۔ یا اس سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے احتیاطی تدابیر بھی مضبوط ہو گئیں اور کچھ راستے بھی لوگوں نے پچھلے سال چن لیے۔ اس میں صحیح طرح سے ایگریمنٹ ہو سکے۔ مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ نئے سال میں کورونا سے ہم نمٹ لیں گے وہ نقصان نہیں ہو گا جو 2020ء میں ہو چکا۔ ان شاء اللہ۔

منزہ ارشاد

(معلمہ۔ براڈکاسٹر)

ا: میرا تعلق درس و تدریس سے ہے کورونا کی وبا نے تعلیمی سلسلے میں تعطل تو پیدا کیا مگر ظاہر ہے کہ علم حاصل کرنے کا جذبہ اتنا طاقتور ہے کہ اس تعلیمی سلسلے کو آن لائن جماعتوں کی شکل میں ایک نئی راہ مل گئی۔ بطور معلمہ میں کمپیوٹر کا استعمال نہیں کر رہی تھی، اگر کر بھی رہی تھی تو بہت کم مگر اس کورونا کی مہربانی سے اب ہم بھی فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ تدریس میں ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے کا ہنر ہماری اضافی قابلیت بن گیا اور اس سے تدریسی عمل میں دلچسپی کے عنصر کو بڑھانے میں مدد ملی۔

۲: سال 2020ء کے حوالے سے نئے سال میں یہ خدشات موجود ہیں کہ ہمارے ملک میں تعلیم کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ سرکاری اسکولوں کے اساتذہ نہ تو تربیت یافتہ ہیں نہ ہی آن لائن تدریس میں ماہر۔ آنے والے سال میں نجی تعلیمی اداروں کے طالب علم شاید اتنا زیادہ متاثر نہ ہوں لیکن لاکھوں بچے جو سرکاری اسکولوں کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں انہیں شاید مایوسی کا سامنا کرے۔ توقع تو صرف اللہ ہی سے ہے کہ اللہ کرم فرمائے گا۔ آمین

سعدیہ اطہر باڑی

(گھریلو خاتون)

ا: جہاں تک ہمارا اپنا ذاتی معاملہ ہے تو اس وبا سے کاروباری طور پر بہت فرق پڑ رہا ہے۔ اس سے متعلق تمام گھریلو مسائل بھی بڑھ گئے ہیں جس کی وجہ سے بڑی دقت ہو رہی ہے اور دوسری طرف حکومت کی عدم توجہی کی وجہ سے روزمرہ گھریلو ضروریات کی اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ صاحب اقتدار لوگ اپنی سیاسی تفریح میں لگے ہوئے عوام کو روایتی جھوٹی تسلیاں دیتے رہتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم برباد ہو رہی ہے۔ لوگ نجی اسکول اور کالج میں بچوں کو پڑھانے پر مجبور ہیں جس کی وجہ سے تعلیمی معاملات کو روز بروز مہنگا کرتے جا رہے ہیں تو دوسری جانب اس وبا سے ہر شخص دوسرے سے ڈر رہا ہے۔ مساجد نہ جانے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ کافی وقت تک مساجد بند کروا دی گئیں اور پولیس کے پہرے بھی لگا دیے۔ اس وبا سے جو بچے کچھ

مواقع تھے آپس میں رشتے داروں سے ملنے کے ان کو بھی ختم کر دیا گیا۔ مزید یہ کہ اپنے رشتے داروں کی میت میں بھی شریک ہونے سے روک دیا گیا۔ اگر کسی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا اور اس کو اسپتال لے گئے تو اس سے آپ ہاتھ دھو بیٹھیں کہ اس پر کورونا کے مریض کا لیبل لگا کر اپنوں سے دور کر دیا گیا جس کی بنا پر مریض شدتِ غم، اپنوں سے دوری کی محرومی اور تکلیف کے سبب زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ اور یہ سب دیکھنا، سننا اور محسوس کرنا بہت تکلیف دہ ہے۔

۲: توقعات تو یہی ہیں کہ حکومت اپنی ذمے داری محسوس کرتے ہوئے کورونا وبا سے متعلق ایجاد ہونے والی ادویات اور انجکشن کی رسائی کو اپنے ملک میں عام درجہ کے شہری تک ممکن بنائے گی۔ کورونا وبا کے تحت معاشی و معاشرتی طور پر تباہ ہونے اور وبا کا شکار ہونے والوں کو مفت ادویات کی سہولت مہیا کرے گی۔ عالمی ادارہ صحت سے توقع ہے کہ وہ اپنی منصبی ذمے داری محسوس کرتے ہوئے ان لوگوں کو پکڑیں گے جو اپنے تجربے کرنے کے لیے وقفے، وقفے سے جو وبائیں مختلف ناموں سے پھیلا رہے ہیں اور جن سے انسانوں کی تباہی ہوتی ہے۔ سوان اداروں میں کام کرنے والے تمام ملکوں کے نمائندوں سے توقع ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ ادارہ بنایا گیا ہے۔ اس پر سچے دل سے عمل کریں گے محض ٹی پارٹیز ارینج کر کے اور کاغذی طور پر صفحے بھر کر میٹنگز ختم نہ کریں گے اور خدشہ بھی یہی ہے کہ اگر ان توقعات کو پورا نہ کیا گیا تو ناقابلِ تلافی نقصانات سے دو چار ہونا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس وبا سے اور اس کو جاری رکھنے والوں کے شر سے بچائے، آمین

نادیہ فاروقی
(Occupational Therapist شکاگو)

۱: عالمی سطح پر یہ بیماری سمجھنے میں کافی مشکلات پیش آئیں۔ بڑی، بڑی سپر پاور بھی اس سے بری طرح متاثر ہوئیں۔ صرف امریکا میں لاکھوں افراد کو یہ بیماری نگل چکی ہے۔ ہمارے خاندانوں اور گھروں میں جہاں اس وبا کی وجہ سے ایک دوری پیدا ہوئی وہیں ایک دوسرے کو قریب بھی کر دیا میرے اپنے خاندان میں میرے ان لاز کو کورونا ہوا اور سب اس سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ سب کو شفا دے گا، ان شاء اللہ۔ جہاں ہم ان سب سے روز ملاقات کرتے تھے اب تین ہفتوں سے نہیں مل پائے ہیں۔ اس وبا سے سب سے بڑا اثر معیشت اور جاب پر پڑا ہے۔ سیر و سیاحت ختم ہو گئی۔ میڈیکل کی فیلڈ میں کام کرنے والوں کی مانگ تو زیادہ ہے لیکن لوگ اس فیلڈ میں کام کرنے سے گھبرا رہے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کورونا کے مریضوں سے دور رہیں۔ میرے اپنے ڈاکٹر ساتھی اس وبا سے متاثر ہوئے ہیں اور روز زندگی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ میں ان تبدیلیوں سے خوف زدہ ضرور ہوں لیکن اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں۔ حساس اور ذمے دار تو پہلے بھی تھی لیکن ان حالات نے پہلے سے کئی گنا بڑھ کر حساس اور ذمے دار بنا دیا۔

۲: میرے نزدیک سالِ نو میں بھی یہ وبا ہمارا آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ ابھی حال ہی میں pfizer کمپنی نے اس کی ویکسین بنائی ہے جو کہ ان کے مطابق 95% اثر انداز ہوتی ہے۔ ابھی ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اس کے اثرات کہاں ہوں گے اور اس میں کتنا وقت لگے گا۔ سالِ نو ہمیں اس وبا سے نجات دلاتا ہے کہ نہیں یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ اللہ سے دعا ہے کہ دنیا کو بھر کو اس وبا سے محفوظ رکھے، آمین۔ پاکیزہ کے قارئین سے کہوں گی کہ اپنا اور اپنی فیملی کا خیال رکھیں۔ ماسک پہنیں اور ہاتھ صاف رکھیے۔

نازمین الطاف
(نیوز کاسٹر پی ٹی وی کراچی مرکز)

۱: کورونا سے پوری دنیا متاثر ہوئی اور لاکھوں افراد ایک ایسی ان دیکھی بیماری کا شکار ہو گئے جس نے ہم سب کو

ڈرا کر رکھ دیا اور بتا دیا کہ پوری دنیا کی حیثیت بہت معمولی ہے۔ اب زندگی احتیاطی تدابیر کے ساتھ گزارنی ہوگی۔ سو میں بھی بہت احتیاطی تدابیر کے پیشِ نظر زندگی گزار رہی ہوں۔

۲: 2020ء میں جس طرح کورونا کی وبا نے تباہی پھیلائی ہے آئندہ آنے والے برسوں میں بھی کورونا کا خوف موجود ہے اور دنیا احتیاط کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مگر پھر بھی امید ہے کہ آنے والا سال اس وبا سے بچاؤ کا حل اور علاج ضرور لے کر آئے گا تاکہ دنیا کو اس بیماری سے نجات ملے، آمین۔

رحمہ ناصر
(pharmacist .. نیو جرسی)

۱: کورونا نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہر لمحہ یہ ڈر کہ آگے کیا ہوگا؟ کہیں یہ وائرس ہمیں نہ لگ جائے۔ ان خدشات نے ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیا۔ لیکن جہاں اس وائرس کی وجہ سے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہیں اس وبا نے اس بات کا احساس بھی دلایا کہ زندگی میں بہت ساری چیزوں کو for granted بھی لے لیتے ہیں مثلاً آزادی سے ہر جگہ آنا جانا، باہر کھانا پینا، شاپنگ یا پھر ذہنی سکون کے لیے تفریح پر جانا، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے عزیز و اقارب کے گھر جانا اور

ان کے ساتھ مل بیٹھ کر باتیں کرنا۔ یہ سب چیزیں بہت اہم ہیں لیکن ہم ان کی قدر نہیں کرتے۔ کورونا نے لوگوں کی اور چھوٹی، چھوٹی چیزوں کی قدر کرنا سکھا دیا۔ سب سے بڑا اثر تو یہی پڑا ہے۔

۲: خدشات تو یہی ہیں کہ جس طرح اس وبا نے دوبارہ تیزی سے سر اٹھایا ہے شدت اختیار نہ کر لے۔ اور امید یہی ہے کہ ہم سب لوگ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی پہلے سے بڑھ کر قدر کریں گے اور اللہ کے شکر گزار رہیں گے اور چیزوں کو for granted لینا چھوڑ دیں گے۔ اور اللہ سے امید ہے کہ اللہ کورونا سے ہم سب کو محفوظ رکھے گا۔

صدف عذیر
(شیف، شاعرہ)

۱: نفسیاتی اثر ہوا کہ ان دیکھی چیز کا خوف ذہن پر مسلط ہو گیا جو کہ بحیثیت مسلمان سوائے خدا کے کسی کا نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن پھر بھی شک اور وہم میں مبتلا کر دیا اور یہ سوچ پریشان کرتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے اور ایسے میں بے اختیاری نے ڈپریشن کا شکار بنا دیا۔ چھوٹی سی بیماری عام نزلہ کھانسی بھی ہو جائے تو ہم کورونا سمجھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور بجائے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنے کے اپنے طور پر علاج اور ٹوٹکے استعمال کرنے لگے۔

۲: خدشہ تو یہ ہے کہ لوگ خوف میں ایک دوسرے سے ملنا اور بیماری میں ایک دوسرے کا خیال رکھنا نہ چھوڑ دیں۔ سرحدوں کی بندش ہو سکتی ہے۔ آزادانہ نقل و حرکت پر پابندی لگ سکتی ہے۔ توقع یہی ہے کہ بہتری کی امید رکھوں گی کہ اس وبا کا علاج ضرور دریافت ہو جائے گا کہ مایوسی کفر ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے ”ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے“ لہٰذا میں بھی اچھے کل کی امید رکھتی ہوں کہ کورونا کی یہ دوسری لہر جلد ختم ہو جائے گی، آمین!

بینا شفیع خان
(قلمکار)

۱: پاکستان میں کورونا کی تشخیص ہوئی تو خوف و ہراس پھیل گیا اور لوگ گھروں میں محدود ہو گئے سارے معاملات زندگی اچانک رک جانے کی وجہ سے کاروباری طبقے خاص طور پر روزانہ کمانے والوں پر اس کا بہت اثر پڑا۔ چونکہ یہ عام بیماریوں سے مختلف بیماری تھی اس لیے آپس میں ہاتھ ملانے اور ملنے ملانے سے بھی رہ گئے۔

اچانک اسکول بند ہو جانے کی وجہ سے بچے گھروں میں بند ہو گئے۔ اس وقت بچوں کو ان حالات سے بچانا اور انہیں سمجھانا بہت مشکل رہا۔ آن لائن کلاسز کا سلسلہ شروع ہوا، وہ بہت مزید مشکلات کا باعث بنا۔ اب کورونا کی دوسری لہر نے دوبارہ ان ہی حالات سے دو چار کر دیا۔ ایس او پیز پر بھی عمل کیا جا رہا ہے لیکن کسی بھی اچانک افتاد کا خوف بھی ساتھ، ساتھ ہے۔

۲: سب سے بڑا خدشہ تو یہی ہے کہ ایس او پیز کا خیال نہ رکھا گیا تو از سرِ نو سر اٹھانے والا یہ مرض شدت نہ اختیار کر جائے۔ اور اگر لوگ احتیاط کے معاملے میں سنجیدہ نہ ہوئے تو دوبارہ لاک ڈاؤن نہ لگ جائے۔ معمولاتِ زندگی دوبارہ مفلوج نہ ہو جائیں اور اگر ویکسین تیار ہو جائے تو متوسط طبقہ افورڈ کر سکے

گا؟ توقعات تو صرف اللہ کی ذات سے ہیں جہاں ابھی تک دنیا کے بڑے، بڑے ڈاکٹرز اس مرض کی ویکسین نہیں تیار کر پا رہے وہاں اللہ ہی اس کا بہتر حل نکالنے والا ہے۔ امید یہی ہے کہ نیا سال خوشیاں لائے گا، آمین۔

عبیرہ اطہر باڑی

(طالبہ اے لیول)

ا: کورونا کا پُر جوش اثر ہوا۔ کورونا نے سب کے دل و دماغ پر قابو کر لیا تھا۔ لاکھ احتیاط کے باوجود بہت سے لوگ اس وبا کا نشانہ بنے۔ بہت سے لوگ کورونا کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تعلیمی ادارے بند ہو گئے اور ہمارے انٹرنیشنل CAIE کے امتحان بھی ملتوی ہو گئے جبکہ ممتحن خود بھی کشمکش میں مبتلا تھے کہ اس سے پہلے ایسی مشکل آئی جو نہیں تھی۔ جس سے ایک ہی وقت میں پوری دنیا متاثر ہوئی۔ آن لائن کلاسز کا تو حال ہی نہ پوچھیں کبھی بجلی نہیں ہوتی تو کبھی وائی فائی، کبھی مون سون کی بارشیں کبھی گھر کی مصروفیت۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کچھ نہ کچھ رہ جاتا۔ آپس میں ملنے میں بھی احتیاط کی جا رہی تھی۔ حتیٰ کے کورونا کے خطرات کے پیشِ نظر اپنے نومولود بھانجے کو پیار کرنے میں بھی بہت احتیاط کرنی پڑی۔ رمضان اور عید میں بھی وہ رونق نہیں تھی۔ اللہ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے! آمین!

۲: کورونا نے ایک بار پھر سر اٹھا لیا ہے عظیم ہستیوں کی رحلت، تشدد کے واقعات، 2020ء ان ہی تکلیف دہ حالات میں گزر گیا۔ تقریبات کا دورانیہ مختصر ہو گیا۔ ابھی کورونا کے خاتمے کا بظاہر تو...... کوئی امکان نہیں نظر آ رہا۔ کہنے کو نیا سال آئے گا لیکن یہ وبا بھی پرانی اور اقدامات بھی وہی ایسے میں خدشات تو بہت سے ہیں لیکن توقعات تو کچھ بھی نہیں۔ ہاں اللہ سے امید ضرور ہے کہ اس وبا کا خاتمہ کر دے گا، ان شاء اللہ!

قارئینِ من!

جہاں معاشی طور پر بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا وہاں تعلیمی میدان میں بھی طالب علم آس و نراس کی کیفیت میں مبتلا رہے۔ بے شک آن لائن کلاسز کا سلسلہ جاری رہا لیکن وہ درس گاہ کا نعم البدل نہ بن سکا۔ بلاشبہ خدشات اپنی جگہ لیکن اللہ تعالیٰ سے اچھی توقعات ہیں کہ بے شک وہ قادرِ مطلق ہے۔ تن مردہ میں جان ڈالنے والا بھی وہی ہے اور محض ایک کُن سے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کرنے والا بھی۔ سو دلی دعا اور اللہ تعالیٰ سے قوی امید یہی ہے کہ ہم پر ابرِ کرم برستا رہے گا اور اللہ آسمانی و زمینی آفات و بلیات سے ہم سب کو اپنی امان میں رکھے گا، آمین!

ادارہ پاکیزہ کی جانب سے تمام قارئینِ پاکیزہ کو نیا سال مبارک ہو۔ ڈاکٹر اختر شمار کے ان دعائیہ اشعار کے ساتھ اجازت دیجیے کہ

قریہ قریہ گریہ پیہم یا رحیم یا کریم
مر رہی ہے نسلِ آدم یا رحیم یا کریم
ہم خطاؤں پر ہیں نادم سب کہیں مل کر شمار
دور کر دے ہم سے ہر غم یا رحیم یا کریم

آمین

بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:110

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ!

تمام حمد وستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود وسلام حبیب خدا رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر جو وجۂ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانۂ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ نہ صرف ہمارے وطن پاکستان بلکہ پوری دنیا سے اس وبا کا خاتمہ کردے، انسانیت کو امان ہو اور ہم بحیثیت مسلمان اپنے رب کی بارگاہ میں حقیقی معنوں میں بخشش وعنایات پائیں۔ (الٰہی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری پاکیزہ بہنو...... سلام اور پُرخلوص دعائیں لیے سال نو کی اس پہلی خوب صورت محفل میں حاضر ہوں...... دعا ہے نیا سال ہم سب کے لیے تمام پریشانیوں سے نجات کا سال ہو اور سال گزشتہ سے جو یہ وبائی مرض کورونا وائرس پوری دنیا میں چھایا ہوا ہے اس کے کامیاب علاج اور نجات کا سال ہو، آمین۔ امید تو ہے بلکہ مثبت خبریں بھی آرہی ہیں کہ ویکسین پر کام ہو رہا ہے۔ اور جلد ہی منظرِ عام پر بھی آہی جائے گی۔ ان شاء اللہ......!

اس بیماری کے زیرِ اثر جو جانیں اللہ کو پیاری ہوئیں ان کے لیے دعائے مغفرت ہے اور تمام بیماروں کے لیے صحت یابی کی دعائیں ہیں۔ اللہ پاک سب پر اپنا رحم وکرم کرے، آمین۔

پچھلے شمارے میں عالیہ حرا بہت عرصے بعد ایک لاجواب، سبق آموز بلکہ ایمان افروز تحریر لے کر آئیں، بہت دعائیں تمہارے لیے عالیہ، اب آنے میں زیادہ وقفہ نہ کرنا، اختر شجاعت نے بہنوں کی محفل میں اپنے بارے میں میرے تاثرات پڑھ کر مجھے فون کرکے نہ صرف شکریہ ادا کیا بلکہ بہت سی دعاؤں سے بھی نوازا۔ جزاک اللہ اختر! ہمیشہ تم صحت وسلامتی کے ساتھ یونہی لکھتی رہو۔

سعدیہ دعا شیخ، تم نے بہت ہی حساس موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت پُراثر تحریر دی۔ تمہارا جو شعبہ وکالت ہے اس میں تو واقعی کتنی ہی کہانیاں دن رات سننی ہوگی اور پھر اپنے مشاہدے کو بہت اچھی طرح تحریر میں لاتی ہو۔

عطیہ ہدایت اللہ آپ نے کافی عرصے بعد کوئی تحریر دی جو آج کی نوجوان نسل کے لیے بہترین پیغام ہے۔ کتاب کے لیے بھی آپ کا شکریہ۔

میری دعا ہے کہ آپ لکھاری بہنیں اور پاکیزہ پڑھنے والی بہنیں صحت وسلامتی سے رہیں کہ آپ ہی لوگوں کے دم سے اور آپ ہی سب کے لیے یہ محفل سجتی ہے بس بہنوں اسی طرح کا پُرخلوص تعاون جاری رکھیے۔

نئے سال کی آمد پر دعاؤں اور نیک خواہشات کے تحفے حاضر ہیں۔ اب اجازت...... ان شاء اللہ اگلے ماہ بشرط صحت و زندگی پھر اس محفل میں ملاقات ہوگی۔

اللہ نگہبان...... دعا گو عذرا رسول

☆☆☆

اب بہنو! حسبِ روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی یاد رکھیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ اس مرتبہ ہماری بہت سی ٹیچرز قاری بہنوں نے درخواست کی ہے کہ اب معلوم نہیں کب اسکول کھلیں تو سب مائیں اور بڑی بہنیں اپنے بچوں کو آن لائن کلاسز باقاعدگی سے اٹینڈ کروائیں اگر یہ سہولت نہ ہو تو اسکول انتظامیہ سے رجوع کر کے بچوں کی پڑھائی پر ہر ممکن دھیان دیں۔ اس لیے کہ ہمیں اپنے بچوں کے مستقبل کی خود فکر کرنی ہے۔ (واقعی یہ تو صحیح گزارش ہے)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری و تبصرہ نگار تسنیم کوثر، کراچی کے بیٹے کے CA کے فائنل پیپرز ہو رہے ہیں، انہیں دعاؤں میں یاد رکھیں۔ (اللہ کامیاب کریں)

☆ شاعرہ، مصنفہ، پاکیزہ کی مداح اور ہماری دوست شگفتہ شفیق ان دنوں گھر بیٹھے ہی آن لائن ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ اللہ پاک انہیں صحت و سلامتی سے رکھے، آمین!

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ نگار اور مصنفہ صبا آصف کی پیاری بیٹی حنزہ علی کے یہاں بیٹی تولد ہوئی ہے جس کا نام علیزے بنت علی رکھا ہے۔ (بہت مبارک ہو اللہ نصیب اچھے کرے)

☆ عصمت آپا، اوکاڑہ کی پیاری بھتیجی ثنا عباس کے ہاں بیٹی تولد ہوئی ہے جس کا نام رامین سعید رکھا گیا ہے۔

☆ مستقل قاری انیسہ زینب، شیخوپورہ آج کل مضامین لکھ رہی ہیں وہ ماشاءاللہ ڈبل ایم اے ہیں۔ (مبارک ہو ضرور لکھیں۔)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ مصنفہ عائشہ خان، لاہور کی آنکھوں کی سرجری کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ (شکر الحمدللہ)

☆ مصنفہ سعدیہ رئیس کے بہنوئی ان دنوں کافی علیل ہیں۔

☆ پاکیزہ کی سینئر رائٹر شیریں حیدر پچھلے دنوں شدید بیمار رہیں اب الحمدللہ روبصحت ہیں۔

☆ مستقل قاری، تبصرہ نگار اور قلم کار سلمٰی غزل، کراچی...... ڈینگی کے بخار میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ بہنوں سے خصوصی دعائے صحت کی درخواست ہے۔

☆ پاکیزہ کی ہر دلعزیز مصنفہ فرحین اظفر کے کئی عزیز ان دنوں کافی علیل ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ نگار اور لکھاری صبا آصف، کراچی کی والدہ کی طبیعت کافی ناساز ہے۔ صبا اس سلسلے میں کافی فکرمند ہے، ابھی دو سال قبل ہی ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھا ہے۔ بہنیں ان کی والدہ کی مکمل صحت یابی کے لیے ضرور دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ نگار عصمت آپا، اوکاڑہ کے چھوٹے بہنوئی کو کورونا ہو گیا ہے۔ ان کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ عصمت آپا کے شوہر حاجی چوہدری محمد اشرف بہت بیمار ہیں۔ خصوصی دعائے صحت کی درخواست ہے۔

☆ پاکیزہ کی سمندر پار بیٹھی قاری بہن راشدہ عفت احمد مطیع، جرمنی کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست۔

☆ حرا احمد، لاہور کی ذہنی و جسمانی صحت یابی کے لیے دعا کی درخواست۔

انتقالِ پُرملال

☆ مصنفہ، پاکیزہ کی مستقل قاری اور بے حد مہربان دوست سلمٰی غزل کے شوہر کی اس ماہ پہلی برسی ہے بہنیں ضرور دعائے مغفرت میں یاد رکھیں۔

☆ مصنفہ روحیلہ خان کی بڑی بہن مہرین اعجاز مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ پروردگار ان کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

☆ مستقل قاری عصمت آپا، اوکاڑہ کے بڑے بہنوئی چوہدری محمد حسین چٹھہ سرگودھا میں اللہ کو پیارے ہو گئے مرحوم بہت نیک، پارسا اور پورے علاقے کی ہر دلعزیز ہستی تھے یہاں تک اپنے خاندان کے ساتھ، ساتھ ملازمین کو بھی حج و عمرہ کروایا۔ (سبحان اللہ، اللہ پاک مغفرت فرمائے) پیاری عصمت آپا کی دو بہنوں کی برسی بھی اسی ماہ ہے۔

☆ مصنفہ فرحین اظفر کی نانی جان انتقال کر گئیں۔

☆ پاکیزہ مصنفین کے قافلے میں شامل ہونے والی ہماری نئی مصنفہ، تبصرہ نگار اور مستقل قاری زرتاشیہ نعمان کے خالو اسی وبائی مرض کا شکار ہو کر چل بسے۔

☆ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی اور اسلامی اسکالر اختر شجاعت کی خالہ جان انتقال کر گئیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری رابعہ خان، حیدرآباد کے والد محترم انتقال کر گئے۔

☆ پاکیزہ سے تعلق رکھنے والی ہماری پیاری دوست، مصنفہ، شاعرہ، تبصرہ نگار ہما علی، اسلام آباد کے بھائی طارق حمید وائن شدید ہارٹ اٹیک کے باعث انتقال کر گئے۔ ہما کی والدہ و دیگر بہن، بھائی شدید غم سے دوچار ہیں۔

اللہ پاک تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبرِ عظیم عطا ہو، الٰہی آمین۔

☆☆☆

اب بہنوں آتے ہیں آپ کے پیارے، پیارے خطوط کی طرف۔

✉ سلمٰی غزل، کراچی سے۔ ”پاکیزہ ماشاء اللہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے تبصرہ کرتے وقت سوچنا پڑتا ہے کہ کس کو زیادہ نمبر دوں اور کس کو کم...... اختر شجاعت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کے بارے میں خوب لکھا کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ کچھ کے بارے میں تو ہمیں انہی کی تحریر سے پتا چلا۔ خوب لکھتی ہیں اور نازک موضوعات پر لکھنا انہی کا خاصہ ہے۔ خولہ سعید جاوید نے ستار العیوب، اچھا لکھا میں اسے نقل تو ہرگز نہیں کہہ سکتی کہ ایک ہی موضوع پر بے شمار تحریریں ہوتی ہیں مگر میں نے 2009ء نومبر میں اسی موضوع پر بالکل سچی کہانی تحریر کی تھی جس کو افسانے کا رنگ دیا تھا۔ اینڈ بالکل یہی تھا مگر اس میں بڑھاپے میں طلاق ہوئی تھی اور بچوں نے آکر اطلاع دی تھی کہ بابا ایکسیڈنٹ میں وفات پا گئے۔ تب سجدے میں گر کر ان خاتون نے یہی الفاظ دُہرائے تھے اور بچے سمجھ رہے تھے کہ صدمے نے امی کے حواس گم کر دیے۔ افسانے کا عنوان ”بھرم“ تھا۔ اور یہ میرے ایک واقف کی بیٹی کے ساتھ ہوا تھا۔ شکر ہے میرا اسرار زنگ اتار دو انجام پر پہنچا اور کم از کم زاویار بزدل ضرور نکلا مگر گناہ کبیرہ کا مرتکب نہیں (ارے ابھی کہاں ختم ہوا ابھی تو کئی انکشاف باقی ہیں) ریٹائرمنٹ بھی عائشہ مصطفیٰ کی اچھی تحریر تھی۔ چھوٹی سی بات لاجواب...... سمیرا سرفراز نے کم از کم بہنوں کو محبت کا اسیر رکھا ورنہ آج کل ٹی وی کے ڈراموں میں بس بہن، بہن کی اور دوست، دوست کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ عالیہ حرا، اتنی کہنہ مشق مصنفہ ہیں کہ ان کی تحریر پر کیا تبصرہ کروں، لاجواب، بے مثال مگر حقیقت سے کوسوں دور۔ کاش جیسا انہوں نے لکھا ہے معاشرہ اسی ڈگر پر چل پڑے۔ اول تو آج کل جوائنٹ فیملی سسٹم ناپید...... ماں، باپ ہی برداشت نہیں ہوتے کہ چچی، چچا آج کل تو وہ زمانہ ہے کہ دیندار بچے ماں، باپ سے ڈرتے ہیں اور لیپ ٹاپ اور موبائل کے بچوں سے ماں، باپ ڈرتے ہیں کہ کہیں بچے ناراض نہ ہو جائیں۔ آج کل کے بچے ماں، باپ کی نہیں سنتے تو دادا، دادی، نانا، نانی کا نمبر تو بعد میں آتا ہے شکر الحمدللہ یہ تجربہ نہیں مشاہدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دور میں جتنے ہم اپنے بزرگوں کے فرمانبردار تھے ہمارے بچے اس سے کم اور آج کل کے تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں مگر عالیہ حرا نے بہترین گھرانے کا بڑا لاجواب نقشہ کھینچا ہے۔ (کہانیاں آئیڈیل صورتِ حال کی ترغیب ہی تو دیتی ہیں) ہمیں بھی جینے دو...... عطیہ ہدایت اللہ کا زبردست اور حقیقت سے بہت قریب، ہم اعتراض تو آرام سے کر لیتے ہیں لیکن عورت کے مقابلے میں مرد کا تنہا زندگی گزارنا زیادہ مشکل ہے کہ عورت میں حوصلہ اور ہمت زیادہ ہوتی ہے ہر عمر میں (بالکل درست کہا) فرحین اظفر تو ہمیشہ ہی چھا جاتی ہیں۔ یقین کا سفر...... طوالت کی وجہ سے بہت زیادہ تاثر نہ چھوڑ سکا ورنہ غزالہ عزیز کے تو کیا کہنے...... تسنیم کوثر کی محبتوں پر شکریہ دعائیں۔“ (بہت شکریہ تبصرے کا، آپ بروقت بھیج دیتی ہیں۔ بس آج ہی آپ کی بیماری کا معلوم ہوا اللہ پاک آپ کو صحت عاجلہ و کاملہ عطا کرے الٰہی آمین)

✉ زرتاشیہ نعمان، ملتان سے۔ ”اس سال اتنی زیادہ وفات سننے میں آئی ہیں کہ کیا بتاؤں...... اللہ پاک ان سب کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ (آمین) صدقِ دل سے دعا ہے کہ اللہ رب العزت اگلے نئے سال میں ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، صحت وتندرستی کے ساتھ اور اس وبا کا خاتمہ ہو جائے (آمین) اب آتی ہوں اس سال کے آخری شمارے پر تبصرے کی طرف، افسانے سبھی اچھے لگے۔ اچھی پر اثر تحاریر تھیں۔ عورت کہانی میں فرحین سبق آموز کہانی لائیں، جس کا نچوڑ میری نظر میں یوں نکلتا ہے کہ چادر دیکھ کے پاؤں پھیلاؤ یا کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔ (بالکل درست کہا) یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں انمول اگلے ماہ اختتام پزیر ہونے کو ہے، اچھی اسٹوری تھی مگر کچھ زیادہ ہی ست روی کا شکار رہی، رونا دھونا، انمول کے ایک ہی طرح کے جذبات و مزاج، خیر

اب اینڈ دیکھتے ہیں۔ (ضرور بتایئے گا کیسا لگا، سعدیہ نے بے انتہا خوب صورت کردار نگاری کی۔) روحیلہ خان کے بوجھ کی دوسری قسط پڑھی...... میرے خیال میں قرۃ العین کے ساتھ کوئی شدید قسم کا دھوکا ہو گیا ہے...... جس کے بارے میں وہ ابھی بے خبر ہے۔ غزالہ عزیز کا یقین کا سفر بھی اس ماہ کی بہترین تحریر رہی مگر ماہنامہ پاکیزہ دسمبر 2020ء کو جس تحریر نے چار چاند لگا دیے اس کا سہرا جاتا ہے۔ عالیہ حرا کے ناولٹ یا حی یا قیوم کو بے حد شاندار کاوش...... ڈھیر ساری مبارک باد وصول کیجیے عالیہ جی (خوش ہو جاؤ عالیہ، کافی گیپ کے بعد تم آئیں اور چھا گئیں) آپ نے نہایت مفصل، جامع اور فکر انگیز انداز میں اپنے ناولٹ میں آج کی نئی پود کے اطوار کی عکاسی کی ہے...... آج کی نسل دین سے اس لیے دور ہے کہ ان کے بڑوں نے انہیں صحیح طور سے دین سے روشناس کرایا ہی نہیں۔ بحیثیت والدین، گھر کے بزرگوں کے کندھوں پر یہ بہت بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ پہلے وہ خود اپنے بچوں کے لیے رول ماڈل بنیں...... اور پھر انہیں دین پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کریں۔ اس بار رسالہ پڑھتے ہوئے دل میں ایک سوچ نے سر ابھارا...... ہم قاری بہنیں، تمام کہانیوں پر تبصرہ کر کے۔ لکھاریوں کو داد بھی دیتی ہیں۔ لیکن ہم ان پیاری بہنوں کو سراہنا بھول جاتے ہیں جو اپنا قیمتی وقت نکال کر اپنے خیالات کا اظہار کسی تحریر یا شاعری کی صورت میں (باکس رائٹنگ) کے لیے ارسال کرتی ہیں۔ ان میں قابلِ ذکر ہیں اس بار...... فہمیدہ جاوید کی دسمبر جب بھی آتا ہے انتہائی دلکش تحریر لگی مجھے۔ پھر ناہید فاطمہ حسنین کی تحریر کفش (جوتے) آپ کا ڈی این اے زبردست...... فریدہ افتخار کا نذرانہ عقیدت بہت بھایا مجھے، نیر فہیم خان نے اپنی تحریر میں ایک باریک نکتہ اجاگر کیا...... جس کے لیے جزاک اللہ خیر کہوں گی...... ہاں واقعی داغ کہاں اچھے ہوتے ہیں؟ اور کسے اچھے لگتے ہیں؟ رابعہ فاروق خان، ہما علی کی کاوشیں اور نگینہ ضیا بنگش کا انتخاب...... (زاویہ از اشفاق احمد) پسند آیا۔ اب آخر میں ایک درخواست کرنی تھی کہ اگر ممکن ہو سکے تو خط بھیجنے کی آخری تاریخ پر نظرِ ثانی کریں اور اسے 18 کے بجائے 20 یا 21 کر دیں تو مہربانی ہوگی۔'' (طویل تبصرے کا بھی شکریہ اور تجویز کا بھی...... پیاری بہن رسالہ ہر حال میں 17,18 تک تیار ہو جاتا ہے اور 20,21 کو تو طباعتی مراحل طے کر رہا ہوتا ہے آپ نے تو ابھی بالکل صحیح وقت پر تبصرہ بھیجا۔)

✉ صبا آصف، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے تو میں آمنہ حماد کے بھائی کی تعزیت کروں گی۔ انتہائی دکھ ہوا۔ اللہ آمنہ حماد اور ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ان کے پیارے بھائی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین) جوان اور اچانک موت کے دکھ بہت گہرے ہوتے ہیں صبر آتے، آتے بہت وقت لگتا ہے۔ (بالکل درست کہا) سلمٰی غزل کا بچھڑا کچھ اس اداس سے کہ رت ہی بدل گئی۔ شوہر کی یاد میں تعزیتی مضمون پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ سلمٰی بہت اچھی خاتون ہیں، بہت پیارا اخلاق۔ ہما بیگ بھی بہت بڑے صدمے سے گزریں...... ان کا دکھ دل پر محسوس ہوتا ہے۔ اللہ انجم انصار اور ان کے بچوں کو خاص طور سے ان کی پیاری بیٹی عظمیٰ آفاق سعید کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین...... بیٹیاں والد کے بہت نزدیک ہوتی ہیں۔ (جی بالکل، سب لواحقین کو اللہ صبر دے اور مرحومین کی مغفرت ہو، الٰہی آمین) افشاں آفریدی کا ناول میرا اسرار از تنگ اتار دو نے بہت اچھا موڑ لیا عکرمہ اور مظفر صاحب انسانیت کی بلندیوں پر۔ فصیحہ آصف خان کا افسانہ ماں بہت پیارا افسانہ۔ فصیحہ آصف نے تو کمال کر دیا۔ بے شک باتیں ہی دلوں کو اور گھروں کو توڑتی ہیں اور باتیں ہی دلوں کو اور گھروں کو جوڑتی ہیں کاش کہ لوگ سیکھ سکیں، پس آئینہ قرۃ العین سکندر کی سوچ کے در وا کرتی ہوئی تحریر ہر بہو یہ سب سوچے اور ساسیں بھی اپنے دل میں تھوڑی وسعت پیدا کریں تو گھر جنت بن جائیں۔ عائشہ تنویر، وہ ایک لمحہ بہت اچھی تحریر تھی...... واقعی تعلیم بہت اچھی چیز ہے لیکن تہذیب اور اخلاق کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ باقی سارے افسانے اور ناولٹ بھی اچھے ہیں۔'' (بہت شکریہ تبصرے کا)

✉ بختاور ابڑو، اوستا محمد بلوچستان۔ آپ کے اشعار تو لگ چکے ہیں...... کہانی کے لیے معذرت دوبارہ کوشش کریں۔ پاکیزہ پر تبصرہ بھی ضرور کریں۔ آپ اتنی دور سے فون کرتی ہیں، خط لکھتی ہیں، ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ دیگر سلسلوں میں ضرور حصہ لیں۔

✉ محترمہ اختر شجاعت کا خصوصی نامہ۔ ''سب سے پہلے بہنوں کی محفل کا مطالعہ کرتی ہوں اس بار عذرا کیا کہوں، آپ یقین کیجیے بغیر وٹامن کے میرا کلو کے حساب سے خون بڑھا دیا۔ آپ کی محبت بھری حوصلہ افزائی کے لیے میں کیا کہوں الفاظ نہیں...... شکریہ جزاک اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔ (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ، پُرخلوص اور حقیقی تعریف رائٹر کا حق ہے) تمام ریڈرز بہنوں کی بھی محبتیں ان کے تعریفی کلمات، یہ سب پڑھ کر میری آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں کہ مجھ کم فہم، کم علم اور حقیر سی ہستی پر

میرے رب کا اس قدر کرم اس کی عطا اور توفیق ہے کہ میں یہ کام کر رہی ہوں ورنہ میری اوقات نہیں۔ میں تو اپنے اس رب کی بہت شکر گزار ہوں...... اس کے بعد عذرا آپ کی محبت، خلوص اور آپ کا تعاون ہے اور یقیناً اللہ رب العزت نے آپ کو بھی چنا ہے کہ آپ کے ادارے سے دین کی اچھی باتیں بہنوں تک پہنچ رہی ہیں...... تو میں اپنی ان تمام بہنوں کی بھی بے حد شکر گزار ہوں...... اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے سلامت رکھے اور آپ یونہی میری حوصلہ افزائی کر کے میری انرجی بڑھاتی رہیں...... خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گی نزہت اصغر کا...... بہن حدیث اختر، آسیہ عامر، سلمیٰ غزل، ساجدہ ظفر، کمالیہ، ثمینہ کوکب، جبینا، فرخندہ جعفری، طیبہ عنصر مغل اور دوسری بہنیں...... بے حد شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں عمل میں عمر میں برکتیں عطا فرمائے اور جو بہنیں بیمار ہیں اللہ تعالیٰ انہیں شفائے کاملہ عطا فرمائے، آمین۔'' (دعاؤں کے لیے آپ کا شکریہ...... بندے کے پاس جو ہنر، صلاحیت، نعمتیں ہیں اور وہ دوسروں کو اس سے فیض پہنچا رہا ہے تو اس کا شکریہ ادا کرنا دراصل پروردگار کا شکر ادا کرنا بھی ہوتا ہے۔)

پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''اس بار پاکیزہ دو تاریخ کو ملا اور میں چار تاریخ کو تبصرہ ارسال کر رہی ہوں۔ فریدہ اعجاز سرورق پر بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ہونٹوں پر یہ قطعہ آ گیا۔

احساس محبت کا میری ذات پہ رکھ دو...... تم ایسا کرو ہاتھ میرے ہاتھ پہ رکھ دو
یوں پیار سے ملنا بھی مناسب نہیں لگتا...... یہ خواب کا قصہ ہے اسے رات پہ رکھ دو

ہمیشہ کی طرح آپ کا اداریہ شاندار تھا واقعی کورونا کی وجہ سے ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے کہ فروری کے بعد یک دم دسمبر آ گیا اور اب ہم 2021ء کی سرحد پر کھڑے داخلے کے منتظر ہیں کہ جہاں بہت سی امیدیں، آرزوئیں، تمنائیں اور خوشگوار و روشن لمحے ہمارا استقبال کرنے کو ہیں، ان شاء اللہ۔ انداز نو میں اس بار ہر فن مولا بھائی جان، آصف الیاس تھے ان سے سوال جواب کا انتخاب خوب رہا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت میں جگہ دے، آمین۔ اور ہماری آپی فریدہ جاوید فری، امینہ عندلیب، نرگس نسیم کو مکمل صحت یابی دے، آمین۔ ہم ساجدہ ظفر کو بیٹی کی شادی پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ آپی کوثر خالد، بیٹے کو پیار دینے کا شکریہ...... جبینا، میری نگارشات پسند فرمانے کا بے حد شکریہ...... تمام پاکیزہ پڑھنے اور اس میں لکھنے والی بہنوں کو سال نو 2021ء مبارک ہو۔'' (جی آپ کو بھی مبارک ہو)

فرخندہ جعفری، گجرات سے۔ ''ماہ دسمبر کا خوب صورت اوڑھنی لیے ہوئے خوب صورت ماڈل کے روپ میں پاکیزہ ملا...... ویسے بھی یہ ماہ محبت نمبر ہے، ہم سب کو ایک دوسرے سے محبتیں بانٹتے رہنا چاہیے۔ (جی بے شک......) اللہ تعالیٰ سب کو اس موذی بیماری سے بچائے تاکہ انسان بہتر اور عزت کی دال روٹی کمائے اور کھائے۔ (الٰہی آمین) ریٹائرمنٹ عائشہ مصطفیٰ...... بالکل سچی کہانی ہے، 2013ء میں، میں جب ریٹائر ہوئی تھی تو کتنے ہی رشتے دار جنہوں نے کبھی شکل نہیں دکھائی تھی۔ وہ اپنی اپنی ضرورتیں لے کر آ گئے تھے۔ کچھ تو واقعی ضرورت مند تھے مگر کچھ کا مقصد صرف پیسے بٹورنا تھا۔ مگر میں نے بھی نفسیات پڑھی ہوئی تھی لوگوں کو پرکھنے کا ہنر آتا تھا۔ کچھ کی مدد کی کچھ کو اچھے طریقے سے ٹال دیا۔ (واہ بہت خوب کیا) اوڑھنی، فرح ریاض چیمہ۔ بعض عورتیں دل میں اتنا شک پال لیتی ہیں کہ اپنا ہی گھر برباد کر لیتی ہیں۔ شوہر اچھا ہو یا برا اس کی عزت کا خیال رکھنا عورت پر واجب ہے۔ (بے شک) عورت کو چاہیے کہ اپنے شوہر کے ساتھ پاکیزہ زندگی گزارے ورنہ رب کا عذاب آئے گا، اس کو چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی۔ ناسور، سعدیہ ہما شیخ۔ یہ سچ ہے کہ عورت ایک دفعہ کہیں بس نہیں سکی تو اسے دوبارہ جہنم میں نہ دھکیلا جائے۔ پھر وٹے سٹے کی شادی رسک ہے...... اس بیچاری نے اپنا سب کچھ دے دیا۔ ظلم سہا، آخر سرطان جیسے موذی مرض نے اس کی جان لے لی۔ ایسے ہزاروں کردار ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں ایک گھر کے بجائے چار، چار گھر اجڑتے دیکھے ہیں۔ (درست کہہ رہی ہیں) ع عورت، گ، گمنام، فرحین اظفر عورت کے مسائل اور دکھ اجاگر کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتی ہیں۔ ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے پڑھ کر دل دکھی بھی ہوتا ہے اور ایک سبق بھی دکھائی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو رزق قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہی ملتا ہے۔ تمام رائٹرز نے ایک سے بڑھ کر ایک کہانی پاکیزہ کو دی ہے۔ سب کی محنت کا ثمر ہے کہ پاکیزہ رسالہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ (آپ سب کا تعاون ہے) تمام کہانیاں سبق آموز اور نصیحت پر مبنی ہیں۔ ادارے کے تمام ممبرز کو نیا سال مبارک ہو۔'' (آپ کو بھی مبارک ہو اللہ تعالیٰ نیا سال خیر و برکت میں گزارے، آمین......)

تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''دسمبر کا محبتوں سے گندھا محبت نمبر پڑھ کر پاکیزہ سے محبت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے تو جناب

تھوڑی سی معیاری تنقید بھی ہونی چاہیے۔ بقول آپ کے تو ایک بات خوب صورت ناول میرا اسارا زنگ اتار دو کے بارے میں ہے۔ دُرِمکنون کی والدہ صاحبہ نے اپنی حسین بیٹی کو تنہا کیوں بھیج دیا وہ بھی ایک نئے علاقے میں...... سب سے بڑی غلطی تو انہوں نے ہی کی ہے، باقی کسر زاویار نے اپنی بزدلی اور غصے کی وجہ سے کردی۔ یہ بات مناسب نہیں لگی مگر خیر ہے یہ تو ایک ناول ہے اور افسانوی دنیا میں تو سب چلتا ہے تو (تو اور کیا اسی سے تو سبق ملتا ہے) اور روحیلہ خان کے ناولٹ بوجھ کو اسٹوری کے لحاظ سے تو بہتر کہہ سکتے ہیں مگر نہ جانے کیوں اس میں کچھ جھول محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نووارد کی تحریر ہو، آپ کا کیا خیال ہے۔ (آپ کی رائے روحیلہ خان تک پہنچ گئی) سعدیہ رئیس کی میں انمول بھی ٹھیک ٹھاک ہی چل رہی ہے۔ اور فرحین اظفر کی عورت کہانی کی اسٹوری ہمیشہ کی طرح بے مثال لگی، جواب نہیں ان کی خوب صورت اور موثر کہانی کا۔ ماشاء اللہ اسی طرح غزالہ عزیز کا۔ یقین کا سفر بھی اچھا لگا اور عالیہ حرا کا یا حی یا قیوم کو شاندار بلکہ بے حد شاندار سبق آموز بہت، بہت عمدہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا...... عالیہ کو سلام اور مبارک باد کہیے گا۔ (جی ضرور) افسانوں میں ہمیں بھی جینے دو...... عطیہ ہدایت اللہ نے بہت خوب لکھا۔ فرح ریاض چیمہ کی اوڑھنی بھی اچھی رہی اور ریٹائرمنٹ، عائشہ مصطفیٰ نے بڑا جم کے لکھا۔ حقیقت یہی ہے کہ لوگ ہر بہانے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں انہوں نے بالکل درست عکاسی کی ہے اس کے علاوہ پاکیزہ کی ڈائری، آمنہ حماد بہت خوب صورت مرتب کر رہی ہیں اور بزم پاکیزہ تو ہنستی، مسکراتی، کھلکھلاتی مزیدار محفل ہے، بہت مزہ آتا ہے اور جناب بہنوں کی محفل کا تو مزہ ہی کچھ اور ہے۔ قارئین بہنیں زبردست تبصرے کرتی ہیں، بھئی پاکیزہ تو ہے گلاب کے پھولوں کا حسین گلدستہ اللہ سلامت رکھے۔ (جزاک اللہ) سلمیٰ غزل صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ آج کل میرے بیٹے کے CA کے فائنل پیپر ہو رہے ہیں ضرور بہنیں دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ کامیاب کرے، آمین۔“ (اللہ پاک کامیابی دیں آپ اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھیں۔ الٰہی آمین)

بھو جینا، کراچی سے۔ ”تمام پاکیزہ فیملی کو محبت بھرا سلام...... بہت، بہت شکریہ میری نعت شائع کرنے کا جزاک اللہ...... مستقل سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک اچھے رہے۔ آصف الیاس کا انٹرویو جاندار تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے دو کا ذکر جن کا نام ہی اللہ تعالیٰ کے مبارک ناموں سے تھا۔ ستار العیوب ایک اچھی تحریر تھی پوری کہانی میں کہیں محسوس نہیں ہوا کہ بیچاری ہیروئن، ایک پلاننگ کے تحت ایک اچھی بہو کے طور پر چنی گئی۔ جس کا سارا پول اینڈ پر کھلا وہ بھی آخری سفر پر جانے سے کچھ دیر پہلے پھر اس کے دھوکے کا بھی اللہ نے پردہ رکھا۔ بے شک وہی عیبوں کو ڈھانپنے والا ہے۔ دوسری کہانی یا حی یا قیوم...... دین کے بارے میں کافی اچھی معلومات پہنچائی گئی۔ بگڑے بچے بھی کافی سدھر گئے مگر کیا بڑے صاحب کی تشریف آوری گھر میں۔ سالوں بعد ہوئی تھی جو اتنی ساری خرابیاں اتنی دیر سے نظر آئیں ان کو گھر سے اتنا غافل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ (بات تو درست ہے مگر جب ہوش آجائے) اور ایک بات تو انہوں نے خود ہی کہہ دی۔ چراغ تلے اندھیرا اور ایسا اندھیرا تو ہمارے اکثر گھروں میں نظر آتا ہے۔ (یہی بتانا مقصد تھا رائٹر کا) بوجھ پڑھ کر دل کا بوجھ بھی بڑھ گیا۔ ہمیں بھی جینے دو، میں ایک اچھا پیغام تھا۔ ہمیں اپنے والدین اور بزرگوں کی ضروریات کا ہر حال میں خیال رکھنا چاہیے۔ چاہے وہ جسمانی ہوں، روحانی یا نفسیاتی، وہ ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں کاغذ کے روپوں کو تو ہم بینکوں اور تالوں میں چھپا کر رکھتے ہیں اور ہمارے بزرگ اب صرف گھر کی چوکیداری، سبزی لانے یا پھر بچوں کو اسکول چھوڑنے، لانے کے لیے رہ گئے ہیں اور آپی میں نے تو پچھلے دس سالوں سے اسکولوں کے باہر عمر رسیدہ، دمے کے مریض اور جوڑوں کے درد سے بے حال لوگوں کو اپنے بچوں کے بچوں کو لاتے لے جاتے دیکھا ہے۔ بہت رونا آتا ہے ان کا حال دیکھ کر اللہ ایسے غیر ذمے دار لوگوں کے دل میں رحم ڈالے۔ (بالکل درست مشاہدہ ہے جینا) آمین۔ عورت کہانی، بہت بہترین اور لاجواب کہانی ہے۔ پرائی مرغی سے اپنی حلال اور عزت کی دال چٹنی اچھی سونے کی چمک تو اصلی اور نقلی دونوں کی ایک جیسی ہی ہوتی ہے، فرق تو قیمت اور حیثیت کا ہے۔ چھوٹے، چھوٹے مضامین، ناہید فاطمہ اور نیر فہیم کے بہت خوب صورت اور دل کو لگے۔ اوڑھنی، ناسور، ریٹائرمنٹ اور چھوٹی سی بات اپنی جگہ

انتقالِ پُر ملال

ادارے سے وابستہ ہمارے دیرینہ ساتھی ہومیو ڈاکٹر نعیم اختر کی والدہ ماجدہ زرینہ خاتون مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ پروردگار عالم سے دعا ہے کہ مرحومہ کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا ہو، الٰہی آمین۔

ہر تحریر بہترین رہی۔ چھوٹے، چھوٹے پاکسز کی شاعری بہت بھائی، خاص طور پر آزاد نظمیں میری جانب سے اتنا اچھا لکھنے والوں کو دعائیں اور مبارک باد۔" (تمہارے تبصرے اور تجزیے کا شکریہ)

حمیرا انجم وحید، واہ کینٹ سے۔ "پاکیزہ سے جڑے ہر فرد کے لیے دعا گو ہوں...... یہ معیاری رسالہ اپنے رائٹرز اور قاری کے غم و خوشی میں ساتھ دیتا ہے۔ اللہ پاک روز بروز پاکیزہ کو ترقی دے...... (الٰہی آمین) محبت نمبر میں اچھی تحریریں شامل تھیں۔ شمع ہدایت سلسلے کے تعریف کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے۔ پچھلے ماہ نیت کے بارے میں پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ آپ کو بتا نہیں سکتی۔ اس بار حضورؐ کے معجزات کے بارے میں پڑھا۔ اختر شجاعت آپی آپ کا لکھا ہوا ہر جملہ قابلِ تعریف ہے۔ (بس آپ لوگوں کی قدر دانی ہے اور اختر کی سچی لگن) پاکیزہ کی کہانیاں معیاری ہوتی ہیں۔ جن کہانیوں کا میں نے مطالعہ کیا۔ ان میں کہانی ریٹائرمنٹ پڑھ کر یہ سوچیں پیدا ہوئیں۔ شہر ہو یا گاؤں ہر مزاج کے لوگ ہر جگہ بستے ہیں۔ کہانی ناسور پڑھ کر دل دکھی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے کی عکاسی کر رہی تھی۔ طلاق یافتہ عورت اس قدر تنقید کا نشانہ بنائی جاتی ہے کہ ایک عورت طلاق سے بچنے کے لیے اپنی جان دینا بہتر سمجھتی ہے، جو کہانیاں مجھے پسند آئیں ان میں یا حی یا قیوم...... ہمیں جینے دو شامل ہیں۔ سلسلے وار ناول میں عشق ہوں...... اچھا جا رہا ہے۔ نئے سال کا آغاز ہونے کو ہے...... دعا ہے یہ سال خوشیوں کا سال ہو...... کورونا وائرس سے نجات کا سال ثابت ہو۔" (الٰہی آمین...... حمیرا پیارے سے تبصرے کا شکریہ آپ کی ہمت بندھانا ہمارا کام ہے بس ہمیں بھی ایسے ہی خط لکھتی رہیں)

عائشہ مصطفیٰ، واہ کینٹ سے۔ "چار تاریخ کو دسمبر کا پاکیزہ خریدا۔ اپنی کہانی دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ فون پر جب آپ سے بات ہوئی تو میں حیران رہ گئی کہ آپ اتنے سالوں بعد بھی مجھے بھولی نہیں تھیں۔ (رائٹرز کے نام تو ایک دفعہ کے بعد ذہن میں رہ جاتے ہیں) پاکیزہ میں ابھی بہنوں کی محفل پڑھی ہے اور افشاں آفریدی کا ناول میرا اسرار ازنگ اتار دو...... باقی ابھی ٹائم نہیں ملا۔ بچے آج کل گھر پر ہیں...... اور مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ ان شاء اللہ رابطہ تو اب رہے گا۔ افشاں آفریدی کا ناول مجھے بہت پسند ہے اس لیے بس وہ سب سے پہلے پڑھ لیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح بہترین تھا...... انجم آپا کے بعد آپ بہت اچھے سے سب سنبھال رہی ہیں۔ (بہت نوازش بس ان کے ساتھ کام جو کیا ہے) عذرا رسول آپا کو میرا اسلام، ان شاء اللہ اب رابطہ نہیں ٹوٹے گا۔ بشرطِ زندگی (ان شاء اللہ ضرور) اللہ تعالیٰ پاکیزہ کو ایسے ہی ترقی دیتا رہے...... یہ ہمارے لیے بھی ایک روزن ہے۔ ہمارے سادہ سے افسانوں کو پزیرائی ملتی ہے۔ مجھے ہلکا پھلکا لکھنا اچھا لگتا ہے۔" (ضرور لکھیں ہر مزاج کی کہانیاں لے کر ہم چلتے ہیں۔ مختصر خط کا شکریہ)

فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی سے۔ "دسمبر کا ماہنامہ جلد ہی مل گیا۔ ہر چیز بہت خوب ہے۔ اس بار اختر بہن کا مقالہ بھی بہت اچھا لگا۔ ویسے تو بہن ہمیشہ ہی بہت عمدہ لکھتی ہیں۔ اس دفعہ اس ذات اقدس کے بارے میں لکھا ہے جس کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ وہ ذاتِ اکمل جس کی تعریف خود خدا نے کی ہے۔ انسان کیسے کر سکتا ہے۔ مگر بہن نے معجزاتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بہت تحقیق کے بعد بہترین مضمون لکھا ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے اختر بہن...... جزاک اللہ۔ شائستہ زریں کا سروے اس بار بہت اچھا لگا۔ موضوع ہی بے حد خوب صورت ہے، عشق مجازی اور عشق حقیقی انہوں نے بہت اچھا اظہار خیال کیا ہے اور بہترین...... الفاظ تو سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ ناول دونوں اچھے جا رہے ہیں، افشاں آفریدی کے حقائق اور نایاب جیلانی کی پُراسراریت دونوں بہت دلچسپ ہیں۔ خولہ سعید جاوید کی ستار العیوب بہت اچھی سبق آموز کہانی ہے۔ مختصر کہانی لکھنا بڑا مشکل کام ہے اور پھر ایک منطقی انجام تک پہنچانا اس سے بھی مشکل ہے۔ بہت اچھا لکھا ہے، فرحین کی تحریر کے کیا کہنے...... ہمیشہ ہی اچھا لکھتی ہیں، اس بار عورت کہانی بہت سبق آموز تھی۔ انسان کو خدا کی مشیت پر قانع رہنا چاہیے۔ جو جس جگہ ہے ٹھیک ہے، دوسروں کی حرص میں انسان اکثر بہت کچھ کھو دیتا ہے۔ (بالکل درست کہا) عالیہ حرا کا ناولٹ اور عطیہ ہدایت اللہ کی کہانی بھی خوب تھی۔ پچھلے دنوں پریوں کا دیس بہت اچھا لگا۔ حبس اور گھٹن کے اس ماحول میں ایسی کہانیاں خوشبودار ہوا کے جھونکے کے مانند ہوتی ہیں۔ مدیحہ شاہد آپ کا شکریہ پھر لکھیے۔ (جی جلد ہی لکھ رہی ہیں) نئے سال کے حوالے سے آپ کا اداریہ بہترین تھا، اچھی نیت اور اچھے اعمال کی خدا توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اکثر آپ کو فون کرتی ہوں تو نام کے ساتھ جو پیغام ہے وہ بڑا متاثر کن ہے، آپ نے لکھا ہے...... خدا تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہیں مگر میں نے خدا کا پسندیدہ راستہ "مخلوق سے محبت" چنا ہے واہ...... (جزاک اللہ) شمیم فضل خالق اور انجم انصار کے شوہر حضرات کے انتقال پر پہلے بھی لکھ چکی ہوں، خدا ان بہنوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور صحت کے ساتھ زندگی کے سارے

فرائض ادا کرنے کا حوصلہ دے۔ دیگر بہنوں کے مرحومین کے لیے بھی دعائے مغفرت اور بیماروں کے لیے شفایابی کی دعائیں، آمین۔" (بہت شکریہ آپا، آپ باقاعدگی سے جامع تبصرہ کرتی ہیں)

✿ نازنین آفریدی، پشاور سے۔ "میری جانب سے سب بہنوں کو نئے سال کی بہت مبارک باد ہو اور جو غم اور تکلیفیں ہم نے 2020ء میں اٹھائیں 2021ء میں اس سے دگنی خوشیاں ملیں، آمین...... پاکیزہ محفل اچھی سجی تھی۔ آنٹی انجم انصار اور آنٹی شمیم فضل خالق کے غم میں برابر کی شریک ہوں...... اللہ دونوں کو صبر اور مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب ہو، آمین...... جن کو غم ملے سب کو اللہ صبر دے اور جن کو خوشیاں ملیں انہیں بہت مبارک باد۔ پاکیزہ ڈائری، آمنہ حماد سجا رہی ہیں کیا وجہ ہے؟ عظمیٰ آپی کہاں ہیں؟ (عظمیٰ آپی ماشاء اللہ گھر اور بچوں میں مصروف ہیں، انجم انصار آپی بخیریت ہیں الحمدللہ) پاکیزہ ڈائری میں ساجدہ ظفر کا مراسلہ بہت پسند آیا۔ آنٹی کچھ سال پہلے انجم آنٹی نے ہانڈی تالے کا عمل دیا تھا روحانی مشورے میں، اگر آپ دوبارہ بتادیں تو مہربانی ہوگی۔ (جی بالکل کوشش کریں گے) اس بار روحانی مشورے، بہت بہترین تھا۔ اختر شجاعت آنٹی کے تو سب ہی مضامین بہت بہترین رہے لیکن یہ والا نبی کریمؐ کے معجزات بہت زبردست اور بہت غور سے پڑھا اور پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ان شاء اللہ مارچ میں ہی شب معراج بھی آرہی ہے اگر ہو سکے تو اختر آنٹی اس ماہ معراج پر مضمون دے دیں۔ آنٹی جی مصنفین کے انٹرویو دینا کیوں بند کردیے؟ (بالکل بند نہیں کیے اس ماہ تو دیا ہے) ایک فرمائش کرنی تھی (جی ضرور) ARY کے اینکرز صابر شاکر اور اقرار الحسن کا بھی تفصیلی انٹرویو کریں...... (جی ضرور بس وقت ان حضرات سے مل جائے) سروے اور اندازِ تو ٹھیک لگے۔ منتخب غزلیں پسند آئیں۔ سلسلے وار ناولز میں میرا اسرار زنگ اتار دو کی یہ قسط اچھی رہی...... اب تو شاید آخری ایک آدھ قسط ہی رہتی ہے۔ (ایک آدھ نہیں کئی ایک۔ آخر کو اتنا زبردست ناول ہے تسلی سے پڑھتی رہو) ویسے میں بلاوجہ ہی زاویار کو مجرم سمجھتی رہی (سب ہی سمجھتے رہے) میں عشق ہوں پُراسراری کہانی لیکن مجھے بہت پسند ہے۔ ناولٹ میں عالیہ حرا کا اندازِ تحریر مجھے پسند ہے اور کہانی میں جس مسئلے کی طرف نشاندہی کی یعنی مذہب سے آج کل کے بچوں کی دوری اس کا گناہ یقیناً والدین کو ملے گا۔ کیونکہ بچے نے وہی بننا ہوتا ہے جیسے اس کی تربیت کی جائے۔ دوسرا ناولٹ روحیلہ خان کا بوجھ، موضوع اچھا ہے اور پسند بھی آیا۔ اب دیکھتے ہیں اختتام کس پر ہوگا...... (اب دیکھ لیا ہوگا) سعدیہ رئیس کی انمول مجھے شروع سے ہی بہت انمول لگ رہی تھی لیکن اس قسط میں پھوپی پر بہت غصہ آیا۔ یہ فساد کی جڑ لگتا ہے انمول کی زندگی میں کچھ زہر گھول کر ہی جائیں گی۔ (پڑھتی جاؤ کافی سبق آموز دلچسپ ہے مرحلہ وار عقل آتی ہے) پسند کی بات ہو رہی ہے تو پسند تو خولہ جاوید کی ستار العیوب بھی بہت آئی اور انجام بہت مناسب لگا۔ شایان کے ساتھ جو بھی ہوا ٹھیک ہوا۔ ع عورت گ گمنام اور چھوٹی سی بارت کچھ خاص نہیں لگیں۔ ریٹائرمنٹ کا موضوع بھی نیا لگا۔ اچھی کوشش تھی عائشہ مصطفیٰ کی جبکہ اوڑھنی اور ناسور بھی پسند آئیں۔ مجموعی طور پر 2020ء کا آخری پرچہ اچھا نکالا آپ نے (بہت نوازش، یہ سب رائٹرز کا تعاون اور آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی ہے) آنٹی گزارش یہ کرنی تھی کہ سندھ سے باہر کے جو لوگ یعنی میری طرح جو دور سے آپ کو خط لکھتے ہیں۔ ان کو تھوڑا مارجن خط چھاپنے کے معاملے میں دے دیا کریں کہ اگر آپ کو ان کے خطوط بروقت نہیں بھی مل پاتے تو درگزر کر دیا کریں کیونکہ سندھ یا کراچی سے باہر والوں کو ایک تو رسالے بھی لیٹ ملتے ہیں سو پھر ڈاک پر بھی اثر پڑتا ہے۔ بہر حال آج کے لیے اتنا کافی ہے اگلے ماہ پھر حاضری دوں گی...... دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔" (نازنین اصل میں پاکیزہ تو اب 23,24 تک مارکیٹ میں آجاتا ہے اپنے علاقے کے ایجنٹ، دکان دار وغیرہ سے کہیں جلد منگوائیں آپ نے صحیح تاریخ پر تبصرہ بھیجا ہے)

✿ نزہت زیدی، سید نگر سے۔ "زندگی میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں، پاکیزہ کی پہلی اشاعت کے وقت پہلا پاکیزہ میری خالہ نے خریدا۔ میں چھوٹی تھی مگر گھر میں پاکیزہ آتا رہا۔ اب خود پڑھتی ہوں، آپ سے ایک شکایت لے کر آئی ہوں لاک ڈاؤن کی وجہ سے پاکیزہ نہیں ملا...... ستمبر اور نومبر 2020ء کے رسالے نہیں ملے۔ اب آپ میرے اس ایڈریس پر اگر ارسال کردیں بہت نوازش ہوگی، ہماری بہت پیاری بہن عذرا رسول ضرور مجھے بھجوا دیں گی۔ دسمبر کا بھی اگر ہو سکے تو تینوں پاکیزہ بھیج دیں۔ فرداً فرداً ادائیگی کروں گی اور آئندہ رسالے کے متعلق تفصیل ضرور لکھوں گی۔" (آپ کا پاکیزہ کے لیے محبت نامہ پاکر بہت خوشی ہوئی۔ پیاری ہم نام بہن نزہت اگر آپ انہی صفحات پر لکھے پاکیزہ کے نمبر 0213,5386783 پر فون کرلیں تو رسالے سے متعلق تفصیلات آپ کو پہنچادی جائیں گی۔)

✿ فہمیدہ جاوید، ملتان سے۔ "دسمبر کے سرورق پر فرینہ اعجاز میری پسندیدہ ماڈل ہے اور سرورق بہت اچھا لگا۔ اداریہ اور

اختر شجاعت کے لکھے واقعات جو معجزات کے متعلق تھے لاجواب تھے۔ مسلسل ناول میں افشاں نے راز سے پردہ اٹھا دیا اور دُرّی، سائرہ کی بیٹی ہے کیا بات ہے بھئی پھر بھی سائرہ انجان بنی رہی۔ (وہ جانتی جو نہیں تھیں بھئی) نایاب جی کا ناول رک سا گیا ہے۔ (ارے پڑھتی رہو ابھی بہت انوکھے انکشاف ہوں گے) میرے خیال سے احتشام، عمائم کو پسند کرتا ہے اور نورس مدرسے کی آڑ میں کچھ غلط کر رہی ہے اس وجہ سے احتشام، نورس کی جاسوسی کر رہا ہے اور احتشام ایک خفیہ ادارے کا رکن ہے۔ (واہ کیا اندازہ لگایا ہے) انمول کی پھپھو کا اچانک سے آ کر معاملات اپنے ہاتھ میں لے کر انمول اور ایمل کی شادی اور باپ کی شادی کروانا بھی ناول نے ایک دم سے اسپیڈ پکڑی اور ختم اگلے ماہ ہوگا خیر اچھا یہ بھی پسندیدہ رہا۔ روحیلہ جی مجھے تو آپ کے ناول کا ہیرو فراڈ لگ رہا ہے اور ہیروئن نے شادی بھی کر لی دوسرے ملک میں، اللہ دھوکے سے محفوظ رکھے۔ عالیہ حرا نے بہت ہی جامع انداز میں معاشرے کی عکاسی کی۔ ناولٹ کی صورت میں بہت ہی اصلاحی رہا اور یہ صدقہ جاریہ ہے عالیہ تمہاری طرف سے۔ یقین کا سفر، معذرت کے ساتھ چند صفحات پڑھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کیا ہوگا آگے۔ (چلو تم تو عقل مند نکلیں) غزالہ مائنڈ نہ کرنا مگر آئندہ جاندار تحریر کے ساتھ آنا جیسے ہمیشہ آتی ہو۔ عورت کہانی، اچھی رہی، فرحین کا انداز کاٹ دار جملے اور طنزیہ انداز پسند آ رہا ہے۔ ریٹائرمنٹ کچھ خاص نہ لگا خونی رشتوں کی خود غرضی، اوڑھنی ٹھیک ہی تھا کہ یہ اوڑھنی ہی عورت کی اہم شناخت ہے۔ ہمیں بھی جینے دو، اولاد کا والدین سے برا سلوک اور خود غرضی مگر افسانہ اچھا تھا۔ ناسور عورت کی مظلومیت کی داستان کہ آخر کب تک عورت ظلم کی چکی میں پستی رہے گی۔ چھوٹی سی بات، بہن کی بہن سے بدگمانی مگر اینڈ اچھا رہا۔ سب ٹھیک ہو گیا۔ ستار العیوب بہت حیران کن رہا ہیرو کا طلاق دینا مگر وہ بھی جہاز سے گر کر مر گیا بیچارہ...... اندازِ نو نزہت تمہارے کہنے پر پڑھا ہاں اچھا تھا مگر اگلے شمارے میں تم اور شائستہ ملاقات کروانا کسی رائٹر سے کہ تم دونوں کا انداز ہے جداگانہ اور میرا پسندیدہ (تو پڑھ لیا انٹرویو!) نئے سال کے لیے تو نزہت، ناہید سلطانہ اختر کو ملاقات کے کمرے میں ہاتھ پکڑ کر لاؤ کھینچ کر کہ ہم کتنے ہی سالوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ (جی بالکل کوشش کریں گے) پاکیزہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے اور میں اسے ہر لحاظ سے دوسروں سے معیاری اور اچھا دیکھنا چاہتی ہوں۔ (آپ کی تجاویز سر آنکھوں پر خامیوں کو دور کیا جائے گا) تجویز ہے کہ اپریل 2021ء کا شمارہ 150 روپے کا کر دیں تاکہ سالگرہ نمبر زیادہ اچھے سے تیار ہو سکے جس میں زیادہ افسانے، زیادہ و طویل مکمل و سلسلے وار ناول، ناولٹ ہوں اور رائٹرز کا پاکیزہ کے متعلق علیحدہ سے سروے اور بہنوں کا بھی علیحدہ ہو اور کسی بڑی رائٹر کا دھماکے دار انٹرویو اور سرورق پر مکمل سجی ہوئی دلہن ہو اور بہنوں کے لیے کوئی نیا مستقل سلسلہ شروع ہو اور زیادہ تعداد میں خطوط لگیں اور پورے مہینے کی پاکیزہ کی ابتدا سے تکمیل تک۔ کے مراحل پر مبنی مضمون اور کارکردگی کا جائزہ ہو اور آفس کی شمارے میں تصویر ہو کہ چلو آفس تصویر ہی میں وقتی طور پر دیکھ لیں۔" (اُف کیا تجاویز ہیں، اللہ کرے فہمیدہ کہ یہ تمہاری خواہشات ہم پوری کر سکیں تفصیلی تبصرے کا شکریہ...... بہنیں بھی اپنی رائے ضرور دیں)

✍ نیر فہیم خان، کراچی سے۔ "اس سال میں نے اپنے آپ سے عہد کیا ہے کہ ہر ماہ پاکیزہ میں حاضری دوں گی۔ پہلے کوئی ماہ ایسا نہ جاتا تھا کہ تبصرہ نہ ہو۔ پاکیزہ ایوارڈ بھی بہنوں کی محفل میں شامل ہونے کے سبب ہی ملا تھا کیا اچھا دور تھا وہ بھی 2000ء سے 2005ء تک بہترین رہا۔ پھر شادی، ذمّے داریاں، جڑواں بچے (ماشاءاللہ) وقت سے برکت ختم ہو گئی۔ نہ لکھ پائی نہ پڑھ پائی یوں لگا زندگی جیسے اندھیرے میں بسر ہوتی رہی اب جبکہ بیٹی کی عمر 10 سال ہو چکی ہے تو عمرِ رفتہ کو آواز دینے کو جی چاہتا ہے۔ پاکیزہ میں تقریباً 8 آٹھ سال بعد اپنی تحریر دیکھ کر یقین کریں آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ (خوشی سے) کورنگی روڈ سے گزرتے کئی بار دل چاہا آپ سے ملوں مگر...... ہمت...... کہاں سے لاؤں۔ (ارے تو فوراً کرو ناں ہمت) انجم آنی گریٹ ہیں۔ بہت پیار سے بات کرتی ہیں اور یاد بھی رکھتی ہیں۔ آپ سے آج تک بات نہیں ہو پائی کئی بار دل چاہا بات کروں پھر سوچتی کس موضوع پر بات کروں خط نہ ہی تبصرہ نہ افسانہ نہ سروے۔ انجم آنی سے تو ڈائریکٹ تحریروں پر بات کرتی تھی۔ کیا آپ سے ایویں ہی بات کی جا سکتی ہے۔ نہیں ناں...... بس یہی سوچ کر ہمت نہیں ہوتی۔ مگر اب کوشش کروں گی۔" (ارے پیاری نیر فہیم آپ نے اتنا ڈرتے، ڈرتے خط کیوں لکھا اور فون پر تو بات محض حال احوال پوچھنے کے لیے بھی کی جا سکتی ہے۔ گھبرائیں نہیں...... اب کے آفس کا چکر لگا لیں۔ وقت تو خیر پر لگا کر اڑتا جا رہا ہے، اللہ پاک خیر رکھے)

✍ خولہ سعید جاوید، کراچی سے۔ "اس دفعہ سب سے پہلے اختر شجاعت کا حضور اقدسؐ کے معجزات کے بارے میں پڑھا

اس خوب صورت مضمون میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یقیناً عرق ریزی سے جمع کیا گیا ہے۔ بیان کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے لیے تعریف کا لفظ بہت چھوٹا ہے یہ مضمون گھر میں ہر بچے کو نا صرف پڑھنا چاہیے بلکہ ذہن نشین بھی کرنا چاہیے۔ اختر شجاعت بے مثال لکھتی ہیں اللہ پاک دونوں جہانوں میں ان کے درجات بلند کرے اور آخری سانس تک ان کے ہاتھوں میں لکھنے کی طاقت سلامت رکھے، آمین۔ کاش ہم بہنیں کھانا پکاتے وقت درود شریف بہ آواز بلند پڑھا کریں تو کھانے میں برکت اور رحمت پیدا ہو جائے۔ پچھلے کئی ماہ سے تبصرہ نہیں لکھ سکی، انجم انصار اور شمیم فضل خالق کو صبر کے ساتھ پروردگار ہمت بھی دے۔ عورت کا سارا مان شوہر کے ساتھ ہی ہوتا ہے اور مرحومین کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ یا حی یا قیوم بہترین تحریر تھی، عالیہ حرا نے اپنے اسٹائل سے ہٹ کر لکھا اور بہت خوب لکھا۔ فرحین اظفر نے میڈیا کی چکا چوند سے متاثر ہونے والوں اور ایک چانس کے منتظر لوگوں کے بارے میں بہت اچھا لکھا۔ میر اسار از نگ اتار دو میں اب زاویار کا کردار واضح ہوا اور نہ وہ اس سب میں فٹ نہیں ہو رہا تھا۔ باقی سارے افسانے بھی بہترین ہیں۔ ناہید فاطمہ حسنین کا کفش آپ کا ڈی این اے بہت اچھا رہا۔ میں بھی ناہید کی طرح سب سے پہلے پاؤں اور جوتے دیکھتی ہوں پڑھ کر مزہ آیا۔ آپ سے اور آمنہ حماد سے فون پر بات ہوئی بہت اچھا لگتا ہے آپ سے بات کرنا۔ خوش رہیں، آمنہ حماد کو اللہ تعالیٰ بھائی کا غم برداشت کرنے کی ہمت دے اور بھابی، بچوں کے لیے آئندہ آسانیاں عطا فرمائے۔" (آمین۔)

فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ "پروردگار عظیم یہ نیا سال ہم سب کے لیے ہمارے پیارے ملک کے لیے اور پوری دنیا کے لیے امن وسلامتی، خوشیوں کا پیغام لائے، آمین۔ عبادات، درود وسلام، صدقات وخیرات سے اس نئے سال کو خوش آمدید کہیں۔ اللہ ہماری کوتاہیوں کو معاف کرے اور پوری امت مسلمہ کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا کرے، آمین۔ خوب صورت سا سادہ ٹائٹل آنکھوں کو اچھا لگا۔ سارے سلسلے ہی خوب ہیں۔ شمع ہدایت ایمان افروز کالم ہے۔ جزاک اللہ خیر...... اس شمارے میں بہترین کہانی یا حی یا قیوم اچھی لگی۔ یہ تقریباً ہر گھر کا نقشہ ہے۔ دعا ہے کہ ایسے داداہر گھر میں ہوں۔ ہم اگر خود احتسابی کریں اور اپنے روزمرہ کے اعمال کا جائزہ لیں تو دامن خالی ہی ملے گا۔ روحیلہ خان کے بوجھ میں آخری پیراگراف کچھ شکوک پیدا کر گیا۔ دال میں کچھ کالا سا لگ رہا ہے۔ اللہ خیر کرے قرۃ العین کے ساتھ کچھ برا نہ ہو۔ گوشۂ ظرافت خوب تھا۔ انمول کا اختتام ہوگا۔ بہنوں کی محفل میں حاضری سے دوسروں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ دعا ہے کہ کورونا کی یہ وبا غارت ہو، آمین۔ اپنا اپنے پیاروں کا اپنے آس پاس کے لوگوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ صاحب حیثیت بہنیں اپنی گاڑی میں چند گرم کپڑے، سوئیٹر، شال یا کمبل ضرور رکھیں۔ کہیں نہ کہیں فٹ پاتھ پر کوئی بندہ ٹھٹھرتا ہوا نظر آئے تو اس کی دعا لیں۔ تندور سے روٹیاں لیتے وقت کچھ رقم فی سبیل اللہ دکاندار کو دے دیں کہ وہ اس رقم سے چند روٹیاں کسی مستحق کو دے دیا کرے۔ ہم نے اپنے قریبی تندور چی کے پاس ایک ٹوکری رکھوا دی ہے کہ اس میں غریب مستحق مزدوروں کو روٹیاں فری دے دیا کرے اور سب اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈالتے رہیں۔ اس کا اجر اللہ ہی دے گا۔ بندے کے بس کی بات نہیں...... پروردگار ہمارا ہاتھ دینے والا بنائے لینے والا نہیں...... آمین۔" (بہت پیار بھرے تبصرے اور خوب صورت باتوں، مشوروں سے بھرے خط کا شکریہ۔ بلاشبہ ہمیں ان باتوں کا ضرور خیال رکھنا چاہیے)

ذوالنورین، ہری پور ہزارہ سے۔ "میرے پیارے ابو ستمبر میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ آپ سے گزارش ہے کہ ان کے انتقال کی خبر پاکیزہ میں ضرور لگائیں۔ (بیٹی دسمبر 2020ء میں خبر دی گئی تھی آپ کا یہ خط پہلے کا چلا اب موصول ہوا ہے۔) یہ بات بھی نیکی کے زمرے میں آتی ہے کیونکہ پڑھنے والے کو بھی اجر وثواب ملتا ہے اور شائع کرنے والے کو بھی (جی بالکل) میں آپ کے توسط سے ان سب سے تعزیت کرنا چاہتی ہوں جن کے پیارے ان سے جدا ہوئے...... ہما بیگ، شمیم فضل خالق، باجی انجم انصار اور خاص طور پر عظمیٰ آفاق صاحبہ سے کیونکہ باپ کے بچھڑنے کا دکھ بیٹی سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ میں خود بھی اپنے آپ کو ابھی تک سنبھال نہیں سکی۔ اللہ سب کو صبر دے، آمین (اللہ پاک ہی صبر دیتا ہے) شمیم فضل خالق کی جوانی سے بڑھاپے تک سفر پڑھ کر دل آبدیدہ ہو گیا۔ اللہ ان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور آسانیاں پیدا فرمائے۔" (آمین)

✉ رابعہ خان بنت ڈاکٹر خان رشید، حیدر آباد۔ آپ کے والد کی وفات کا سن کر افسوس ہوا۔ یقیناً ایک استاد کے جانے سے گہرا خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ پاکیزہ سے وابستگی آپ کی پرانی ہے، ضرور لکھیں اور اپنی رائے بھی دیں۔ جی ہم چھوٹے، چھوٹے مضامین، مراسلات، خوب صورت قابلِ غور باتیں اور شاعری معیار کے مطابق ہو تو ضرور لگاتے ہیں۔

✉ بیگم بخاری، فیصل آباد۔ آپ نے جوفون نمبر لکھا اس پر رابطہ کر رہے ہیں مگر نہیں مل پایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی پوتی علیشہ کو کامیابی عطا کرے، آمین۔ آپ چاہیں تو پاکیزہ کے ٹیلی فون نمبر 03316266612 پر کال کر سکتی ہیں۔

مسرتِ عزت، شبقدر کے پی کے سے۔ ”سب سے پہلے غزالہ کا ناول یقین کا سفر پڑھا اور بہت اچھا لگا اگر چہ اس کا اینڈ نہایت فلمی انداز میں ہوا مگر پھر بھی دلچسپ رہا۔ فرحین اظفر نے ع عورت گ گمنام میں عورت کے لیے بہت خوب صورت پیغام دیا۔ ویلڈن۔ روحیلہ خان کی بوجہ بہت اچھی جا رہی ہے آگے کے بارے میں ہمیں بھی تھوڑا تھوڑا اندازہ ہو چکا ہے۔ چلو خیر دیکھتے ہیں۔ شرجیل صاحب کیا گل کھلاتے ہیں۔ ہمیں بھی جینے دو، عطیہ ہدایت اللہ نے بہت اہم ٹاپک پر بہت خوب صورت لکھا واقعی جوان اولاد بوڑھے والدین کی پروا نہیں کرتی لیکن اگر وہ اپنی زندگی کو اچھا بنانا چاہیں تو یہ پھر اولاد سے برداشت نہیں ہوتا۔ عالیہ حرا نے یا حی یا قیوم لکھ کر دل جیت لیا۔ دین کے متعلق بہت اہم معلومات حاصل ہوئیں کہ جن کو صرف پڑھنا نہیں بلکہ اپنی اصلاح بھی ضرور کرنا چاہیے۔ سعدیہ رئیس کی میں انمول بھی اچھی جا رہی ہے۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی تھیں اس کے علاوہ پاکیزہ ڈائری اور روحانی مشورے بہت اچھے لگے۔ اور باقی سب سلسلے بھی دلچسپ ہیں۔“ (اب تو نام درست لکھا ہے ناں، مختصر خط کا شکریہ...... دور دراز سے لکھنے والوں کی یقیناً ہم قدر کرتے ہیں)

پیاری بہنو! ہماری طرف سے ایک مرتبہ پھر سال نو کی مبارک باد وصول کریں۔ ان شاء اللہ اس برس آپ کے پاکیزہ میں بھی نت نئی تبدیلیاں لائیں گے جو آپ کے ہی مشوروں پر مبنی ہوں گی تو جلدی سے بتا دیجیے گا۔ اگلے ماہ یعنی فروری میں معراج رسول صاحب کی دوسری برسی ہے اگر کچھ مختصر لکھنا چاہیں تو ضرور اور جلدی بھیج دیں بعد میں بہنیں بھیج رہی ہوتی ہیں۔ ایک گزارش ہے اپنی نگارشات الگ، الگ صفحات پر لکھا کریں بذریعہ پوسٹ بھیجیں...... میسج پر مشکل ہوتا ہے۔ کہانیوں کے لیے اردو ان پیج کا ذریعہ ہے ای میل ایڈریس بھی اسی لیے دیا جاتا ہے، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ یہ نیا سال ہم سب کے لیے نہایت خوش آئند ہو اور یہ عالمی وبا اب اس جہاں سے نیست و نابود ہو جائے...... یہ سال ہمارے ملک کے لیے بے حد ترقی، خوشحالی اور امن و سکون کا سال ہو، اللہ پاک ہم سب پر اپنا کرم و فضل اور رحم فرمائے، الٰہی آمین۔

آپ کی خیریت کی طالب...... نزہت اصغر

چند گزارشات عرض ہیں

1۔ تمام لکھنے والوں اور تبصرہ کرنے والوں کے لیے لازمی ہے کہ صاف اور رواں خط لکھائی میں لکھیں۔ 2۔ اپنا نام و پتا رابطہ نمبر ضرور لکھیں۔ 3۔ خط کتابت کے لیے دو پتے دیے جاتے ہیں ایک دفتر کی بلڈنگ کا ایڈریس دوسرا پوسٹ بکس نمبر...... یہ آپ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ پوسٹ بکس نمبر پر رجسٹرڈ پوسٹ نہیں جاتی، یہ آپ کے علاقے کے ڈاک خانے کے عملے کو معلوم ہے اور انہیں آپ کو ضرور آگاہ کرنا چاہیے۔ 4۔ کوریئر یا رجسٹری کرنا ہو تو دفتر کا پتا لکھا کریں تاکہ ڈاک بہ آسانی پہنچ جائے ورنہ پوسٹ بکس سے پہنچ تو جاتی ہے مگر بہت دن لگ جاتے ہیں اس لیے خوب دیکھ بھال کر سوچ سمجھ کر ڈاک روانہ کیا کریں۔ عام ڈاک تو پوسٹ بکس پر پہنچ جاتی ہے مگر رجسٹری نہیں، رسید کو اپنے پاس سنبھال کر رکھیں تاکہ بوقتِ ضرورت کام آسکے۔ 5۔ اپنی نگارشات بھیجنے کے ہفتہ دس دن بعد درج ذیل نمبروں پر رابطہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ڈائریکٹ نمبر 02135386783 صبح 10 بجے سے شام 5 بجے۔ 02135802552 Ext -110 صبح 10 سے شام 5 بجے۔ 02135895313 Ext -110

موبائل نمبر۔ 03316266612 صبح 11 بجے سے شام 4 بجے فون کریں میسج کسی بھی وقت send کر سکتی ہیں۔ جوابی ٹیکسٹ کا انتظار کریں۔ جواب ضرور دیا جاتا ہے اگر چہ کچھ دیر سے ہی سہی۔ امید ہے ہماری پیاری اور بے حد سمجھدار بہنیں ان وضاحتوں کو خوب اچھی طرح سمجھ گئی ہوں گی۔ اب دفتر کا پتا بھی نوٹ فرمالیں محفل کے آغاز میں پی او باکس اور ای میل ایڈریس واضح لکھ دیا گیا ہے۔

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
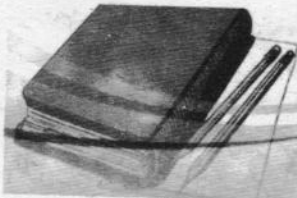
حمد باری تعالیٰ

ہم ہیں گناہ گار اور اس کی عطا بہت
اب شکر کیسے ہوگا ادا کیا کریں گے ہم
راتوں کو جاگ، جاگ کے سجدے کریں گے ہم
سجدے میں جا کے اشک بہایا کریں گے ہم
مجھ کو یقیں ہے معاف وہ کردے گا ہر خطا
اشکوں سے آنسوؤں سے منایا کریں گے ہم
رحمت خدا کی ہوگی شفاعت حضورؐ کی
دل کو پکڑ کے ان کو پکارا کریں گے ہم
امید بندھ رہی ہے کلی سی کِھل گئی
خوش ہو کے اب تو جشن منایا کریں گے ہم
ایسا ملے نصیب کہ جنت میں ہو قیام
اک دوسرے کو ڈھونڈتے گھوما کریں گے ہم
قسمت سے گر پہنچ گئے ہم سب بہشت میں
آرام وہ بچھونوں پہ سویا کریں گے ہم
کلام: ذکیہ بلگرامی

نعتِ رسول مقبول

سرکارؐ کی عنایت، سرکارؐ کی عطا ہے
سرکارؐ کی عنایت سرکارؐ کی عطا ہے
سائے میں رحمتوں کے ہر ایک غم ڈھلا ہے
اوقات کیا ہے میری سب ان کا ہی کرم ہے
ان کی عطا سے میرا ہر کام ہی بنا ہے
شاہ مدینہ مجھ کو طیبہ میں اب بلالو
عاصی کی میرے آقا بس اتنی التجا ہے
تاریکیوں میں گھر کے رستہ ملا ہے مجھ کو
لب پہ جو نام میرے سرکارؐ کا سجا ہے
آیا ہے یاد مجھ کو سرکارؐ کا مدینہ
پھر آنکھ نم ہوئی ہے پھر دل تڑپ اٹھا ہے
آقا مجھے بھی دے دو آنے کی اب اجازت
پھر سوئے طیبہ آقا یہ قافلہ چلا ہے
روضہ پہ آپؐ کے جب جھک جائے گا یہ ثانی
آجائے موت اس پل آقا یہی دعا ہے
کلام: محمد شان عالم ثانی عطاری
پسند: ممتاز خانم، کراچی

اظہار عقیدت

اے مدینے کے کبوتر میرا پیغام لے جا
سر کو جھکا کر ادب سے سرکار کو سنا
یہ بتا تاجدارِ حرمؐ کو بیمار میں پڑی ہوں
اے طبیب مدینہ آپؐ کے ہاتھ میں شفا ہے
گر ہوجائے نگاہِ کرم دور ہوں دل کے الم
ساتھ اپنوں نے چھوڑا سب نے ہی منہ موڑا
ہے بس آپؐ کا ہی سہارا تھام لیں ہاتھ میرا
درودوں کی مالا جپتی ہیں سانسیں میری
بلالیں مجھے مدینہ اے دو جہاں کے داتا
کنیزِ پنجتن ہوں اور ہوں میں فقیر مدینہ
بھیک دے دیں نظرِ کرم کی، نواسوں کا صدقہ
اے مدینے کے کبوتر میرا پیغام لے جا
کاوش: زرتاشیہ نعمان، ملتان

عبادت

اے میرے ہم سفر!
کبھی جو روٹھ جاؤ تو
میرے منانے پر جلد مان جانا
ناراضیاں ساری چھوڑ دینا
اے میرے ہم سفر......
میرے مسکرا کر دیکھنے پر
ہلکا سا مسکرا دینا

کہ یہ انداز محبت عبادت ہے

کاوش: مسز طیبہ عبدالروف، پنجاب

ناشکری

☆ انسان کی لالچ کا پیالہ کبھی نہیں بھرتا کیونکہ اس میں ناشکری کے سوراخ ہوتے ہیں جو اسے بھرنے نہیں دیتے۔

☆ ناشکرا بندہ اپنے جیسے انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا تو اسے اللہ کے شکر کی کبھی توفیق نہیں ملتی۔

☆ شکر صرف زبان سے ادا نہیں ہوتا...... بلکہ تشکر سے ڈوبے الفاظ، شکر کی جھیل سے بھری آنکھیں اور لرزتی ہوئی زبان بھی شکر کے درجے پر ہوتی ہے۔

☆ شکر کا مطلب کسی کو الفاظ کا طعنہ مارنا نہیں بلکہ قلب و زبان سے اظہارِ تشکر ہی اصل شکریہ ہے اور اللہ کا شکر ادا کرنے کی توفیق تو اس کے عاجز اور خاکی بندوں کو ہی ملتی ہے ورنہ بنی اسرائیل جیسی قوم میں شمار ہوتا ہے جو من وسلویٰ کھا کر بھی ناشکری ہی رہی۔ (استغفر اللہ)

از: نگہت غفار، کراچی

حضرت محمدؐ کی فضیلت دوسرے انبیا کرام پر

آدمؑ کو نام حیوانات و جمادات کے سکھائے، محمدؐ کو تمام امت کے نام بتائے، مشرق و مغرب زمین دکھائے اور جو قیامت تک ہونے والا تھا وہ بتائے۔ آدمؑ کو مسجودِ ملائکہ کیا، محمدؐ کو محبوبِ خلائق کیا۔ آدمؑ کو بہشت میں رکھا، محمدؐ کو عرش بریں پر بلایا اور مقامِ قرب سے مشرف فرمایا۔

نوحؑ کے سبب مسلمانوں کو طوفان سے نجات بخشی...... محمدؐ کے سبب کافروں کو عذاب سے مہلت دی۔

حضرت سلمانِ فارسیؓ سے روایت ہے۔ "جس جگہ خلیلؑ کی نظر پہنچی وہاں حبیبؐ کے قدم پہنچے۔ خلیلؑ نے خود تمنائے وصل کی، حبیبؐ کو خواب سے جگا کر دولتِ وصل عنایت فرمائی۔ خلیلؑ نے خدا کی قسم کھائی، خدا تعالیٰ نے حبیبؐ کی قسم کھائی۔

موسیٰؑ کو کوہِ طور پر بلا کر کلام کیا، محمدؐ کو عرش پر بلا کر اسرارِ حقیقت سے خبردار کیا۔ کلیمؑ کے لیے پتھر سے پانی جاری کیا...... حبیبؐ کی انگلیوں سے اس قدر پانی جاری ہوا کہ سیکڑوں لوگوں نے پیا اور وضو کیا...... سبحان اللہ......

مرسلہ: ظل شاہین، رحیم یار خان

عورت

عورت اگر پرندے کی صورت میں خلق ہوتی تو ضرور "مور" ہوتی۔ اگر چوپائے کی صورت میں خلق ہوتی تو ضرور "ہرن" ہوتی۔ اگر کیڑے مکوڑے کی صورت میں خلق کی جاتی تو ضرور "تتلی" ہوتی لیکن وہ انسان خلق ہوئی تاکہ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی بنے...... اس حد تک نازک مزاج کہ اک پھول اسے راضی اور خوش کر دیتا ہے۔ اور اِک لفظ اسے مار دیتا ہے۔

تعجب یہ ہے کہ عورت اپنے بچپنے میں اپنے باپ کے لیے برکت کے دروازے کھولتی ہے، اپنی جوانی میں اپنے شوہر کا ایمان کامل کرتی ہے اور جب ماں بنتی ہے تو جنت اس کے قدموں تلے ہوتی ہے۔ ماں کی عظمت کو سلام

ساجدہ ظفر، کمالیہ

دعا

اے میرے رب
میری ماں کو سلامت رکھنا
جو بھی اٹھتے ہیں ہاتھ سدا
میری دعاؤں کے لیے
ان کو میرے سر پر
تا قیامت رکھنا، آمین

مخلص، ثمینہ کوکب، جہلم

دعا

اے میرے خدا ہم سب کی دعا ہے
بندوں پہ ترے آکے کڑا وقت پڑا ہے
یعنی شیطان سے تو ہم کو بچالے
مدت سے یہ ظالم میرے پیچھے پڑا ہے
ڈر ہے کہ کہیں نارِ جہنم نہ بن جائیں
دامن میں چھپالے کہ تو سب سے بڑا ہے
در چھوڑ تمہارا کہاں جائیں ہم آقا
تو ہی ہے سہارا جو یکتا و تنہا ہے
کر معاف گناہوں کو ہمارے تو اللہ
درِ توبہ ترا ہر دم ہی کھلا ہے
دن پھیر ہمارے لوٹا دے وہ خوشیاں
ہر درد کا درماں ہے تو ملجا و ماویٰ ہے

پاکیزہ کے نام

ذرا سی بات کہنے کو، ذرا سی بات ہوتی ہے
مگر یہ زندگی میں ہر طرح ہلچل مچاتی ہے
ہمیں غیروں سے کیا شکوہ ہوئے اپنے بھی بیگانے
یہ ظالم سوچ ہے جو نت نئے فتنے جگاتی ہے
محبت، پیار، عشق و عاشقی افسانوی باتیں
یہ انٹرنیٹ یہ چیٹنگ نئے جلوے دکھاتی ہے
ہوئے قصے پرانے اب کتابوں میں انہیں ڈھونڈو
حیا کیا تھی، حیا کیا ہے یہ اب ٹک ٹاک بتاتی ہے
سنا تھا ہم نے پرکھوں سے بھلائی کر بھلا ہوگا
بھلائی ہوگئی انگشتِ بدنداں، جب برائی جیت جاتی ہے

کاوش: فریدہ افتخار، اسلام آباد

غزل

دکھ کو اشکوں میں بہا لیتے ہیں
لب پہ مسکان سجا لیتے ہیں
تم بتاؤ میں انہیں کیسے ملوں
لوگ کئی چہرے بنا لیتے ہیں
ان کا حق ان کو ملے کیسے پھر
غرض اپنے جو دبا لیتے ہیں
ان کا کردار حفاظت میں رہے
بات دل کی جو چھپا لیتے ہیں
وہ نہیں ہوتے کسی کے محتاج
بوجھ اپنا جو اٹھا لیتے ہیں
وہ جو گھبراتے نہیں مشکل میں
شب کے بدلے وہ ضیا لیتے ہیں
اپنے اسلاف کی جو قدر کریں
وہ بزرگوں کی دعا لیتے ہیں
کام آتے ہیں جو اوروں کے سدا
سوداؔ وہ رب کی رضا لیتے ہیں

کاوش: کوثر خالد سوداؔ، فیصل آباد

مانگنا سیکھ لو

دیکھو اللہ تعالیٰ نے تمہیں کتنی نعمتیں دی ہیں کتنی سہولتیں دی ہیں کتنی آسانیاں دی ہیں تم خود، تمہارا جسم، تمہارا لباس اور تمہارے اعضا......

رحمت سے تری ہم مایوس نہیں ہیں
گو جرم ہمارا بہت ہی بڑا ہے
کر نظرِ کرم ہم پہ کر دور کورونا
ہوں دور بلائیں ہم سب کی دعا ہے

مرسلہ: مسز خالد اعجاز، اوکاڑہ

فریاد

گزارے تیرے در پہ جو
بتاتے تیرے گھر پہ جو
الم وہ یاد ہیں مجھ کو
بھلائے یوں نہیں جاتے
عذاب روز و شب کے بس
کسک ہے، یاد ہے، باقی
خدا کی اس عدالت میں
میری فریاد ہے باقی

کاوش: حینا، کراچی

نئے سال پر

زندگی جو محبت ہے
زندگی جو امن ہے
زندگی جو تہذیب ہے
مگر وقت نے دیکھا
کائنات نے سنا
کیسے محبت کو ریزہ، ریزہ کر دیا گیا
کیسے امن کو خاک میں ملا دیا گیا
کیسے تہذیب و تمدن کو پاؤں تلے روند دیا گیا
اے ربِ کائنات
اے خالقِ ارض و سما
اپنے سورج کو حکم دے
کہ اب یہ نظارے کسی کو دیکھنے کو نہ ملیں
نئے سال میں امن ہو
جیسے فاختائیں اڑتی ہیں
محبت ہو جیسے چمن میں پھول کھلتے ہیں
تمدن و تہذیب جس پر ہم فخر کر سکیں...... آمین!

کاوش: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

کیا ہوا اگر کچھ پریشانیاں، تکلیفیں ہیں...... مسائل ہیں تو کیا ہوا؟ اللہ سب سیٹ کردے گا۔ صرف اللہ ہی کرسکتا ہے، ہاں بس یقین رکھو اللہ کی ذات پر...... بس گڑگڑا کر، روکر اور عاجزی سے مانگنا تمہیں آنا چاہیے...... ہر شے تمہارے پاس ہے۔ ہاں تم امیر ہو، تمہیں اللہ نے بہت کچھ دیا ہوا ہے۔

بس کچھ مسئلے مسائل ہیں جو بہت جلد حل کردے گا اللہ بس سجدوں میں مانگنے کی عادت پیدا کرلو...... بس جھکنا سیکھ لو...... ہر منزل تمہاری ہے۔ ہر راستہ تمہارا ہے، خود کو یقین دلا دو کہ تمہارا رب سب کرسکتا ہے۔

ہاں ہمت نہ ہارنا، ہاں حوصلہ نہ کھونا، کوشش ضرور کرنا...... رب کو پانے کی بھی کوشش کرنا اور دعا مانگنے کا سلیقہ سیکھ نا۔ وہ دے گا وہ ضرور دے گا۔ وہ بڑا مہربان ہے وہ تمہاری عاجزی اور خلوص پسند کرتا ہے۔ بار، بار چلے آنا اس کی راہ میں...... معافی مانگ لینا بار، بار، وہ تمہارا ہر معاملہ ٹھیک کردے گا۔ ضرور، ضرور بہت جلد، یقینِ کامل رکھو اس لیے کہ ہم سب توکل اللہ کے ہی داعی ہیں۔

دعا گو: رابعہ فاروق، ڈیرہ اسماعیل خان

آس

کب سے اس کی آس میں یارو
دہلیز دروازہ دیکھ رہی ہوں
اِک دن شاید لوٹ آئے گا
اس کے سپنے دیکھ رہی ہوں
جو بھیجے تھے پہنوں گی میں
کالے کپڑے دیکھ رہی ہوں
فری کتنی پاگل ہوں میں
دن میں تارے دیکھ رہی ہوں

کلام: فریدہ فری، یوسف زئی، لاہور

کبھی جو تنہا بیٹھو

یاد کرنا
ان گزری ہوئی ساعتوں کو
یاد کرنا
فرصتوں کے لمحوں میں
جب مل بیٹھتے ہم دو
ہوتا نہ ہوش
نہ خبر
کب دن ہوا ختم
کب رات ہوئی
فقط ایک لمحے کے لیے یاد تو کرو
وہ برسوں کا
بنا تعلق توڑا
وہ بچپن کی میٹھی یادیں
وہ چاند کو تکتے رہنا
وہ رات گئے
باتیں کرتے رہنا
وہ ہولے سے ہنسنا
دھیرے سے کچھ کان میں کہنا
اور مسکرا دینا
کبھی جو تنہا بیٹھو تو یاد ضرور کرنا

از: سدرہ کلثوم، لکی مروت

سوچ

لڑکا اپنی ٹیچر سے۔ ''میں آپ کو کیسا لگتا ہوں؟''
ٹیچر: ''بہت پیارے لگتے ہو۔''
لڑکا: ''تو کیا میں اپنے امی، ابو کو آپ کے گھر بھیجوں؟''
ٹیچر: ''وہ کیوں؟''
لڑکا: ''کیونکہ وہ ہی ہماری بات کو آگے بڑھائیں گے۔''
ٹیچر: غصے سے۔ ''یہ کیا بکواس ہے؟''
لڑکا: ٹیچر، ٹی وی ڈرامے دیکھ، دیکھ کر آپ کی سوچ بھی خراب ہوگئی ہے۔ میں نے اپنے امی، ابو کو آپ کے پاس ٹیوشن پڑھانے کی بات کرنے کے لیے بھیجنا تھا۔''

محبت

ایک آدمی نے ایک کروڑ پتی بیوہ سے شادی کرلی۔ شادی کے چند ماہ ہی بیوی نے پوچھا، سنو! جب میں بوڑھی ہوجاؤں گی اور بدصورت ہوجاؤں گی تو کیا اس وقت بھی تم مجھ سے محبت کروگے؟''

وہ آدمی جل کر بولا۔ ''کر تو رہا ہوں اور کیا ثبوت دوں۔''

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

☆نعمانہ اکبر......منڈی بہاؤالدین
آفتیں جیسے انتظار میں تھیں
تیرے جاتے ہی سب نے گھیر لیا
☆تسنیم کوثر......کراچی
نہ کوئی رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے
خدا کرے کہ نیا سال سب کو راس آئے
☆پروین افضل شاہین......بہاول نگر
وہ وقت دور نہیں جب زمین والوں پر
مکان ٹوٹے گا اور لامکان برسے گا
☆آسیہ عامر......کراچی
مجھے اب فرق نہیں پڑتا دسمبر بیت جانے کا
اداسی میری فطرت ہے اسے موسم سے کیا لینا
☆حمیرا انجم......ٹیکسلا
مجھ سے مت پوچھ میرے محبوب کی سادگی کا انداز
نظریں بھی مجھ پہ تھی اور پردہ بھی مجھ سے تھا
☆ثمرین قیصر......ذیشان کالونی
بے نور سی لگتی ہے زندگی اس سے بچھڑ کے
اب چراغ تو جلتے ہیں پر اجالا نہیں کرتے
☆نازنین آفریدی......پشاور
عدم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں
☆تسنیم......ایف بی ایریا
نگاہِ عشق میں اتنا تو محترم کردے
گزر گئے ہیں جو لمحے انہیں بہم کردے
ترس رہی ہوں کوئی ماں سا مہربان وجود
دعائے نور پڑھے اور مجھ پر دم کردے
☆عروبہ ناز......کوٹلی
ہے میرے دل کو خدا کی رحمتوں کی طلب
وہ وسیع بھی ہیں بے حساب بھی ہیں

☆ساجدہ ظفر......کمالیہ
تیرا خیال تیری طلب، تیری آرزو
اک بھیڑ سی لگی ہے میرے دل کے شہر میں
دنیا کی نعمتیں تو یہاں دستیاب ہیں
تیری ہی اک کمی ہے میرے دل کے شہر میں
☆مسز اکرم شہزاد......لاہور
دسمبر کی خنک راتوں میں تنہائی
تیری نیندیں اڑائے گی قسم لے لو
سمجھداری کا دعویٰ کرنے والوں کو
یہ دنیا بیچ کھائے گی قسم لے لو
☆عرشیہ جنید......کراچی
اِک تم ہی فراز نہ تھے تنہا اب کے بلاوا جب آیا
اِک بھیڑ لگی تھی مقتل میں ہر درد کا مارا اس دن تھا
☆رعنا مشتاق......سرگودھا
نہ جانے جرم کیا سرزد ہوا ہے
زمانے بھر کی باتیں سہہ رہا ہوں
شجر کا خشک پتا ہوں میں اختر
ندی کے پانیوں میں بہہ رہا ہوں
☆حمنیٰ قندیل......ٹوبہ ٹیک سنگھ
نہ جانے کیوں اب راتوں کو جاگنا اچھا لگتا ہے
جو آ کر ہم سے جھوٹ کہے وہی سچا لگتا ہے
اس سے ملنے کے لیے مچلتا ہے بار، بار
دل اپنا ہمیں ایک روٹھا ہوا بچہ لگتا ہے
☆گل شاد نذیر......اسلام آباد
ہو وصل کا زمانہ محبت کا ہو فسانہ
غمِ ہجر ملے جس میں، نہ آئے کبھی وہ کل
میری زندگی ادھوری، تیرا ساتھ ہے ضروری
تیرا ساتھ جو مل جائے تو ہو جائے یہ مکمل

☆رانی زرناب......ٹوبہ ٹیک سنگھ
دسمبر کی شب آخر نہ پوچھو کس طرح گزری
یہی لگتا تھا ہر دم وہ ہمیں کچھ پھول بھیجے گا
☆ماہین مہتاب......کیماڑی
کس طرح چھوڑ دوں تمہیں جاناں
تم میری زندگی کی عادت ہو
داستاں ختم ہونے والی ہے
تم میری آخری محبت ہو
☆مریم رضوی......کراچی
محسن وہ میری آنکھ سے اوجھل ہوا ناں جب
سورج تھا میرے سر پہ مگر رات ہو گئی
☆ناہید مشیر......امریکا
دوسروں پر اگر تبصرہ کیجیے
آئینہ سامنے رکھ لیا کیجیے
☆ماہین مسعود......کمالیہ
یونہی گرتے نہیں برگ شجر سے
بچھڑ گیا تھا کوئی ہم سفر دسمبر میں
☆نرگس نسیم......صابہ موہڑہ
عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
☆زرینہ خان......بہارہ کہو
اب غرق ہوں میں آٹھ پہرے کی یاد میں
توبہ نے مجھ کو اور گناہ گار کردیا
☆امینہ مشیر......نئی دہلی
ایک دو زخم نہیں جسم ہے سارا چھلنی
درد بیچارہ پریشاں ہے کہاں سے نکلے
☆ایمن رانی......کمالیہ
خوشبو کی طرح اس نے بکھرنا نہیں سیکھا
عاشق کی طرح ٹوٹ کے مرنا نہیں سیکھا
اس پر میرے الفاظ اثر کر نہیں سکتے
اس نے کسی اسکول میں پڑھنا نہیں سیکھا

☆فہمیدہ جاوید......ملتان
نہ کوئی رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے
خدا کرے یہ نیا سال سب کو راس آئے
☆شرمین علی......میرپور خاص
ایک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے
☆فہمیدہ......شجاع آباد
تیرے ہجراں سے تعلق کو نبھانے کے لیے
ہم نے اس سال بھی جینے کی قسم کھائی ہے
☆نگینہ ضیا......کراچی
دکھائے پانچ عالم اک پیام شوق نے مجھ کو
الجھنا روٹھنا، لڑنا، بگڑنا دور ہوجانا
☆عرشیہ......کراچی
مجھ میں سات سمندر شور مچاتے ہیں
ایک خیال نے دہشت پھیلا رکھی ہے
☆صائمہ سجاد بنگش......پشاور
آئینہ سامنے اب آٹھ پہر رہتا ہے
کہیں ایسا نہ ہو یہ مد مقابل ہوجاتے
☆نرمین اعجاز......حیدرآباد
ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے
☆حمیرا انجم وحید......واہ کینٹ
سنینِ عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
☆شمائلہ جاوید......منڈی بہاؤالدین
محبت رہی چار دن زندگی میں
رہا چار دن کا اثر زندگی میں
☆جیا جاوید......ملتان
اے دسمبر کچھ تو ہوش کر تجھے کیا ہوا
بن برسے گزر جانا تیری عادت تو نہ تھی
☆☆☆

روغنی مچھلی کا سالن

اشیا: مچھلی، آدھا کلو۔ (بغیر کانٹے کی) لال مرچ پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ۔ ہلدی، آدھا چائے کا چمچ۔ ثابت سیاہ مرچ، دس عدد۔ پیاز (پیسٹ بنالیں) تین عدد درمیانی۔ دہی، آدھا کپ۔ میتھی دانہ، آدھا چائے کا چمچ۔ (ہلکا سا کوٹ لیں) دھنیا پاؤڈر، ڈیڑھ کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ لونگ، دو عدد۔ لہسن پیسٹ، ایک چائے کا چمچ۔ تیل، حسب ضرورت۔

ترکیب: سب سے پہلے مچھلی کے قتلوں کو اچھی طرح دھو کر خشک کرلیں۔ ایک برتن میں مچھلی پر دہی پھینٹ کر لگا کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد ایک دیگچی میں تیل گرم کر کے اس میں میتھی دانہ ڈال کر ہلکا سا گولڈن فرائی کر لیں۔ پیاز اور لہسن کا پیسٹ ڈال کر لال مرچ پاؤڈر، ہلدی، نمک، ثابت سیاہ مرچ اور لونگ ڈال دیں۔ اور تھوڑا، تھوڑا پانی ڈال کر اچھی طرح بھونتی رہیں۔ جب مسالا اچھی طرح بھون جائے تو پانی کا چھینٹا دے کر مچھلی ڈال دیں اور دس منٹ تک ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ چمچ بالکل نہیں چلائیں۔ دیگچی کو صافی سے پکڑ کر ہلاتے رہیں۔ جب اچھی طرح بھن جائے تو کفگیر کی مدد سے مچھلی کی سائڈ تبدیل کر دیں۔ حسبِ ضرورت پانی ڈال کر شوربہ تیار کرلیں۔

بیکڈ ڈونٹس

اشیا: میدہ، تین چوتھائی پیالی۔ نمک، ایک چٹکی۔ چینی، آدھی پیالی۔ دودھ، ایک چوتھائی پیالی۔ انڈا، ایک عدد۔ مارجرین یا مکھن، دو کھانے کے چمچ۔ سادہ آٹا، ایک چوتھائی پیالی۔ بیکنگ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ جائفل، آدھا چائے کا چمچ۔ (پیس لیں) دہی، ایک چوتھائی پیالی۔ ونیلا ایسنس، ایک چائے کا چمچ۔ آئل، حسب ضرورت۔

ترکیب: سب سے پہلے اوون کو 180c پر پندرہ منٹ سے بیس منٹ کے لیے گرم کرلیں۔ میدہ اور آٹا چھان لیں اور اس میں چینی، نمک اور بیکنگ پاؤڈر ملالیں۔ اب اس میں تیل، مارجرین یا مکھن ڈال کر انگلیوں کی مدد سے اسے اچھی طرح ملائیں کہ ڈبل روٹی کے چورے کی شکل میں آجائے۔ پھر اس میں دودھ، دہی، انڈا اور ونیلا ایسنس اور پسی ہوئی جائفل ڈال کر گندھے ہوئے آٹے کی شکل میں لے آئیں چھوٹے بسکٹ کے سانچوں میں برش کی مدد سے آئل لگائیں۔ تیار کیے ہوئے ڈونٹ کے مکسچر کو چمچے یا پائپنگ کی مدد سے سانچوں میں ڈالیں اور ٹرے میں رکھ کر اوون میں آٹھ سے دس منٹ کے لیے ہلکے سنہرے ہونے تک بیک کرلیں۔ اوون سے نکال کر مکمل ٹھنڈے ہونے دیں اور اس پر حسب پسند آئسنگ کرلیں یا گرم ڈونٹس پر صرف پسی ہوئی چینی چھڑک دیں۔

موسمی پھل و سبزیاں

گاجر، چقندر، سیب کو ملا کر جوس بنائیں مزید ذائقے کے لیے کوئی سا اورنج فروٹ بھی ڈال سکتی ہیں۔

موسمی پھل اور سبزی سے حتی المقدور فائدہ اٹھائیں جوس یا سلاد کی صورت......

☆☆☆

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ ثمینہ کوکب...... جہلم
سوال: بچپن کے کھانے اور پچپن کے کھانے میں کیا فرق ہے؟
جواب: فرق نہیں مماثلت ہے، نرم اور کم نمک، مرچ کا۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ فرخندہ جعفری...... گجرات
سوال: تلوار کا گھاؤ تو مٹ جاتا ہے مگر زبان کا گھاؤ کیوں نہیں مٹتا؟
جواب: وہ مستقل مار کرکے جو لگایا جاتا ہے۔

☆ زرتاشیہ نعمان...... ملتان
سوال: اڑتی چڑیا کے پر گننے کے لیے آنکھوں میں کون سا سرمہ لگاؤں؟
جواب: پڑوسن سے لے لو، تم بھی تو انہی کی ٹوہ میں رہتی ہو ناں!
سوال: سردیاں آگئی ہیں...... آپ گاجر کا حلوا کب بنائیں گی؟
جواب: بنا کر کھا بھی لیا اور تمہارے لیے فریز کر دیا ہے آجاؤ۔
سوال: صابن کی پرانی پتلی ٹکیہ نئے صابن پر کیوں چپکا دی جاتی ہے؟
جواب: سمجھا کرو...... کفایت شعاری بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔
سوال: کسی کی بک، بک بند کرانی ہو تو فائر بریگیڈ کو کال کی جائے یا 1122 کو؟
سوال: آپی! کوئی بھوت آپ کو ڈنر پہ انوائٹ کرے...... تو آپ کیا کریں گی؟
جواب: میٹھے سے منہ بھر دیں۔

جواب: تم جیسا ہو تو چلے گا۔
☆ نسیم منظر...... کراچی
سوال: میرے مسئلے کا حل تو بتائیں۔ میں جب بھی پرس سے سینیٹائزر نکالتی ہوں تو فوراً چار عورتیں ہاتھ آگے کر دیتی ہیں؟
جواب: دو، دو روپے پکڑا دیا کرو۔
سوال: کسی کے زخموں پر نمک چھڑکنا ہے تو کون سا ٹھیک رہے گا، سادہ یا آیوڈین؟
جواب: لاہوری نمک۔
سوال: باجی میں یخنی کیسے بھگاروں؟
جواب: راز کی باتیں محفل میں نہیں ہوتیں۔
☆ فردوس شازیہ...... لاہور
سوال: حجام کے سامنے سب سر جھکا لیتے ہیں مگر میرے میاں وہاں بھی سر نہیں جھکاتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟
جواب: اب سر کے پچھلے حصے پر صرف جھالر ہے تو سر تو اٹھانا ہی پڑے گا ناں......
سوال: وہ آیا اور چھا گیا...... بھلا کون......؟
جواب: بادل۔
☆ ساجدہ ظفر، کمالیہ
سوال: گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو ڈبے کو ٹیڑھا کرنا چاہیے یا انگلیوں کو......؟
جواب: ڈبا گرم کر لو اور الٹ لو سمپل۔
سوال: دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر

پیتا ہے اور چائے کا جلا......؟

جواب ﴾ شڑپ شڑپ کر کے۔

☆ پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

سوال ﴾ ہر نئے سال کے شروع میں میرے میاں جانی پرنس افضل شاہین مجھے پیار سے گفٹ کا وعدہ کرتے ہیں مگر دیتے نہیں، کیوں؟

جواب ﴾ آپ پہلے ہی کیش نکال لیتی ہیں تو خالی جیب سے وہ بیچارے کیا دیں۔

سوال ﴾ ماضی میں لڑکے، لڑکیوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کے دلکش چہرے پر نظریں جماتے تھے مگر آج کل ان کی نظر لڑکیوں کے جوتے پر کیوں ہوتی ہے؟

جواب ﴾ کب اترتا ہے اور ان پر پڑتا ہے اسی لیے۔

سوال ﴾ شادی والے دن دولھا سے زیادہ اس کے دوست خوش کیوں ہوتے ہیں؟

جواب ﴾ چلو ایک لنگلے سے تو جان چھوٹی۔

☆ تسنیم کوثر...... کراچی

سوال ﴾ اس میں کہاں تک صداقت ہے کہ آگ میں وہ آگ کہاں جو لوگ باتوں سے لگاتے ہیں بتایئے؟

جواب ﴾ اُف...... کیسی آگ لگادی اصل آگ شرما گئی۔

سوال ﴾ نیا سال مبارک ہو آپ نے کیا، کیا پلان بنائے ہیں سنا ہے کہ آپ پاکیزہ کے تمام قارئین کی دعوت کر رہی ہیں؟

جواب ﴾ جی، جی بالکل آپ آنے والی بنیں۔

سوال ﴾ جھوٹ تو جھوٹ ہی ہوتا ہے مگر یہ سفید جھوٹ کیا ہوتا ہے؟

جواب ﴾ جو کبھی، کبھی تمہیں بچپن میں بولنا پڑ جاتا تھا بھئی۔

☆ مسز اکرم شہزاد...... لاہور

سوال ﴾ سیاست گر اور جادوگر میں کیا بات مشترک ہے؟

جواب ﴾ گر۔

سوال ﴾ میاں جانی سے اپنی فرمائش پوری کرانے کا سنہری وقت کون سا ہوتا ہے؟

جواب ﴾ مزیدار سا کھانا کھلادو اور کچھ خدمت وومت کرو بھئی۔

☆ حمنیٰ قندیل...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال ﴾ معروف ہونے اور محبوب ہونے میں کیا فرق ہے؟

جواب ﴾ کیا مطلب بھئی معروف تو زمانے کے لیے اور محبوب خاص، خاص ہستیوں کے لیے۔

سوال ﴾ عورت اور سگریٹ میں کیا بات مشترک ہے؟

جواب ﴾ دونوں سلگتی ہیں۔

☆ ایمن رانی...... کمالیہ

سوال ﴾ گھر کے افراد کو جمع کرنے آسان طریقہ کیا ہے؟

جواب ﴾ ایک پکار...... آؤ اپنے، اپنے تحفے لے لو۔

سوال ﴾ مہنگائی کے علاوہ اور کون، کون سی چیزیں آسمان کو چھو رہی ہیں؟

جواب ﴾ بلڈنگز!

☆ فہمیدہ جاوید...... ملتان

سوال ﴾ دسمبر کو لوگ اداس کیوں تصور کرتے ہیں؟

جواب ﴾ یہ تو اپنے، اپنے تجربے کی بات کوئی تو اسے ملن گھڑیاں بھی کہتا ہے؟

سوال ﴾ سچی محبت نفرت میں کب اور کیوں بدلتی ہے؟

جواب ﴾ خود غرضی کی یلغار کی وجہ سے۔

سوال ﴾ میرے خوب صورت سفید دانتوں کی دلکشی کا راز کیا ہے؟

جواب ﴾ ہم تمہارے پرسنل معاملوں میں نہیں بولیں گے بھئی!

سوال ﴾ کنجوس مکھی چوس اور فضول خرچ؟

جواب ﴾ کنگلا...... خون چوس اور کیا۔

☆ فرخندہ جعفری...... گجرات

سوال ﴾ دادا جی کی قبر پر نانا جی کی فاتحہ کب پڑھی جاتی ہے؟

جواب ﴾ جب کتبہ سمجھ نہیں آرہا ہو پھر کسی کا بھی نام لے لو۔

سوال ﴾ بلی کو چھیچھڑوں کی رکھوالی پر کیوں بٹھا دیا جاتا ہے؟

جواب ﴾ ارے یہ نادانی تم نہیں کرنا۔

☆☆☆

روحانی مشورے

ادارہ

قارئین پاکیزہ! جس طرح ان صفحات کو پڑھ کر آپ بذریعہ فون وخط اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں وہ یقیناً ہمارے لیے قابلِ قدر ہے۔ ایک مرتبہ ہم پھر بتا دیں کہ یہ دعائیں مستند ذرائع سے حاصل کی جارہی ہیں اور ہر سائل یا حاجت منداس سے فیضیاب ہوسکتا ہے بشرطیکہ حسنِ نیت سے کام لیا جائے اور اپنے جیسے دیگر مسلمان بھائیوں کے لیے بھی نیک ارادے وخواہشات رکھی جائیں اور وظائف کے ورد کے ساتھ، ساتھ حسبِ حیثیت صدقہ ضرور دیں۔ سالِ نو کے لیے خصوصی دعائیں کریں اور اپنے پیاروں کو بھی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ آپ ہی کے اصرار پر اسمائے ربانی کے فیوض وبرکات پیش کیے جارہے ہیں۔

العلیم

یہ اسم جمالی ہے۔ اس کے اعداد 150 ہیں۔ جو شخص کثرت سے یاعلیم پڑھے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے خزانے سے علم کی بے انتہا دولت عطا فرمائے گا۔ نماز جمعہ کے بعد پڑھنا کاروبار میں بہتری کے لیے بہت مفید ہے۔ جس طالب علم نے امتحان دینا ہو، امتحان کے کمرے میں جاتے ہوئے اس اسم پاک کا ورد کرے تو اللہ تعالیٰ اسے امتحان میں کامیابی عطا فرمائے گا۔

اگر کسی عورت کا خاوند شراب پینے کی بری عادت میں مبتلا ہوتو وہ سات بار پڑھ کر پانی پردم کر کے شوہر کو پلادے تو شوہر کی یہ بدعادت چھوٹ جائے گی۔ کثرت سے اس اسم مبارک کا ورد کرنے سے حافظے کی کمزوری دور ہوجاتی ہے جس کسی کی یادداشت کمزور ہو اور وہ مرضِ نسیان میں مبتلا ہوتو وہ ہر روز صبح نہار منہ اکیس مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھ کر پانی پردم کرے اور پی لے۔ چالیس دنوں تک بلاناغہ یہ عمل کرنے سے حافظہ مضبوط ہوجائے گا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بھول جانے کی عادت ختم ہوجائے گی۔

اس اسم مبارک کا بکثرت ورد کرنے والے کو اللہ تعالیٰ ارادے کی پختگی اور ثابت قدمی عطا فرماتا ہے۔

جو یہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کشف و اسرار سے مطلع فرمائے تو وہ رات کو سونے سے پہلے باوضو حالت میں ہر روز 111 مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھے اور پھر سو جائے۔ روزانہ کے اس معمول سے اس کا شمار صاحبانِ کشف میں ہونے لگے گا۔ ہر نماز کے بعد ایک سو مرتبہ اس کا ورد کرنے والا دلی طمانیت اور سکون پاتا ہے۔

جس کسی کو پاگل پن یا جنون کے دورے پڑتے ہوں تو دوسرا شخص باوضو حالت میں اول تین، تین مرتبہ درود پاک پڑھے اور درمیان میں 121 مرتبہ یہ اسم مبارک پڑھ کر پانی پردم کر کے مریض کو چالیس یوم تک پلائے تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مریض کی حالت ٹھیک ہوجائے گی۔

القدیر

یہ اسم پاک جلالی ہے۔ اس کے اعداد 314 ہیں۔ اس اسم پاک میں بے شمار شفائی خواص ہیں اگر کوئی بیماری کی وجہ سے لاغر ہوگیا ہو اور مرض کے غلبے کی وجہ سے جسمانی لاغری میں مبتلا ہوتو اسے چاہیے کہ وہ ہر نمازِ فجر کے بعد 111 مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے کمزوری ونقاہت دور ہوجائے گی اور رفتہ، رفتہ جسم میں توانائی پیدا ہوتی چلی جائے گی اور اللہ تعالیٰ شفائے کاملہ عطا فرمائے گا۔

ہر طرح کی مشکل اس اسم مبارک کے بکثرت ورد کرنے سے حل ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مشکلات کے حل میں آسانیاں پیدا فرماتا ہے۔

دنیا والوں کی بے ثباتی پر دل کو سکون اور اطمینان پہنچانے کے لیے ہر نماز کے بعد اس اسم مبارک کی ایک تسبیح پڑھنا بہت فائدہ مند ہے۔

الحلیم

یہ اسم پاک جمالی ہے۔ اس کے اعداد 88 ہیں۔ اس

اسم پاک کو زعفران سے لکھ کر پانی میں دھو کر کھیتوں میں ڈالنے سے کھیتی آفات سے محفوظ رہے گی اور فصل زیادہ ہوگی۔

ضروریاتِ زندگی کے لیے نمازِ فجر کے بعد 883 مرتبہ ورد کرے اگر اسے نمازِ عشا کے بعد 77 مرتبہ پڑھے تو خلقِ خدا عزت کرے گی۔

گھر کے چاروں کونوں میں پانی پر دم کر کے چھڑکے تو برکت ہوگی۔ باہمی محبت ہوگی اور گھر کے افراد ایک دوسرے کا احترام کریں گے۔

حاکم کے سامنے جاتے ہوئے سات بار پڑھے تو حاکم مہربان ہوگا اگر مظلوم ہے تو وہ عزت کرے گا۔

اس اسم مبارک کو بکثرت پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ سمجھداری اور بردباری کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔

باوضو حالت میں مریض کے سرہانے یہ اسم مبارک کثرت سے پڑھنا مرض کی شدت میں کمی کرتا ہے اور بیماری کی نقاہت جاتی رہتی ہے۔

اگر کوئی شہرت، مرتبہ اور ناموری کا خواہشمند ہے تو وہ اس اسم مبارک کا کثرت سے ذکر کرے، اللہ تعالیٰ معاشرے میں بلند مقام عطا فرمائے گا۔

اگر کسی کی کھیتی یا درخت پھل نہ دیتے ہوں یا ٹھیک طرح سے پروان نہ چڑھتے ہوں تو صاف پانی لے کر باوضو حالت میں اول اور آخر تین، تین مرتبہ درود پاک پڑھیں اور درمیان میں تین سو مرتبہ یہ اسم مبارک پڑھ کر دم کریں اور کھیتی یا درخت کی جڑوں میں یہ پانی چھڑک کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں تو باری تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے خوب برکت عطا فرمائے گا۔

ہر نماز کے بعد باقاعدہ اکتالیس مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور کشف کی نعمت ہاتھ آتی ہے۔

باوضو حالت میں ہر وقت پڑھتے رہنے سے دل کی سختی دور ہوجاتی ہے اور طبیعت میں نرمی اور عاجزی پیدا ہوجاتی ہے۔ مخلوق مہربانی اور شفقت سے پیش آتی ہے۔

الغفور

یہ اسم جمالی ہے۔ اس کے اعداد 1286 ہیں۔ اس کے کثرت سے ورد کرنے سے رنج و غم دور ہوجاتے ہیں۔ مال و دولت میں برکت پیدا ہوتی ہے۔

یارب اغفرلی سجدے میں سر رکھ کر تین بار پڑھنے سے اللہ تعالیٰ گناہوں سے معافی عطا فرماتا ہے۔

کوئی بیماری یا تکلیف ہو تو نمازِ فجر کے بعد سات دن تک سات بار روزانہ پڑھنے اور دعا مانگنے سے بیماری یا تکلیف سے چھٹکارا حاصل ہوجاتا ہے۔

کوئی بھی مہم درکار ہو تو 101 بار سجدے میں سر رکھ کر پڑھے۔

کسی سے مراسم ٹھیک نہ ہوں تو اس کے سامنے اول و آخر درود شریف پڑھ کر تین بار اس اسم مبارک کا ورد کرے۔

اس اسم مبارک کے ذاکر کی اللہ تعالیٰ ہر طرح سے پردہ پوشی فرماتا ہے اور اس سے درگزر فرماتا ہے۔ اسے نیکی اور بھلائی کے کاموں کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

اگر کوئی صدقِ دل سے توبہ کی طلب رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ ہر نماز کے بعد اول و آخر تین بار درود شریف پڑھے۔ درمیان میں 111 مرتبہ یہ اسم پاک پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے اور توبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد دعا کو قبول فرمائے گا۔

مرض کی شدت کو کم کرنے کے لیے باوضو ہو کر 121 مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھ کر پانی پر دم کرے اور صبح نہار منہ پی لے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بیماری میں افاقہ ہوگا اور مرض جاتا رہے گا۔

اگر گلے کی خرابی کی وجہ سے آواز بیٹھ جائے اور سر میں درد کی شکایت پیدا ہوجائے تو ایسی صورت میں یہ اسم پاک اپنے اندر شفائی اثرات دکھانے کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک صاف کاغذ پر سات مرتبہ یہ اسم پاک سبز روشنائی سے لکھیں اور پانی میں حل کر کے پی لیں، ان شاء اللہ شفا عطا ہوگی۔

اس اسم مبارک کو کثرت سے پڑھنے والا ہر قسم کے عذاب و مصیبت اور ظلم و نقصان سے بچا رہتا ہے۔ کوئی اس کو گزند پہنچانے کی جرأت نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ اس پر اپنی خاص نظرِ کرم عنایت فرماتا ہے۔

بڑی سے بڑی پریشانی اس اسم مبارک کے ورد کرنے سے جلد ہی رفع ہوجاتی ہے۔

ہاتھ پیروں کی دیکھ بھال

گھریلو نسخوں میں ہاتھوں پر گھریلو مکھن لگا کر ہاتھوں کے حسن کو مزید نکھارا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ لیموں کا رس اور عرق گلاب ملا کر لگانے سے ہاتھ ملائم ہو جاتے ہیں۔ رات کو سونے سے قبل ناریل کے تیل میں پگھلا موم ملا کر ہاتھوں پیروں پر لگائیں۔ صبح نیم گرم پانی سے دھو ڈالیں۔ چند دنوں میں فرق نظر آنے لگے گا۔ دودھ اور عرق گلاب ملا کر ہاتھوں پر ملیں۔ ایک گھنٹے بعد دھولیں۔ ہاتھ نرم اور ملائم ہو جائیں گے اور صاف ستھرے بھی ہو جائیں گے۔ موسم سرما میں شہد، گلیسرین اور لیموں کا رس ملا کر ہاتھ پیروں پر لگانے سے بہت افاقہ ہوتا ہے۔ ہاتھوں کو نرم اور ملائم کرنے کے لیے لیموں کا رس یا سرکہ ملیں۔ عرق لیموں میں عرق کی مقدار کے برابر گلیسرین ملائیں اور اس میں ایک چھوٹا چمچہ بورک ایسڈ ڈال کر تینوں کو یکجا کریں اور ایک شیشی میں بھر کر رکھ دیں۔ ہاتھ دھونے کے بعد دن میں تین چار بار اس کا استعمال کریں۔ ہاتھ نرم اور رنگت صاف ہوگی۔ رات سوتے وقت روغنِ بادام کی مالش کریں۔ اس کے علاوہ مہینے میں ایک مرتبہ مینی کیور کریں۔

یہ بات تو بے شمار بار کہی جا چکی ہے کہ خواتین اپنے چہرے کے مقابلے میں ہاتھوں اور پیروں کو زیادہ توجہ نہیں دیتی ہیں۔ بہت کم خواتین ایسی ہیں کہ جن کے چہرے کے ساتھ، ساتھ ان کے ہاتھ اور پاؤں بھی خوب صورت اور دلکش ہوتے ہیں۔ آج کل خواتین کی ایک بڑی تعداد ملازمت پیشہ ہے۔ ان خواتین کے پاؤں زیادہ تر جوتوں میں قید رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی انگلیوں کے درمیان میل اور پسینہ جمع ہو جاتا ہے اگر اس میل کی باقاعدگی سے صفائی نہ کی جائے تو یہ زخم بھی بن سکتا ہے لہٰذا ہر بار جوتے یا سینڈلز پہننے سے قبل اور اتارنے کے بعد پیروں کو اچھی طرح دھو کر خشک کر لیں اور رات کو سوتے وقت ان پر معیاری کریم لگائیں تاکہ نرم و ملائم رہیں۔ ایڑیاں پھٹنے اور پاؤں خشک ہونے سے بچانے کا آسان اور کارآمد حل یہ ہے کہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے پیروں پر بکری کا کچا دودھ مل لیں۔ صبح پاؤں اچھی طرح دھو کر کولڈ کریم لگائیں۔ اس کے علاوہ نیم گرم پانی میں نمک اور پیپر منٹ آئل کے چند قطرے ملائیں اور پیروں کو اس محلول میں پندرہ بیس منٹ تک بھگوئیں۔ اس کے بعد پیروں کو پانی سے نکال کر انہیں خشک کر لیں پھر کریم لگا کر پیروں کو ہاتھوں سے ہلکا، ہلکا رگڑیں، اس سے بھی پیر نرم ہوں گے۔ پندرہ دن میں ایک مرتبہ لازمی پیڈی کیور کریں۔ اگر سردیوں میں پیروں کی انگلیاں سوج جاتی ہیں تو دیسی شلجم ابالیں۔ اب اس ابلے ہوئے شلجم کے پانی میں نمک اور سرسوں کا تیل ملا کر پاؤں میں آہستگی سے مالش کریں اور کپڑا لپیٹ لیں تاکہ ہوا نہ لگے۔ پاؤں کی جلد کو نرم و ملائم کرنے کے لیے انڈے کی سفیدی سے مالش کریں۔ ناریل کے نیم گرم تیل سے پیروں کی ایڑیوں سمیت مالش کریں۔ اس کے بعد نرم تولیے سے صاف کر لیں، پاؤں نرم ہو جائیں گے۔ پندرہ دن میں ایک مرتبہ پیڈی کیور کرنا ضروری ہے۔ اور یہ آپ کے گھر میں بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ گرم پانی ٹب میں بھر کر اس میں لاہوری نمک ڈال کر اس میں پاؤں رکھیں اور سنکائی کریں۔

☆☆☆

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

مستقل نزلہ

روبینہ......کراچی

میں 20 سال سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں۔ بہت اچھا رسالہ ہے۔ ہومیو کلینک بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ نہایت توجہ سے تمام مریضوں کو علاج بتاتے ہیں اسی بنا پر میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً ایک سال سے نزلہ حلق میں گرتا رہتا ہے۔ سڑسڑ کر کے سارا دن نزلہ حلق میں کرتی ہوں۔ کبھی ٹھیک ہوجاتا ہے کبھی دوبارہ ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی گلا خراب ہوجاتا ہے۔ کھانسی بھی ہوتی ہے۔ باقی ماشاء اللہ سے سب ٹھیک ہے۔ کھانا پینا بھی صحیح ہے۔ میں باہر کی چیزوں سے مکمل پرہیز کرتی ہوں۔ گھر کے تیار کردہ کھانے ہی کھاتی ہوں۔ کولڈ ڈرنک، آئسکریم بھی سال میں ایک یا دوبار لیتی ہوں۔

جواب: جب نزلہ مستقل رہنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نمبر 1 خاندانی ہے۔ نمبر 2 ناک کا گوشت یا ہڈی یا پھر دونوں بڑھ چکے ہیں۔ آ کر ملتیں تو زیادہ بہتر تھا۔ ٹھنڈا گرم اور گرم ٹھنڈا نہ کریں۔ نیم گرم پانی میں تھوڑا سا نمک ڈال کر غرارے بھی کریں اور ناک میں اوپر تک بھی چڑھائیں۔ تمام قسم کی ٹھنڈی چیزوں

ٹوکن

برائے شوابے ہومیوکلینک

فروری 2021ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

اور فریج کی رکھی ہوئی ٹھنڈی چیزوں، پھلوں سے پرہیز کریں۔ ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Cinnabaris Pentarkan Ptk-31 کی ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ لیں۔

تکلیف دہ ایام

روبینہ......کراچی

مجھے ماہانہ ایام بہت تکلیف سے اور زیادہ آتے ہیں۔ پیڑو میں سخت درد ہوتا ہے جیسے دردِ زہ کے درد ہوتے ہیں۔ جب مینسز رک جاتے ہیں تو درد بھی رک جاتا ہے۔ پورے مہینے وقفے وقفے سے درد رہتا ہے۔ پیٹ اور کولھے بھاری ہو گئے ہیں۔ مینسز کے دنوں میں پیٹ سخت ہو جاتا ہے اور بڑھا ہوا لگتا ہے میرے چہرے پر غیر ضروری بال نکل آئے ہیں۔

جواب: لگتا ہے کہ آپ کے اندر ورم بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ خون کی کمی بھی ہے اور ہارمونز کی تبدیلیاں بھی ہو رہی ہیں۔ آ کر دکھا دیتیں تو زیادہ اچھا تھا۔ لیکوریا اور مینسز کے دنوں خصوصاً اور عام دنوں میں گرم پانی کی ٹکور کریں اور ہلکے ہلکے مساج بھی کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے کی Magnesium Phos Pentarkan Ptk-60 کی 2-2 گولیاں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ کھانے میں گرم تاثیر والی چیزوں سے پرہیز کریں اور فروٹ اور سبزیوں کا استعمال زیادہ کریں۔

بواسیر

فرخ......راولپنڈی

مجھے ایک سال سے بادی بواسیر ہے۔ مسوں سے خون نہیں آتا۔ البتہ مسے وقفے وقفے سے تنگ کرتے ہیں اور لگتا ہے کہ جیسے ایک جگہ جمع رہتے ہیں اور درد کرتے ہیں۔ اسی سے مجھے تھکن، کمزوری اور ٹانگوں میں درد ہے اور دل پر گھبراہٹ رہتی ہے۔

جواب: یہ مسئلہ کب سے ہے نہیں لکھا؟ وزن بھی نہیں لکھا، کیا کرتی ہیں؟ نہیں بتایا۔ حیض کی کیا حالت ہے؟ بلڈ پریشر اور نبض چیک کرائیے۔ شوگر کتنی رہتی ہے؟ کولیسٹرول کتنا ہے؟ کیلشیم کی مقدار اخون میں کتنی ہے؟ ساری تفصیل بتائیں تاکہ ایک صحیح نسخہ تجویز کیا جا سکے۔ فی الوقت ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کے Aesculus Pentarkan Ptk3 اور Rhustox Pertarkan Ptk-73 کے 10-10 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

ناک کا گوشت

رخسار......لاہور

میری بیٹی کو 3 سال سے نزلہ ہے جو مستقل رہتا ہے۔ دن میں تو منہ سے سانس لیتی ہے لیکن سوتے وقت منہ کھول کر سوتی ہے۔ قد ٹھیک ہے لیکن وزن زیادہ ہے۔ چہرے، بازو اور پیٹھ وغیرہ پر غیر ضروری بال زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کی ناک کا گوشت بڑھا ہوا ہے۔ دوا کتنے عرصے استعمال کرنی ہے اور پرہیز بھی بتائیے گا۔ آپ کی بہت مشکور رہوں گا۔

جواب: بیٹی سے کہیں وہ دن میں 5 مرتبہ ناک میں اوپر تک پانی چڑھایا کرے اور اگر نیم گرم پانی میں تھوڑا سا نمک ڈال کر ناک میں چڑھائیں تو زیادہ فائدہ ہوگا۔ تمام قسم کی ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کریں۔ (آئس کریم، قلفی، لال شربت، کولڈ ڈرنکس) اور بغیر دیکھے نہیں بتایا جا سکتا کہ کب تک ٹھیک ہوگا۔ فی الحال 2 ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Cinnabaris Pentarkan Ptk-31 کی ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ استعمال کرائیں۔

نسوانی حُسن

مسز ناظمہ......فیصل آباد

اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ اور لمبی زندگی عطا

فرمائے اور ضرورت مندوں کے کام آنے کی توفیق دے، آمین۔

میں اپنے نسوانی حُسن میں کمی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ مجھے احساسِ کمتری بھی ہے۔ بہت سی دوائیاں استعمال کیں مگر بے فائدہ رہیں۔ اس وجہ سے میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ مہربانی فرما کر کوئی دوا تجویز کر دیں۔ کیا یہ دوائیں دورانِ حمل بھی لے سکتے ہیں؟

جواب: ماشاء اللہ ایک لڑکا اور لڑکی یعنی دونوں نعمتوں سے اللہ نے آپ کو نوازا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کریں اور آئندہ کے لیے بہتری کی دعا کریں۔ دورانِ حمل یہ ادویات نہیں لی جاسکتیں۔ آپ کے اندر ہارمونز کی تبدیلیاں ہوئی ہیں جس کی وجہ سے آپ کے نسوانی حُسن میں کمی واقع ہوئی ہے۔ مقوی غذاؤں کا استعمال کریں۔ ہلکی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Sabal Serr Q کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

اوورویٹ

ارسلا رحمان......لاہور

پچھلے 6 ماہ سے میرا وزن کافی بڑھ گیا ہے۔ پہلے مناسب تھا لیکن اب پیٹ، کھولے اور بازو بہت موٹے ہو رہے ہیں۔ اس کے لیے کوئی اچھی سی دوا تجویز کیجیے۔

جواب: وزن کی زیادتی کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ آپ Throid Profile, Serum Insulin& CBC Profile کرا کر رپوٹ بھجیں۔ کم از کم ایک گھنٹا کی چہل قدمی کیا کریں۔ میٹھی اور چکنی چیزوں سے پرہیز کریں۔

ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا........ Phytolaca e baccis Q کے 7 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ رپوٹس کے ساتھ دوبارہ حال تفصیل سے بتائیں۔

پتّے میں پتھریاں

صالحہ......گوالمنڈی

تقریباً ایک سال سے میرے پتّے میں پتھریاں ہیں۔ پہلے بھی کبھار تکلیف ہوتی تھی اور پھر Pain Killer لگوانا پڑتا تھا۔ اس وقت تین چھوٹی پتھریاں ہیں۔ کیا یہ دوا دورانِ حمل استعمال کر سکتی ہوں؟ آپ کے جواب کی منتظر اور دعا گو۔

جواب:۔ دورانِ حمل پتّے کی پتھری کے لیے دوا استعمال کی جاسکتی ہے۔ Carduus Marianus Chelidonium-Ø اور Pentarkan Ptk-23 کے 10،10 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ میٹھی اور چکنی چیزوں سے پرہیز کریں۔ 3 ماہ بعد U/s Upper Abdomen کی رپورٹ کے ساتھ دوبارہ اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔

اندرونی کمزوری

اے آر......فیصل آباد

ڈاکٹر صاحب میں اندرونی طور پر بہت زیادہ کمزور ہوں جس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ ابھی تک میں نے کسی ڈاکٹر سے چیک اپ نہیں کرایا۔ برائے مہربانی اچھی سی دوا تجویز فرما دیں۔ میری عمر 27 سال ہے۔

جواب: آپ مکمل تفصیل لکھیں تاکہ کیس کی صحیح صورتِ حال معلوم ہو سکے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Damiana Penterkan Ptk-40 کے 15-15 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ 2 ماہ بعد حالات سے مطلع کریں۔

سر کے سفید بال

عروج......راولپنڈی

میرے سر کے تقریباً 80 فیصد بال سفید ہو چکے

ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں کہ میرے بال کالے جائیں۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی، غیر معیاری شیمپو، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں بالوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Lycopodium 30, Natrum mur-30 کے 7،7 قطرے اور Jaborandi Q کے 10 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

ماہانہ نظام کی خرابی

جنت نعیم ......ٹنڈو جام

مجھے جب بھی ماہواری آتی ہے بدہضمی ہو جاتی ہے اور کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔یوں لگتا ہے کہ جان نکل جائے گی۔ ایلوپیتھک دوا کھانے سے ماہواری آتی ہے۔میری کمر کے نچلے حصے، پٹھوں اور پنڈلیوں میں درد ہوتا ہے۔میرے سر کے بال بھی گرتے ہیں۔ میرے جسم پر سرخ دانے نکل رہے ہیں اور کبھی کبھی ہاتھ بھی کانپتے ہیں۔ پیٹ اور کولھے پھیلتے جارہے ہیں۔رنگ بھی خراب ہوگیا ہے۔صرف چہرے اور ہاتھوں کا رنگ خراب ہوتا ہے۔ پانی پینے سے مجھے اپھارا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی ہیں۔چہرے پر بال نکل آئے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔

جواب: پانچ وقت نماز کی پابندی کریں۔ صبح چہل قدمی کیا کریں۔ پانی کم از کم 12 گلاس روزانہ پئیں۔متوازن غذا دودھ، گوشت، سبزیاں اور پھلوں کا استعمال بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر اپنا حال تفصیل سے لکھیں۔Sulphur-200 کی ایک خوراک سب سے پہلے لیں۔صبح نہار منہ 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر ہر 3 ہفتے بعد لیں۔اس سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لیں۔

Calc. flour-30 Ferrum met.-30 Calc. phos-30 Pulsatilla-30 کے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ اور Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ چوسیں۔

لیکوریا

مسز سیّد......کوٹ اڈّو

تقریباً 5 سال سے لیکوریا کی شکایت ہے۔مینسز ویسے تو ٹائم پر ہوتے ہیں مگر ایک ہی دن کھل کر ہوتے ہیں۔میرا پیٹ بڑھ گیا ہے۔میں نے لیکوریا اور پیٹ کے لیے کافی دفعہ لیڈی ڈاکٹر سے علاج بھی کروایا مگر دوائیوں سے وقتی طور پر افاقہ ہوتا ہے پھر کچھ عرصہ بعد پہلے سے بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔

جواب: ہمیں لگتا ہے کہ آپ لگ کر علاج نہیں کراتیں، فائدہ نہیں افاقہ ہونے پر علاج چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسا نہ کریں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کریں ورنہ مسئلہ پیچیدہ ہو جائے گا۔ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات، Borax-30 Pulsatilla-3 Calc. carb-30 ہر شیشی میں سے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ اور Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ چوسیں۔دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

حال بتائیں

عاشق علی......مٹھی

میرا مسئلہ معدے کا ہے اور یہ تقریباً 4 سال سے ہے۔میں نے اس کا بہت علاج کرایا ہے۔کوئی ڈاکٹر کہتا ہے جگر کا مسئلہ ہے اور کوئی کہتا فلاں چیز کا مسئلہ ہے

لیکن اس کا کوئی مناسب علاج نہیں ہوا۔ اب ایک ڈاکٹر نے معدے کا السر بتایا ہے۔ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ نتھی کررہا ہوں۔ برائے مہربانی میرا کوئی اچھا سا علاج تجویز کریں۔

جواب: عاشق علی آپ نے کہانی تو بیان کردی لیکن اس میں اپنا حال نہیں بتایا کہ آپ کو ہوتا کیا ہے؟ لہٰذا اپنے حال کی علامات تفصیل سے بیان کریں۔ الٹراساؤنڈ میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔ دوا آپ کی علامات کے مطابق تجویز کی جائے گی۔ قارئین بھی اس کو نوٹ کرلیں کہ اپنا حال بتایا کریں نہ کہ کہانیاں۔

بچوں کو بھوک نہیں لگتی

ارمینہ...... گلبرگ

محترم میری بیٹی کی عمر پانچ سال ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ روٹی بالکل نہیں کھاتی نہ چاول شوق سے کھاتی ہے، چند ایک فروٹ کھا لیتی ہے، وہ زیادہ شوق سے دودھ نہیں پیتی ہے فیڈر میں دو حصے دودھ ہوتا ہے اور ایک حصہ کوک، چینی نہیں ڈلواتی۔ اکثر رات کو پیشاب کردیتی ہے۔ جسمانی طور پر بالکل ٹھیک ہے۔

جواب: اکثر مائیں بچوں کے متعلق یہ شکایت کرتی ہیں کہ ان کا بچہ/ بچی کو بھوک نہیں لگتی یا وہ صحیح سے نہیں کھاتا اس کی وجوہات میں نمبر 1 آپ کی محبت کہ آپ اس کو سب کچھ کھلا دینا چاہتے ہیں اس کے پیٹ (معدے) کی گنجائش سے زیادہ۔ نمبر 2 بار بار کھلانا، کولڈرنک، شربت چپس، بسکٹ ٹافیاں دینا۔ جب ہم بچوں کو یہ سب چیزیں کھلاتے رہیں گے تو بھوک ان کو کب لگے گی؟ نمبر 3، کوئی اندرونی بیماری یا اندورنی خرابی جو عموماً کم ہوتی ہے۔ آپ اپنی بچی کو عمر کے حساب سے کھلائیں اور پانی پلائیں۔ بچوں کے ساتھ خود کو بھی پیک شدہ اور کیمیکل سے بنی چیزوں سے بچائیں۔ صاف، تازہ، قدرتی غذا دیں۔ کولڈ ڈرنکس کوئی سی بھی اور یہ سب بازاری شربت کلر + پریزیٹو+ ایسنس کا مجموعہ ہوتے ہیں، یہ انتہائی مضرِ صحت ہیں۔ فیڈر سے کبھی بھی بچوں کو دودھ نہ پلائیں یہ بیماری کی جڑ ہے۔ بچی کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Euphrasia30 اورKali.mur30 Calc.Phos30 کے 3،3 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

تلووں میں جلن

خاور عباس...... گجرات

مجھے گزشتہ ایک سال سے پاؤں کے تلووں میں جلن ہورہی ہے۔ ہر قسم کے میڈیکل علاج ہومیو پیتھک اور دیسی علاج کرواچکا ہوں لیکن کوئی بھی فائدہ نہیں ہوا۔ میرا یورک ایسڈ پہلے بڑھا ہوا تھا اب دواؤں سے کنٹرول ہے۔ شوگر ٹھیک ہے۔ بائیں پاؤں میں بہت شدید جلن ہورہی ہے۔ بند جوتے پہننا میرے لیے بہت مشکل ہوگیا ہے۔ میرے سر کے بال بہت تیزی سے سفید ہورہے ہیں۔ یادداشت بھی میری بہت کمزور ہوگئی ہے ان سب کے لیے کوئی دوا... تجویز کریں۔

جواب: سبزیوں اور پھلوں کا استعمال بڑھا دیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ صبح نہار منہ ایک دفعہ 2 قطرے آدھا کپ پانی میں Sulphur 200 کے۔ ایک دن کے بعد 30 Iodium اور 30 Acid Phos کے 5،5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔ HbA1C کا ٹیسٹ کراکر ایک ماہ کے بعد اپنی طبیعت سے مطلع کریں۔